

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مطالعہ الفرقان

(قرآن مجید کی تفسیر — خود — قرآن مجید سے)

جلد دوم

سورة بقرہ - آیات ۳۰ تا ۱۱۲

پتروین

جملہ حقوق محفوظ

مطالب الفرقان (جلد دوم)	_____	نام کتاب
قلام احمد پرویزؒ	_____	مصنف
طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)	_____	ناشر
25-B گلبرگ II لاہور 54660	_____	
فون: 576 4484	_____	
دوست ایسوسی ایشن	_____	طابع
الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور 54000	_____	
فون: 712 2981	_____	
عالمین پریس	_____	مطبع
دسمبر 1996ء (بلا ترمیم)	_____	چوتھا ایڈیشن

طلوع اسلام ٹرسٹ سے حاصل شدہ جملہ آمدن
قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آئینہ مطالب

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۲۳	<u>نفس انسانی</u>	۱- ظ	فہرست
۲۴	۶- انسانی ذات ہر بچہ کو عطا ہوتی ہے لیکن غیر نشوونما یافتہ شکل میں۔	ع	اندکس آیات
۲۴	۷- انسانی زندگی کا مقصد اس ذات کی نشوونما ہے۔	ف	حرف آغاز
۲۴	۸- تزکیہ نفس کا ذریعہ اتفاق فی سبیل اللہ۔		پہلا باب — تمہید پرگزشتہ دم
۲۵	۹- اس کی پہچان کہ ذات انسانی کی نشوونما ہو رہی ہے		<u>الانسان</u>
۲۶	۱۰- ذات کی خصوصیت انفرادیت ہے۔	۳	۱- غیر جاندار مادہ سے زندگی کی نمود کیسے ہو گئی۔
۲۶	۱۱- نیز اختیار و ارادہ۔	۶	۲- نظریہ ارتقاء اور قرآن مجید۔
۲۶	۱۲- موت کے بعد انسانی ذات اپنے اعمال کے نقوش لئے آگے بڑھتی ہے۔	۱۰	۳- محققین مغرب کی غلط نگہی۔ سیکولر ازم کا تصور۔
۲۸	۱۳- سائیکالوجی کی تحقیق	۱۲	۴- انسان اور حیوان میں بنیادی فرق
۳۰	نفس انسانی کے دو شعبے۔ شعوری اور غیر شعوری	۱۵	”نفخ روح“ سے مراد
۳۰	ان دونوں کا مجادلہ۔	۱۶	۵- انسانی ذات یا نفس کے خصائص و وظائف
			حیات بعد الممات
		۲۲	انسانی ذات، ذات خداوندی کا جزو نہیں

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۳۱	۳۰۔ جملت۔ نسل۔ وراثت۔ ماحول۔ عادات۔ عمریت	۱۴	۱۴۔ اعمال نامہ سے مراد۔
۴۶	کے نظریات اور ان کی تردید۔	۱۵	۱۵۔ نفس انسانی کا بقا۔
۵۰	۳۱۔ ابلیس یا شیطان — قرآن میں۔		<u>انسانی فطرت</u>
۵۱	یہ خود انسان کے اپنے جذبات کا نام ہے۔	۱۶	۱۶۔ انسان کی کوئی فطرت نہیں
۵۲	۳۲۔ ان بیباک جذبات کے مختلف مظاہر۔	۱۷	۱۷۔ ہمارے ہاں کا غلط عقیدہ۔ اسلام دینِ فطرت ہے
۵۳	شیاطینِ اکبر والانس۔	۱۸	۱۸۔ قرآن میں بیان کردہ انسانی خصوصیات۔
۵۴	۳۳۔ غلط اعمال کو مزین بنا کر دکھانا — شیطان کا	۱۹	۱۹۔ خیر و شر کی تمیز انسان کے اندر رکھ دی گئی ہے۔
۵۵	سب سے زیادہ کامیاب حربہ		یہ عقیدہ بھی غلط ہے۔
۵۶	مصنوعی نیکیاں — مصنوعی صلوة	۲۰	۲۰۔ <u>حملِ امانت</u>
۵۷	۳۴۔ احکام کے نتائج خود قرآن نے واضح کر دیئے۔	۲۱	۲۱۔ دیگر انسانی خصوصیات
۵۸	اسے کتابِ وحی کہتے ہیں۔	۲۲	۲۲۔ اشرف المخلوقات ہونے کا غلط نظریہ۔
۵۹	۳۵۔ نفسِ آمارہ۔ نفسِ توامہ۔ نفسِ مطمئنہ	۲۳	۲۳۔ انسان اور بشر۔
۶۰	۳۶۔ نفسیاتی امراض اور اخلاقیات کا باہمی تعلق	۲۴	۲۴۔ جن دانس
۶۱	۳۷۔ انسانی جذبات کی گہرائیاں۔	۲۵	۲۵۔ الماس
۶۲	۳۸۔ شیطان اور ابلیس دونوں الفاظ کیوں؟		<u>ابلیس</u>
	<u>ادھ</u>	۲۶	۲۶۔ انسانی کردار کے دو گوشے
۶۳	۳۹۔ آدم سے مراد آدمی ہے،		خوشخواریت اور گدازیت
۶۴	۴۰۔ قصہٴ آدم خود مدنی الطبع انسان کی مرگوش ہے۔	۲۷	۲۷۔ عیسائیت کا باطل نظریہ —
۶۵	۴۱۔ آدم کا لفظ انبیاء کرام کے ساتھ۔		گناہِ اول
۶۶	خلیفہ	۲۸	۲۸۔ اس سے جبریت کا عقیدہ پیدا ہوا۔
۶۷	۴۲۔ خلیفۃ اللہ کا غلط عقیدہ۔		اس کی تردید۔
۶۸	۴۳۔ خلیفہ کے معنی جانشین کے ہیں۔	۲۹	۲۹۔ مغربی محققین کی ریسرچ
			اور اس کی تردید۔

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۷۸	۵۷۔ عیسائیت اور جنگ	۶۵	۴۴۔ انسان سے پہلی مخلوق۔
۷۹	۵۸۔ تغلب یعنی قوت کے استعمال کی دو قسمیں	۶۶	۴۵۔ استخلاف فی الارض۔
۸۰	(سائیکالوجی کا انکشاف)		ملائکہ
۸۱	۵۹۔ قرآن اور قوت کا استعمال	۶۷	۴۶۔ مدبریات امور الہیہ۔
۸۱	۶۰۔ علم الاسماء۔۔۔۔۔ صدقین		یعنی نظم و نسق کائنات کے لئے مامور قوتیں
۸۱	۶۱۔ علم الاسماء۔	۶۷	۴۷۔ فطرت کی قوتیں۔
۸۲	۶۱۔ اشیائے کائنات یا قوانین فطرت کا علم	"	ضمناً۔ عرش خداوندی سے مراد
"	۶۲۔ غلط نام رکھنے کی تباہ کاریاں۔ ایک ضمنی گوشہ	۶۸	۴۸۔ تسبیح ملائکہ۔
"	بڑے بڑے مزار اور خانقاہیں	"	۴۹۔ ملائکہ کا سجدہ۔
۸۳	۶۳۔ تسخیر فطرت۔	"	۵۰۔ تسخیر فطرت۔
۸۴	۶۴۔ علم انسانی کی امکانی دستیں	۶۹	۵۱۔ نفسیاتی اثر پیدا کرنے والے ملائکہ۔
"	۶۵۔ سائنسدانوں کا اعترافِ عجز۔	"	ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے۔
۸۶	۶۶۔ تسخیر فطرت مقام آدم ہے جس میں مومن و		دوسرا باب۔ سرگزشت آدم
"	کافر سب شامل ہیں۔		آیات ۳۰ تا ۳۹
"	۶۷۔ یہ مومنین کا فریضہ ہے۔		
۸۷	۶۸۔ علما کون ہیں۔		
"	۶۹۔ کائنات کے متعلق سیکولرزم کا باطل نظریہ۔	۷۲	۳۰۔ واذ قال ربك..... تعلمون
۸۸	افلاطون کا نظریہ۔ اعیان نامشہود۔	"	۵۲۔ ملائکہ کی تسبیح و تقدیس۔
"	ہندوؤں کی دیدانت اور ہمارے صوفیاء کا	۷۳	۵۳۔ تسبیح اور ذکر کا فرائضی مفہوم
۸۸	وحشت الوجود کا عقیدہ۔	۷۵	۵۴۔ ورد و وظائف۔ تعویذ گنہگاروں کی حقیقت
"	مفرک مادہ پرستوں کا نظریہ۔	۷۶	۵۵۔ فساد انگیزیاں اور خونی زیاں۔
۸۹	۷۰۔ قرآنی نظریہ کائنات۔	۷۷	۵۶۔ نیشنلزم کی خونریزیاں و فساد انگیزیاں

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۰۰	۸۰۔ ابلیسی کردار کے دورِ رخ۔	۸۹	۱۔ اسے باکھن پیدا کیا گیا ہے۔
	اپنا فیصلہ۔ اور مجبوری کا عذر۔	۹۰	۲۔ اسے باطل سمجھنا کفر ہے۔
	۸۱۔ عقیدہ تجبر، پستی کردار اور دوں ہمتی کا مظہر ہے۔	۹۱	۳۔ کائنات کو باطل سمجھنے والے دنیا میں ذلیل ہوتے ہیں۔
۱۰۱	۸۲۔ معصیت ابلیس دَآدم میں مسروق۔		۴۔ مادہ پرستی کی تباہ کاریاں۔ مغربی مفکرین کا داویلا۔
	آدم نے غلطی کا اعتراف کر لیا۔ اس میں اصلاح کا امکان ہو گیا۔	۹۱	۵۔ تین گروہ۔ مومن۔ مغرب کے مادہ پرست۔ مذہب پرست۔
	ابلیس نے اس کا اعتراف نہ کیا۔ اس میں اصلاح کا امکان نہ رہا۔	۹۲	۶۔ تخلیق کائنات کا ایک مقصد۔ قانونِ مکار کا عمل کی کار فرمائی۔
	۸۳۔ ابلیسی کردار اور اقبال۔	۹۳	مغرب کے مفکرین کا اعتراف۔
۱۰۲	۸۴۔ پیدائشی امتیاز کا باطل نظریہ۔		۲۲۔ قالوا سبحنک... الحکیم
۱۰۳	۸۵۔ آدم مسجود ملائکہ ہے	۹۴	۷۔ ملائکہ کا اعترافِ عجز۔
	خدا کے سوا کسی کی حکومت جائز نہیں یہی مقامِ عبدیت ہے۔	۹۵	۲۳۔ قال یا آدم... تکفون۔
	۸۶۔ شرک کیوں جرمِ عظیم ہے		۸۔ خدا غیب و شہود کا علم رکھتا ہے۔ اس کا مفہوم۔
۱۰۴	۸۷۔ رسوم و مظاہر کی اہمیت اور انہیں مقصود بالذات سمجھ لینے کی تباہ کاریاں۔	۹۶	۹۔ میلادِ آدم کے مناظر (اقبال کی زبانی)
۱۰۵	۸۸۔ سیکور نظام میں سجدہ کی اجازت!	۹۸	۲۴۔ واذ قلنا للملائکہ... من الکفرین
۱۰۶	تحریک پاکستان کے دوران یہی مسئلہ مابہ النزاع تھا۔	۹۸	۱۰۔ ملائکہ کا سجدہ۔
۱۰۷	۸۹۔ ابلیس کے جبرائیم کی فہرست۔	۹۹	سجدہ کا مفہوم۔
۱۰۸	۹۰۔ جذبہ حسد۔		۱۱۔ ابلیس کا انکار۔
	۹۱۔ مستبدوں کا دبدبہ اور بزدلی۔		ابلیس ملائکہ میں سے نہیں تھا۔

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۱۷	۱۰۵۔ قرآن کریم نے مرد اور عورت دونوں کو یکساں مجرم قرار دیا۔	۱۰۷	۹۲۔ فرعون کا ایمان۔ اس کی پستی کردار کا نتیجہ
۱۱۸	عیسائیت نے صرغ عورت کو مجرم ٹھہرایا اور اس بنا پر اسے مردود مخلوق قرار دیا۔	۱۰۸	۹۳۔ ابلیس کا جذبہ انتقام۔
۱۱۸	عیسائیت میں عورت کی حیثیت	۱۰۹	۹۴۔ قیامت تک مہلت۔
۱۱۹	۱۰۶۔ عورت کی حیثیت خود ہمارے ہاں۔	۱۱۰	۹۵۔ ابلیس اور خدا کے مخلص بندوں کی آویزش میں خدا دخل نہیں دیتا۔
۱۲۳	دعویٰ روایات پر مبنی تفاسیر	۱۱۱	۹۶۔ احنک کا رسوا کن تغلب۔
۱۲۳	۱۰۷۔ قرآن کریم میں مرد اور عورت ہمدوش	۱۱۲	۹۷۔ مستبد ڈکٹیٹر اپنے مخالفین کو ذلیل کر کے بڑی لذت حاصل کرتے ہیں۔
۱۲۵	۱۰۸۔ بیہبوط آدم سے مراد تششت و افتراق کی پست سطح زندگی۔	۱۱۳	۲۔ ۱۔ وقلنا یا آدم۔۔۔۔۔ الظالمین
۱۲۶	۱۰۹۔ عداوت کا مفہوم۔ الگ الگ ہو جانا۔	۱۱۴	۹۸۔ جنت آدم۔ رزق کی فراوانی لیکن میری او تیری کی تفریق نہیں۔
۱۲۷	۱۱۰۔ معاشی طبقات میں باہمی عداوت۔	۱۱۵	۹۹۔ مردوں اور عورتوں دونوں کا حصہ۔
۱۲۷	۱۱۱۔ قرآن کریم کی دارنگ۔	۱۱۶	۱۰۰۔ جو قوم دنیا میں ذلیل ہے وہ آخرت میں بھی ذلیل ہوگی۔
۱۲۹	۲۔ ۱۔ فتلیٰ آدم۔۔۔۔۔ التواب الرحیم	۱۱۷	۱۰۱۔ شجر سے کیا مراد تھی؟
۱۲۹	۱۱۲۔ وحی کی راہنمائی کی ضرورت	۱۱۸	۱۰۲۔ باہمی اختلافات سے قبیلوں۔ گردہوں اور قوموں میں بٹ جانا۔
۱۳۱	کلمات اللہ سے مراد وحی خداوندی ہے۔	۱۱۹	۲۔ ۱۔ ہاں لہما الشیطان۔۔۔۔۔ الیٰ حین
۱۳۲	یا وہ نظریہ حیات یا نظام زندگی جو وحی پر مبنی ہو	۱۲۰	۱۰۳۔ ابلیسی سازش یہ ہے کہ نوح انسان، اولاد کی نسبت سے مختلف ٹکڑوں میں بٹ جائے۔
۱۳۳	۱۱۳۔ آدم کی توبہ۔ اصلاح کی گنجائش اور اس کا طریق	۱۲۱	۱۰۴۔ اہل و عیال و حوزہ نیست ہیں لیکن اگر یہ بلند انسانی مقام کے راستے میں حائل ہو جائیں تو فتنہ بن جاتے ہیں۔
۱۳۴	۲۔ ۱۔ قلنا اہبطوا۔۔۔۔۔ یحزنون۔		
۱۳۴	۱۱۴۔ اتباع وحی کا نتیجہ۔ خوف و حزن سے مامونیت		
۱۳۵	خوف و حزن کا تفصیلی مفہوم۔		
۱۳۵	سبب غالب۔ عبت مومنین کی زندگی یہی اولیاء اللہ ہیں۔		

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۲۰	قرآن فہمی کے تین طریقے۔ علم و دانش کی روشنی میں	۱۳۹	۲۹ - والذین کفروا وکذبوا ۔۔۔۔۔
۱۲۷	نتائج پرکھنے سے۔ یا تاریخی شہادت کے ذریعے۔	۱۳۹	خلدون۔۔۔۔۔
۱۲۹	تاریخ کی اہمیت۔	۱۱۵	اس کے برعکس کفر اور تکذیب کا نتیجہ جہنم کی تباہی ہوگا۔
۱۵۰	سائنس یا فلاسفی اور ہمسری۔	۱۳۶	تکذیب کا مفہوم۔
۱۵۱	مارکس کا نظریہ تاریخ۔	۱۱۶	سرگزشت آدم پر نگہ باز گشت۔
۱۵۲	۱۲۲ - قانون مکافات عمل یا سنت اللہ	۱۳۶	انسان نے خارجی کائنات کے حسن کو سنوارا ہے۔ لیکن اپنی دنیا کو تباہ و برباد کرنا چلا آ رہا ہے۔
۱۵۳	۱۲۳ - اثری انکشافات (اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات)	۱۳۷	۱۱۷ - جنت آدم اور جنت موسیٰ میں فرق —
۱۵۴	۱۲۴ - قوموں کے عروج و زوال کے اصول۔	۱۳۸	بخشیش کی جنت اور اعمال کے بدلے میں حاصل کردہ جنت۔
۱۵۵	۱۲۵ - قوموں کی ہلاکت سے کیا منہموم ہے۔	۱۳۹	۱۱۸ - تورات میں قصہ آدم
۱۵۶	۱۲۶ - داستان بنی اسرائیل۔	۱۴۱	یہ نتیجہ ہے وحی خداوندی میں انسانی آمیزش کا
۱۵۷	ابتدائی تعارف۔	۱۴۲	۱۱۹ - وضعی روایات کی سازش۔
۱۵۸	فسرہ عربی مصر۔	۱۴۳	ان روایات کی رد سے قصہ آدم کو اچھو بہ بنا دیا گیا ہے۔
۱۵۹	۱۲۷ - بنی اسرائیل کے دس گم شدہ اباط۔	۱۴۴	خلاصہ آیات ص ۳ تا ص ۳۹
۱۶۰	۱۲۸ - بخت نصر کا حملہ۔	۱۴۵	(مقتبس از مفہوم القرآن)
۱۶۱	اس کا نقشہ حزقی ایل نبی کے خواب کی صورت میں		
۱۶۲	اس کا قرآن کریم میں ذکر۔		
۱۶۳	۱۲۹ - حضرت عیسیٰ کے زلمے میں یہودیوں کے اجارہ رہبان کی حالت۔		
۱۶۴	حضرت عیسیٰ کے انقلابی وعظ۔		
۱۶۵	انجیل برنباس کا بیان۔		
۱۶۶	سیکولرازم کے خلاف بغاوت۔		
۱۶۷	۱۳۰ - آخری تباہی۔		

تیسرا باب — داستان بنی اسرائیل — منزل اقل

آیات ۲ تا ۲۹

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۸۳	۱۴۳- ان کی کتابیں محرف تھیں۔	۱۳۱	ان کے جرائم کی فہرست جن کی وجہ سے ان کی
۱۸۴	۱۴۴- ان میں اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔	تباہی ہوئی۔	
۱۸۵	۱۴۵- تورات کی تاریخ۔	۱۳۲	ایک غلط فہمی کا ازالہ۔
۱۸۶	۱۴۶- وحی کی دو قسمیں۔ وحی جلی اور وحی خفی	۱۳۳	یہودیوں کی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔
۱۸۷	۱۴۷- مثنا۔ جمارا۔ تالمود۔ باطنی علم۔	۱۳۴	حضرت موسیٰ کی داستانِ حیات۔
۱۸۸	۱۴۸- قرآنِ کریم کے مصدق ہونے کا مفہوم۔	۱۳۵	۲۔ یبنی اسرائیل۔۔۔۔۔ فارہبون۔
۱۸۹	۱۴۹- ولاتکونوا اول کا فرقہ۔	۱۳۶	بنی اسرائیل پر انعاماتِ خداوندی۔
۱۹۰	۱۵۰- دین کی سب سے زیادہ مخالفت مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوتی ہے۔	۱۳۷	فرعون کی طرف سے عذاب کی شکلیں۔
۱۹۱	۱۵۱- ایمان، قرآنِ خالص کی اطاعت کا نام ہے۔	۱۳۸	محکومی۔ تفرقہ۔ ذبحِ ابنار کا مفہوم۔
۱۹۲	۱۵۲- مذہب، شخصیتوں کو ساتھ ملا تا ہے۔ اور انہی کی وضع کردہ شریعت کو شریعتِ خداوندی کہہ کر پکارتا ہے۔	۱۳۹	نجات کا قرآنی مفہوم۔
۱۹۳	۱۵۳- یہ شکر ہے	۱۴۰	۱۳۴- تمکن فی الارض خدا کا انعام ہے جس سے بنی اسرائیل بہرہ یاب ہوتے تھے۔
۱۹۴	۱۵۴- حضور پر قریش تو ایمان لے آئے لیکن اہل کتاب مخالفت پر اڑے رہے۔	۱۴۱	۱۳۵- کتابِ حکومت و نبوت۔ سرفرازیں اور سر بلندیاں۔
۱۹۵	۱۵۵- اگر تمام معاملات کے فیصلے منزل من اللہ کتاب (قرآن مجید) کے مطابق نہ کئے جاتیں تو یہ کفر ہے۔	۱۴۲	۱۳۸- میثاق بنی اسرائیل کی تفصیلات۔
۱۹۶	۱۵۶- مذہب میں جنتِ آسانی سے مل جاتی ہے۔	۱۴۳	۱۳۹- نقضِ عہد کا نتیجہ۔ احساسِ کمتری۔ منافقت۔
۱۹۷	۱۵۷- یہود و نصاریٰ کا باہمی تفرقہ۔	۱۴۴	۱۴۰- "قرن مجھ سے ڈرو" کا مفہوم۔
۱۹۸	۱۵۸- یہ دین میں غلو کرتے تھے۔	۱۴۵	۱۴۱- "خدا سے ڈرنے کا مفہوم کیا ہے۔ ایک اہم ضمنی گوشہ۔
۱۹۹		۱۴۶	۲۔ وامنوا بما انزلت۔۔۔۔۔ فاتقون۔
۲۰۰		۱۴۷	۱۴۲- اہل کتاب سے قرآن پر ایمان لانے کا مطالبہ کیوں کیا گیا؟

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۲۰۲	رسول اللہ اور جماعت مومنین کو زکوٰۃ کا حکم۔	۱۹۳	رسولوں کو خدا اور علماء و مشائخ کو رسول بنا دینا
۲۰۴	۱۶۱۔ زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم جو قرآن کے مطابق نہیں۔	۱۵۴	ہر رسول کا اعلان کہ میں تمہارے ہی جیسا
۲۰۵	۱۶۲۔ ایتائے زکوٰۃ حکومت کا فریضہ ہے۔	"	بشر ہوں۔
۲۰۶	۱۶۳۔ زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم۔	۱۹۴	۲۔ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا
۲۰۶	انسانی جسم اور ذات کی نشوونما کا سامان پہنچانا	۱۹۴	۱۵۵۔ مذہب کو کاروبار مت بناؤ
۲۰۸	۱۶۴۔ دولت جمع کرنے کی سخت ممانعت۔		ہر رسول کا اعلان کہ تم سے کوئی معاوضہ
۲۰۹	فاضلہ دولت کسی کے پاس نہ رہے۔	"	نہیں مانگتا۔
۲۰۹	زکوٰۃ کے متعلق ایک وضعی روایت۔	۲۔	وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ
۲۱۰	۱۶۵۔ رسول اللہ نے مروجہ زکوٰۃ دی ہی نہیں۔	۱۹۵	وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَانْتُمْ تَعْلَمُونَ
۲۱۰	حضور کی مالی حالت۔	"	حق کے معافی و مفہوم
۲۔	۲۔ وَارْكَبُوا مَعَ الرَّاحِطِينَ	۱۹۶	خدا اکتی ہے۔
۲۱۱	۱۶۶۔ رکوع کا مفہوم۔ اطاعت خدا وندی۔	"	قرآن اکتی ہے۔
	رکوع اور سجدہ میں فرق — رکوع عبوری	"	اسلام دین اکتی ہے۔
۲۱۲	دور کے احکام کی اطاعت ہے۔	۱۹۷	اعمال نامہ اکتی ہے۔
۲۱۳	۱۶۷۔ دین اجتماعی نظام کا نام ہے۔	۱۹۷	۱۵۶۔ کشمکش حق و باطل۔
"	تشکیل امت۔	۱۹۸	۱۵۷۔ قوانین فطرت بھی حق ہیں
	رنگ، نسل، زبان، وطن کے اشتراک سے نہیں	۱۹۹	ان کی خلاف ورزی باطل نتائج پیدا کرتی ہے۔
۲۱۵	ایمان کے اشتراک کی بنا پر تعمیر امت۔	"	۱۵۸۔ اسلامی جنگیں بھی اسی مقصد کے لئے تھیں۔
"	ضمناً۔ دین اور تصوف میں فرق۔	۲۰۱	۳۔ وَاقِيمُوا الصَّلَاةَ..... الرَّاحِطِينَ
۲۱۶	۱۶۹۔ امت کا اجتماعی نظام — خلافت یا اسلامی مملکت	"	۱۵۹۔ زکوٰۃ کا مفہوم۔
"	مرکز ملت — قبلہ	۲۰۲	ضمناً اسلام اور کیونرم کا بنیادی فرق)۔
۲۱۷	۱۷۰۔ ہماری موجودہ حالت — فرقہ بندی شرک میں مبتلا۔	۲۰۲	۱۷۰۔ انبیاء سابقہ کو زکوٰۃ کا حکم۔

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۲۳۴	۱۸۰۔ شفاعت کا قرآنی مفہوم۔ (ضمناً) قرآنی اصطلاحات کا مفہوم کس طرح متعین کرنا چاہئے۔	۲۱۹	(۲/۳۳۷) اتامرون الناس..... تعقلون
۲۳۵	۱۸۱۔ دنیاوی زندگی میں شفاعت کے معنی معاذ کے ہیں۔	۲۱۹	۱۴۱۔ برتر کے معنی۔
۲۳۵	۱۸۲۔ اخروی زندگی میں شفاعت سے مراد شہادت (گواہی) دینے کے ہیں۔	۲۲۰	۱۴۲۔ یہودیوں کے علماء و مشائخ کی حالت۔
۲۳۶	۱۸۳۔ خدا خود شفیع ہے۔	۲۲۲	(۲/۳۳۷) واستعینوا بالصبر... راجعون
۲۳۶	۱۸۴۔ رسول اللہ کے لئے یہ لفظ نہیں آیا۔ حضور کے لئے شاہد اور شہید کے الفاظ ہی آئے ہیں۔	۱۴۳	یہودیوں میں استقلال اور استقامت سے خطرات کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رہی تھی
۲۳۶	۱۸۵۔ مجرموں کو جرم کے بدلے میں کچھ لے کر بھیج دیا نہیں جائے گا۔ اسے عدل یا کفارہ کہتے ہیں۔	۲۲۳	۱۴۴۔ فیصلے قانون مکافاتِ عمل کے مطابق ہوں گے۔
۲۳۹	۱۸۶۔ نصرت کے معنی کسی مجرم کی مدد کے لئے اُس پر نصرت کرنا۔	۲۲۴	خلاصہ باب
۲۴۰	(۲/۳۳۷) واذا نجینکم..... عظیم۔		پچوٹھا باب
۲۴۱	۱۸۷۔ بلا (ابتلا) کا قرآنی مفہوم۔		داستان بنی اسرائیل۔ دوسری منزل سینا کی وادی
۲۴۱	اللہ اپنے بندوں کی آزمائش نہیں کرتا۔		آیات ۲/۳۳ تا ۲/۳۷
۲۴۱	۱۸۸۔ ابتلا سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنا محاسبہ کرتا رہے کہ اس کی صلاحیتیں کس حد تک نشوونما پا رہی ہیں اور وہ کس سیرت و کردار کا مالک ہے۔	۲۲۸	(۲/۳۳۷) یبنی اسرائیل..... علی العلمین
۲۴۲	۱۸۹۔ بلا عظیم کے معنی احسان عظیم۔	۲۲۸	۱۴۵۔ نعمائے خداوندی کی یاد دہانی سے مقصد
۲۴۲	(۲/۳۳۷) واذا فرقنا..... تنظرون	۲۲۸	(۲/۳۳۷) واتقوا یوما..... ینصرون
		۱۴۶	نجات کے متعلق یہودیوں کے عجیب و غریب عقائد۔
		۲۲۹	۱۴۷۔ قانون مکافاتِ عمل کا تشریحی بیان۔
		۲۳۰	۱۴۸۔ جزا اور سزا کا قرآنی مفہوم
		۲۳۱	۱۴۹۔ شفاعت کا باطل عقیدہ

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۲۴۴	۲۰۵۔ شرک سے انسان شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔	۲۴۴	۱۹۰۔ مصر سے نکل کر سینا کی طرف آنے کا مرحلہ۔
۲۴۱-۲۴۲	اس لئے یہ ظلم عظیم ہے۔	۱۹۱۔ ضمناً۔ رسول اللہ کی ہجرت کے دوران غار کا واقعہ۔	
۲۴۲	(۲/۵۲)۔ تَعَفُّوْنَا..... تَشْكُرُونَ۔	۲۴۴	۱۹۲۔ عصا کے معنی۔
۲۴۳	شکر کا مفہوم۔	۲۴۵	۱۹۳۔ آل کے معنی۔
۲۴۴	۲۰۶۔ باز آفرینی کا ایک اور موقع۔	۲۴۶-۲۴۸	۱۹۴۔ سمندر نے کیسے راستہ دیا تھا۔
۲۴۴	(۲/۵۳)۔ وَاذَاتَيْنَا..... تَهْتَدُونَ	۲۴۹	۱۹۵۔ فرعون کا ڈوبتے وقت ایمان لانا۔
۲۴۴	۲۰۸۔ اس مقصد کے لئے ضابطہ ہدایت دیا گیا	۲۴۹	(جبریل اس کے منہ میں مٹی ٹھونس رہا تھا!)
۲۴۴	۲۰۹۔ اسے فرقان کہا گیا۔ فرقان کا مفہوم۔	۲۵۰	۱۹۶۔ اس کے بالمقابل ساحرین دربار فرعون کا ایمان!
۲۴۵	۲۱۰۔ ہر نبی اور ہر رسول کو کتاب دی گئی تھی۔	۲۵۲	۱۹۷۔ فرعون کی لاش کا محفوظ رکھے جانے۔
۲۴۵	۲۱۱۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون دونوں کو کتاب ملی تھی۔	۲۵۳	(۲/۵۴)۔ وَاذْوَاعِدْنَا..... ظَلَمُونَ۔
۲۴۶	(۲/۵۴)۔ وَاذْوَاعِدْنَا..... التَّوَابِ الرَّحِيمِ۔	۲۵۳	۱۹۸۔ فرمائش کہ ہمارے لئے بھی ایک بت بنو جائے۔
۲۴۶	۲۱۲۔ توبہ اور توبہ کی مزید تشریح۔	۲۵۴	۱۹۸۔ عزیر کون تھا؟
۲۴۷	۲۱۳۔ خدا کی صفت ابدی کا مفہوم۔	۲۵۶	۱۹۹۔ سامری کون تھا۔
۲۴۷	۲۱۴۔ فَاقْتُلُواْ اَنْفُسَكُمْ کا مفہوم	۲۵۷	دستان گوداعظ۔
	خلاصہ باب	۲۵۷	۲۰۰۔ گودال پرستی کا واقعہ
	پانچواں باب۔ آیات ۲/۵۵ تا ۲/۶۱	۲۵۹	۲۰۱۔ قوم کو تفرقہ سے بچانے کے لئے عارضی شرک
	داستان بنی اسرائیل۔ سخت غلامی کے مظاہرے	۲۵۹	گوارا کر لیا۔
۲۴۷	۲۱۵۔ سخت غلامی میں بے چنگلی کے نتائج۔	۲۵۹	۲۰۲۔ مسلمان اور فرقہ پرستی کا شرک!
۲۴۷	۲۱۶۔ حضرت ابراہیمؑ کا سوال۔ رب! دینی کیف	۲۶۰	ابلیس کا افسوس۔ یہ فرقے نہیں مکاتب فکر ہیں۔
۲۴۷	تحتی الموتی۔	۲۶۱	۲۰۳۔ سامریت کی افسانہ نگاری۔
			۲۰۴۔ تورات کا بیان۔

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۲۸۶	۲۲۷ - عام فاتحین اور موسیٰ فاتحین میں مشرق -	۲۸۵	۲۱۷ - حضرت موسیٰ کو ستانے والی قوم -
"	عجز و انکساری کے ساتھ مفتوحہ علاقہ میں داخل ہونا	"	طرح طرح کے مطالبات، شکوے، طعن تشنیع -
"	اندازِ ملکیت کی بساط الٹ دی گئی -	۲۸۶	(۲۵۷) - واذا قلتم تنظرون -
۲۸۷	۲۲۸ - مغفرت کا مفہوم	۲۸۶	۲۱۸ - مطالبہ کہ ہم خدا کو بے نقاب دیکھیں گے -
۲۸۸	بخشش کا تصور ہی خلافِ قرآن ہے -	"	اور بزدلی کا یہ عالم کہ بجلی کی کڑک سے ہوش بیدار ہو گئے -
۲۸۹	۲۲۹ - محسنین کے لئے اجر سے بھی کچھ زیادہ -	۲۸۷	شرک سے انسان ایسا ہی بزدل ہو جاتا ہے -
۲۸۹	محسنین کے معنی - حسن کا مفہوم -	"	۲۱۹ - مسلمانوں کو تنبیہ کہ تم ایسا نہ ہو جانا!
۲۹۰	الاسمار الحسنیٰ کے معنی -	۲۸۸	لیکن تصرف ہمیں ان سے بھی آگے لے گیا -
۲۹۱	۲۳۰ - عدل و احسان کا حکم - اس کے معنی -	۲۸۹	(۲۵۸) - ثم بعثناکم تشکرون -
"	۲۳۱ - هل جزاء الاحسن الا الاحسان	۲۹۰	۲۲۰ - لفظ موت کا مجازی مفہوم -
۲۹۱	کا مفہوم -	۲۹۱	۲۲۱ - لفظ بعث کا مفہوم
۲۹۳	(۲۵۹) - فبدل الذین یفسقون	۲۹۲	(۲۶۰) - وظللنا علیکم یظلمون
"	۲۳۲ - ہماری تفسیر کی رو سے اس کا مفہوم -	"	۲۲۲ - دیگر نعمتے خداوندی - بادلوں کا سایہ -
"	اس کا عملی نتیجہ - اہمیت صرف الفاظ کو	۲۹۲	یعنی آسائش و راحت کا سامان -
"	معانی کو نہیں - فنِ قرأت - تبلیغی جماعت -	۲۹۳	۲۲۳ - لفظ نزول کے معانی
۲۹۴	۲۳۳ - ان سے کہا کہ اٹھو اور ارض مقدس پر قبضہ کر لو	"	۲۲۴ - من و سلویٰ -
"	کہنے لگے - ہم تو نہیں جائیں گے - آپ نے و لوں بھلا	۲۹۳	۲۲۵ - رزق کے ساتھ طیب کی شرط - طیب کا مفہوم
"	جائیے -	"	یہی شرط، کمیونزم اور قرآن کے معاشی نظام
۲۹۵	وہ زمین چالیس سال تک ان پر حرام قرار دیدی گئی	"	میں حدِ فاصل ہے -
"	۲۳۴ - زمین کے وارث وہی ہو سکتے ہیں جن میں اس	۲۸۵	(۲۵۸) - واذا قلنا المحسنین
۲۹۵	کی صلاحیت ہو -	۲۸۶	۲۲۶ - خلافتِ ارضی - مملکت و ملکہ -
۲۹۵	۲۳۵ - رجسز کے معنی -		

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۳۱۰	۲۴۸- مردودی صبا کی تفسیر	۲۹۷	(۲۰۰) - واذا استسقی... مفسدین
"	(۲۰۰) - فجعلنا نكالاً... للمتقين	۲۹۷	۲۳۶- پانی کے چشمے۔
۳۱۰	۲۴۹- یہ واقعہ ہمارے لئے موجب عبرت ہے۔	۲۹۸	۲۳۷- چیشی غذاؤں کے تقاضے۔
۳۱۱	(۲۰۰) - واذا قال موسى... من الجاهلین	۲۹۹	(۲۰۰) - واذا قلتم... يعتدون
"	۲۵۰- ذبح بقر کا واقعہ	۳۰۰	۲۳۸- قتل انبیاء کا مفہوم۔
۳۱۲	۲۵۱- اعوذ باللہ کا مفہوم۔	۳۰۱	(مرزا غلام احمد کی دلیل کا ابطال)۔
۳۱۲	(۲۰۰) - قالوا ادع لنا... تؤمرون	۳۰۲	۲۴۰- اللہ اور اس کے رسول ہی غالب آکر رہیں گے۔
"	۲۵۲- بجائے اس کے کہ وہ اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے	۳۰۳	حزب اللہ اور حزب الشیطان،
"	موشگافیاں کرنے — مثلاً اس بیل کی عمر	۳۰۴	ہو سکتا تھا کہ دین کا غلبہ رسول کی وفات کے بعد ہو
۳۱۲	کیا ہونی چاہئے۔	۳۰۴	۲۴۱- قتل بغیر الحق کے معنی۔
"	(۲۰۰) - قالوا ادع لنا... النظرین	۳۰۴	۲۴۲- تورات اور انجیل دونوں میں ہے کہ دین نبی اکرم ﷺ
۳۱۲	۲۵۳- اور اس کا رنگ کس قسم کا ہونا چاہئے۔	"	کی قوم تک محدود رکھا جائے گا۔ عالمگیر نہیں ہوگا
"	(۲۰۰) - قالوا ادع لنا... لمهتدون	۳۰۵	قرآن نے اس کی تردید کی۔
۳۱۲	۲۵۴- کہا کہ بات اب بھی مشتبہ سی ہے وقت کیجئے۔	۳۰۵	(۲۰۰) - ان الذين امنوا... يحزنون
۳۱۵	(۲۰۰) - قال انه... يفعلون	"	۲۴۳- دین عالمگیر انسانیت کے لئے ہے
"	۳۵۵- اس قدر کٹ جھتیوں کے بعد جا کر اس سیدھے	۳۰۶	(۲۰۰) - واذا اخذنا... تتقون
"	سارے حکم کی تعمیل کی!	"	۲۴۴- الطور سے مراد۔
"	۲۵۶- ناپختہ ذہنیتوں کے مسلمان اپنے سابقہ	۳۰۶	(۲۰۰) - ثم توليتم... الخسرين
۳۱۵	عقائد ساتھ لائے ہیں	۳۰۷	۲۴۵- بہلت کے وقفے میں اضافہ۔
۳۱۶	۲۵۷- قرآن کریم کے اصولی احکام کی جزئیات کا تعین	۳۰۷	(۲۰۰) - ولقد علمتم... خاسئين
۳۱۸	۲۵۸- یہ قوم اس طرح حضرت موسیٰ کو تنگ کرتی تھی	"	۲۴۶- سبت کا مفہوم۔
۳۱۹	۲۵۹- بہار ہاں کی ایک وضعی روایت پتھر پڑے لیکر بھاگ گیا۔	۳۰۸	۲۴۷- یہودیوں کے بند رہنے جانے کا مفہوم

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۳۲۶	(۲/۷۷) - اولایعلمون یعلنون	۳۲۱	چھٹا باب آیات ۲ تا ۱۱۴
۳۲۶	۲۷۱ - لیکن وہ خدا سے کیا چھپا سکتے تھے؟		داستان بنی اسرائیل - مسلسل
"	۲۷۲ - لفظ حدیث کے معنی		
۳۳۷	(۲/۷۸) - ومنہم امیدون یظنون	۳۲۲	(۲/۷۸) - واذا قتلتم تعقلون
۳۳۷	۲۷۳ - لفظ اُتی کے معنی (۱) ان پڑھ۔ (۲) غیلائی کتاب	"	۲۷۰ - قرآنی احکام و حقائق کے تین گوشے
۳۳۷	اور (۳) مکہ کا باشندہ	۳۲۳	۲۷۱ - واقعہ قتل کی عام تفسیر اور اس پر اعتراضات
۳۳۷	۲۷۴ - رسول اللہ نبوت سے پہلے ان پڑھ تھے بعد	۳۲۳	۲۷۲ - ہمارا قیاس — اس میں تفتیش جرم کا
۳۳۸	میں ایسے نہیں تھے	۳۲۵-۲۲	نفسیاتی طریقہ بتایا گیا تھا
۳۳۸	۲۷۵ - لفظ امانی کے معنی آرزو اور (۲)	۳۲۳	۲۷۳ - مودودی صاحب کا بیان کہ قرآن میں (معاذ اللہ)
۳۳۸-۳۹	لفظی تلاوت	۳۲۸	ابہام ہے
۳۳۹	۲۷۶ - کتاب اللہ کا رسمی احترام - تلاوت مفہوم سمجھنے پر	۳۲۹-۳۰	(۲/۷۹) - ثور قست قلوبکم تعلمون
۳۴۰	(۲/۷۹) - فویل للذین یکسبون	۳۳۰	۲۷۴ - یہودیوں کی قساوت قلبی
۳۴۰	۲۷۷ - شریعت سازی اور دین فروشی	۳۳۱	۲۷۵ - دل کس طرح سخت ہو جاتے ہیں؟
۳۴۰	جب مذہب ذریعہ معاش بن جائے تو ہر	۳۳۲	۲۷۶ - یہودیوں کی زرپرستی اور خود غرضی کی انتہا
۳۴۰	جگہ یہی کچھ ہوتا ہے	۳۳۲	۲۷۷ - خشیت کا مفہوم
۳۴۱	(۲/۸۰) - وقالوا خلدون	۳۳۳	(۲/۸۰) - افتطمعون یعلمون
۳۴۱	۲۷۸ - خدا کا قانون مکافات - جزا اور سزا	۳۳۳	۲۷۸ - حضور دل سے چاہتے تھے کہ یہ لوگ تباہی سے
۳۴۱	اعمال کا نتیجہ	۳۳۴	بچ جائیں
۳۴۲	عمل اور فعل میں فرق	۳۳۴-۳۵	(۲/۸۱) - واذا لقوا الذین تعقلون
۳۴۲	عمل کے معنی ہیں ایسا کام جو بالارادہ اور	۳۳۵	۲۷۹ - ان کی منافقت
۳۴۲	التراماً کیا جائے		۲۸۰ - ان کے مذہبی پیشواؤں کی تاکید کہ مسلمانوں سے
۳۴۲-۳۴۳	(۲/۸۱) - واذا اخذنا معرضون	۳۳۵	اپنی صحیح تعلیم کی کوئی بات نہ کہہ دیتا

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۳۴۲	۲۷۹- تولید و تخلیق میں قدرت	۳۴۲	عصر حاضر کے باطل نظام سرمایہ داری، اور فلاحی مملکتوں کا نقشہ۔
"	خدا کا عمل تخلیقی ہے، تولیدی نہیں۔	۳۵۴-۳۵۶	۲۸۷- روایات اور پیش گوئیاں — ایک ضمنی گوشہ
۳۴۳	اس کے ہاں بیٹا نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اس کی بیوی نہیں۔	۳۵۸	۲۸۸- غلام اور لونڈیاں — قرآن کریم کی روشنی میں
"	ایک عظیم دلیل۔ خدا اپنے قوانین کے خلاف نہیں کرتا	۳۵۸-۳۵۹	— مودودی صاحب کی تفسیر میں
۳۴۵	۲۸۰- والدین سے حسن سلوک۔	۳۵۹-۴۰	۲۸۹- کتاب کے ایک حصہ پر ایمان دوسرے سے انکار
۳۴۶	۲۸۱- عائلی زندگی (یعنی خاندانی رفاقت) کی ضرورت	۳۶۱	یہ سیکولر ازم ہے۔
۳۴۷	۲۸۲- ماں باپ کی اطاعت کا حکم قرآن میں نہیں۔	۳۶۱	۲۹۰- تحریک پاکستان کے دوران، نیشنلسٹ
۳۴۸	اسوۂ ابراہیمی کا اتباع نہ کہ رام کی تقلید۔	۳۶۱	علماء کا یہی مسلک تھا۔
۳۴۹	۲۸۳- ذی القربی سے حسن سلوک۔		یہی اب ہماری حالت ہے۔ پرسنل لاز او
"	۲۸۴- یتامی سے حسن سلوک۔	۳۶۲	پبلک لاز کی قیصر
۳۵۰	یتیم کے معنی۔ جو معاشرہ میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے۔	۳۶۲-۳۶۳	۲۹۱- دین کے نظام کی تکمیل تدبیراً ہوگی۔
"	۲۸۵- قولوا للناس حسنا۔	۳۶۳	(۲۸۶)۔ اُولَئِكَ ینصرون۔
۳۵۲	(۲۸۷)۔ واذاخذنا..... تشہدو۔	۳۶۳	۲۹۲- اس کی وجہ۔ دنیاوی مفاد کو مستقل
۳۵۲	۲۸۶- بنی اسرائیل کے دو عہد۔ باہمی خونریزی نہیں کر دے گی۔	۳۶۴	اقدار پر ترجیح دینا ہے۔
"	(۲۸۸)۔ ثم انتم هؤلاء..... تعلمون۔	۳۶۴	(۲۸۹)۔ ولقد اتینا..... تقتلون۔
۳۵۲	پہلے لوگوں کو بیکس اور محتاج بنادینا، پھر ان کی مدد کر کے اپنے آپ کو فریب دے لینا	۳۶۵	۲۹۳- ختم نبوت — ایک ضمنی گوشہ۔
۳۵۲-۵۳	کہ ہم ثواب کا کام کر رہے ہیں۔	"	۲۹۴- روح القدس کا ایک مفہوم۔
		۳۶۶	۲۹۵- قرآن خالص سے نفرت — اس میں
		۳۶۶	تبدیلی کرنے کا مطالبہ۔
		۳۶۷	(۲۸۸)۔ وقالوا قلوبنا غلف..... یومنون

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۳۸۳	۳۰۲ - قرآن مجید سننا لیکن عمل اس کے خلاف کرنا۔ یہ ہے ہمارا شیوہ۔	۳۶۸	۲۹۶ - حصول علم کی ضرورت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ انسانی علم ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا جا رہا ہے۔
۳۸۵	(۲/۹۷-۹۸) - قل ان کانت --- بایعبلون	"	یہ ذہنیت غلط ہے کہ ہمیں مزید علم کی ضرورت نہیں۔
۳۸۶	۳۰۳ - موت محاسبہ خورش کا ذریعہ ہے۔ مومن موت کا استقبال کرتا ہے۔ کافر اس سے بھاگتا پھرتا ہے۔	۳۶۹	ہمارے علماء کی حالت۔ امام غزالیؒ - مفتی محمد عبدہ - مولانا ابوالکلام آزاد - دارالمصنفین کے مجلہ معارف کی آراء - اور علامہ اقبال کی تنقیدات۔
۳۸۷	(۲/۹۸-۹۹) - قل من --- للکفرین	۳۷۰-۷۲	۲۹۷ - لعنت کے معنی۔
۳۸۸	۳۰۴ - وحی کس طرح نازل ہوتی تھی، ہم جان نہیں سکتے۔ ہم اس کے متن کو سمجھ سکتے ہیں۔	۳۷۱	(۲/۸۹) - ولما جاء ہم --- علی الکفرین
۳۸۸	جبریل - میکائیل - روح القدس۔	۳۷۲	۲۹۸ - تورات میں آنے والے رسول کی پیش گوئی۔ انجیل میں بھی۔
۳۸۸	خدا کفار کا دشمن ہے۔ اس کا مفہوم۔	۳۷۳	۲۹۹ - حضرت عیسیٰ کی پیش گوئی حضورؐ کے متعلق قرآن کریم میں اس کا ذکر تمام اہل مذہب آنے والے کے انتظار میں ہیں۔
۳۸۸	خدا کے ولی (دوست) ہونے کا مفہوم۔	۳۷۴	۳۰۰ - وہ آنے والا آچکا ہے۔ یعنی حضورؐ نبی اکرم۔ لیکن ہم بھی آنے والے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔
۳۸۹	(۲/۹۹) - ولقد --- الفسقون	۳۷۵	مجددین - ہمدی آخر الزمان - حضرت عیسیٰ کا نزول
۳۸۹	۳۰۵ - جو بھی غیر متبدل اخلاقی پابندیوں سے آزادی چاہتا ہے فاسق ہے۔ عصر حاضر میں سیکولر ازم، سوشلزم یا کمیونزم سب اسی جذبہ اباحت کے پیدا کردہ ازمن ہیں۔	۳۷۶	۳۰۱ - یہ عقائد ختم نبوت کے منافی ہیں۔ اب کوئی نہیں آئے گا۔
۳۹۰	(۲/۱۰۰) - اوکلمنا --- یؤمنون	۳۸۰	(۲/۱۰۱-۱۰۲) - ہئسما --- مؤمنین
۳۹۰	۳۰۶ - معاہدہ کے معنی یہ ہیں کہ اس کی پابندی پوری قوم کی طرف سے ہو۔	۳۸۱-۸۲	

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۴۱۴	۳۱۳ - مسلمان اور تصوف -	۳۹۱	(۲۱۱) - ولما يعلمون -
۴۱۷	۳۱۴ - رسول اللہ پر جادو (مودودی صاحب کی تفسیر)	۳۰۷	۳۰۷ - یہودیوں کی طرف سے حضرت عیسیٰ
۴۱۹	۳۱۵ - تعویذ اور درود و نذیفے اور ہمارے علماء کرام	۳۰۸	کی مخالفت -
۴۲۳	۳۱۶ - قرآن کی عظمت -	۳۰۸	۳۰۸ - قرآن کریم کی طرف دعوت دینے والوں
۴۲۷	۳۱۷ - علامہ اقبالؒ اور تصوف -	۳۰۹	کی مخالفت -
۴۲۹	(۲۱۲) - یا ایہا الذین امنوا عذاب الیم -	۳۰۹	(۲۱۲) - واتبعوا يعلمون -
۴۲۹	۳۱۸ - یہودیوں کی پست ذہنیت - ذو معنی	۳۹۲	۳۰۹ - ایک حقائق پر در آیت اور اس کا غلط مفہم
۴۲۹	باتیں کرنا - زبان کو توڑ مروڑ کر گفتگو کرنا -	۳۹۴	حضرت سلیمان کے خلاف تورات کی یادہ گوئی
۴۳۱	جماعت مومنین سے تاکید کہ بات ہمیشہ دو ٹوک	۳۹۵	جادو اور حضرت سلیمانؑ - اسم اعظم -
۴۳۱	- واضح کر دو -	۳۹۶	رضمنّا، حضرت عیسیٰ کے حواری
۴۳۱	(۲۱۳) - ما یود الذین الفضل العظیم	۳۹۶	قرآن کریم نے حضرت سلیمانؑ کا دامن پاک کیا
۴۳۲	۳۱۹ - قریش کی مخالفت کی وجوہات -	۳۹۷	لیکن ہماری کتب تفسیر میں کیا کہا گیا ہے؟
۴۳۳	۳۲۰ - قرآن کریم خیر ہے اس کا مفہم -	۳۹۹	۳۱۰ - بابل - سحر کاری کا اولین مرکز -
۴۳۳	(۲۱۴) - ما ننسخ من آية ولی ولا نصیر -	۴۰۰	۳۱۱ - ہاروت و ماروت کا افسانہ اور ہماری
۴۳۳	۳۲۱ - ناسخ و منسوخ سے متعلق آیت -	۴۰۱	کتب تفسیر -
۴۳۳	(۲۱۵) - امر تریدون سواء السبیل	۴۰۲	مودودی کی تفسیر (تفہیم القرآن) میں -
۴۳۵	۳۲۲ - دین تمام کا تمام قرآن کے اندر دیدیا گیا ہے -	۴۰۲	آیت کا صحیح مفہم -
۴۳۵	(۲۱۶) - ود کثیر قدیر -	۴۰۴	۳۱۲ - سحر یا جادو کی تاریخ اور حقیقت
۴۳۵	۳۲۳ - اہل کتاب کی کوشش کہ مسلمانوں کو	۴۰۸	یہودی اور باطنیت - یہی ہمارے
۴۳۵	دین سے برگشتہ کر دیں -	۴۱۱	ہاں کا تصوف ہے -
۴۳۵		۴۱۳	عیسائیت اور تصوف -
۴۳۵			قرآن - باطنیت کے خلاف چیلنج -

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۴۳۴	(۲/۱۱۱) - وقالوا صدقین	۴۳۵	ان سے اعراض برتو لیکن حسن کارنامہ انداز سے۔
۴۳۵	ان کا زعم باطل کہ جنت یہود و نصاریٰ کے لئے مختص ہو چکی ہے۔	۴۳۶	نبی کا قلب گداز و پرسوز۔
۴۳۶	اس کی تردید۔	۴۳۷	(۲/۱۱۲) - واقیموا الصلوة۔۔۔ بصیر۔
۴۳۷	(۲/۱۱۳) - بلی من اسلم۔۔۔ یحزنون۔	۴۳۸	۳۲۲۔ اقامت صلوة دیتے زکوٰۃ کے پروگرام
۴۳۸	۳۲۶۔ خدا کا قانون مکافات۔ ایمان و عمل کے نتائج ہر ایک کو ملیں گے۔	۴۳۹	کی اہمیت۔
		۴۴۰	ان کا ہر عمل نتیجہ خیز ہوگا۔

خلاصہ باب پنجم و ششم صفحہ ۵۲-۴۳۴
(آیات ۲/۵۵ تا ۲/۱۱۲)

گماں مبرکہ بیاباں رسید کارِ معناں
ہزار بادۂ ناخوردہ در گِ تاک است

انڈکس آیات - جلد اول

یہ انڈکس ان آیات کا ہے جن کی تفسیر مطالب الفرقان کی پہلی اور دوسری جلد میں مسلسل دی گئی ہے

جلد اول

آیت	سورة فاتحہ	صفحہ	آیت	سورة بقرہ	صفحہ	آیت	سورة بقرہ (مسل)	صفحہ
۱	۳	۵	۱۵۲	۱۸	۲۶۲
۲	۲۰	۶	۱۵۸	۱۹	۲۶۴
۳	۲۸	۷	۱۷۹	۲۰	۲۶۹
۴	۳۵	۸	۲۰۲	۲۱	۲۸۰
۵	۴۰	۹	۲۰۵	۲۲	۲۹۴
۶	۴۸	۱۰	۲۲۸	۲۳	۳۰۸
۷	۵۳	۱۱	۲۲۹	۲۴	۳۱۵
	سورة بقرہ		۱۲	۲۳۰	۲۵	۳۳۱
۱	۷۰	۱۳	۲۴۴	۲۶	۳۴۱
۲	۷۱	۱۴	۲۴۶	۲۷	۳۴۴
۳	۷۸	۱۵	۲۴۸	۲۸	۳۴۶
۴	۱۴۴	۱۶	۲۵۰	۲۹	۳۵۲
			۱۷	۲۵۷			
				انڈکس آیات جلد دوم سورة بقرہ				
۳۰	سورة بقرہ	۷۲	۳۴	سورة بقرہ	۹۸	۳۸	سورة بقرہ	۱۳۳
۳۱	۸۱	۳۵	۱۱۱	۳۹	۱۳۶
۳۲	۹۴	۳۶	۱۱۵	۴۰	۱۷۱
۳۳	۹۵	۳۷	۱۲۹	۴۱	۱۸۲

آيت	سورة	صفء	آيت	سورة	صفء	آيت	سورة	آيت
٢٢	سورة بقره	١٩٥	٦٥	سورة بقره	٣٠٤	٩٠	سورة بقره	٢٨١
٢٣	٢٠١	٦٦	٣١٠	٩١	٢٨١
٢٤	٢١٩	٦٧	٣١١	٩٢	٢٨٢
٢٥-٢٦	٢٢٢	٦٨	٣١٣	٩٣	٢٨٢-٨٣
٢٦	٢٢٨	٦٩	٣١٤	٩٤	٢٨٥
٢٨	٢٢٨	٧٠	٣١٤	٩٥	٢٨٥
٢٩	٢٣٠	٧١	٣١٥	٩٦	٢٨٦
٥٠	٢٣٣	٧٢-٧٣	٣٢٢	٩٦-٩٨	٢٨٦-٨٦
٥١	٢٥٢	٧٤	٣٢٩-٣٠	٩٩	٢٨٩
٥٢	٢٦٢	٧٥	٣٣٣	١٠٠	٢٩٠
٥٣	٢٦٣	٧٦	٣٣٣-٢٥	١٠١	٢٩١
٥٤	٢٦٦	٧٧	٣٣٦	١٠٢	٢٩٢
٥٥	٢٧٦	٧٨	٣٣٧	١٠٣	٢٠٣
٥٦	٢٧٩	٧٩	٢٣٠	١٠٣	٢٢٩
٥٧	٢٨٢	٨٠-٨٢	٢٣١	١٠٥	٢٣١
٥٨	٢٨٥	٨٣	٢٣٢-٢٣٣	١٠٦-٧	٢٣٣
٥٩	٢٩٣	٨٤	٢٥٢	١٠٨	٢٣٣
٦٠	٢٩٧	٨٥	٢٥٢	١٠٩	٢٣٥
٦١	٢٩٩	٨٦	٢٦٣	١١٠	٢٣٦
٦٢	٣٠٥	٨٧	٢٦٣	١١١	٢٣٧
٦٣	٣٠٦	٨٨	٢٦٧	١١٢	٢٣٧
٦٤	٣٠٦	٨٩	٢٦٥

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حرف آغاز

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچین بہار تو ز دامن گلہ دارد

(پہلا ایڈیشن)

مطالب الفرقان کی پہلی جلد، اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ آیات کے شمار کے اعتبار سے تو وہ سورۃ فاتحہ کے علاوہ سورۃ بقرہ کی صرف (۲۹) آیات پر مشتمل تھی لیکن اس میں اتنے اصولی مباحث آگئے تھے کہ بعض ایسے اجاب نے جنہوں نے اس سے پہلے میری کسی تصنیف کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا تھا اور پہلے پہل اس جلد کو بدقت نظر دیکھا تھا۔ مجھ سے کہا کہ اس ایک جلد سے پورے کے پورے اسلام کا صحیح خاکہ ان کے سامنے آگیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد چاروں طرف سے اس کی اگلی جلد کی اشاعت کے تقاضے شروع ہو گئے۔ اس تفسیر کا مسودہ میرے پاس پہلے سے تیار نہیں رکھا تھا میں اسے ساتھ کے ساتھ بڑھاتا رہا ہوں۔ اس میں جس قدر وقت لگتا ہے وہی کم نہیں۔ لیکن اس کے بعد، کتابت اور طباعت کی جن خاردار وادیوں میں سے گزرنا پڑتا ہے، ان کی آبرو انگیزی اور دامگیری کا اندازہ وہی حضرات لگا سکتے ہیں جو ان مراحل سے خود گزرے ہوئے ہیں۔ الحمد للہ یہ صبر آزمائے نازل بھی بخیر و خوبی طے ہو گئیں اور میں اس قابل ہو گیا کہ اس کی دوسری جلد، حسب وعدہ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں پیش خدمت اجاب کر سکوں۔ اکتوبر کی تخصیص اس لئے ہے کہ طلوع اسلام کی سالانہ کنونشن (بالعموم) اسی ماہ میں منعقد ہوتی ہے اور بادہ مستان ذوق قرآنی کا یہی وہ دلکش و پُر خلوص اجتماع ہے جو میرے اس نذرانہ محبت و عقیدت کا صحیح محل ہو سکتا ہے۔ خدا میرے ان رفقاء سفر کو تادیر سلامت رکھے۔

۲۔ زیر نظر جلد، سورۃ بقرہ کی (۸۲) آیات — از مت ۳ تا ۱۱ کو محیط ہے اور ان کا بنیادی موضوع قصہ آدم اور داستان بنی اسرائیل ہے۔ جیسا کہ آپ دیکھیں گے، قرآن مجید میں بیان کردہ قصہ آدم، کسی فرد کی داستان حیات نہیں۔ یہ خود انسان (آدمی) کی کیفیات و نفسیات کا تذکرہ ہے جسے مثالی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں عودی طوط پر بتایا گیا ہے کہ انسان میں تسخیر فطرت کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے۔ اگر یہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں

اقدار خداوندی کے مطابق استعمال کرے گا تو عالم انسانیت (أَخْوَفُ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْذَرُونَ) کا فووس
 بدایاں معاشرہ بن جائے گا۔ اور اگر، افراد یا اقوام انہیں اپنے سرکش جذبات کی تسکین کے لئے صرف میں لائیں گی، تو
 یہ کرہ ارض، يَفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (پ)۔ فساد انگیزیوں اور خونریزیوں کا جھیم بن جائے گا۔
 قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک محکم اصول حیات یا ابدی قانون زندگی پیش کرتا ہے اور نظری دلائل کے ساتھ
 ساتھ اقوام سابقہ کے تاریخی شواہد کو اس کی صداقت کی تائید میں سامنے لاتا ہے۔ اپنے اسی انداز کے مطابق اس نے سورہ
 بقرہ کے آغاز میں قصہ آدم کے فوری بعد، داستان بنی اسرائیل کی ابتداء کر دی ہے۔ یہ داستان صرف قوم بنی اسرائیل
 کی تاریخ نہیں۔ اس میں قوموں کے عروج و زوال کے ابدی قوانین شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں یہی وجہ ہے
 کہ قرآن مجید نے جس تکرار و اصرار سے اس داستان کو دہرایا ہے، کسی اور قوم کے تذکرہ کو اس تفصیل سے بیان نہیں کیا
 زیر نظر جلد میں مقام آدم کی کیفیات اور داستان بنی اسرائیل کی تفصیلات (قریب قریب) تمام و کمال آگئی ہیں
 یہ وجہ ہے کہ شمار کے اعتبار سے قویہ جلد کل (۸۲) آیات پر مشتمل ہے لیکن مضامین کے لحاظ سے یہ گویا اپنے موضوع کا
 دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) ہے۔ اس وضاحت سے یہ حقیقت بھی سامنے آگئی ہوگی کہ (جیسا کہ میں نے
 جلد اول کے آغاز میں کہا تھا) اس تفسیر کی ابتدائی جلدوں میں آیات کی تعداد کم ہوگی لیکن جوں جوں ہم آگے بڑھتے
 جائیں گے، آیات کی تعداد زیادہ ہوتی جائے گی کیونکہ جو آیات پہلے آچکی ہوں گی انہیں دہرایا نہیں جائے گا۔ ان
 کے حوالہ پر اکتفا کیا جائے گا۔ اگرچہ بعض اوقات ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جو بات کسی پہلی جلد میں کہی جا چکی ہے،
 وہ مزید وضاحت کے لئے کسی اگلی جلد میں بھی آجائے۔ میں حتمی وعدہ تو نہیں کر سکتا (کیونکہ اکثر ایسے حالات بھی
 رونما ہو جاتے ہیں جن کے متعلق پہلے سے کچھ نہیں کہا جاسکتا)۔ لیکن میرا ارادہ یہی ہے کہ اس سلسلہ کو منقطع نہ ہونے
 دیا جائے۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ (۱۱۸)۔ میرا عمر بھر کا ساتھی اگر
 عمر بھر میرے ساتھ رہے تو اس سے بڑھ کر میری سعادت اور کیا ہوگی؟

۳۔ ان مجلدات کے ترتیبی انداز کے متعلق جلد اول میں تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔ ان میں دو ایک نکات

کا اضافہ ضروری ہے:-

(۱) آیات کے حوالوں میں اوپر سورہ کا نمبر ہے اور نیچے آیت کا نمبر۔ (مثلاً ۲/۱۵ سے مراد ہے سورہ بقرہ کی...
 پندرھویں آیت)۔ ان حوالوں کو بڑی احتیاط سے چیک کر لیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں چونکہ قرآن مجید کے مختلف
 نسخوں میں آیات کے نمبروں کا اختلاف ہوتا ہے اس لئے اگر کسی حوالہ کے مطابق مطلوبہ آیت نہ ملے تو ایک آدھ

آیت پہلے یا بعد میں دیکھ لیا جائے۔ اگر اس سے بھی وہ آیت نہ ملے تو براہ کرم مجھے مطلع فرما دیا جائے تاکہ، اگر حوالہ میں غلطی ہو تو آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر لی جائے۔

(۲) جلد اول میں ان (۷۹ + ۷۰) آیات کا اندکس نہیں دیا جاسکا تھا جن کی تفسیر اس جلد میں آئی تھی۔ زیر نظر جلد میں، فہرست کے بعد، جلد اول و جلد دوم دونوں کی آیات کا اندکس دیدیا گیا ہے تاکہ مطلوبہ آیت یا آیات کے تلاش کرنے میں دقت نہ ہو۔

۴۔ آخر میں اس اعتراف کو پھر دہرا دوں جسے میں اپنی ہر کتاب کا جزو لازم سمجھا کرتا ہوں کہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں یہ، بہر حال ایک انسانی کوشش ہے جسے نہ سہو و خطا سے منزہ قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ حرف آخر۔ میں جو کچھ خدا کی اس کتاب عظیم سے اپنی بصیرت کے مطابق سمجھ سکا ہوں اُسے میں نے بے کم و کاست پیش کر دیا ہے۔ اگر آپ اس سے متفق ہوں تو ہوا المراد۔ اگر اس سے اختلاف ہو تو آپ اپنے طور پر غور و تدبر کریں۔ میں اس ضمن میں کسی سے بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ اس کے لئے مجھے فرصت ہی نہیں۔

وَأَفِضْ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ۔ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ (پہنچا)۔ والسلام۔

پرویز

۲۵/ربیع الثانی۔ گلبرگ، لاہور

۱۵ ستمبر ۱۹۷۶ء

دوسرا ایڈیشن

مطاب الفرقان کو بفضل ایزدی اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس کا پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو گیا اور دوسرے ایڈیشن کے تقاضے بہ شدت موصول ہونے لگے۔ اللہ الحمد کہ اب یہ ایڈیشن (بلا تغیر و تبدل) پیش خدمت ہے۔ اس دوران میں اس کی تیسری، چوتھی اور پانچویں جلد بھی شائع ہو چکی ہے۔

جنوری ۱۹۸۳ء

ناظم ادارہ طلوع اسلام

مَطَالِبُ الْفَرِيقَانِ

جلد دوم

سورة بقره — آیات ۳۰ تا ۱۱۲

پہلا باب

(تمہید سرگزشتِ آدم)

انسان کی پیدائش

نفسِ انسانی (انسانی ذات یا خودی)

انسانی فطرت

حملِ امانت سے مراد

ابلیس — شیطان

نفسِ امّارہ - لوامہ - مطمئنہ

آدم

خليفة في الارض

ملائکہ

تسخیرِ فطرت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پہلا باب

تمہید سرگزشت آدم

آغاز — سورۃ بقرہ — آیت — (۲/۲)

مطالب الفرقان کی پہلی جلد، سورۃ بقرہ کی آیت (۲/۲) پر اختتام پذیر ہوئی تھی۔ اس کا آغاز ہوا تھا، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (۱) یعنی خدا کی ربوبیتِ عالمین سے۔ اور آیت (۲/۲) میں اسی حقیقت کو ان الفاظ میں دہرایا گیا تھا کہ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ هَآءِی الْاَرْضَ جَمِیْعًا (۲/۲)۔ ”اے نورِ انسان! ہم نے زمین میں جو کچھ پیدا کیا ہے وہ سب تمہارے اجتماعی مفاد کے لئے ہے“ یعنی اس سامانِ رزق میں تمام نورِ انسان برابر کی شریک ہے۔ لہٰذا ان سب کی نشوونما کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ لہٰذا اسے انفرادی ملکیت میں نہ لے لینا۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس کا عملی مفہوم یہ ہوگا کہ تم خدا کے شریک و ہمیم پیدا کر لو گے (۲/۲)۔ یہ شرک ہوگا۔ اس حقیقت کو ان آیات میں نظری طور پر بیان کیا گیا تھا۔ اس کے بعد قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ نورِ انسان کس طرح مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔ انہوں نے کس طرح ان ذرائعِ رزق کو انفرادی ملکیت میں لے لیا اور اس طرح ان میں باہمی عداوت پیدا ہو گئی۔ اسے اس نے ”قصۃ آدم“ کے تشبیہ انداز میں بیان کیا ہے جس کا آغاز آیت (۲/۲) سے ہوتا ہے لیکن یہ داستان سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک پہلے یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ قرآن کریم خود انسان کے متعلق کیا بتاتا ہے۔ اس لئے ہم پہلے اسی موضوع کو لیتے ہیں۔

الْاِنْسَانُ

میں نے اپنی کتاب — ابلیس و آدم — کے پہلے باب میں کہا ہے کہ انسانی بچہ کی پیدائش آج ہمارے نزدیک ایک ایسا عادی اور معمولی واقعہ بن چکی ہے جیسے سورج کا طلوع و غروب۔ لیکن اسباب و علل کی کڑیوں میں جکڑا ہوا انسان جب کتابِ تخلیق کے ادراک کو نیچے کی طرف اُلٹا ہے تو اس کی نگہِ استعجاب کا اس مقام پر رُک جانا فطری امر ہے جسے وہ سلسلہٴ تخلیقِ انسانی کی سب سے پہلی کڑی قرار دیتا ہے۔ اس وادیِ حیرت میں پہنچ کر وہ ہٹک کر رہ جاتا ہے کہ سب سے پہلا انسان کس طرح وجود میں آ گیا۔ ذہنِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں اس سے زیادہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح ایک فرد کو تراش لیا جائے۔ پھر اس سے اس کا جوڑا پیدا کر دیا جائے۔

اس طرح جب مرد اور عورت وجود میں آجائیں تو پھر افزائش نسل انسانی کے سمجھنے میں کوئی دشواری باقی نہیں رہ جائے گی۔ چنانچہ دنیا کے قریب قریب ہر مذہب میں ”پہلے انسان“ کے سلسلہ میں ایسا ہی کچھ بیان کیا گیا ہے ہم اس کی تفصیل قصہ آدم میں (آگے چل کر) پیش کریں گے۔ یہاں بات انسان سے متعلق ہو رہی ہے۔

ہم مطالب الفرقان۔ جلد اول (۸۶-۲۸۵) میں بتا چکے ہیں کہ ”انسان“ تو ایک طرف، دنیا بھر کے محققین آج تک اس حقیقت کو بھی نہیں سمجھ سکے کہ خود یہ کائنات کس طرح وجود میں آگئی۔ انہوں نے اس کے متعلق تو بہت کچھ کہا ہے کہ یہ اپنی ابتداء کے بعد مختلف گردشیں کرتی ہوئی، کس کس قسم کی تبدیلی کی دادیوں میں سے گزر کر اس مقام تک آ پہنچی جہاں ہم اسے آج موجود پاتے ہیں، لیکن یہ کہ اس کی پہلی شکل کا آغاز کیسے ہو گیا۔ وہ عناصر کہاں سے آگئے جن کی گردشوں سے یہ اس طرح آگے بڑھی۔ اس سوال کے جواب میں آج کا بڑے سے بڑا سائنسٹ بھی اسی طرح انگشت بدنداں ہے جس طرح آج سے چھ ہزار سال پہلے کا انسان، یا آج کا جاہل دہقان۔

جب غیر جاندار کائنات کے آغاز کے متعلق ہمارے محققین کے بحرِ فہم کی یہ کیفیت ہے تو وہ اس کے متعلق کیا سمجھ سکتے ہیں کہ اس غیر جاندار مادہ

(IN-ORGANIC MATTER) میں زندگی (LIFE) کی نمود کیسے ہو گئی۔ یعنی زندگی کا آغاز کیسے ہو گیا۔ (ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ) اس کا تصور ڈارون نے پیش کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد اس نظریہ میں بڑی اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ آج اس نظریہ کا سب سے بڑا ماہر (G. G. SIMPSON) کو سمجھا جاتا ہے۔ وہ اپنی کتاب (THE MEANING OF EVOLUTION) میں لکھتا ہے:-

زندگی کی ابتدا کیسے ہو گئی؟ نہایت دیانتداری سے اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس کا کچھ علم نہیں..... اس معمہ کو حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور رفتہ رفتہ اس کے قریب پہنچا جا رہا ہے..... لیکن اس معمہ کا آخری نقطہ (یعنی زندگی کا نقطہ آغاز) وہ مقام ہے جو سائنس کے انکشافات کی دسترس سے باہر ہے۔ اور شاید انسان کے حیطہ ادراک ہی سے باہر..... کائنات کے آغاز اور سلسلہ علت و معلول کی اولیں کڑی کا مسئلہ لاینحل ہے اور سائنس اس تک نہیں پہنچ سکتی..... یہ اولیں کڑی راز ہے، اور میرا خیال ہے کہ ذہن انسانی اس راز کو کبھی نہیں پاسکے گا۔ ہم اگر چاہیں تو اپنے اپنے طریق پر اس علتِ اولیٰ کے حضور اپنا سر جھکا سکتے ہیں،

لیکن اُسے اپنے جیٹہ اور اک کے دائرے میں کبھی نہیں لا سکتے۔ (۱۳۵ و ۱۳۶)۔

مشہور سائنسدان (J.S. HALDAN) ہمارے دور کا بہت بڑا ماہر علم الحیات (BIOLOGIST) ہے۔ وہ اپنی

کتاب - - - - (THE PHILOSOPHICAL BASIS OF BIOLOGY) میں لکھتا ہے :-
اب اس حقیقت کے تسلیم کر لینے میں کوئی دقت نہیں کہ (جیسا کہ نیوٹن کے اصولوں کے تحت سمجھا جاتا تھا) زندگی محض طبیعیاتی اور کیمیائی کیفیات کی پیدا کردہ نہیں، بلکہ ان مادی کیفیات سے پہلے موجود تھی اور ہمیشہ سے موجود تھی۔ اور اس امر کے باور کرنے میں بھی کوئی دشواری نہیں کہ اس مادی کائنات کے پیچھے ایک اور دنیا ہے جس کی تعبیرات کی روشنی میں ہمیں اپنے حیاتیاتی اصولوں کو عملاً منطبق کرنا چاہیئے (۲۰۳۸)۔ لہذا زندگی کے مسئلہ کو طبیعیاتی اور کیمیائی مسئلہ سمجھنا ہی نہیں چاہیئے (۲۰۱۱)۔ زندگی اور انسانی ذات (PERSONALITY) کا وجود اس حقیقت کی دلیل ہیں کہ ہماری کائنات کی محض مادی تعبیر ناممکن ہے۔ اور یہ تعبیر ناممکن ہی رہتی ہے خواہ ہم زمانہ - (TIME) کے اعتبار سے کتنے ہی پیچھے اور مکان (SPACE) کے اعتبار سے کتنے ہی اونچے کیوں نہ چلے جائیں۔ زندگی کو پیچھے لے جانے سے اس کی مادی تعبیر کبھی نہ مل سکے گی، نہ ہی انسانی ذات کو پیچھے لے جانے سے ہم کسی ایسے مقام تک پہنچ سکیں گے جہاں ہم کہہ سکیں کہ انسانی ذات اس طرح مادہ سے پیدا ہو گئی (۲۰۱۲)۔

زندگی کہاں سے گئی؟ اس سوال کا جواب تو کوئی نہیں دے سکا، البتہ ڈارون نے یہ بتایا کہ اس کی اولین نمود کہاں سے ہوئی۔ یعنی ہم زندگی کی نمود کو اس کی اولین شکل میں کہاں دیکھتے ہیں۔ اس کی تحقیق ہمیں بتاتی ہے کہ حیات کے جراثیمہ اویہ (PROTOPLASM) کی ابتداء سمندر میں ہوئی تھی کیونکہ اس میں اسی نوعیت اور اُسی تناسب کے نمکیات (SALTS) پائے جاتے ہیں جیسے سمندر کے پانی میں۔ سمندر کا پانی جب اپنے کنارے کی مٹی سے ملا تو اس سے وہ پہلا (CELL) - خلیہ وجود میں آگیا جس میں زندگی اپنی ابتدائی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس خلیہ میں ہنوز نر و مادہ کی تیز نہیں تھی، اس لیے اسے سائنس کی اصطلاح میں (UNI-CELLULAR ORGANISM) کہتے ہیں۔ قرآن کریم اسے "نفس واحدہ" کہہ چا رہا ہے۔ اس کے بعد سلسلہ ارتقاء شروع ہوا۔ نفس واحدہ، جوش نمود سے دو حصوں میں بٹ گیا جن میں سے ایک حصہ نے نر کی شکل اختیار

کر لی اور دوسرے نے مادہ کی۔ اوریوں زندگی کے پیکروں کا سلسلہ آگے بڑھنے لگا۔ یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے مختلف شاخوں میں پھیل گیا۔ ان میں سے ایک شاخ نوع حیوانات کی ہے۔ اسی سلسلہ ارتقار نے ایک قدم آگے بڑھایا تو زندگی نے انسانی پیکر اختیار کر لیا۔ (ان اشارات کو ہم مطالب الفرقان، جلد اول (۹۲-۲۸۹) میں بھی بیان کر چکے ہیں، لیکن موضوع زیر نظر کی اہمیت کے پیش نظر ان کا یہاں دہرا دینا ضروری ہے۔

سلسلہ کائنات کی ابتداء اور اس کے تدریجی مراحل کے متعلق قرآن کریم نے ایک اصولی نظام بیان کیا ہے
نظریہ ارتقار اور قرآن جو اس بحث کا نقطہ ماسک ہے۔ ارشاد ہے:-

يُذَيِّرُ الْآمَرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ
مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ - ذَلِكَ عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ
الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (۳۲-)

تدابیر الہیہ (خدا کی اسکیموں) کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنی مضمحل شکل میں علم الہی کی بلندیوں پر ہوتی ہیں۔ جب ان میں سے کسی اسکیم کو برحقے کار لانا مقصود ہوتا ہے تو قانون مشیت کے مطابق زمین کی پستیوں سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر وہ اسکیم اپنے ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے اپنے مقام تکمیل کی طرف اٹھتی چلی جاتی ہے۔ یہ مراحل بڑے بڑے طویل المیعاد وقفوں میں طے ہوتے ہیں جن میں کا ایک ایک وقفہ (PERIOD) تمہارے حساب شمار کی رو سے ہزار ہزار برس کا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ اس خدا کے قانون کے مطابق ہوتا رہتا ہے جو ہر شے کی موجودہ صورت سے بھی واقف ہے۔ اور اس کے مضمحل کمالات سے بھی۔ اس کا قانون مشیت اتنی قوت رکھتا ہے کہ وہ ہر شے کو مناسب نشوونما دیکر اس کے نقطہ تکمیل تک پہنچا دے۔

یہاں ان مراحل کے متعلق کہا ہے کہ وہ ”ہزار ہزار برس“ کے ہوتے ہیں۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ یہ بعض صورتوں میں ”پچاس پچاس ہزار سال“ کے بھی ہوتے ہیں۔ (۲۱)۔

خدا کے اسی نظام ارتقار کی رو سے (اس نے کہا ہے کہ) زندگی کا آغاز پانی سے ہوا۔ سورۃ الانبیاء میں ہے:-
”جَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ - أَفَلَا يُؤْمِنُونَ (۲۱)۔“ اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی سے بنایا،
کیا یہ لوگ اس حقیقت پر یقین نہیں رکھتے؟ اور اس کے بعد کہا کہ ”كَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ (۲۱)۔“ زندگی کے اس

سرچشمہ پر پورا پورا کنٹرول خدا کو حاصل ہے۔ اس کے بعد اس نے ان تخلیقی مراحل کا ذکر کیا ہے جن میں سے گزر کر زندگی، پیکر انسانی تک پہنچی۔ اس سلسلہ میں فرمایا:-

وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ (۳۲)۔ (نیز ۴ ذی ۳۸)۔

اس نے انسانی تخلیق کی ابتداء مٹی سے کی۔

دوسری جگہ ”طین“ کی بجائے ”تراب“ کا لفظ آیا ہے۔ (۱۸ ذی ۳۲) ”طین“ یا ”تراب“ غیر جاندار مادہ تھا۔ جب اس کے ساتھ پانی کی آمیزش ہوئی تو وہ ”طین لاذب“ یعنی چسپائی مٹی بن گیا۔ سورۃ الصفّٰت میں ہے کہ اِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِنْ طِينٍ لَّازِبٍ (۳۳)۔ قرآن کے اس کی بھی تصریح کر دی ہے کہ مٹی اور پانی کے امتزاج، یعنی اس گارے کی صورت یہ نہیں تھی کہ اس میں ”مٹی“ زندگی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس نے کہا یہ کہ اس ”مٹی“ کا خلاصہ ”پانی“ سے ملا تو اس سے زندگی کے اولین جرثومہ کی نمود ہوئی۔ چنانچہ سورۃ مومنوں میں ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ (۲۳)۔ اس آیت میں ”مٹی“ کے خلاصہ کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ ہم جب کوئی بیج زمین میں بوتے ہیں تو وہ ان اجزاء کو، جن پر اس کی نشوونما کا۔۔۔ مدار ہوتا ہے، زمین سے کھینچ کر اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ انہی اجزاء (نکلتا، معدنیات وغیرہ) کو سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ (۲۳) یعنی مٹی کا خلاصہ کہا جائے گا۔ اس قسم کے مٹی کے خلاصہ سے حیات کا پہلا خلیہ (CELL) وجود میں آیا۔

قرآن کریم نے دیگر مقامات میں ایک اور حقیقت کی بھی وضاحت کی ہے۔ اس نے اشارۃً یہ بتایا ہے کہ پانی اور مٹی کے اس امتزاج کے ساتھ حرارت کی بھی ضرورت تھی، لیکن ان عناصر ترکیبی میں ایک خاص توازن، یا تناسب نہایت ضروری تھا۔ اگر وہ تناسب قائم نہ رہے تو وہ مٹی سوکھ کر ٹھیکری بن جائے۔ چنانچہ سورۃ الرحمن میں ہے: خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (۵۵ ذی ۳۹)۔ ہم نے انسان کو خیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا، جس کی کیفیت یہ تھی کہ اس میں اگر حرارت کی زیادتی ہو جائے تو وہ سوکھ کر ٹھیکری کی طرح بکھنے لگ جائے۔ لیکن ہم نے ان اجزاء میں ایسا تناسب قائم کیا کہ اس سے زندگی کا اولین جرثومہ وجود میں آگیا۔ اسے قرآن کریم نے ”نفس واحدہ“ کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی ایسا خلیہ جس میں نر و مادہ کا امتیاز نہیں تھا۔ وہ واحد، یعنی ایک (UNIT) تھا۔ سورۃ الانعام میں ہے:-

وَهُوَ الْإِنْسَانُ أَنشَأَكُم مِّنْ نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ - فَمُسْتَقَرٍّ وَمُتَوَدِّعٍ۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُوْنَ (۶ ذی ۴۰)۔

خدا کی ذات وہ ہے جس نے تمہیں نفس واحدہ سے نشوونما دی۔ پھر تمہارے لئے مختلف

منازل مقرر کیں کہ تم ایک وقت معین کے لئے ایک منزل میں ٹھہرو اور وہ منزل تمہیں اگلی منزل کے سپرد کر دے۔ اس طرح، تم ارتقار کی مختلف منازل طے کرتے ہوئے پیکر انسانی میں پہنچے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے قوانین حیات کو نکھارا اور ابھار کر بیان کر دیا ہے۔ لیکن انہیں وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو عقل و فکر سے کام لیں۔

انہی مراحل اور منازل کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ لَتَرَكَبْنَ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ (۸۴) تم یقیناً ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتے ہوئے یہاں تک پہنچے۔ اور اس کے بعد شاہراہ حیات پر اسی طرح آگے بڑھتے اور بلند ہوتے جاؤ گے۔ ”ارتقائی منازل میں اسی تبدل و تحول کے متعلق دوسری جگہ کہا: وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا (۸۵) اُس نے تمہیں اس طرح پیدا کیا کہ تم طوڑ طریقے بدلتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے۔“

ہم نے اوپر کہا ہے کہ سلسلہ ارتقار کے متعلق سائنٹیفک تحقیق نے یہ بتایا ہے کہ سب سے پہلے زندگی کے جس خلیہ کی نمود ہوئی اس میں نرم مادہ کی تیز نہیں تھی۔ اس کے بعد یہ خلیہ جوڑن نمونے سے پھٹ کر دو حصوں میں بٹ گیا۔ ان میں سے ایک حصہ نے نر کی شکل اختیار کی اور دوسرے نے مادہ کی۔ گویا یہ جوڑا اسی نفس واحدہ سے وجود میں آیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ :-

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا ذَوْجَهَا (۸۹)۔

تمہارا نشوونما دینے والا وہی ہے جس نے تمہیں ایک ”نفس واحدہ“ سے پیدا کیا۔ اور اسی میں سے اس کا جوڑا بنا دیا۔ ۱۷

ضمناً قرآن کریم نے صرف انسان کے متعلق ہی یہ نہیں کہا کہ نفس واحدہ سے اس کا جوڑا بنایا۔ اس نے کہا ہے کہ: وَهِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا ذَوْجَيْنِ۔ لَكُمْ تَذَكَّرُونَ (۹۳)۔ اور ہم نے ہر شے کے جوڑے بنائے ہیں۔ ہم نے ان امور کا تذکرہ اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ تم قانونِ خداوندی کی ہمہ گیری کو پیش نظر رکھ سکو۔ آج سائنس کے انکشافات اس حقیقت کو بے نقاب کر رہے ہیں کہ زندگی جہاں بھی ہے (مثلاً نباتات اور حیوانات میں) وہاں ”جوڑے“ موجود ہوتے ہیں۔ اگرچہ زندگی کے ابتدائی مراحل میں ایک ہی خلیہ کے اندر افزائشِ نسل کی صلاحیت ملتی ہے لیکن زندگی جب ذرا آگے بڑھتی ہے تو ہر مقام پر نرم مادہ کا سلسلہ دکھائی

دیتا ہے۔ چونکہ اس مسئلہ کا تعلق ہمارے زیر نظر موضوع سے نہیں، اس لئے ہم اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ زندگی کی نمود تو ”تراب“ (یعنی زمین) سے ہوئی لیکن آگے بڑھ کر وہ مختلف انواع (SPECIES) ہیں اس طرح پھیل گئی جس طرح درخت کی شاخیں مختلف سمتوں میں پھیل جاتی ہیں (۱/۱۱)۔ سلسلہ ارتقاء کے ماہرین جب مختلف انواع حیات کو سمجھاتے ہیں تو وہ اسے درخت کی شکل میں ہی پیش کرتے ہیں۔ ان انواع کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ انہی میں وہ جاندار بھی ہیں جو پیٹ کے بل بیٹھتے ہیں، وہ بھی جو دو پاؤں پر چلتے ہیں اور چوپائے بھی (۲۲/۲۲)۔ نیز اڑنے والے پرندے بھی۔ ان سب کے متعلق کہا کہ تمہاری ہی قسم کی مختلف ”ام“ ہیں (۶/۶)۔ آپ غور کیجیے کہ قرآن کریم نے اصل حیات کی وحدت کو کس کس انداز سے سمجھایا ہے؟

ان تخلیقی مراحل کو طے کرتی ہوئی زندگی اس مرحلہ میں آپہنچی جہاں افزائش نسل بذریعہ تناسل یعنی نطفہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ عام اصطلاح میں اسے درجہ حیوانات کہا جاتا ہے۔ سورۃ السجدہ میں ہے:

ثُمَّ جَعَلْنَا نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ (۳۲)

پھر اس کی (انسان کی) نسل کو کمزور سے پانی کے خلاصہ سے بنایا۔

اسی کو دوسری جگہ نطفہ کہا گیا ہے (۱۶/۱۶)۔ لہٰذا نطفہ سے جو جرثومہ وجود میں آتا ہے وہ رحم مادر میں کن کن مراحل سے گزرنا اور کیا کیا شکلیں اختیار کرتا ہے، قرآن کریم نے مختلف مقامات پر اس کا تذکرہ بھی کیا ہے مثلاً سورۃ المؤمنون میں کہا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِينٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ لَاقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظْمًا فَكَسَوْنَا الْعِظْمَ لَحْمًا (۲۳/۲۳)۔ ۲

ہم نے انسان کی تخلیق کی ابتدا مٹی کے خلاصہ (بے جان مادہ) سے کی۔ پھر ہمارا یہ تخلیقی پروگرام اس کڑی تک جا پہنچا جہاں افزائش نسل بذریعہ تولید ہوتی ہے اس طرح

۱۔ مزید حوالوں کیلئے دیکھئے (۱۹/۱۹) (۲۵/۲۵) (۳۶/۳۶) (۴۶/۴۶) (۴۷/۴۷) (۵۶/۵۶)۔

۲۔ اس جگہ آیت (۲۳/۲۳) کے آخری الفاظ دانستہ چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ یہ ذرا آگے چل کر سامنے لائے جائیں گے

ہم نے اسے نطفہ بنایا جو (رحم کے اندر) ٹھہر گیا اور مادہ کے بیضہ میں قرار گیر ہو گیا۔ پھر اس نطفہ کو علقہ (جوزک کی سی شکل) میں تبدیل کیا۔ پھر اس علقہ کو گوشت کا لوتھڑا سا بنا دیا۔ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ ابھار دیا۔ پھر اس ڈھانچہ پر گوشت کی تہہ چڑھا دی۔

اسی طرح سورۃ الحج میں ہے..... فَإِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ نُّرَابٍ ثُمَّ مِّنْ تُطْفَةِ ثُمَّ مِّنْ عَلَقَةٍ تُمَمِّنْ مِّنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنَبِّئَنَّ لَكُمْ وَنَقَرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ آجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا..... (۲۲)۔ ”ہم نے تمہاری پیدائش کی ابتدا بے جان مادہ سے کی (پھر یہ مادہ مختلف منازل طے کرتا اس منزل میں آپہنچا جہاں افزائش نسل بذریعہ تولید ہوتی ہے) اور نطفہ رحم مادر میں ٹھہر جاتا ہے۔ پھر وہ ایک جوزک کی سی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر متشکل اور غیر متشکل گوشت کے ٹکڑے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ ان مراحل میں سے اس لیے گزرتا ہے کہ نطفہ میں جس قدر امکانات مضبوطی پر موجود تھے وہ بتدریج نشو و نما پاتے ہوئے ظہور میں آجائیں۔ وہ جنین ہمارے قانون مشیت کے مطابق کچھ وقت کے لیے رحم مادر میں رہتا ہے۔ پھر تم جیتے جاگتے بچے کی شکل میں دنیا میں آجائے ہو“

یہ مراحل وہ ہیں جن سے انسانی بچہ ہی نہیں بلکہ ہر حیوانی بچہ رحم مادر میں گزرتا ہے۔ لہذا اس حد تک انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ مغربی محققین اپنی ریسرچ میں اس مقام تک آکر رک گئے اور انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ انسان بھی دیگر حیوانات کی طرح فطرت کے طبعی قوانین کے مطابق وجود پذیر ہوتا ہے۔ انہی قوانین کے ماتحت یہ زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر انہی کے مطابق اس پر موت وارد ہو جاتی ہے، اور جس طرح دیگر حیوانات کا موت سے خاتمہ ہو جاتا ہے اسی طرح انسان کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حتٰیٰ کہ انہوں نے انسانی جسم کا تجزیہ کر کے یہ بھی بتا دیا کہ یہ کن کن عناصر سے مرکب ہے۔ انہوں نے بتایا کہ انسانی جسم میں :-

(۱) دس گیلیں پانی ہے۔

- (۲) اتنی چربی، جس سے صابن کے سات ڈنڈے بن سکیں۔
 (۳) اتنا کاربن، جس سے نو ہزار سرمہ کی پنسلیں بن سکیں۔
 (۴) اتنی فاسفورس، جس سے دو ہزار دوسو دیاسلائی کی تیلیاں تیار ہو سکیں۔
 (۵) اتنا لوہا، جس سے ایک چھوٹی سی کیل بن جائے۔
 (۶) اتنا چونا، جس سے ایک مرغی کے ڈربے میں سفیدی ہو جائے۔
 (۷) ذرا سی گندھک اور میگنیشیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

(THE PROPER STUDY OF MAN; BY B.A. HAWARD)

ضمناً، اگر ان لوگوں کی تحقیق طبیعیات تک محدود رہتی تو بھی خیر تھی، لیکن یہاں ایک اور دشواری نے سرا بھارا جسے مشہور مذہبی مفکر (F.J. SHEEN) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :

یہ ایک حقیقت ہے جس کی تصدیق تاریخ سے کی جا سکتی ہے کہ جب کبھی سائنٹیفک زاویہ نگاہ میں کوئی بڑی تبدیلی واقعہ ہوتی ہے تو اس کے ساتھ ہی ایسے مفکر پیدا ہو جاتے ہیں جو چاہتے ہیں کہ بنیادی اور ابدی صداقتوں میں بھی اسی زاویہ نگاہ کے مطابق تبدیلی پیدا کر دی جائے۔ جب اٹھارویں صدی میں نیوٹن کے نظریہ کے ماتحت عالم آفاق کے متعلق نیا تصور قائم ہوا تو اس کے ساتھ ہی اس کا بھی تقاضا شروع ہو گیا کہ اب دنیا کو مذہب بھی نیا ملنا چاہئے۔ چنانچہ اس کے مطابق ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس کی رو سے مطالبہ یہ کیا گیا کہ اخلاقیات، ادب اور مابعد الطبیعیات کو اپنے بنیادی اصول اور جوہر بدل لینے چاہئیں تاکہ وہ اس سائنٹیفک زاویہ نگاہ کے مطابق ہو جائیں۔

(PHILOSOPHY OF RELIGION)

خارجی کائنات کے متعلق نیوٹن کی تحقیق کا نتیجہ یہ ہوا۔ اور ڈارون کی تحقیق کی رو سے یہ نتیجہ کہ قوانین فطرت کے سوا نہ کوئی اور قوانین ہیں نہ سرچشمہ علم۔ انسان کی طبیعی زندگی قوانین فطرت کے تابع بسر ہوگی اور اس کی تمدنی زندگی ان قوانین کی رو سے، جنہیں انسان خود وضع کرے۔ انیسویں صدی کے آخر میں اس تصور نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی جسے (RATIONALIST MOVEMENT) "تحریک عقلیت" کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کی ایسوسی ایشن نے ۱۸۹۵ء میں اس کی تعریف ان الفاظ میں پیش کی تھی :-

عقیدت سے مراد وہ ذہنی رجحان ہے جس کی رو سے عقل انسانی کو بلا حدود و قیود بند ترین مقام پر فائز سمجھا جاتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ایسے فلسفہ اور اخلاقیات کی بنیاد رکھی جائے جس کی صداقت کا معیار خالص عقل انسانی ہو، اور وہ کسی سند یا اختیاری کو تسلیم نہ کرے۔ ۱۰

اس "نئے مذہب" کو سیکولرازم کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی انتہائی شکل مارکسزم کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ چنانچہ اس باب میں لینن لکھتا ہے:-

مادہ پرستی (سیکولرازم) کے معنی یہ ہیں کہ ہم یہ تسلیم کر لیں کہ خارجی صداقت وہی ہے جسے ہم اپنے حواس کے ذریعہ معلوم کر سکیں۔ عقل انسانی اس قابل ہے کہ یہ ہمیں صداقت مطلقہ کا علم دیدے۔ چنانچہ اس نے یہ علم دیدیا ہے۔ ۱۱

آپ نے غور فرمایا کہ خالص طبیعی تحقیق کے ڈانڈے کہا جا کر ملائے گئے ہیں؛ یعنی اس تحقیق کی رو سے دعویٰ یہ کر دیا گیا کہ وحی و رسالت، مستقل اقدار، حیاتِ آخرت سب اساطیر الاولین ہیں، ان کا کوئی وجود نہیں۔ انسان ایک حیوان ہے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ یہ زندگی کے مسائل کے فیصلے اپنی عقل کی رو سے کر سکتا ہے۔

انسان کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ اپنی ہر تحقیق کو حرفِ آخر سمجھ لیتا ہے، حالانکہ وہیں سے تردید | اگر وہ تھوڑا سا انتظار کرے اور اپنی تحقیق کو آگے بڑھنے دے تو اس کی سابقہ

تحقیق کی کمزوری اس پر خود واضح ہو جائے۔ چنانچہ ابھی طبیعیاتی نظریہ کی صدائے بازگشت بھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ اسی مغرب سے ہمارے کانوں میں اس قسم کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں جن میں کہا گیا کہ:-

میں آج آپ کے سامنے یہ نہیں کہتا چاہتا کہ مسئلہ حیات، موجودہ زمانہ کی طبیعیات اور کیمسٹری سے سمجھایا جاسکتا ہے، خواہ سمجھانے والا کیسا ہی ذی فہم کیوں نہ ہو۔ ایسا ممکن ہی نہیں، آئیا مستقبل کے علم طبیعیات اور کیمیا کے ذریعہ ایسا ہوگا، اس سے متعلق میں قیاس آرائی نہیں کرنا چاہتا۔ جب علم طبیعیات کے حوادث غیر متنبہ ہو جائیں، جب کیمیا خود طبیعیات بن جائے (۱۲) وقت صورتِ حالات اور ہو جائے گی۔ لیکن اس وقت تک میں (HALDANE)

کی ہمنوائی میں یہی کہتا رہوں گا کہ جب ہم علم حیات کو تمام دیکھتے ہیں

۱۰ انسان نے کیا سوچا (ص ۱۲)۔ ۱۱ انسان نے کیا سوچا (ص ۱۳)۔

تو ہمارے سامنے ایک بالکل نئی صورت آجاتی ہے۔ ایسی صورت، جسکی وحدت اور بنیاد فطرت ایسی ہی اہم ہے، جیسی طبیعیات کے کسی اور تصور کی۔ لہ اور مشہور روسی مفکر اوسپنسکی کے الفاظ میں :-

ہماری سائنس، زندگی اور اس کی ابتدا کے متعلق کچھ نہیں بتلا سکتی۔ یہ معمہ، معمہ ہی رہ جاتا ہے۔ ایک زندہ جسم، زندہ خلیہ (CELL) زندہ مادہ حیات (PROTOPLASM) میں کچھ ایسی چیز ہے جسے سمجھا نہیں جاسکتا۔ یہی وہ ناقابل فہم شے ہے جو ذی حیات مادہ کو غیر ذی حیات سے متمیز کرتی ہے۔ ہمیں اس شے کا تعارف صرف اس کے عمل (FUNCTION) سے ہوتا ہے۔ اس کے اعمال میں سب سے اہم عمل تولید خویش (SELF-REPRODUCTION) ہے۔ یہ چیز غیر ذی حیات جسم، مردہ خلیہ اور مردہ مادہ میں نہیں پائی جاتی۔ ایک ذی حیات جسم اپنے آپ کو لامحدود طور پر (MULTIPLY) کرتے چلا جاتا ہے اور اس کے لئے غیر ذی حیات مادہ کو اپنے اندر جذب کرتا رہتا ہے۔ یہی "زندگی" کا وہ عمل ہے جس کی ماہیت سمجھائی نہیں جاسکتی۔ لیکن اتنا تو یقینی ہے کہ ماہرین کا یہ تصور بالکل غلط ہے کہ زندگی میکائلی قوتوں کے نتیجہ کا نام ہے۔ (TERTIUM ORGANUM: P. 103)

گلاسگو یونیورسٹی کا وائس چانسلر، (JOHN CAIRD) اپنے ایک لیکچر میں کہتا ہے :-

آج تک اس امر کی کوئی مثال بھی نہیں پیش کی جاسکی کہ زندگی محض کیمیائی عناصر (CHEMICAL CONSTITUENTS) سے پیدا ہو گئی ہو۔ لہذا یہ قیاس، کہ زندگی کا ارتقا کسی اور زندگی کے اثر کے بغیر بھی ممکن ہے، بلا دلیل ہے۔ (PROTOPLASM) کو، جسے مادہ حیات قرار دیا جاتا ہے، محض کیمیائی مرکبات کی سطح پر نہیں رکھا جاسکتا۔ وہ مادہ حیات، جس کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے اور جس کے کیمیائی اجزاء معلوم ہو سکتے ہیں، زندہ نہیں، بلکہ مردہ مادہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس وہ مادہ حیات، جسے زندہ کہا جاسکتا ہے، اگرچہ انہی اجزاء کا مجموعہ ہوتا ہے جو مردہ مادہ حیات میں پائے جاتے ہیں، لیکن اس سے ایسے خواص و اعمال

کا مظاہرہ ہوتا ہے جو بالکل جدید ہوتے ہیں اور جنہیں اس کے کیمیائی اور طبیعیاتی اجزاء کی طرف کبھی منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی شے کسی ایک وقت میں ایسے خواص کا مظاہرہ کرتی ہے جو یکسر کیمیائی یا میکائی ہوں اور دوسرے وقت میں ایسے خواص کا، جن سے وہ اپنے آپ کو ایک جیتے جاگتے، بڑھنے پھولنے والے جسم میں تبدیل کرے، یا ایسے افعال کا جن سے وہ دوسری چیزوں کو اپنا جزو بدن بنا سکے اور پھر اپنے جسم سے کچھ اور پیدا کر سکے تو اس کا منطق نتیجہ یہ ہے کہ دوسری صورت میں جو نئی چیزیں اس میں پیدا ہوتی ہیں ان کا سبب کوئی ایسا جدید عنصر ہے جو پہلی صورت میں اس میں موجود نہ تھا۔ اس سے محض کیمیائی یا میکائی عمل ظہور میں آتا تھا۔

(INTRODUCTION TO THE PHILOSOPHY OF RELIGION-P. 96)

اس موضوع پر عصر حاضر کے محققین کے اسی قسم کے متعدد اقوال پیش کئے جاسکتے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی چند ضرورتیں نہیں اقول سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ خود مغرب ہی کی تحقیق جدید کا نسخہ اس سمت کی طرف مڑ چکا ہے کہ ”زندگی“ بے جان مادہ کی میکائی بنیادوں سے وجود میں نہیں آجاتی۔ یہ کسی اور ”عنصر“ کی کارفرمائی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جس طرح ”زندگی“ مادہ کی سابقہ میکائی کڑیوں سے بالکل متمیز اور ممتاز کڑی ہوتی ہے۔ اسی طرح جب ”زندگی“ حیوانات سے انسانی بیکرا اختیار کرتی ہے تو وہاں بھی بیکڑی اپنی سابقہ کڑیوں سے بالکل منفرد ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کے سمجھنے کے لئے قرآن کریم کی طرف پڑھتے سابقہ صفحہ (۹) پر آیت (۲۳-۱۲) درج کرنے کے بعد ہم نے (حاشیہ میں) یہ لکھا تھا کہ اس آیت کے آخری الفاظ دانستہ چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ اس آیت کے الفاظ اور اس کے ترجمہ کو ایک دفعہ سامنے لائیے اور اس مقام پر پہنچتے جہاں قرآن کریم نے کہا تھا کہ ”رحم مادر میں جنین کی ہڈیوں کے ڈھانچے کو گوشت سے ڈھانپ دیا گیا“ یہاں تک کہ مراحل حیوانی اور انسانی جنین میں مشترک تھے۔ اس کے بعد انسانی جنین کے سلسلہ میں کہا کہ تَخْلُقُ نَسْلَهُ خَلْقًا آخَرَ هَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ (۲۳)۔ ”پھر ہم نے انسان کو ایک بالکل نئی اور دوسری قسم کی مخلوق کی شکل میں نمودار کر دیا۔ سو دیکھو، خدا کا قانون تخلیق کتنی بڑی ممکنات کا حامل ہے اور اسی جہت سے وہ احسن الخالقین ہے“ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو ”احسن الخالقین“ کہا۔ اور انسان کی اس منفرد حیثیت کے متعلق دوسری جگہ کہا کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (۹۵)۔ ”ہم نے انسان کو احسن حیثیت کی ممکنات لئے مجھے پیدا کیا“

یہ خَلْقًا آخَرَ۔ ایک بالکل جدا گانہ قسم کی تخلیق کیا ہے جس میں انسان منفرد ہے، یعنی جو کسی اور مخلوق کو عطا نہیں ہوئی۔ قرآن کریم نے اس کیلئے ایک منفرد اصطلاح استعمال کی ہے۔ سورۃ السجۃ میں پہلے، انسان کے مختلف تخلیقی مراحل کو گنایا گیا ہے اور اس کے بعد کہا ہے وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ (۳۲)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے ”اور اس میں ہم نے اپنی روح پھونک دی“ لہ، یہ خصوصیت صرف لہ مزید حوالوں کیلئے دیکھئے (۱۵۲-۲۸۸)۔

انسان کی ہے۔ کسی دوسری مخلوق کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ خدا نے اس میں اپنی روح پھونک دی۔ ”روح“ کے معنی توانائی ہیں۔ لہذا ”نفخ“ سے مراد یہ ہے کہ انسان کو ایک ایسی توانائی یا قوت عطا کی گئی جو دیگر مخلوقات میں سے کسی کے حصہ میں نہیں آئی۔ بآدنی تعن یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ یہ قوت، اختیار و ارادہ کی ہے جملہ کائنات میں یہ قوت یا تو خدا کو حاصل ہے (اس کی عطا کردہ) انسان کو۔ اسی لئے خدا نے اسے ”روحہ“ یا ”روحنا“ (الوہیاتی توانائی۔ قوتِ خداوندی) کہہ کر پکارا ہے۔ بالفاظِ دیگر، انسان کو دیگر مخلوقات کی طرح مجبور پیدا نہیں کیا گیا۔ اسے صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس کے سامنے دو راستے (POSSIBILITIES) آئیں تو اسے اختیار دیا گیا ہے کہ یہ ان میں سے جس راستے کو چاہے اپنے لئے منتخب اور اختیار کر لے۔ اس کے سوا اور کسی مخلوق کو ایسا اختیار نہیں دیا گیا۔ کائنات کی ہر شے ربّے جان

انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہے

اور جاندار) اُس راستہ پر چلنے کے لئے مجبور ہے جس کے لئے اُسے پیدا کیا گیا ہے۔ صرف انسان اس سے مستثنیٰ ہے۔ انسان میں وہ ”شے“ جسے یہ قوت عطا کی گئی ہے قرآن نے اُسے ”نفس“ کہہ کر پکارا ہے۔ اسی کو انسانی ذات، خودی (SELF) یا (PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔ عصرِ حاضر کے ماہرینِ علمِ النفس نے اس کے لئے ایک جدید اصطلاح (PSYCHE) وضع کی ہے۔ قرآنِ کریم نے انسانی نفس کی خصوصیات کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کفر اور ایمان یا حق و باطل کا اولین نقطہ امتیاز یہی ہے۔ یعنی ایک تصورِ حیات یہ ہے کہ انسان حیوانات ہی کی ایک بڑھی ہوئی شکل کا نام ہے جو طبیعی قوانینِ فطرت کے تابع زندہ رہتا ہے اور انہی کے مطابق ایک دن ختم ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم اس تصور کو کفر کہہ کر پکارتا ہے۔ سورۃ محمد میں ہے: وَ السَّٰدِیْنَ کَفَرُوْا یَمْتَعُوْنَ دِیَآ کُلُوْنَ کَمَا تَآکُلُ الْاَنْعَامُ (۲۳)۔ ”جو لوگ حیوانات کی طرح کھاتے پیتے اور دیگر طبیعی مفادات سے متمتع ہوتے ہیں اور اسی کو منتہائے زندگی سمجھتے ہیں، وہ کفر کی زندگی بسر کرتے ہیں“۔ دوسرا جگہ ہے کہ:-

وَقَالُوا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوتُ وَ نَحْیَا وَ مَا یُعْلِمُکُمْۤ اِلَّا الدَّهْرُ وَ مَا لَہُمْ بِذٰلِکَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ ہُمْ اِلَّا یَظُنُوْنَ (۲۵)۔

ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ زندگی بس اس دنیا کی زندگی ہے۔ اسی میں مرنے والے مر جاتے ہیں اور نئے نپے، نئی زندگی لے کر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ زمانہ کا چکر ہے جو یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ گردِ بنِ زمانہ سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو انسان

کی اصل و حقیقت کا کچھ علم نہیں، یونہی سطحی سی معلومات ہیں جن کی بنا پر یہ اس قسم کی قیاس آرائیاں کرتے رہتے ہیں۔

انسانی نفس یا ذات | قرآن کریم نے یہ بات اپنے زمانہ نزول کے مخاطبین کے متعلق کہی تھی لیکن آج خود مغرب کے محققین یہ کہہ رہے ہیں کہ ان سے پہلے جن محققین نے یہ تصور حیات پیش کیا تھا، وہ ان کی قیاس آرائیاں تھیں جنہیں بعد کی تحقیق نے خود ہی غلط ثابت کر دیا۔ یہ محققین اس نتیجہ پر کہ انسان میں اس کے طبیعی جسم کے علاوہ کچھ اور بھی ہے، اپنے طور پر عجیب انداز سے پہنچے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انسانی جسم مرکب ہے مختلف خلیات (CELLS) کا۔ ان خلیات کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی کثیر تعداد ہر وقت ضائع ہوتی رہتی ہے اور ان کی جگہ نئے خلیات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ فنا و تجدید مسلسل جاری رہتا ہے تا آنکہ کچھ وقت کے بعد سابقہ جسم سارے کا سارا ایک نئے جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اگر انسان محض اس کے طبیعیاتی جسم سے عبارت ہوتا تو کچھ عرصہ کے بعد اس سابقہ انسان کا کچھ بھی باقی نہ رہتا۔ لیکن تجربہ اس کے خلاف جاتا ہے۔ آپ نے آج سے بیس تیس برس پہلے جو بات کہی تھی یا جو کام کیا تھا اس کے متعلق آپ آج بھی یہ کہتے ہیں کہ ”میں نے یوں کیا تھا“ یا ”میں نے یہ بات کہی تھی“ جسے آپ ”میں“ کہتے ہیں طبیعی جسم کے بدل جانے کے ساتھ نہ وہ ختم ہوتی ہے نہ تبدیل۔ وہ بعینہ وہی رہتی ہے اور یہی وہ ”میں“ ہے جس سے انسان فی الحقیقت، انسان کہلانے کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اس مقام پر قرآن کریم میں بیان کردہ ایک ایسی عظیم حقیقت سامنے آتی ہے جسے پیش کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ سورۃ السجدۃ کی آیت (۱۸) کا ایک حصہ پہلے درج کیا جاتا ہے۔ اس میں پہلے انسانی تخلیق کے ان مراحل کا ذکر ہے جن میں انسان اور حیوان دونوں شریک ہیں۔ ان میں انسان کے لئے غیب کی ضمیر (THIRD PERSON) لائی گئی ہے۔ نَسَلَهُ — سَوَّاهُ — فِيهِ — اس کے بعد ہے: وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوْحِهِ۔ ”خدا نے اس میں اپنی روح پھونک دی“ اس طرح وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ (۲۴)۔ ”خدا نے تمہیں سماعت و بصارت اور قلب عطا کر دیئے۔ یہاں ضمیر غائب کی جگہ مخاطب (دکھائی) (SECOND PERSON) لائی گئی ہے۔ بالفاظ دیگر اس نَفَخِ رُوْحِ خداوندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان تن مخاطب کے قابل ہو گیا یعنی اب

سہ سائنس کی اصطلاح میں اس طریق کو (ANABOLISM : KATBOLISM) اور (METABOLISM) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے میری کتاب — سلیم کے نام خطوط — جلد اول میں ساتواں خط دیکھئے۔

یہ مخلوق انسان کہلانے کی مستحق قرار پائی۔ اور یہ ”تم“ وہ ہے جو ہر آن بدلنے والے انسانی جسم کے ساتھ بدلتا نہیں رہتا۔ جب آپ کسی سے کہتے ہیں کہ تم نے دس سال پہلے یہ کہا تھا، تو اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ تم آج بھی وہی شخص ہو جو دس سال پہلے تھے۔

بہر حال ہم کہہ رہے تھے کہ اب مغربی محققین بھی اسے تسلیم کر رہے ہیں کہ انسان کے ہر آن بدلنے والے جسم میں کوئی شے ایسی بھی ہے جو تغیرنا آشنا ہے، جو بدلتی نہیں، جو اپنی ذات میں قائم رہتی ہے۔ اسے انسانی نفس یا ذات کہا جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ انسانی جسم کے ہر آن بدلنے کا اس میں ”پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ جب انسانی جسم پر موت وارد ہوا تو اس کی ”میں“ اُس سے بھی متاثر نہیں ہوتی۔ وہ اسی طرح باقی اور غیر متبدل رہتی اور جسم کا ببادہ اتار کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ انسانی نفس کی یہی بنیادی خصوصیت ہے جس کے متعلق مشہور فرانسیسی مفکر برگسان کہتا ہے کہ :-

WE CHANGE WITHOUT CEASING

یعنی ”ہم میں تغیر تو واقع ہوتا ہے، لیکن ہم کبھی معدوم نہیں ہوتے“ اور برگسان کی ہمنوائی میں پولینڈ کا مفکر (NICHOLAS BARDYEAU) کہتا ہے کہ :-

PERSONALITY IS CHANGELSSNESS IN CHANGE

یعنی ”انسانی ذات، تغیرات کے هجوم میں عدم تغیر کا نام ہے“ لے
پروفیسر (ERWIN SCHRODINGER) نے ایک چھوٹی سی، لیکن بڑی اہم کتاب لکھی ہے۔ جس کا نام ہے
(WHAT IS LIFE)۔ وہ اس کتاب کے خاتمہ پر لکھتا ہے :-

”میں“ کسے کہتے ہیں ؟

اگر آپ ”میں“ کا تجزیہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ انسانی تجارب اور حافظہ سے کچھ زیادہ کا نام ہے۔ یہ وہ پردہ ہے جس پر انسانی حافظہ اور تجربہ کے نقوش جمع ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنی داخلی دنیا کا غور سے مطالعہ کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ جسے آپ ”میں“ کہتے ہیں، وہ اس بنیاد کا نام ہے جس پر تجربے

اور حافظے کی عمارت اٹھتی ہے..... اگر کوئی ماہر عمل تنویم ایسا بھی کر دے کہ تمہاری تمام سابقہ یادداشت یکسر ذہن سے محو ہو جائے پھر بھی تم دیکھو گے کہ اس تمہاری ”میں“ کی موت واقع نہیں ہو جائے گی۔ لہذا انسانی ذات کی ہستی کبھی ضائع نہیں ہوتی۔

انسانی ذات اور حافظہ | اس مفکر نے اس مقام پر ایک ایسا نکتہ بیان کیا ہے جس کی وضاحت کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ انسانی ذات کے منکرین (رامادہ پرستوں) کی طرف سے کہا یہ جاتا ہے کہ جسے ”میں“ کہتے ہو اور اس کے ثبوت میں دلیل یہ پیش کرتے ہو کہ ”میں نے دس سال پہلے جو بات کہی تھی، میں آج بھی اس کا احساس اور اعتراف کرتا ہوں کہ وہ میں نے ہی کہی تھی۔ اگر جسم کے بدلنے سے کچھ بھی باقی نہ رہتا تو مجھے اس کا احساس کیسے ہو سکتا تھا۔ اس سے واضح ہے کہ انسان میں کوئی شے ایسی ہے جو جسم کے تغیرات سے متاثر نہیں ہوتی۔ اسی کو انسانی ذات کہتے ہیں۔“ یہ دلیل بڑی کمزور ہے۔ (ان رامادہ پرستوں) کا کہنا یہ ہے کہ یہ انسانی حافظہ ہے جس سے اس قسم کا احساس قائم رہتا ہے۔ جس شخص کا حافظہ خراب یا گم ہو جاتے، اُسے اپنے متعلق کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ نہ اپنے ماضی کے کوائف کا کوئی احساس ہوتا ہے۔ اور حافظہ، دماغ کے خلیات کی کارفرمائی ہے۔ یعنی طبیعی نظام جسم کا فعل ہے اور چونکہ دماغ کے خلیات موت کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے مرنے کے بعد انسان کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ پروفیسر (SCHRODINGER) نے یہاں ان کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ (انسانی اعمال اور ارادوں کے نقوش انسانی ذات پر مرتسم ہوتے ہیں جو تغیرنا آشتنا ہے۔ حافظہ وہ ذریعہ ہے جس سے یہ نقوش مشہور شکل میں سامنے آتے ہیں۔ اس لطیف نکتے کو دو ایک مثالوں سے سمجھیے۔ براڈ کا سنگ اسٹیشن سے کوئی پروگرام نشر ہو رہا ہے جسے آپ اپنے ریڈیو سیٹ سے سنتے ہیں کہ اس میں سے یکایک آواز آتی بند ہو جاتی ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ ریڈیو اسٹیشن کا پروگرام ختم ہو گیا ہے۔ لیکن تحقیق کے بعد پتہ چلتا ہے کہ دراصل آپ کے سیٹ کا ایک تار خراب ہو گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ریڈیو سیٹ سے آواز کے بند ہونے کا مطلب نہیں کہ ریڈیو اسٹیشن ختم ہو گیا ہے۔ وہ تو بدستور موجود ہے لیکن اس کے پروگرام بچھڑنے کا جو ذریعہ (آپ کا سیٹ) تھا، اس میں نقص واقع ہو گیا ہے۔ حافظہ وہ ریڈیو سیٹ ہے جس کے ذریعے آپ کی ذات کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہونے والے پروگرام سامنے آتے ہیں۔ حافظہ (ریڈیو سیٹ) کی خرابی سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں ہوگا کہ اس کے پیچھے ریڈیو اسٹیشن ہی نہیں بلکہ ذریعہ خراب ہو گیا ہے۔ لہذا اگر کسی کے حافظہ کے خراب یا گم ہو جانے سے اُسے ماضی کے احساسات یاد نہیں رہتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ احساسات حافظہ پر منقوش تھے۔ اس کے

خراب یا گم ہو جانے سے وہ نقوش ہی ضائع ہو گئے۔ وہ نقوش انسانی ذات پر مرسم تھے جو حافظہ کی خرابی کے باوجود اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ یا مثلاً سینما فلم کا عکس، سکریں (پردہ) پر پڑتا ہے جسے ہم سب دیکھتے ہیں۔ اگر سینما ایڈج پر سکریں نہ رہے یا غراب ہو جائے تو وہ تصویر ہمیں نظر نہیں آئے گی۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ وہ فلم ہی باقی نہیں رہی۔ فلم تو بدستور موجود ہے صرف وہ ذریعہ باقی نہیں رہا جس سے اس فلم کے نقوش مشہود طور پر ہمارے سامنے آتے تھے جب وہ سکریں درست ہو جائے گی ریاسائنس کی تحقیق اس کی جگہ کوئی دوسرا ذریعہ اظہار ایجاد کرے گی) تو فلم پر نقوش تصویر پھر ہمارے سامنے آ جائے گی۔

برگسان اس باب میں اور بھی آگے جاتا ہے۔ وہ اپنی معرکہ آرا تصنیف (MATTER AND MEMORY) میں اس موضوع پر بلند فلسفیانہ سطح پر بحث کرنے کے بعد یہ نتیجہ پیش کرتا ہے کہ حافظہ درحقیقت دماغ کا فعل نہیں۔ وہ محض ذریعہ اظہار ہے ایک غیر مادی فعال عنصر کا۔ اس کے الفاظ ہیں:

آپ نے اب سمجھ لیا ہو گا کہ حافظہ کیوں دماغ کا فعل نہیں ہو سکتا۔ دماغ، حافظہ کے تسلسل کو قائم رکھتا ہے اور اسے مادی قالب میں سمو کر اس قابل بنا دیتا ہے کہ یہ حال (PRESENT) پر اپنا تصرف کر سکے۔ لیکن ”خالص حافظہ“ مادی شے نہیں۔ یہ روحانیت (غیر مادی عنصر) کا مظہر ہے۔ حافظہ کی دنیا درحقیقت روح کی دنیا ہے۔

ان مفکرین کی تحقیق سے واضح ہے کہ انسانی شعور (یا حافظہ جو تسلسل شعور کا دوسرا نام ہے) انسا کے طبعی نظام جسم کا نتیجہ نہیں۔ یہ انسانی ذات کا وظیفہ ہے جو تغیرنا آشنا ہے اور جو مدت کے بعد بھی بدستور تغیرنا آشنا رہتا ہے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو بڑے بلیغ انداز سے بیان کیا ہے۔ سورہ زمر میں ہے:

اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَاجِئِهَا. فِيمِنْ ذِكْرٍ
الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأَخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسْتَقَرٍّ. إِنَّ فِي ذَٰلِكَ
لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ (۳۹)۔

خدا انسانی ذات کو (جو سرخشمہ شعور ہے) نیند کی حالت میں اور موت کی حالت میں اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے۔ (یعنی انسانی ذات کا وظیفہ شعور اور اختیار دار اور وہ وقتی طور پر معطل ہو جاتا ہے) نیند کے بعد جب انسان بیدار ہو جاتا ہے تو یہ شعور ایک مدت تک کے لئے واپس آ جاتا ہے۔ لیکن موت کی صورت میں وہ (انسانی جسم کی طرف لوٹ کر نہیں آتا) روک لیا

جاتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیں، ایک عظیم حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں مضمحل ہیں۔

جس طرح نیند کی حالت میں انسانی ذات فنا نہیں ہو جاتی۔ اسی طرح، حافظہ کی خرابی یا کم ہو جانے کا مطلب یہ نہیں کہ انسانی ذات بھی فنا ہو گئی۔ یا وہ حافظہ سے الگ کوئی شے ہی نہیں۔ نیند کی حالت میں انسانی شعور کا فرما نہیں رہتا حالانکہ اس کا جسم بدستور کام کر رہا ہوتا ہے۔ موت کے بعد بھی انسانی جسم کے ہونے یا نہ ہونے کا اس کی ذات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ اپنے نقوش کو لئے بدستور باقی رہتی ہے۔ لیکن جسم کی طرف لوٹ کر نہیں آتی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ موت کے بعد انسانی ذات کے نقوش کے مشہود ہونے کے لئے کس قسم کے ذرائع عطا کئے جائیں گے لیکن ذرائع کوئی بھی ہوں، یہ حقیقت ہے کہ انسانی ذات کے نقوش فنا پذیر نہیں۔ یہی ہے وہ حقیقت جسے ان مغربی مفکرین نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔

جن مفکرین کا ادھر ذکر کیا گیا ہے اگرچہ ان کا تعلق بھی ہمارے ہی زمانے سے ہے لیکن وہ آج سے چند سال پہلے ہو گزرے ہیں۔ اس وقت دنیا نے علم النفس (سائیکالوجی) میں (ERICH FROMM) کا نام سرفہرست ہے۔ وہ عقیدہ کی رد سے (HUMANIST) ہے یعنی وحی کا قائل نہیں، لیکن آپ دیکھئے کہ وہ سائیکالوجی کے عمیق اور طویل مطالعہ اور تجربہ نفس کے ذاتی تجارب کے بعد نفس انسانی کے متعلق کیا کہتا ہے۔ وہ اپنی کتاب (MAN FOR HIMSELF) میں لکھتا ہے :-

انہی معنوں میں، ہم اپنے آپ پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ ہم اپنے جسم میں، اپنی ذات کے وجود سے باخبر ہیں۔ اس کا ہمیں احساس ہے۔ یہ ذات ناقابل تغیر ہے۔ اور تغیر پذیر احوال کوائف، خشک، اپنے خیالات اور جذبات تک میں بعض تغیرات کے باوجود، یہ ہماری زندگی میں شروع سے آخر تک اسی طرح قائم و دائم رہتی ہے۔ یہی وہ ”شے“ وہ معجزہ حیات ہے جو لفظ ”ہیں“ کے پیچھے ایک حقیقت ہے اور جس کی بنیاد پر، ہمارے تشخص کے عقیدہ اور یقین کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اگر ہمیں اپنی ذات پر اعتماد اور یقین نہ ہو تو ہمارے تشخص خوشی کا احساس منزلزل ہو جاتا ہے۔ — ہم دوسرے لوگوں کے سہارے جینے لگتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ (ہماری اپنی کوئی شے یا فیصلہ نہیں ہوتا) انہی لوگوں کی رائے ہمارے لئے تشخص خویش کا موجب بن جاتی ہے۔

یاد رکھئے! صرف وہ شخص، جسے اعتمادِ خویش حاصل ہو، دوسرے لوگوں سے عہدِ وفا نباہ سکتا ہے کیونکہ اسی صورت میں اسے اس امر کا یقین ہو سکتا ہے کہ وہ آنے والے زمانہ میں بھی وہی ہوگا جو وہ آج ہے۔ اور اسی طرح محسوس اور عمل کرے گا جس طرح وہ آج کرتا ہے۔ یہ اعتمادِ خویش بھی جس سے ہم دوسروں سے کچھ وعدہ کرنے کے قابل ہوتے ہیں نطشے نے کہا تھا کہ انسان کی تعریف (DEFINITION) یہ ہے کہ ”وہ وعدہ کر سکتا ہے“ اور یہی وہ خصوصیت ہے جس سے ایک انسان، انسان کہلا سکتا اور انسان رہ سکتا ہے۔ انسانی وجود کی شرطِ اولین، اس کا اپنے آپ پر یقین ہے۔ (صفحہ ۲۰۶)

غالباً ایسے ہی ہیں وہ لوگ جن کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ:-

شارخ نہالِ جندۂ خارِ دُخس چمنِ منشو بہ منکرِ ادا گر نشو بہ منکرِ خویشِ منو

اس لئے کہ جو شخص خدا (وحی اور آخرت) کا منکر ہے لیکن انسانی ذات میں عقیدہ رکھتا ہے، اس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی دن ان صداقتوں کو بھی تسلیم کرے گا۔ لیکن جو شخص انسانی ذات کا منکر ہے (یعنی اپنے آپ کو ایک حیوان سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا) وہ حیوانیت سے بلند و بالا کسی حقیقت کو بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس کا ذہن اس پست سطح سے بلند ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

بادِ نرسیدیِ خدا چہ می جوئی

(ERICH FROMM) نے کہا ہے کہ انسانی ذات کے تغیرنا آشنا ہونے کا نتیجہ ہے کہ انسان کو اس کے سابقہ

فیصلوں کا ذمہ دار اور پابند قرار دیا جاتا ہے۔ اس باب میں راشڈل اپنی کتاب (THEORY OF GOOD AND EVIL) میں لکھتا ہے کہ:-

اخلاقی نظام کا دار و مدار ہی اس مسلمہ پر ہے کہ ”میں“ اپنے تمام گزشتہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہوں۔ اس لئے اگر کچھ عرصہ کے بعد ”میں“ وہ نہیں رہتا جو پہلے تھا تو اس صورت میں، میں اپنے سابقہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہی نہیں قرار پاتا۔ اگر صورتِ حال یہ ہو تو پھر کسی شخص پر معاہدہ کی خلاف ورزی کا الزام ہی عائد نہیں کیا جاسکتا۔

اور یہی ہے وہ بنیاد جس پر قرآن کے قانونِ مکافاتِ عمل کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے جس کا سلسلہ دراز موت کے بعد تک چلا جاتا ہے۔

نفس انسانی کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے اسے ان الفاظ میں سمجھایا ہے: **وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهِ** ”خدا نے انسان میں اپنی روح پھونک دی“ اس کے غلط مفہوم سے ایک ایسا عقیدہ وضع ہوا جس پر تصوف کی ساری عمارت ایستادہ ہے۔ ہندوؤں کے تصوف (ویدانت) نے

انسانی ذات اور ذاتِ خداوندی | یہ عقیدہ وضع کیا کہ انسانی آتما (روح) پر ماتا (سب سے مکمل روح یعنی خدا) کا ایک جزو ہے جو مادی جسم میں محبوس ہے اور انسانی زندگی کا منتہی و مقصود یہ ہے کہ مادی آتما کو اس طرح ترک کیا جائے کہ یہ روح، مادہ کی دلدل سے نکل کر پھر اپنی اصل، یعنی روحِ خداوندی سے جا کر مل جائے۔ یہ عقیدہ پھر تا پھر آتا مسلمانوں کے تصوف میں بھی در انداز ہو گیا اور تعلیم دی جانے لگی کہ انسانی ذات، ذاتِ خدا کا جزو ہے۔ اور انسانی زندگی کا منتہی یہ ہے کہ یہ جزو، اپنی اصل میں جا کر مل جائے۔ غالب کے الفاظ ہیں:

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اسی عقیدے کا نتیجہ ہے کہ اولیاء اللہ کی موت کو موت نہیں کہا جاتا، اُسے ”اصل بالحق“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی ان کی روح پھر سے الحق کے ساتھ جا کر مل گئی۔ اسے وصال بھی کہا جاتا ہے۔ یہ عقیدہ باطل ہے۔ ذات، جہاں بھی ہو، اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ناقابلِ تقسیم وحدت ہوتی ہے۔ وہ اجزاء میں تقسیم ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر کسی ذات سے اس کا جزو الگ ہو جائے تو وہ ذات نامکمل یا ناقص ہو جاتی ہے اور نامکمل ذات کو ذات کہا ہی نہیں جاسکتا۔ انگریزی زبان میں انسانی ذات کی انفرادیت کے لئے لفظ (INDIVIDUALITY) آتا ہے (IN-DIVIDUAL) کے معنی ہی (IN-DIVISIBLE) یعنی ناقابلِ تقسیم ہیں۔ لہذا انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا جزو نہیں، یہ خدا کی عطا کردہ صفات یا قوت ہے، جس سے انسان کو نوازا گیا ہے۔ پروفیسر (C. LLOYD MORGAN) نظریۂ فجائی ارتقاء (EMERGENT EVOLUTION) کا موجد ہے جس نے ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی بنیادوں تک کو متزلزل کر دیا ہے۔ وہ ارتقاء سے نفس انسانی کے سلسلہ میں لکھتا ہے :-

میں اپنے اس عقیدہ کا اعتراف کرتا ہوں کہ (نفس کے) اس ارتقاء کو ایک ”نفسِ اعلیٰ“ (SUPREME MIND) کا مظہر یا عکس سمجھنا چاہئے۔ وہ ”نفسِ اعلیٰ“ جو ان تمام اشیاء کا خالق ہے جسے ہم ”جدید سے تعبیر کرتے ہیں۔ میں اس ارتقاء سے نفس کے اندر یہی دیکھتا ہوں کہ اوپر سے نیچے اور اول سے آخر تک ایک عظیم الشان اسکیم (تدبیر) عمل پیرا ہے۔ میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ فطرت کی ہر شے میں یہ ارتقائی بالیدگی، خدائی عاملیت (DIVINE AGENCY) کا ہی مظاہر

ہے۔ اور چونکہ اس سلسلہ ارتقاء میں، نفس انسانی، بلند ترین مقام پر ہے، اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ارتقاء نفس انسانی اس "نفس اعلیٰ" کی عاملیت کا آئینہ ہے۔ لیکن جیسا کہ میرا عقیدہ ہے، یہ "نفس اعلیٰ" لامحدود اور زمان کی قیود سے بے نیاز ہے۔ اس کی ذات کے لئے "او" اور "آخر" اور "جدت" و "اعادہ" کے الفاظ ان معانی میں استعمال نہیں کئے جاسکتے جن معانی میں یہ نفس انسانی سے بحث کرتے وقت استعمال ہوتے ہیں۔ وہ "روح ناتی" جو قدیم اور واجب الوجود ہے ارتقاء کی پیداوار نہیں، بلکہ وہ ایسی ذات ہے کہ خود ارتقاء کی بڑھتی ہوئی صورت اس کا پرتو ہے۔

(THE GREAT DESIGN)

اس سے بھی انسانی ذات اور ذاتِ خداوندی کا بنیادی فرق ابھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے نفس انسانی کی جو خصوصیات بیان کی ہیں، اس فرق کا صحیح تصور انہی سے سامنے آ سکتا ہے۔ اس مقام پر ہم، ان میں سے چند ایک کا تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں۔

نفسِ انسانی

کتاب لغت کی رُو سے، اس مادہ (ن. ف. س) کے متعدد معانی ہیں۔ عظمت اور بڑائی، ہمت، عزت، ارادہ اور عقوبت (سزا) نیز عقل، علم، قلب، شعور اور احساس کے معنوں میں بھی۔ لیکن جامع طور پر یہ لفظ، انسانی ذات یا شخصیت کے جملہ پہلوؤں کو محیط ہوتا ہے۔ ان معانی کی رُو سے، اس کے لئے ہمارے ہاں، ذات یا خودی کا لفظ بولا جلتا ہے۔ نیز "نفس" کے معنی بھائی بندوں کے بھی ہوتے ہیں اور یہ لفظ ان معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے جن کے لئے ہم اپنے ہاں اپنے آپ کے الفاظ بولتے ہیں۔

ضمناً "نفس" (ف کے زبر کے ساتھ) کے معنی سانس کے ہوتے ہیں۔ اس کی جمع "أَنْفَاسٌ" آتی ہے۔ — زیر نظر موضوع کی نسبت سے ہم اپنے آپ کو صرف اس دائرہ تک محدود رکھیں گے جس کے اندر یہ لفظ انسانی ذات کے لئے آیا ہے۔

لہٰذا مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: لغات القرآن (۱: ۱۰۰-۱۰۱)

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حیوانات اور انسان میں ماہر الامتیاز خصوصیت، انسانی ذات ہے۔ اس سے واضح ہے کہ انسانی ذات، ہر انسانی کچھ کو بلا تخصیص عطا ہوتی ہے۔ اور یہی وہ امتیاز ہے جس کی بنا پر کہا گیا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۱۵)۔ ”ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے“۔ انسانی ذات کیا ہے؟ یعنی اس کی کنہ و ماہیت کیا ہے، یہ نہ بتایا جاسکتا ہے نہ سمجھایا جاسکتا۔ اس لئے کہ یہ کوئی مادی شے نہیں۔ انسانی ذات تو ایک طرف، ہم تو یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ زندگی (LIFE) جسے عام طور پر ”جان“ کہتے ہیں، کیا ہے! ہم زندگی کی علامات سے، زندہ اور مردہ میں تمیز کر سکتے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ زندگی ہے کیا؟ یہی کیفیت انسانی ذات کی بھی ہے، بلکہ اس سے بھی لطیف تر۔ اس کی ماہیت کے متعلق بھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اسلئے خصوصیات کی بنا پر پہچانا جاسکتا ہے جو اس سے عملاً ظہور میں آتی ہیں۔ انسانی ذات، ہر انسان کو امکانی (POTENTIAL) شکل میں ملتی ہے۔ یعنی غیر نشوونما یافتہ (UN-DEVELOPED)۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اس میں نشوونما پا کر مستحکم ہونے کی بھی صلاحیت رکھ دی گئی ہے اور اگر اس کی نشوونما نہ کی جائے تو یہ، دلی کی دبی رہ جاتی ہے۔ سورۃ الشمس میں ہے: وَلَنفُسٌ وَمَا سَوَّاهَا۔ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا۔ قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا (۱-۴)۔ ”انسانی ذات، اور جس انداز سے اسے متوازن بنایا گیا ہے، اس پر غور کرو۔ اس میں، اس امر کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ یہ چاہے تو غلط روش پر چل کر اپنے اندر انتشار پیدا کر لے اور چاہے اس انتشار سے محفوظ رہ کر مستحکم سے مستحکم ہوتی چلی جائے۔ جس نے اپنی ذات کی نشوونما کر لی وہ کامیاب و کامران ہو گیا، اس کی کھیتی پر دان چڑھ گئی۔ لیکن جس نے اسے اپنے پست جذبات کے بوجھ تلے دبائے رکھا اور ابھرنے نہ دیا، اس کی کشتِ حیات ویران ہو گئی۔ اس کی انسانی صلاحیتیں خوابیدہ کی خوابیدہ رہ گئیں“۔ لہ۔ اس کے نشوونما پانے کی کیفیت کے لئے قرآن کریم نے ”تزکیہ“ کی اصطلاح استعمال کی ہے جس کے لغوی معنی نشوونما یا بالیدگی (GROWTH) کے ہیں۔ انسانی زندگی کا فریضہ یہ ہے کہ اس (ذات) کی نشوونما کی جائے اس سے یہ اس قابل ہو جائے گی کہ زندگی کے مزید ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی آگے بڑھ جائے (اسے جہانِ اُخروی میں جنت کی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے)۔ لیکن اگر یہ غیر نشوونما یافتہ رہ جائے تو یہ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ رک کر رہ جاتی ہے (اسے جہنم کی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے)۔ جہنم کے لئے ایک لفظ ”حجم“ بھی آئی ہے جس کے معنی رکاوٹ کے ہیں۔

انسانی ذات کی نشوونما ان اقدار کی پابندی سے ہوتی ہے جو وحی کی رو سے عطا ہوئی ہیں اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ ان اقدار پر عمل پیرا ہونا اس

لہ ان آیات کا ایک اور پہلو بھی غور طلب ہے، لیکن اسے ہم ذرا آگے چل کر سامنے لائیں گے جہاں یہ بھی بتایا جائے گا کہ اس کے مروجہ مفہوم نے کس قدر غلط فہمی پیدا کر رکھی ہے۔

نظام کے اندر رہتے ہوئے ممکن ہے جسے ”الدین“ یا ”الاسلام“ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فریضہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ”يُذَكِّرْكُمْ“ (۱۵۱)۔ ”وہ تمہاری ذات کی نشوونما کرتا ہے“۔ اس کے معنی ہیں کہ رسولؐ تعلیم کتاب و حکمت کے مطابق ایسا نظام مشکل کرتا ہے، جس میں اقدارِ خداوندی کے اتباع سے مومنین کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں خانقاہوں کی غلو توں میں چلتوں اور ریاضتوں سے تزکیہ نفس کیا جاتا ہے، وہ فریب نفس سے زیادہ کچھ نہیں۔ قرآن کریم کی رو سے تزکیہ نفس، قرآنی نظام کے اندر جہد مسلسل کی رو سے ہوتا ہے۔ ان اقدار پر عمل کرنے کے مختلف اور متعدد گوشے ہیں۔ انسانی زندگی کا ہر گوشہ ان کی آماجگاہ ہے لیکن ان میں نمایاں حیثیت مزد و معادضہ کے خیال کے بغیر انفاق فی سبیل اللہ کو حاصل ہے۔ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی استعداد اور استطاعت کے مطابق پوری پوری محنت کرے اور اس محنت کے ماحصل میں سے اپنی ضروریات کے مطابق لیکر باقی نفع انسان کی بہبود کیلئے اس نظام کے حوالے کرے۔ مثلاً سورۃ التیل میں ہے کہ جہنم سے وہ محفوظ رہ سکتا ہے: ”الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى“ (۹۲)۔ جو اپنا مال و دولت اس مقصد کے لئے دیدیتا ہے کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو جاتے۔ سورۃ بقرہ میں کہا گیا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ سے تثبیتِ نفس حاصل ہو جاتی ہے (۲۵۷)۔ تثبیت کے معنی استحکام ذات کے ہیں۔ انفاق کے برعکس، بخل یا شح نفس ہے۔ یعنی سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر رکھ لینا۔ قرآن کریم میں اس سے بچنے کی سخت تاکید آئی ہے (دیکھئے ۵۹ ذ ۶۴)۔ نظامِ خداوندی میں انفاق کی یہ شکل ایک تنظیمی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے لئے دیکھئے (۹۱)۔

اس مقام پر فطری طور پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ اس کی پہچان کیا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما ہو

اس کا معیار

رہی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے اس کی پہچان آسان ہے۔ ذاتِ خداوندی مکمل ترین ذات ہے اور اس کی جو صفات قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں، وہ اس ذات کے مختلف (FACETS) یا شتوں ہیں۔ ان میں بعض صفات تو ایسی ہیں جن کا تعلق ذاتِ خداوندی کی لامتناہیت سے ہے۔ مثلاً اس کا ازل و ابدی ہونا۔ ان میں تو کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا۔ لیکن دیگر صفات ایسی ہیں جن کی نمود (علیٰ حدِ بشریت) انسانی ذات میں بھی ممکن ہے لہذا جس انسان سے ان صفات کی نمود ہو، اس کے متعلق کہا جائے گا کہ اس کی ذات کی نشوونما ہو رہی ہے۔ اسی کو ”قربِ خداوندی“ کہا جاسکتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن کریم میں ہے: ”فَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ وَأَعْلَاهُ مِن بَيْنِ إِلَٰهِي“ (۵۳)۔ ”تم خود ہی اپنے معیار کے مطابق فیصلے کرنے نہ بیٹھ جاؤ کہ تمہاری ذات نشوونما پا رہی ہے۔ خدا کو ابھی طرح معلوم ہے“

کس کی ذات، کس حد تک، تخریب سے محفوظ ہے؟ (نیز دیکھئے ۴/۲۴)۔ سورۃ الحشر میں ایک بڑی اہم آیت ہے جس میں کہا گیا ہے: وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۵۹)۔ دیکھنا! تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے خدا کو فراموش کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی اپنی ذات ہی ان کی نگاہوں سے ارجھل ہو گئی۔ اس کا دمع، مہم یہ ہے کہ خدا فراموشی، در خود فراموشی (منکر خوشنشدن) لازم ملزوم ہیں۔ ان حقائق سے واضح ہے کہ صفاتِ خداوندی وہ معیار (STANDARD) ہے جس سے یہ پایا اور پرکھا جاسکتا ہے کہ انسان کی ذات کس حد تک نشرو نما پا چکی، یا پارہی ہے۔

ذات کی بنیادی خصوصیت انفرادیت ہے۔ انفرادیت کے معنی یہ ہیں کہ ہر ذات خود مکنتی ہے۔

انفرادیت

بذاتہ قائم ہے کسی دوسرے سہارے کی محتاج نہیں۔ یہ اپنے ہر فیصلہ کی آپ ذمہ دار ہے اور اس کے نتائج بھی اسے خود ہی بھگتنے پڑتے ہیں۔ اس میں نہ کوئی دوسرا شریک ہوتا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ سورۃ اخلاص میں خدا کے متعلق جو کہا گیا ہے: قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ (۱) تو اس میں "احد" کے معنی "ایک" نہیں، بلکہ یہ ذاتِ خداوندی کی انفرادیت یا یگانگت (UNIQUE-NESS) کا مظہر ہے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت اس کا صاحب اختیار و ارادہ ہونا ہے۔ کائنات کی ہر شے قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ کائنات میں منیتِ خداوندی تمام و کمال کار فرما ہے، لیکن انسان کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ اَعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ (۱۳۰)۔ تم اپنی مرضی کے مطابق، جو کرنا چاہتے ہو کرو۔ انسان کا یہی اختیار و ارادہ ہے جس کی تصریحات سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ کہیں کہا گیا: وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (۱۸)۔ "ان سے کہہ دو کہ احق تمہارے رب کی طرف سے آپکا ہے۔ تم میں سے جس کا جی چاہے اسے قبول اور اختیار کرے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔" کہیں کہا گیا: مَنْ أَهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ - وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (۱۷)۔ "جو صحیح راستہ اختیار کرے گا اس کا فائدہ اس کی ذات کو پہنچے گا۔ جو غلط راہ پر چلے گا اس کا نقصان بھی اس کی ذات کو ہو گا۔"

انسان کے اسی اختیار و ارادہ کا فطری نتیجہ ہے کہ ہر فرد اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس میں کوئی دوسرا

۱۔ مزید حوالوں کے لئے دیکھئے۔ (۱/۱۱) ذ (۳۴) ذ (۱۹) ذ (۳۱) ذ (۳۹)۔ مطاب الفرقان جلد اول میں زیر تشریح (۱/۱۱) میں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیجئے۔ نیز کہ اب استتیر۔

(DIS-INTEGRATION) واقع ہو جاتا ہے۔ مٹر کہتے ہی انتشار کو ہیں۔ اسی کو خسرانِ نفس سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔

(۴/۳۹) یعنی وہ اعمال جن سے انسانی ذات میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ لہ

ہم نے ادھر کہا ہے کہ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے عمل سے مراد وہی کام نہیں جو کسی سے محسوس طور پر مرزدہ ہوں۔ اس میں وہ امور بھی شامل ہیں، جن کا انسان ارادہ یا نیت کرے، خواہ وہ عملی طور پر اس سے مرزدہ نہ ہی ہوں۔ مثلاً آپ کسی کے ہاں بیٹھے ہیں اور میز پر اس کی قیمتی گھڑی پڑی ہے۔ آپ کے دل میں خیال آتا ہے کہ اگر موقع مل جائے تو میں اس گھڑی کو چرائوں لیکن آپ کو اس کا موقع نہیں ملتا۔ دنیاوی قانون کی رد سے آپ نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ لیکن خدا کے قانون مکافاتِ عمل کے حساب سے آپ کی اس نیت کا اثر بھی آپ کی ذات پر مرتب ہو گیا۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے: **وَنَعْلَمُ مَا تُوسِّسُ بِهِ نَفْسُهُ** (۲۴)۔ ”ہم انسان کے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے بھی واقف ہیں“۔ دوسری جگہ ہے: **يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ**۔ (۲۵) (نیز ۲۶)۔ ”خدا تمہاری نگاہوں کی خیانت اور دل کے پوشیدہ رازوں تک واقف ہے“ اس کے معنی یہی ہیں کہ انسان کی نیت اور ارادہ بھی اس کی ذات پر اثر مرتب کر دیتا ہے۔ انسانی ذات، اعمال انسانی کے انہی اثرات و نقوش کو ساتھ لے کر موت کے بعد آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسی کا نام انسان کا اعمال نامہ ہے۔ اگر انسانی ذات کو نشوونما دینے والے اعمال کا وزن زیادہ ہے تو وہ ارتقائی منزل میں آگے بڑھ جائے گی۔ اور اگر ان کا وزن کم ہے اور انسانی ذات کی کما حقہ نشوونما نہیں ہو سکی، تو وہ آگے بڑھنے سے روک دی جائے گی۔ اس لئے جنت کے متعلق کہا کہ **وَذَٰلِكَ جَزَاءُ مَنْ تَزَكَّىٰ** (۲۷)۔ ”جنت انسان کے ان اعمال کا بدلہ ہے جن سے اس کی ذات کی نشوونما ہو چکی ہو“ واضح ہے کہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ہر ذات اپنے اعمال کی آپ ذمہ دار ہوتی ہے۔ نہ کسی دوسرے کے کسی عمل کا اثر اس پر پڑ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اس کو کسی قسم کا فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ یہ اس کی انفرادیت کا فطری نتیجہ ہے۔ سورۃ الانعام میں ایک آیت ہے کہ

۱۔ مزید حوالوں کے لئے دیکھئے - (۱۱ : ۲۳۳ ; ۳۹) انسانیت ذات کے متعلق مطالبہ الفرقان جلد اول میں، زیر تفسیر آیات (۱۰)؛ (۷)؛ (۶)؛ (۵)؛ (۴) ہیں بھی ذکر آچکا ہے ۔

تھ اس مقام پر آپ امیت (۲۹) کو ایک بار پھر سامنے لائے جسے پہلے درج کیا جا چکا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ نیند اور موت کی حالت میں نفس انسانی (ذات) کا عمل معطل ہو جاتا ہے۔ نیند کی صورت میں وہ (ذات) بیدار ہونے پر ”واپس آ جاتا ہے“۔ جبکہ موت کی صورت میں اسے لوہے کی لٹا جاتا ہے۔ وہ اس دنیا میں واپس نہیں آتی۔ اس کی کارفرمائی کا میدان اگلی دنیا ہوتا ہے۔ اسی کو آخری حیات کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ جس طرح نیند کی حالت میں انسانی ذات مرقی نہیں، اسی طرح موت سے بھی وہ مرقی نہیں۔ مرقہ صرف جسم ہے۔ تفصیل اس کی اپنے مقام پر آئے گی۔

جوں جوں نگہ بصیرت اس کی گہرائیوں میں اترتی ہے، انسان وجد میں آجاتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فُرَادًى ثُمَّ خَلَقْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا ثُمَّ جَعَلْنَا بَيْنَهُمُ الْوُجُوہَ لِيُحْسِنُوا كَلَامَ رَبِّهِمْ ۚ وَتِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الَّتِي كُنَّا نَقُولُ لَكَ قُرْآنٌ بَلَدٌ ۚ وَتِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الَّتِي كُنَّا نَقُولُ لَكَ قُرْآنٌ بَلَدٌ ۚ وَتِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الَّتِي كُنَّا نَقُولُ لَكَ قُرْآنٌ بَلَدٌ ۚ

اس آیت جلیلہ کا مفہوم یہ ہے کہ ”جن جن چیزوں کو تم یہاں ”میری“ یا ”میرا“ کہتے ہو، جن اپنیوں کو تم اپنے یا میرے کہہ کر پکارتے ہو، ان سب کو یہیں چھوڑ کر، صرف اپنی ذات کو لیکر ہمارے ہاں آؤ گے۔ تمہارے مال و دولت، تمہارے اعزہ و اقربا، تمہارے رفقاء اور متعلقین، تمہارا جسم، یہ سب پیچھے رہ جائیں گے۔ اور تم صرف اپنی ذات کو لے کر ہماری عدالت میں حاضر ہو گے“ لفظ ”فرادی“ سے انسانی ذات کی انفرادیت کی طرف اشارہ ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے تاکید کی ہے کہ عَلَیْکُمْ أَنْفُسُکُمْ لَا یُضْرَکُمْ مَنٌ حَتَّىٰ إِذَا أَهْتَدَیْتُمْ (۱۳)۔ ”تم اپنی ذات کی حفاظت کرو۔ اگر تم میرے راستہ پر چلتے رہے تو کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔“ یہ آیت بھی ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ دنیا میں دوسرے لوگ انسان کو نفع بھی پہنچا سکتے ہیں اور نقصان بھی، لیکن یہ نفع اور نقصان اس کی طبعی زندگی تک محدود ہوتا ہے۔ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے، کوئی دوسرا اُسے نہ نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ اس کو نفع بھی انسان خود آپ پہنچاتا ہے اور اس کا نقصان بھی یہ خود ہی کرتا ہے۔ کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اس مقام پر ہمیں جرمن فلاسفر فطیشے کا وہ قول یاد آ جاتا ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ تم نے جو جرم میرے خلاف کیا ہے اُسے میں تو معاف کر دوں گا لیکن اس سے جو جرم تم نے اپنی ذات کے خلاف کیا ہے اُسے کون معاف کر سکتا ہے؟ قرآن کریم میں جو بار بار کہا گیا ہے: وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن کَانُوا أَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُونَ (۲)۔ ”ہم کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ انسان، اپنی ذات پر، خود آپ ظلم کرتا ہے۔“ تو اس کا بھی یہی مفہوم ہے۔ انسان اپنی ذات کو خود آپ نقصان پہنچاتا ہے، کوئی دوسرا ایسا نہیں ہو سکتا۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں ذات انسانی کے وہ خصائص و نزوات، جن کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے۔ اس کی بعض دیگر دنیا کا خصوصیات ایسی ہیں جن کا ذکر ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا۔ قرآن کریم نے یہ کہا تھا کہ سَمِعْنَا مِنْهُمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ یَتَّبِعُوا لَهُمْ آتَانَهُ الْحَقُّ (۲۱) ”ہم انہیں عالم آفاق اور خود ان کی نفسیاتی دنیا میں اپنی نشانیاں دکھاتے جاتے گے، تا آنکہ یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ حقیقت پر مبنی ہے“ عالم آفاق، یعنی خارجی کائنات کے نظم و ضبط کے متعلق، سائنس کی تحقیقات ایک عرصے سے جاری ہیں اور ان میں ہمارے دور تک، کافی ترقی ہو چکی ہے۔ لیکن عالم انفس (یعنی انسانی ذات) کے متعلق تحقیق کا دروازہ حال ہی میں کھلا ہے۔ اسے علم النفس یا

سائیکالوجی (PSYCHOLOGY) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اگرچہ اس تحقیق نے ابھی تک، باقاعدہ سائنس کی حیثیت اختیار نہیں کی لیکن، بایں ہمہ، اس وقت تک بھی اس کے متعلق جو تحقیق ہوئی ہے اس سے قرآنی حقائق پر بڑی حد تک روشنی پڑتی ہے۔ اس تحقیق کی رو سے

سائیکالوجی کی تحقیق | انسانی نفس کو دو شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک نفس شعوری (CONSCIOUS MIND) اور دوسرا نفس غیر شعوری یا نیم شعوری (SUBORDIN-CONSCIOUS MIND) ان کا کہنا

یہ ہے کہ نفس شعوری کا تعلق انسان کے محسوس اعمال سے ہے اور ان اعمال کی بھی صورت یہ ہے کہ عقل انسانی غلط اعمال کو بھی مزین اور مستحسن بنا کر دکھا دیتی، اور ان کے جواز کے لئے قسم قسم کے دلائل ہمیا کر دیتی ہے، جس سے انسان اس فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس سے کوئی غلط کام (جرم) سرزد نہیں ہوا۔ لیکن ان جرائم کے اثرات، نیز ان ارادوں، آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشوں تک کے اثرات جو محسوس شکل اختیار نہیں کر پاتے، ان سب کو نفس غیر شعوری، اپنی تہوں میں چھپائے رکھتا ہے۔ اس دنیا میں ان اثرات کے نتائج نفسیاتی امراض کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ اور علم تجزیہ نفس کی رو سے ان کا علاج بھی کیا جاتا ہے، لیکن جہاں تک انسانی ذات کے مستقبل کا تعلق ہے، یہ حیاتِ آخرت میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ وہاں کی زندگی کے متعلق قرآن کریم نے ایک مقام پر کہا ہے: یَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ (۱۶)۔ ”جب چھپے ہوئے راز بھی ابھر کر سامنے آجائیں گے“ دوسری جگہ ہے: لَقَدْ كُنْتُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا ۖ فَكُشِفْنَا عَنْكُمْ غِطَاءَکَ ۚ فَبَصَرُکَ الْیَوْمَ حَدِیدٌ (۱۷)۔ ”تم اپنے اعمال کے نتائج سے بے خبر تھے۔ آج تمہاری نگاہوں سے پردے اٹھا دیے گئے ہیں اور وہ اتنی تیز ہو گئی ہیں کہ کوئی شے بھی ان سے اوجھل نہیں رہ سکتی“ فِیَوْمَ یَبْذُرُ الذِّیْنِ ظَلَمُوْا مَعٰذِرَہُمْ (۱۸)۔ ”دنیاوی زندگی میں انسان کی عقل بہانہ ساز مختلف قسم کے دلائل سے اس کی غلط کوشیوں کے لئے وجہ جواز ہمیا کر دیا کرتی ہے۔ اس دن اس کی وہ وجہ جواز (معذرتیں) اسے کچھ فائدہ نہ دے سکیں گی“ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت وہ تمام نقوش و اثرات، جنہیں نفس غیر شعوری نے اپنی تہوں میں چھپا رکھا تھا، ابھر کر سامنے آجائیں گے (۱۹)۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے چار الفاظ میں اس اعجاز و ایجاز کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس کی کما حقہ، داد کوئی علم النفس کا ماہر ہی دے سکتا ہے۔ کہا ہے: یَوْمَ تَنٰلُنٰی کُلُّ ذٰلِکَۃًۢ مِّنْ نَّفْسِہَا ۚ وَتُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَہُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (۲۰) ”جس دن انسان کا ایک نفس اس کے دوسرے نفس سے جھگڑتا ہوا سامنے آئے گا۔ اس دن ہر انسانی ذات کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔ اور کسی پر کسی قسم کی کوئی زیادتی نہیں ہوگی“ غور کیجئے! آج سے چودہ سو سال پہلے انسان کے علو و نفوس کے باہمی مجادلہ کا ذکر کیا کسی مفکر کے بس کی بات تھی؟ ایسا انکشاف وحیِ خداوندی ہی کر سکتی تھی۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، اسی کو قرآن نے انسانی اعمال نامہ سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل میں کہا گیا ہے:

اعمال نامہ | وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَبْعَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ كِتَابًا

يَلْقَاهُ مَنْشُورًا اقْرَأْ كِتَابَكَ . كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (۱۰۲)

اس دنیا میں انسان کا اعمال نامہ اس کی گردن میں لٹکا رہتا ہے لیکن ایک لپٹی ہوئی شکل میں ظہور نتائج کے وقت، یہ لپٹا ہوا اعمال نامہ ایک کھلی کتاب کی شکل میں سامنے آجائے گا۔ اس وقت انسان سے کہا جائے گا کہ تو اپنا اعمال نامہ خود ہی پڑھ لے۔ تمہارا حساب کرنے کے لئے باہر سے کسی محاسب کے... بلانے کی ضرورت نہیں۔ آج تمہارا نفس خود اپنے خلاف محاسبہ کرنے کے لئے کافی ہے۔

اُس وقت نفس غیر شعوریہ اپنے تمام پوشیدہ نقوش کو ساتھ لے، نفس شعوریہ کے سامنے کھڑا ہو جائے گا اور اس سے کہے گا کہ عقل فریب کار، جن غلط اعمال کو مزین بنا کر تمہیں دکھاتی رہی اور تم اس کے فریب میں آتے رہے، آج وہ اعمال بے نقاب ہو کر تمہارے سامنے ہیں۔ اگر تم میں جرات ہے تو ان سے انکار کرو۔ تم ایسا نہیں کر سکتے، کہ یہ وہ سیٹ ہے جس پر لکھا ہوا ہر حرف، حقیقت اور صداقت پر مبنی ہے۔ اس پر کوئی خارجی عنصر اثر انداز نہیں ہوا۔ سورہ القیامت میں ہے:

بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۚ وَلَوْ أَنَّهُ لَنَفَىٰ مَعَاذَ يَوْمِهِ (۱۰۵) عقل فریب کار، انسان کے غلط اعمال کو ہزار مزین بنا کر اُسے دھوکے میں رکھے، اس کا نفس (غیر شعوریہ) اس پر پوری پوری نگاہ رکھتا ہے اور وہ اس دن اس کا اچھی طرح محاسبہ کرے گا۔

یہ ہیں نفس انسانی کے متعلق قرآنی شواہد۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، علم النفس (سائیکالوجی) ہنوز اپنے عہد طفولیت میں ہے۔ جب یہ ذرا اور آگے بڑھے گا تو زمانہ دیکھے گا کہ اس کی تحقیقات کس طرح ان حقائق کو بھی تائید کرتی چلی جاتی ہیں، جو ابھی اس کے دائرہ جستجو اور تفتیش سے باہر ہیں۔ یہ حضرات، انسانی نفس (SELF) کی حیات بعد الممات (SURVIVAL) کے امکان کو قائل ہو چکے ہیں۔ وقت آئے گا کہ یہ اس کی بقا (IMMORTALITY) کے بھی انہی معنوں میں معترف ہو جائیں گے، جن معنوں میں قرآن کریم نے اسے پیش کیا ہے۔ لہ۔ (SURVIVAL) اور (IMMORTALITY) میں کیا فرق

لہ اس باب میں ڈاکٹر (C.G. JUNG) کے تجربات بڑے بصیرت افروز ہیں۔ دیکھئے اس کی کتاب (MEMORIES, DREAMS

REFLECTIONS) نیز (DEATH AND RE-BIRTH OF PSYCHOLOGY BY IRA PROGOFF)

ہے، اس کی وضاحت اس مقام پر کی جائے گی جہاں حیات بعد الممات کا تفصیلی تذکرہ آئے گا۔ سیر دست اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ قرآن کریم نے، اہل جنت اور اہل جہنم دونوں کے بقائے نفس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اہل جہنم کا یہ کہہ کر کہ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيٰی (۱۳۱) نیز (۱۳۲) اس میں انہیں نہ زندگی نصیب ہوگی، نہ موت ہی آئے گی: ”یہ محض (SURVIVAL) ہوگا۔ ان کے برعکس اہل جنت کے متعلق کہا کہ: لَا يَمُوتُ فِيهَا الْمَوْتُ إِلَّا الْمَوْتُ الْأُولٰی (۱۳۳)۔ ”پہلی موت (جو دنیا میں آگئی، اس کے بعد) وہاں ان پر موت وارد نہیں ہوگی“ اسے (IMMORTALITY) کہا جائے گا۔ یعنی بقائے دوام۔

اس کے ساتھ ہی اتنا اور سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ انسانی ذات کا بقائے دوام، خدا کے ”بقائے دوام“ جیسا نہیں خدا کی بقا فنا آشنا نہیں۔ لیکن یہ خصوصیت صرف لامحدود ذات (INFINITE) کی ہو سکتی ہے، جو خدا کے سوا کوئی نہیں۔ اسے ہم ابدیت (ETERNITY) سے تعبیر کریں گے۔ انسانی ذات بہر حال محدود (FINITE) ہے۔ اس لیے یہ لامتناہی نہیں ہو سکتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی جائے گی۔ (جنت بھی اس کا منتہی نہیں۔ راستے کی منزل ہے) لیکن اس کا بہر حال انجام ہوگا۔ وہ انجام کیا ہوگا، ہم اپنے ادراک کی موجودہ سطح پر اسے نہیں سمجھ سکتے شاید وہاں جا کر یہ راز بھی کھل جائے۔

یہ ہیں انسانی ذات (نفس) کے متعلق، قرآنی شواہد کے چند گوشے۔

انسانی فطرت

انسانی ذات کے تذکرہ کے بعد، ہم ان چند ایک نظریات کا سامنے لانا ضروری سمجھتے ہیں، جو ہمارے ہاں شدید قسم کی غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب بنے چلے آ رہے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ گمراہ کن نظریہ ”انسانی فطرت“ (HUMAN NATURE) کا ہے۔ فکر انسانی کی بعض غلط اندیشیاں ایسی ہیں جن کے نتائج اس طرح عالمگیر ہو جاتے ہیں کہ وہ زمان اور مکان کی حدود سے بھی غیر متاثر رہتے ہیں۔ انہی میں ایک غلط نگہی انسانی فطرت کا نظریہ ہے۔ تاریخی اعتبار سے، انسانی فکر کا آغاز یونان کے فلاسفہ سے ہوتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ نظریہ ان کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ انہوں نے انسان کی جو تعریف (DEFINITION) متعین کی تو اس کی بنیاد یہی نظریہ تھا۔ ان میں سے بعض نے کہا کہ ”انسان صاحب شعور حیوان ہے“، کسی نے کہا ”انسان مدنی الطبع حیوان ہے“ کسی نے کہا کہ ”انسان وہ حیوان ہے جو اوزار بناتا ہے“ وغیرہ وغیرہ۔ ان (DEFINITIONS) میں تو وقتاً فوقتاً اختلاف ہوتا رہا۔ لیکن فطرت انسانی کا بنیادی نظریہ مسلسل آگے چلا آیا۔ ہر مفکر نے انسانی فطرت کا نظریہ پیش کیا لیکن یہ کوئی نہ بتا سکا کہ انسانی

فطرت بالآخر ہے کیا؟ حیرت ہے کہ یہ اتنے بڑے بڑے مفکر اس دور اڑھائی ہزار سال کے عرصہ میں ان چند مبادیات پر غور نہ کر سکے، جن سے یہ مسئلہ صاف ہو سکتا تھا۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ فطرت کسے کہتے ہیں؟ پانی کو اگر علیٰ حالہ چھوڑ دیا جائے تو وہ نشیب کی طرف بہتا ہے، ہر برتن کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک خاص درجہ حرارت پر جا کر منجمد ہو جاتا ہے اور دوسری طرف، بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے۔ یہ خصوصیات پانی کی فطرت کہلاتی ہیں گی۔ یا مثلاً بحری گھاس کھاتی ہے، گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتی۔ شیر گوشت کھاتا ہے، کسی دوسری غذا سے

فطرت کا مفہوم | اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسے بکری اور شیر کی فطرت کہا جاتے گا۔ ان مثالوں سے ہم

نے دیکھا کہ :-

(۱) فطرت اس بنیادی خصوصیت کو کہتے ہیں جو غیر متبدل ہو۔ اور

(۲) یہ فطرت اس نوع کے ہر فرد میں یکساں طور پر پائی جائے گی۔ یعنی بحری دنیا میں کہیں بھی ہو، اور کسی زلنے میں بھی ہو، وہ گھاس کھانے والی ہوگی۔ اسی طرح شیر بھی کسی زمانے میں ہو، اور کسی ملک میں، وہ گوشت خود ہوگا۔ اور یہ خصوصیات ہر بکری اور ہر شیر میں یکساں ہوں گی۔

شق (۱) سے ظاہر ہے کہ فطرت مجبوراً اشیا کی ہوتی ہے جو اسے بدلنے پر قادر نہیں ہوتیں۔ لہذا صاحب اختیار و ارادہ کی کوئی فطرت نہیں ہو سکتی۔ اور انسان کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صاحب اختیار و ارادہ ہے۔

شق (۲) سے واضح ہے کہ ہر نوع کی فطرت، اس نوع کے ہر فرد میں یکساں طور پر پائی جائے گی۔ اور جہاں تک انسان کا تعلق ہے، مختلف زمانوں کے انسان تو ایک طرف، کسی ایک زمانے میں بھی، نوع انسان کا ایک فرد، دوسرے فرد سے نہیں ملتا۔ ان کی شکل و شبہت یا انگلیوں کے نشانات کی بات نہیں، اگرچہ وہ بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے، ان کی سیرت و کردار ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان مبادیات سے بتواضح ہے کہ انسان (MAN) کی کوئی فطرت نہیں (جسلی طور پر، انسانوں میں جو حیوانی خصوصیات پائی جاتی ہیں، یا وراثت اور ماحول کا جو اثر، انسانی بچوں پر مرتب ہوتا ہے، اس کا ذکر آگے چل کر ایلکس کے عنوان کے تابع ملے گا)۔ ایسے بچے پاتے گئے ہیں جنہیں ان کی پیدائش کے وقت ہی کوئی جنگلی جانور اٹھا کر لے گیا اور انہوں نے، انہی جانوروں میں، جنگل میں پرورش پائی۔ بعد میں دیکھا گیا کہ ان میں کوئی بھی ایسی بات نہیں تھی جو انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ ان کی خوبئو انہی حیوانوں جیسی تھی جن میں انہوں نے پرورش پائی تھی۔ اس کے برعکس، جانوروں کو کسی ماحول میں بھی رکھا جائے، وہ اپنی فطرت پر قائم رہتے ہیں۔ بکری اور کتے کی پرورش ایک ہی گھر میں کیوں نہ ہو۔ بکری، بکری ہے اور کتا، کتا۔ یہ اس لئے کہ ان کی فطرت الگ الگ ہوتی ہے، جو غیر متبدل ہے

کوئی دواڑھائی ہزار سال کے عرصہ کے بعد اب کہیں جا کر علم النفس
انسان کی کوئی فطرت نہیں | کے ماہرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں ۔

(ERICH FROMM) نے اپنے عمر بھر کے تجارب کے بعد اس غلط نظریہ کی بڑے محققانہ انداز سے تردید کی ہے ۔
اس نے بڑے نشترانہ انداز میں کہا ہے کہ یہ باطل نظریہ اس لئے مسلسل اور متواتر چلا نہیں آیا کہ علمی انداز سے اس کی
تردید نہیں ہو سکتی تھی ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ انسان کی بہت سی تخریب کاریوں کے لئے سپر کا کام دیتا تھا ۔ مثلاً
ارسطو نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ غلامی ، انسانی فطرت کا تقاضہ ہے اور یہی دلیل اٹھارویں صدی تک غلامی کے جواز
میں دی جاتی رہی ۔ یا مثلاً نظام سرمایہ داری کے جواز میں یہ کہا جاتا رہا کہ ذاتی ملکیت اور مفاد خویش یا خود غرضی انسانی
فطرت کا تقاضہ ہے ۔ اس لئے کوئی ایسا نظام انسانی فطرت کے مطابق نہیں کہلا سکتا جس کی بنیاد ان جذبات
پر نہ ہو ۔

انسانی فکر نے تو یہ ٹھوکریں کھائی ہی تھیں ، کہ اس کے پاس ایسا سرچشمہ علم نہیں تھا جو غلطیوں سے منزہ ہو ۔
لیکن حیرت اندر حیرت کہ خود مسلمانوں نے بھی اس نظریہ کو اختیار کر لیا ۔ اور یہیں تک اکتفا نہیں کیا ، اسے بڑھا چڑھا
کر یہاں تک لے گئے کہ عقیدہ یہ وضع کر لیا کہ :-

(۱) اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے ۔

(۲) لہذا انسان کی فطرت ، عین خدا کی فطرت ہے ۔

(۳) اسلام بون فطرت ہے ، یعنی عین انسانی فطرت کے مطابق ۔

(۴) لہذا کوئی کام ، جو انسانی فطرت کے خلاف ہو ، وہ اسلام کے خلاف ہے ۔

(۵) ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے ۔ اگر اُسے ماحول کے اثرات سے غیر متاثر رکھا جائے تو اس کی زندگی

اسلام کے مطابق ہوگی ۔

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھئے اس کی کتاب (THE ANATOMY OF HUMAN DESTRUCTIVENESS . P. ۲۳۸-۲۳۹) لکھیں گے ۔ اس سے مراد اس کی ہی کتاب ہے ۔

آگے چل کر اس کتاب کے حوالے اکثر دہرائے گئے ۔ ان مقامات پر ہم صرف (ERICH FROMM) لکھیں گے ۔ اس سے مراد اس کی ہی کتاب ہے ۔

۲۔ (محرف) تو رات نے کہا تھا کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا ۔ ہم نے اس سے یہ تصور لے کر ، یہ عقیدہ وضع کر لیا کہ خدا

نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے ۔

ہمارے ہاں ان نظریات کو مسلمات کی حیثیت سے مانا جاتا ہے اور اس شدت کے ساتھ کہ یہ گویا خود اسلام کے بنیادی نظریات ہیں۔ اس کی سند میں قرآن کریم کی ایک آیت پیش کر دی جاتی ہے جس میں کہا گیا ہے :

فَطَرَتَ اللَّهُ النَّسِیَ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا۔ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللَّهِ۔ ذَٰلِكَ
الَّذِیْنَ الْقَیِّمُ۔ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُونَ (نبی)

اللہ کی وہ فطرت، جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ دینِ قیّم (اسلام) ہے۔ لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جانتے۔

اس آیت میں جو لفظ ”فطرت“ آیا ہے اس کا یہ مفہوم (NATURE) یکسر غیر قرآنی ہے۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو ان معانی میں استعمال ہی نہیں کیا جن معانی میں یہ آج مستعمل ہے۔ قرآن کریم تو ایک طرف، زمانہ نزولِ قرآن کی عربی تمہین میں بھی یہ لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتا تھا۔ بعد میں جب (جہاسیوں کے زمانہ میں) یونانی فکر کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا تو ان کے ہاں لفظ (NATURE) کے لئے ”فطرت“ کی اصطلاح وضع کی گئی۔ وہاں سے یہ لفظ بیچر کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اور پھر اسی خود وضع کردہ اصطلاح کے مطابق، قرآن کریم کی مندرجہ بالا آیت کی پہلے تفسیر کی گئی اور پھر دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ یوں یہ باطل تصور نہ صرف یہ کہ ہمارے ہاں عام ہوا بلکہ اسلام کا بنیادی نظریہ قرار پا گیا۔

اس لفظ کے مادہ (ف۔ ط۔ ر) کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول (زیر تشریح آیت ۲۱) میں تفصیل سے بتایا جا چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالدَّرَیْ (۲۱) کہا ہے۔ فَطَرَ کے معنی ہیں کسی شے کو عدم سے وجود میں لانا۔ اسے پہلی بار پیدا کرنا۔ لہذا ”فطرت“ کے معنی ہوئے خدا کا وہ طریق (یا قانون) تخلیق، جس کی رو سے وہ کسی شے کو عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ فَطَرَ کے ان معانی کی روشنی میں آیت (۲۱) کا صاف مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو بھی اپنے اُسی قانون و طریقِ تخلیق کے مطابق عدم سے وجود میں لایا ہے جس طریق کے مطابق اس نے جملہ کائنات کو پیدا کیا۔ تخلیقِ انسانی کے لئے کوئی دوسرا طریق اختیار نہیں کیا گیا۔ خدا کا یہ تخلیقی نظام بڑا محکم ہے، جس میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ لہذا جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسانوں کو اس نے کسی دوسرے طریق سے پیدا کیا (یعنی مثلاً اس نے مٹی کا ایک پتلا بنایا۔ اس کی پسلی چیر کر اس میں سے اس کی بیوی نکالی اور اس سے نسلِ انسانی کا سلسلہ آگے بڑھا) وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ وہ حقیقت سے واقف نہیں۔ چنانچہ اس نے خود انسانوں کے متعلق کہا ہے : قُلِ اِنِّیْ فَطَرْتُكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (۲۱) ”اللہ وہ ہے جو تمہیں پہلی بار عدم سے وجود میں لایا“ اس کی تشریح میں دوسری جگہ کہا : هَلْ اَتٰی عَلٰی الْاِنْسَانِ حِیْنَ مِّنَ الدِّیْنِ لَمْ یَكُنْ شَیْءًا مَّذْکُوْرًا (۲۱) ”کیا انسان پر وہ زمانہ نہیں گزرا، جب یہ کوئی قابلِ ذکر

شے نہیں تھا، بلکہ اَدَلَايِدْ كُرَالِ نَسَانْ اَنَا خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ. وَلَمْ يَكُنْ شَيْءٌ (۱۹) کیا انسان کو یاد نہیں کہ ہم نے آپسے کیا درنا خالیکہ یہ کوئی شے نہیں تھا۔ یہ ہے فطرت اللہ کا مفہوم۔ یعنی خدا کا قانون تخلیق، جس کی رو سے وہ دیگر مخلوقات کی طرح انسانوں کو بھی عدم سے وجود میں لایا۔ خود آیت (۲۱) لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ میں ”خلق اللہ“ کے الفاظ ”فطرت اللہ“ کی تشریح کر رہے ہیں۔ یعنی قانون تخلیق۔

ہم ذرا آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ انسان کو خدا نے اپنی فطرت پر پیدا کیا، اور ہم قرآن کریم میں دیکھتے ہیں کہ انسان کے متعلق خدا نے یہ کچھ کہا ہے: (۱) وَخَلَقَ الْاِنْسَانَ ضَعِيفًا (۲۸)۔

انسانی خصوصیات ”انسان کو بڑا کمزور پیدا کیا گیا ہے“ (۲) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (۱۳۰)۔ ”انسان

ظالم بھی واقع ہوا ہے اور کفر پسند و ناشکر گزار بھی“ (۳) وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (۹۲) نیز ۲۶: ۲۳، ۲۳: ۱۵، ۸۲: ۸ یعنی ”انسان بڑا ہی ناشکر گزار ہے“ (۴) ناشکر گزار بھی بے حد جھگڑا تو بھی — هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ (۱۱)۔ ”واضح طور پر جھگڑا تو“ (۵) وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرُ شَيْءٍ جَدَلًا (۱۸) ”انسان اکثر معاملات میں خواہ مخواہ جھگڑے نکالتا رہتا ہے“ (نیز دیکھئے ۲۶: ۲۲)۔ (۶) وَكَانَ الْاِنْسَانُ جَعُوْلًا (۹۱) ”انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے“ (نیز ۱۱: ۷)۔ (۷) وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (۹۱) ”انسان بڑا خود غرض بخیل اور تنگ نظر واقع ہوا ہے“ (۸) کيفِيَّتِ اس کی یہ ہے کہ یہ بے صبرا بھی ہے اور ایسا لالچی کہ اس کا پیٹ ہی نہیں بھرتا — اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (۹۰)۔ (۹) اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ (۲)۔ ”یہ نعمائے خداوندی کی ناقدر شناسی کرتا ہے اور اس کی ہوس کی کوئی حد اور کتنا رہی نہیں“ (۱۰) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰی (۹۶) ”یہ بڑا سرکش واقع ہوا ہے“ (۱۱) سرکش بھی اور اس کے ساتھ ظالم اور جاہل بھی — اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۳۳)۔

یہ ہیں انسان کی موٹی موٹی خصوصیات، جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ یہ تو ہم آگے چل کر بیان کریں گے کہ ان سے حقیقی مراد کیا ہے۔ اس مقام پر آپ اس پر غور کیجئے کہ اگر عقیدہ یہ ہو کہ خدا نے انسان کو اپنی ”فطرت“ پر پیدا کیا ہے اور انسانی فطرت کی، قرآن نے یہ خصوصیات بتائی ہوں، تو سوچئے کہ اس سے خود خدا کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوگا؟ کیا خدا کی فطرت (معاذ اللہ) انہی خصوصیات کی حامل ہوگی؟ لہذا یہ نظریہ یا عقیدہ بالبدایت غیر قرآنی اور باطل ہے، کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا۔ یا انسان کی کوئی فطرت بھی ہے! علاوہ ازیں، ہم دیکھ چکے ہیں کہ فطرت ان بنیادی خصوصیات کو کہا جاتا ہے جو غیر متبدل ہوں۔ اگر انسانی فطرت کے نظریہ کو صحیح تسلیم کر لیا جاتے تو پھر خدا کی طرف سے سلسلہ ہدایت اور حضرات انبیائے کرام کی بعثت عبث ہو کر رہ جاتی ہے، کیونکہ جب فطری خصوصیات

کو بدلا ہی نہیں جاسکتا تو پھر اس تمام سلسلہ رشد و ہدایت سے حاصل کیا ہوگا؟ کہا یہ جانتا ہے کہ انسان اپنی فطرت کی خلاف ورزی کرتا ہے اس لئے حضراتِ انبیائے کرام مبعوث ہوتے رہے کہ وہ انسان کو اس کی فطرت کے مطابق چلائیں۔ یہ تصور پھر باطل ہے۔ کوئی شے اپنی فطرت کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتی۔ ہر نوع اپنی فطرت پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہے اور چونکہ وہ اپنی فطرت کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتی، اس لئے ان کے لئے نہ خارجی طور پر ہدایتِ خداوندی کی ضرورت ہے نہ ہادیانِ طریقت (انبیاء و رسل) کی بعثت کی حاجت۔ بکریوں کو کوئی رسول آکھ نہیں بتاتا کہ تمہارے لئے گھاس حلال ہے اور گوشت حرام۔ یہ چیز ان کی فطرت میں داخل ہے جس کی وہ خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتیں۔ جس خصوصیت کی خلاف ورزی کی جاسکے اُسے فطرت کہا ہی نہیں جاسکتا۔

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جس نوع کی کوئی فطرت ہو، اس کے تمام افراد اُس فطرت کے مطابق چلتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اس نوع کے افراد میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر کہا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو تمام انسانوں کو ایسا پیدا کر دیتے کہ ان میں کوئی اختلاف نہ ہوتا، لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ یہ ہماری مشیت کے خلاف تھا۔ سورہ ہود میں ہے: وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُ الْأَوَّلُونَ مُخْتَلِفِينَ (۱۱۸) اگر تیرے رب کی مشیت میں ہوتا تو وہ تمام نوعِ انسان کو ایک گروہ کی طرح پیدا کر دیتا اور وہ آپس میں اختلاف نہ کرتے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ لہذا یہ آپس میں اختلاف کرتے ہیں۔ یہ اختلافات ہدایتِ خداوندی کی رو سے مٹ سکتے ہیں۔ دوسری جگہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ الْمَنَ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جِيعًا أَفَأَنْتَ تُنْكِرُ الْبَاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا هُوهَآئِینَ (۱۶۹)۔ ”اگر مشیتِ خداوندی میں ایسا ہوتا تو کرۂ ارض پر بسنے والے تمام انسان ایک ہی راستہ پر چلتے لیکن خدا نے ایسا نہیں کیا۔ اے رسول! کیا تو... انسانوں کو مجبور کرنا چاہتا ہے کہ وہ ایمان کی راہ اختیار کر لیں؟ ان آیات سے بھی واضح ہے کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں جس پر چلنے کے لئے اُسے مجبور پیدا کیا گیا ہو۔ ہر انسانی بچہ، ایک صاف اور سادہ لوح لے کر پیدا ہوتا ہے جس پر وہ جس قسم کے نقوش مرتسم کرنا چاہے، کر سکتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں —

تو اپنی نرشت خود اپنے قلم سے لکھ : خالی رکھی ہے خامہ حق نے تری چیں

— وحیِ خداوندی کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان اُس سلیٹ (اپنی ذات) پر اپنے اختیار و ارادہ سے وحی کی راہنمائی میں صحیح خطوط و نقوش مرتسم کر لے۔ (ERICH FROMM) اپنی اس کتاب میں، جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، لکھتا ہے: اب علمِ انسان کے ماہرین کی اکثریت نے یہ انکشاف کیا ہے کہ انسان ایک قوطی ایض

(سفید کاغذ) لیکر پیدا ہوتا ہے جس پر ہر کچھ اپنا متن تحریر کر دیتا ہے۔ (ص ۲۴۷)

خیر و شر کی تمیز

یہیں سے ہم ایک اور غلط فہمی کی طرف رخ کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ عقیدہ بھی ہے کہ خیر و شر کی تمیز خود انسان کے اندر موجود ہے۔ یہ عقیدہ بھی بالبدایت باطل اور قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ اگر خیر و شر کی تمیز انسان کے اندر ہوتی تو اسے وحی کی راہنمائی کی قطعاً ضرورت لاحق نہ ہوتی۔ خیر و شر کی تمیز بکریوں کے اندر ہے، شیروں کے اندر ہے۔ جو چیز ان کے لئے شر (موجب نقصان) ہے، وہ کبھی اس کی طرف رخ نہیں کرتے۔ اس سے دُور بھاگتے ہیں۔ اور اس کے لئے انہیں کسی خارجی ہدایت یا تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر اس قسم کی صلاحیت انسان کے اندر ہوتی تو اسے بھی وحی کی ہدایت کی ضرورت لاحق نہ ہوتی۔ اس غلط عقیدہ کے لئے بھی قرآن کریم کی ایک آیت کا سہارا لیا جاتا ہے، جس کے ایک گونے کو ہم پہلے بھی سامنے لائے ہیں۔ یعنی سورۃ الشمس کی یہ آیت کہ خَالَهُمَا فُجُورًا وَتَقْوَاهَا (۹۱)۔ ”خدا نے فسق و فجور اور تقویٰ کو نفس انسانی میں الہام کر دیا۔“ اور مطلب اس سے یہ لیا جاتا ہے کہ گناہ اور ثواب کے کاموں کی تمیز خود نفس انسانی کو الہام کر دی گئی ہے۔ جو کچھ ”فطرت انسانی“ کے سلسلہ میں لکھا جا چکا ہے اس کی روشنی میں اس عقیدہ کے ابطال کے لئے کسی دلیل اور سند کی ضرورت نہیں۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ نفس انسانی میں دونوں امکانات (POSSIBILITIES) اور صلاحیتیں رکھی گئی ہیں۔ یعنی اگر وہ چاہے تو غلط روش اختیار کر کے منتشر ہو جائے۔ (DIS-INTEGRATE) اور چاہے تو صحیح روش اختیار کر کے اس سے بچ جائے (فُجُور کے معنی پھٹ جانا، ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ہے) اور آہ زیرِ نظر میں ”فجور ہا“ اور ”تقوا ہا“ کی ضمیر (ها) اس کی طرف واضح اشارہ ہے۔ یعنی انسانی نفس کا فجور اور تقویٰ اس کے اندر رکھ دیا گیا ہے۔ یہ ان دونوں ممکنات کی حامل ہے۔

۱۔ ہمارے ہاں کشفِ دلہام کے الفاظ بھی عام ہیں جن سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ خدا اپنے برگزیدہ بندوں (اولیاء اللہ یا صوفیاء) کو بذریعہ الہام، براہِ راست علم عطا کر دیتا ہے۔ یہ عقیدہ بھی قرآن کے خلاف اور ختمِ نبوت کے منافی ہے۔ خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملنے کا ذریعہ فقط ایک تھا جسے وحی کہہ کر پکارا گیا ہے اور وحی کا سلسلہ حضور رسالت پر ختم ہو چکا ہے۔ اس موضوع پر مطالب الفرقان جلد اول زیرِ آیت (۱۰۱) ذ (۱۰۲) گفتگو ہو چکی ہے۔

اس ضمن میں سورۃ الاعراف کی آیت (۱۲۴) پیش کی جاتی ہے، یعنی یہ آیت :-

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَى
أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَى شَهِدْنَا أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَمَةِ
إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ (۱۲۴)۔

اور اس سے مفہوم یہ لیا جانا ہے کہ ہستی باری تعالیٰ کا اقرار ہر انسان کے اندر دوہرے کر کے رکھ دیا گیا ہے، یہ عقیدہ بھی بالبداهت غلط ہے۔ اس آیت کے صحیح مفہوم کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول (زیر آیت ۲۶) میں تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

حمل امانت

ایک اور غلط فہمی سورۃ احزاب کی آیت (۲۳) کے غلط مفہوم سے پیدا کی جاتی ہے۔ آیت حسب ذیل ہے :-

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا
وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا - وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ - إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا - (۲۳)۔

اس کا ترجمہ حسب ذیل کیا جاتا ہے :-

ہم نے اپنی امانت زمین اور آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی، لیکن انہوں نے

اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ وہ اس ذمہ داری سے ڈر گئے، لیکن انسان نے اسے

اٹھا لیا۔ یہ بڑا ہی ظالم اور جاہل واقع ہوا ہے۔

”امانت سے کیا مراد ہے؟“ اسے تو ہم ذرا آگے چل کر واضح کریں گے۔ یہاں اتنی بات دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی شے کو اٹھانے

کے لئے زمین، آسمان اور پہاڑوں سے کہا اور انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ آپ غور کیجئے کہ یہ تصور کس قدر

باطل ہے۔ اشیائے کائنات کے متعلق تو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ وہ سب احکام خدا

کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (۲۴)۔ ان میں سے کسی میں مجال سرکشی

نہیں، یا رائے انکار نہیں۔ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ (۲۵) لہذا یہ سمجھنا کہ انہوں نے خدا کے کسی حکم کی اطاعت سے انکار

کر دیا، قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔

اب اس سے آگے بڑھیے۔ خدا نے اپنی امانت کو زمین، آسمان، پہاڑوں کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس سے (معاذ اللہ صبار معاذ اللہ) اللہ تعالیٰ کی کس قدر سبکی ہوئی ہوگی؟ اسی احساس کے ماتحت انسان آگے بڑھا اور کہا کہ لایئے! اسے میں اٹھا لیتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ انسان کی اس پیشکش پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے ثواب یا سزا ملنی چاہیے تھی۔ لیکن اس کی بجائے اللہ تعالیٰ نے یہ کہا کہ یہ بڑا ہی ظالم اور جاہل تھا۔ آپ دیکھئے کہ اس سے خدا کے متعلق کیا تصور سامنے آتا ہے!!

یہ ساری ٹیڑھی دیوار ”حمل امانت“ کے غلط مفہوم کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔ ان الفاظ کے معنی لئے جاتے ہیں: ”امانت کا اٹھانا“ حالانکہ عربی لغت کی رو سے ”حمل امانت“ کے معنی ہیں ”امانت میں خیانت کرنا“۔ لہٰذا ان معانی کی رو سے اس آیت جلیلہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اشیائے کائنات کے ذمے کچھ فرائض عائد کئے تو وہ نہایت دیانتداری سے بے چون و چرا انہیں ادا کرتے گئے۔ انہوں نے اس امانت میں کوئی خیانت نہ کی۔ وہ ایسا کرنے سے خائف رہتے ہیں (۱۱۱)۔ لیکن انسان کی یہ حالت ہے کہ جو فرائض اس کے ذمے عائد کئے گئے ہیں، یہ ان کی بجا آوری میں خیانت کرتا ہے۔ حالانکہ ایسا کرنے میں کسی اور کا کچھ نہیں بگڑتا، خود اسی کا نقصان ہوتا ہے۔ یہ اس کی کتنی بڑی جہالت ہے جس کی وجہ سے یہ خود اپنے آپ پر اس قدر ظلم اور زیادتی کرتا ہے: (اس سلسلہ میں آیات ۲۴ ذ ۲۱ ذ ۱۳ بھی ملاحظہ کیجئے)۔

دیگر انسانی خصوصیات

یہ بتایا جا چکا ہے کہ اختیار و ارادہ کی قوت یا صلاحیت انسان اور دیگر حیوانات میں خط امتیاز کھینچتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور صلاحیتیں بھی ہیں جو اسے دیگر حیوانات سے متمیز اور ممتاز کرتی ہیں۔ مثلاً قوت گویائی (عَلَّمَ الْبَيَانَ ۵۵)۔ تحریر کی صلاحیت (عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۹۶)۔ حصولِ علم کی استعداد (عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۹۶)۔ انسان میں یہ صلاحیتیں مضبوطی پر رکھ دی گئی ہیں۔ جنہیں وہ اپنی محنت اور کاوش سے بروئے کار لائے گا۔ یعنی یہ نہیں کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے ساتھ ہی عالم و فاضل اور صاحبِ قلم و لسان ہوتا ہے، وہ تو بالکل کورا ہوتا ہے۔ البتہ اس میں ایسا بننے کی صلاحیت ہوتی ہے جس کے لئے محنت اور کاوش درکار ہوتی ہے۔ اسی لئے کہا ہے کہ

يَسْأَلُ الْإِنْسَانَ إِلَّا مَا سَعَى (۵۳)۔ ”انسان وہی کچھ حاصل کر سکتا ہے جس کے لئے وہ محنت کرے“

اشرف المخلوقات

ہمارے ہاں انسان کو، اشرف المخلوقات بھی کہا جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ کرۃ ارض پر جو مخلوق محسوس طور پر نظر آتی ہے، اس کے مقابلہ میں یہ واقعی اشرف ہے لیکن خدا کی مخلوق کرۃ ارض تک ہی تو محدود نہیں، نہ معلوم خدا کی اس ناپید کنارہ کائنات میں اور بھی کس کس قسم کی مخلوق موجود ہے جس کی ہمیں ہنوز کچھ واقفیت نہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے انسان کے متعلق کہا ہے: **وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا** (۲۱)۔ ”ہم نے انسان کو اپنی اکثر مخلوق سے افضل پیدا کیا ہے“ خدا نے ”اکثر مخلوق سے افضل“ کہا ہے۔ ”تمام مخلوق سے افضل“ نہیں۔ اس لئے یہ اشرف المخلوقات نہیں کہلا سکتا۔ قرآن کریم میں تو یہاں تک بھی آیا ہے: **لَخَلَقُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ**۔ **وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ** (۲۲)۔ ”ارض و سما کی تخلیق انسانی تخلیق کے مقابلہ میں کہیں بڑی تھی۔ لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے“ اس حقیقت کی تفسیر کو بلند پایہ سائنسدان، یا سائنسدانوں کی جماعت پیش کر سکتی ہے۔ سطحی طور پر تو ہمارا خیال اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ انسانی تخلیق کے سلسلہ میں قرآن نے کہا ہے کہ **وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ** (۲۳)۔ ”انسان کی پیدائش کا آغاز بے جان مادہ سے ہوا“ لیکن بے جان مادہ کے متعلق کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس طرح وجود میں آگیا۔

انسان اور بشر | دو ایک ضمنی گوشے اور بھی۔ قرآن کریم نے انسان اور بشر کے الفاظ مراد معنوں میں بھی استعمال کئے ہیں۔ مثلاً سورۃ الحجر میں پہلے کہا: **وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ (۱۵)۔** اور پھر اسی کو **إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا (۱۶)۔** (۱۵) بھی کہا۔

قرآن کریم میں ”جن دانس“ کے الفاظ بھی اکٹھے آتے ہیں۔ (مثلاً ۶) دیگر مقامات) انسانی آبادیاں، قدیم الایام سے دو حصوں میں منقسم چلی آرہی ہیں۔ ایک آبادی وہ جو شہری یا تمدنی زندگی بسر کرتی ہے اور دوسری وہ، جو جنگلوں، صحراؤں میں خانہ بدوشوں کی طرح رہتی ہے۔ اب تو اس ثانی الذکر آبادی کی تعداد گھٹتی چلی جا رہی ہے اور مواصلات کے عام ہو جانے سے ان میں باہمی میل جول بھی بڑھ رہا ہے، لیکن، پہلے

جن دانس

یہ آبادی بڑی کثیر التعداد ہوتی تھی اور رسوم و رواج اور بود و ماند کے طور طریقوں میں شہری آبادی سے بالکل مختلف عربوں کے ہاں یہ دونوں آبادیاں خصوصیت سے ایک دوسرے سے متمیز تھیں اور ان کے رہنے سہنے کے طریقے، رسوم و عادات، معاشرتی و معاشی انداز بالکل جدا گانہ۔ ان کے ہاں اَلْاَنْسُ اس قبیلہ کو کہتے تھے، جو کسی ایک جگہ مقیم ہو یعنی شہری آبادی اور اَلْاَیْنُ ان لوگوں کو جو ان شہریوں کی نگاہوں سے اوجھل و غم محو نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ دونوں گروہ انسانوں ہی پر مشتمل تھے۔ انہی کو قرآن کریم نے ”جن دانس“ کہہ کر پکارا ہے۔

النّاس (۱۳۳ ذیل) ان آیات میں قرآن نے نوع انسان کو امت واحدہ (ایک عالمگیر برادری) کہہ کر پکارا ہے اور اسی اعتبار سے دوسری جگہ کہا ہے کہ جس طرح تمہارا آغاز ایک وحدت کی شکل میں تھا اسی طرح تمہاری نشاۃ ثانیہ بھی وحدت کا انداز لئے ہوگی۔ سورۃ لقمان میں ہے: مَا خَلَقُكُمْ وَلَا بَعَثُكُمْ إِلَّا كُنُفُسٍ وَاحِدَةٍ (۱۳۳) ”تمہاری تخلیق اور بعثت نفس واحدہ کی طرح ہے“

قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ کسی انسان کو اس زمین پر دوام اور بقا حاصل نہیں۔ طبعی موت ہر ایک کے لئے ہے۔ (۲/۲۱۵ ذیل)۔

ابلیس

اب ہم اپنے اس تحقیقاتی سفر کی مشکل ترین وادی میں داخل ہوتے ہیں۔ چنگیز اور ہلاکو بھی انسان تھے جن کی دہشت، درندگی، خونخواریت، ظلم اور تشدد کے تصور سے آج بھی روح کانپ اٹھتی ہے۔ دوسری طرف حاتم طائی بھی انسان تھا جس نے اپنی ساری عمر نوع انسان کی بے مزد و معاوضہ خدمت اور غمگساری میں گزار دی۔ سوال یہ ہے کہ ایک ہی نوع کے مختلف افراد میں یہ ”بُعد المشرقین“ کیسا؟ اس سے ظاہر ہے کہ نہ تو ظلم اور تشدد ہی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ ایسا ہوتا تو انسان حاتم طائی کیسے بن سکتا تھا! اور نہ ہی ہمدردی اور خیر سگالی کا جذبہ اس کی فطرت ہے کیونکہ اس صورت میں انسان ہلاکو اور چنگیز کیسے بن سکتا تھا! یہاں سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ پھر انسان میں اس قسم کی خوں ریزی اور قصابیت کہاں سے آتی ہے، اور ول سوز گدازیت کہاں سے؟ اس سوال نے صدیوں سے انسان کو عجیب کشمکش میں مبتلا کر رکھا ہے اور ”مذہب“ ان الجمنوں میں مزید اضافہ کا موجب

بننا چلا آرہا ہے۔

(محرّف) عیسائیت نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ ہر انسانی بچہ، پیدائش کے ساتھ، اپنے اولین ماں باپ کے گناہ کی آلائش لے کر آتا ہے۔ اور اس آلائش کو دور کر دینا اس کے بس کی بات نہیں۔

عیسائیت کا نظریہ

اس کے معنی یہ ہوئے کہ گناہ یا شر (EVIL) انسان کی فطرت میں داخل ہے اور وہ اس باب میں مجبور محض ہے۔ اس خود پیدا کردہ مشکل کا حل انہوں نے یہ سوچا کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت مسیحؑ) کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ صلیب پر اپنی جان دیکر انسانوں کے اس گناہ کا کفارہ ادا کرے۔ (ہم اس وقت عیسائیت کے صرف عقائد بیان کر رہے ہیں۔ ان پر تبصرہ اور تنقید سرِ دست مقصود نہیں اور ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ان عقائد کا بودا پن ایسا واضح ہے جس کے لئے کسی تبصرہ اور تنقید کی ضرورت ہی نہیں)۔ ”گناہ اول“ کے عقیدہ کے بعد خود ان کے ہاں یہ اعتراض پیدا ہوا کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ تو اپنے اولین ماں باپ (آدم اور حوا) کے گناہ کا بوجھ لیکر پیدا ہوتا ہے، لیکن خود آدم اور حوا نے یہ گناہ کیسے کیا؟ وہ جب ”پیدا ہی نہیں ہوئے تھے“ تو وہ اس گناہ کے مرتکب کس طرح ہوئے؟ اس کے لئے انہوں نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ وہ شیطان کے بہکاوے میں آگئے تھے، اور شیطان کا تصور انہوں نے ایسا دیا گویا وہ خارج میں کوئی مستقل بالذات شخصیت ہے۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ”گناہ اول“ کے عقیدہ نے جبریت (DETERMINISM) کا نظریہ پیدا کیا۔ مذہب کی گرفت کس قدر محکم اور انسانی قلب کی گہرائیوں تک پہنچی ہوتی ہوتی ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یورپ میں ایسے ایسے محققین اور سائنسدان پیدا ہوئے جنہوں نے ”انسان“ کے متعلق جڑی وسیع اور گہری ریسرچ کی۔ ان میں سے بیشتر ایسے تھے جو عیسائیت تو ایک طرف، خدا تک کے بھی منکر تھے، لیکن عیسائیت کے پیدا کردہ عقیدہ جبریت کی محکمت کا یہ عالم تھا، اور وہ اس طرح ان کے تحت الشعور میں داخل ہو چکی تھی کہ وہ اپنی ہر ریسرچ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ انسان اپنے اعمال میں آزاد نہیں، مجبور ہے۔ لیکن صداقت اپنے آپ کو منوائے بغیر نہیں رہتی۔ ہمارے زمانے میں علم انسانی نے جو غیر العقول ترقی کی ہے، وہ عیسائیت کے اس باطل عقیدہ اور سابقہ محققین کے جبریت کے غلط تصور کی تردید کرتی چلی جا رہی ہے۔ ذیل میں مختصر الفاظ میں، ان دونوں گوشوں کی، سرسری سی جھلک دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جہاں تک ان غلط نظریات کی تردید کا تعلق ہے، میں نے مناسب سمجھا ہے کہ (ERICH FROMM) کی اس کتاب کے حوالہ سے بات کروں جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ کیونکہ وہ اس ریسرچ میں تازہ ترین (LATEST) بھی ہے اور مختلف محققین کی فکر کی ہمیں بھی۔ عیسائیت کے عقیدہ ”اولین گناہ“ کے متعلق (ERICH FROMM) لکھتا ہے کہ ازل

عقیدہ کو فروغ اس لئے ہوا کہ اس نے انسان کے ہر جرم کے لئے وجہ جواز مہیا کر دی اور مجرمین نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دلایا (یعنی وہ خود فریبی کا شکار ہو کر اطمینان سے بیٹھ گئے) کہ ہم تو مجبور محض ہیں۔ جرم، انسان کی فطرت کے اندر پیدا نشی طور پر ودیعت کر کے رکھ دیا گیا۔ اس سے اتنا ہی نہیں ہوا کہ ارتکابِ جرم کے خلاف احساسِ ندامت تک ختم ہو گیا بلکہ یہ مایوسی کا تصور بھی عام ہو گیا کہ انسان کی کسی کوشش سے بدکرداری اس کی تردید | کی اصلاح ممکن ہی نہیں، لیکن :-

اس طرح کی مایوسی کا عام کرنا بھی ایسا ہی ہلاکت انگیز ہے جس طرح کسی اور باطل کا عام کرنا۔ یہ الجھنیں بھی پیدا کرتا ہے اور حوصلہ شکنی بھی۔ اس قسم کے خلافِ عقل عقائد کا پھیلنا اور پھر ان کے پیدا کردہ نقصانات کی تلافی کے لئے ”جھوٹے مسیحوں“ کی آمد کا عقیدہ وضع کرنا کچھ کم ہلاکت آفریں نہیں۔ یہ عقائد پہلے انسان کو جرم اور گناہ کی ترغیب دلاتے ہیں اور پھر اسے مفلوج بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ (صفحہ ۷۸۲)

اب آئیے مغربی محققین کی اس ریسرچ کی طرف، جس کا ادھر ذکر کیا گیا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ڈارون نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان حیوان ہی کی بڑھی ہوئی شکل کا نام ہے۔ طبیعی طور پر ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ لہذا جو خصوصیات، حیوانات میں جبلتی طور پر پائی جاتی ہیں، وہ خود انسان کے اندر موجود ہیں۔ اسے نظریہ جبلت (INSTINCTIVENESS) کہا جاتا ہے۔ سابقہ ماہرینِ علم النفس نے پہلے ان جبلتوں کو تین بنیادی شقوں میں تقسیم کیا، یعنی جذبہ تحفظِ خویش

(SELF-PRESERVATION) — جذبہ تغلب (SELF-AGGRESSION) اور — جذبہ افزائشِ نسل (SELF-PROCREATION)۔ فراموش نہ کرنے چاہئے کہ جذبہ تحفظِ خویش اور جذبہ تغلب کو یکجا کر کے ان تین شقوں کو دو میں بدل دیا۔ لیکن جذبہ تغلب نے اپنی اہمیت برقرار رکھی کیونکہ دنیا میں فساد انگیزیوں اور خون ریزیوں کا باعث اکثر و بیشتر یہی جذبہ ہوتا چلا آیا ہے۔ اس لئے یہ شق مغربی محققین کی تحقیق اور بحث و نظر کا موضوع بنتی رہی بلکہ لیکن حال کی تحقیق نے اس نظریہ کی تردید کر دی ہے۔ چنانچہ (ERICH FROMM) لکھتا ہے کہ جبلتِ جذبات مغربی محققین کی ریسرچ | بیشک انسان کے طبیعی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، لیکن انسان کے تقاضے طبیعی ہوں

لے اس باب میں (K-LORENZ) کی کتاب (ON AGGRESSION—1966) بڑی تفصیل کی حامل ہے۔ اور اس

نے اس نظریہ کے عام کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

تو نہیں، ان سے آگے کچھ اور بھی ہیں، جن کا تعلق اس کی انسانی زندگی سے ہے۔ یہ تقاضے اس وقت پورے ہوتے ہیں، جب اس کے ان جلی جذبات کو اس کے کیرکٹر کے ساحلوں کا پابند کر دیا جائے (ص ۲۶)۔ وہ دوسرے مقام پر لکھتا ہے کہ:

انسانیت کا جوہر اس کا کیرکٹر ہے، جسے وہ حیوانیت کے جلی تقاضوں کے نعم البدل کے طور پر اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔ (ص ۲۸۵)

”حیوانی جبلت“ سے ملتا جلتا، نسل کا عقیدہ ہے جس کی رُوس مغرب کے ماہرین علم الحیات (ANTHROPOLOGISTS) نے کہا۔ کہ انسانی بچہ کے ذہنی نقوش، معتقدات و تصورات وغیرہ انفرادی نہیں، بلکہ نسلی (RACIAL) ہوتے ہیں۔ ہر فرد کسی نہ کسی نسل سے متعلق ہوتا ہے۔ نسلی معتقدات و تصورات درائنات آگے منتقل ہوتے رہتے ہیں اور انہی کے مجموعہ اثرات کا نام ایک فرد کے ذاتی خصائص و رجحانات ہوتے ہیں۔ نسلی امتیازات کا نظریہ بڑی تباہیوں کا موجب بنا کیونکہ اس سے انسانیت ایسے ٹکڑوں میں بٹ گئی جن کا متحد کرنا ناممکنات میں سے سمجھا گیا۔ غنیمت ہے کہ اب خدا خدا کر کے اس باطل نظریہ کی بھی تردید ہو چکی ہے۔ (مثلاً) پروفیسر (L. HOG BEN) اس باب میں رقمطراز ہے کہ:-

تیس سال کے گہرے تجربہ نے اس امر کا بین ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر مخلوط نسل کے انسانوں کے اندر اس قسم کے افراد پیدا ہو جاتے ہیں جن کے خصائص اپنے آباؤ اجداد سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

(THE NATURE OF LIVING MATTER)

”نسلیت“ سے ملتا جلتا عقیدہ ”وراثت (HEREDITY) کا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی بچہ کو اس کے ماں باپ کے معتقدات و تصورات بھی پیدا کنشی طور پر ملتے ہیں۔ اس عقیدہ کا مشہور مؤید، پروفیسر (N.S. JENNINGS) انسانی بچہ کی پیدائش کے مختلف مراحل پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے کہ رحم مادر میں جنین کی تشکیل قریب ایک ہزار موالید (GENES) سے ہوتی ہے۔

اور یہ معلوم ہے کہ ان ہزار موالید میں سے ہر ایک اپنی اپنی مستقل حیثیت رکھتا ہے اور الگ الگ فریضہ۔ چنانچہ اگر ان میں سے ایک بھی تلف یا تبدیل ہو جائے تو جنین کی شکل و صورت میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے اور خود اس انسان میں بھی، جس کی ابتداء اس جنین سے ہو رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تبدیلی اس کی آنکھوں کی رنگت، ناک کی شکل یا قد و قامت پر اثر انداز ہو، اور اس کے ساتھ ہی اس کے

مزاج اور افتادِ طبیعت پر بھی۔ مزاج، ذہنیت، افتادِ طبیعت، شخصیت وغیرہ کا انحصار

مختلف طریقوں سے ان موالید پر ہے جن سے انسانی بچہ متشکل ہوتا ہے۔ ۱۷

لیکن اب اس نظریہ کی بھی تردید ہوتی جا رہی ہے اور کہا یہ جا رہا ہے کہ جو کچھ ہمیں وراثتاً ملتا ہے، اُسے ماحول سے بدلا جاسکتا ہے، اور ماحول کو ہم اپنے کنٹرول میں رکھ سکتے ہیں۔ ۱۸

یہاں سے انسانی فکر کا رخ، نظریہ وراثت سے نظریہ ماحول کی طرف مڑ گیا۔ اس نظریہ کی سب سے مشہور شاخ، نظریہ عادات (BEHAVIOURISM) ہے، جسے ڈاکٹر واٹسن نے پیش کیا تھا۔ اس نے یہ کہا کہ انسانی بچہ پیدائشی طور پر اپنے اندر کوئی خصوصیات یا تصورات لے کر نہیں آتا۔ اس میں، جس قسم کی عادات پیدا کر دی جائیں، وہی اس کے مختلف اعمال کی محرک بن جاتی ہیں، اور یہ عادات انٹس ہوتی ہیں۔ اسی کی دوسری شاخ نظریہ عمرانیت (SOCIOLOGY) ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی بچہ جس قسم کی سوسائٹی میں آنکھ کھولتا اور پرورش پاتا ہے، وہ ویسا ہی بن جاتا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اٹھارہ ماہ کی عمر سے لے کر تین سال یا زیادہ سے زیادہ پانچ سال کی عمر تک، انسان نے جو کچھ بننا ہوتا ہے، وہ بن چکتا ہے۔ اور بچپن کے ان نقوش کا مٹانا کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس نظریہ نے ہمارے دور میں بڑی اہمیت اختیار کر لی، لیکن مزید تحقیق نے اسے بھی باطل قرار دیدیا۔ اس تحقیق کی رو سے یہ تو تسلیم کیا جاتا ہے کہ بچہ پر ماحول کا اثر بڑا گہرا ہوتا ہے لیکن اسے تسلیم نہیں کیا جاتا کہ اس کے یہ نقوش ایسے انٹس اور محکم ہوتے ہیں کہ انہیں بعد میں بدلا ہی نہیں جاسکتا۔ اس باب میں مشہور محقق (B.F. SKINNER) نے بڑی وسیع تحقیق کی ہے جس کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ بچپن کے بعد اگر مثبت محرکات محکم طور پر پیدا کر دیے جائیں تو ان سے ابتدائی ماحول کا تمام اثر زائل کیا جاسکتا ہے۔ (ERICH FROMM) اگرچہ پروفیسر (SKINNER) کے بعض نتائج سے اختلاف کرتا ہے لیکن وہ اس باب میں اس سے متفق ہے کہ ماحول کے یہ اثرات مٹائے جاسکتے ہیں اور اس کا طریقہ انسان کے اندر کیریکٹر پیدا کرنا ہے۔ ۱۹

۱۷ ملاحظہ ہو پروفیسر مذکور کی کتاب (THE BIOLOGICAL BASIS OF HUMAN KNOWLEDGE) ان امور کی تفصیل کیلئے دیکھئے میری کتاب ————— انسان نے کیا سوچا ————— کا باب ”میکانیکی تصور حیات“۔

۱۸ دیکھئے (V.H. MOTTRAM) کی مشہور کتاب (THE PHYSICAL BASIS OF PERSONALITY)

۱۹ آپ نے غور فرمایا کہ محققین مغرب کی تحقیق کے نتائج کس طرح، خود بخود قرآنی دعادی کی دلیل اور ثبوت بنتے چلے جا رہے ہیں، یعنی نفسِ اذن میں آیاتِ خداوندی کی نقاب کشائی کس طرح حقائق کو سامنے لاتی چلی جا رہی ہے (۲۰)۔

آپ نے غور فرمایا کہ نظریہ جلت، نسلیت، وراثت، عادات، عمرانیت کے واضعین، کس طرح غیر شعوری طور پر عیسائیت کے وضع کردہ نظریہ جبریت سے متاثر ہو گئے اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ انسان اپنے معتقدات اور اعمال کے لئے آزاد نہیں ہونا بلکہ وہ مجبور ہے۔ لیکن خود مغرب ہی کے محققین اب اس نظریہ پر پہنچے ہیں کہ جبریت کا عقیدہ اور نظریہ باطل و ناقابل تسلیم ہے۔ اور یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے آج سے چودہ سو سال پہلے نہایت واضح الفاظ میں پیش کر دیا تھا۔ اس نے انسان کے متعلق جو کہا کہ اسے اختیار و ارادہ یا انتخاب کی صلاحیت دی گئی ہے تو اس ایک نکتہ نے ان تمام باطل تصورات کو جڑ سے اکھڑ کر رکھ دیا۔ مجبور کے سامنے ایک ہی امکان (POSSIBILITY) ہوتی ہے، ایک سے زیادہ نہیں۔ بکری کے سامنے ایک ہی امکان ہے کہ وہ گھاس کھائے، گوشت نہ کھائے۔ اس کے لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ ان دونوں (گھاس یا گوشت) میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لے۔ صاحب ارادہ اُسے کہا جاتا ہے جس کے سامنے دو امکانات (POSSIBILITIES) موجود ہوں اور اسے اس کا اختیار حاصل ہو کہ وہ ان میں سے جس امکان کو چاہے، اختیار کر لے۔ اس بنیادی تصور سے لازمی طور پر یہ نتائج سامنے آتے ہیں کہ (۱) پیدائشی طور پر انسان کوئی ایسا نقص لے کر نہیں آتا جو امٹ ہو۔ ہر انسانی بچہ ایک سفید لوح لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اور (۲) دنیا میں خیر و شر، غلط اور صحیح، تخریب و تعمیر کے امکانات ہر دور اپنے پر موجود ہوتے ہیں اور یہ انسان کے اپنے فیصلے پر موقوف ہے کہ وہ ان میں سے جسے چاہے، اختیار کر لے۔ سوال یہ ہے کہ انسان کے سامنے ان دو امکانات، اور ان میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے سے مراد کیا ہے؟ جیسا کہ واضح ہے، انسان کا جسم، حیوانات کی طرح، طبیعی قوانین کے تابع زندہ رہتا ہے، لہذا اس کے جسمانی یا طبیعی تقاضے وہی ہیں جو دیگر حیوانات کے ہیں۔ انہیں جبلت یا (ANIMAL INSTINCTS) کہا جاتا ہے۔ لیکن انسان صرف حیوان ہی نہیں وہ انسان بھی ہے۔ اور اس اعتبار سے اس کے انسانی تقاضے بھی ہیں۔ یہ بات محض عقیدہ کی سطح پر نہیں کہتے، عصر حاضر کے غیر مسلم محققین بھی اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ مثلاً (ERICH FROMM) اس باب میں لکھتا ہے:-

انسان کے طبیعی تقاضے اور محرکات ضروری ہیں، لیکن وہ مقابلہ کم اہمیت رکھتے ہیں انسان کے وہ جذبات، جو اس کی توانائیوں کو اس کے نصب العین کی تلاش کے لئے مجتمع کر دیتے ہیں، زیادہ اہم ہیں انہیں ہم عقیدت (DEVOTIONAL) یا مقدس (SACRED) کے نام سے پکار سکتے ہیں۔

لہٰذا یہ مفکر خدا اور وحی کا قائل نہیں۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ وہ، انسان کے انسانی (حیوانات سے بلند) تقاضوں کے لئے کس طرح اپنے آپ کو ان اصطلاحات کے اختیار کرنے پر مجبور پاتا ہے، جن کا تعلق وحی کی دنیا ہے، ان کے لئے اور الفاظ دل ہی نہیں سکتے۔

زندگی کے طبیعی تقاضے تو انسان کو صرف زندہ رکھتے ہیں۔ اس کے وہ جذبات جو عقیدت یا تقدیر کے دائرے میں آتے ہیں، ان کا میدان اس کی طبیعی زندگی سے بہت آگے ہے۔ یہ وہ میدان ہے جس میں انسان اپنی زندگی، بلکہ اپنی قسمت تک کو متربان کر دیتا ہے۔ یہی وہ زمین ہے جس میں اس کے وہ محرکات پیوست ہوتے ہیں، جو اس کی زندگی کو درحقیقت زندہ رہنے کے قابل بنادیتے ہیں (صفحہ ۲۹۸)۔

اس سے ذرا پہلے وہ لکھتا ہے کہ ”یاد رکھیے کہ انسان میں کوئی بات بھی ایسی نہیں جس کی تبدیلی ناممکن ہو، اور نہ ہی حقیقت ہے کہ انسان خارجی اثرات سے محفوظ رہ ہی نہیں سکتا۔ ہمیں بد سے بدتر سوسائٹی میں بھی ایسے افراد ملتے ہیں جو اپنے آپ کو ان اثرات سے ملوث نہیں ہونے دیتے۔ اور وہ بھی جن سے مناسب تعلیم و تربیت سے، یہ اثرات زائل ہو ہو جاتے ہیں“ (صفحہ ۲۹۷ فٹ نوٹ)۔ وہ اپنی دوسری کتاب (MAN FOR HIMSELF) میں لکھتا ہے کہ :-

مریض انسانوں میں صحت یاب ہونے کی آرزو اس امر کی دلیل ہے کہ انسان مرض پر مطمئن نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنی بد اندیشی، تساہل، تغافل یا جہالت کی بنا پر مرض میں مبتلا ضرور ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اُسے کہیں شفا کی کرن نظر آتی ہو تو وہ اس کی طرف پلک کر جاتا ہے۔ ہم جو تجربہ نفس (PSYCHO ANALYSIS) کی رو سے نفسیاتی امراض کا علاج کرتے ہیں تو اس میں کرتے صرف اتنا ہی ہیں کہ پہلے ان اثرات کا کھوج لگاتے ہیں جو اس کے تحت الشعور میں جائز ہیں اور جنہیں اس کا شعور فراموش کر چکا ہو۔ اس کے بعد ہم اس کے ان محرکات کو تقویت دیتے ہیں جنہوں نے اسے اپنے علاج یا شفا یاب ہونے کی ضرورت یاد دلائی تھی اور اس کے لئے اُسے آمادہ کیا تھا۔ اگر انسان کے اندر یہ جذبہ موجود نہ ہو — یا مرجھا ہو — تو ہم اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ اسے بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تنہا عقل انسانی اس مقصد کے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔ عقل انسانی مرض او

سلہ علم تجربہ نفس کی رو سے، انسان کے وہ احساسات جن کا وہ اظہار تو نہ کرے لیکن ان کی یاد اس کے حافظہ میں موجود ہو، (SUPPRESSED FEELINGS) کہلاتے ہیں۔ لیکن جب ان کی یاد بھی محو ہو جائے تو وہ اس کے تحت الشعور میں جا گزیں ہو جاتے ہیں۔ انہیں (REPRESSED FEELINGS) کہا جاتا ہے۔

اور صحت کو پہچان تو سکتی ہے، انسان کے ان محرکاتِ خیر کو بیدار نہیں کر سکتی جو شر کے پیدا کردہ اثرات کا ازالہ کر سکیں (ص ۲۲۳-۲۲۴)۔

اس مفکر کے یہ آخری الفاظ خاص اہمیت کے حامل ہیں جن سے وحی کی ضرورت پر بڑی گہری روشنی پڑتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ نکتہ سبردست ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لئے ہم فی الحال اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ اس کا مقام آگے چل کر آئے گا۔ یہ مفکر، اس علاج کے لئے ایک ایسے معاشرے کا وجود اور قیام لاینفک سمجھتا ہے جس میں وہ اقدار و نظریات زندہ اور بیدار ہوں جو انسان کے ان محرکات کو تقویت دے سکیں جو شر کے پیدا کردہ اثرات کو مٹا دیں (ANATOMY ص ۲۳)۔ وہ دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ:-

انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی پوری نشوونما اور برومندی حاصل کرے بشرطیکہ جس معاشرہ میں وہ رہتا ہے اس کے حالات اس کیلئے عمدہ معاون ہوں۔ (ANATOMY ص ۲۹۱)

اس وقت مختلف اقوام اور ممالک ہیں، جس قسم کے معاشرتی حالات کارفرما ہیں، ان کے پیش نظر وہ اس قسم کی تبدیلی کو بڑا دشوار قرار دیتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اسے ناممکن نہیں کہتا۔ وہ انسان کے مستقبل سے ناامید نہیں۔ وہ کہتا ہے:-

ایسا تصور کرنا بالکل جائز ہوگا کہ انسان اپنی نشوونما کے مکانی دائرہ کو مکمل کر لے گا اور ایسا معاشرہ متشکل ہو جائے گا جس میں کوئی انسان کسی دوسرے سے خائف نہ ہوگا۔ بلکہ نہ کوئی بچہ اپنے ماں باپ سے خائف ہو اور نہ کوئی ماں باپ اپنے بالادستوں سے نہ کوئی طبقہ دوسرے طبقہ سے خائف ہو، نہ کوئی قوم اپنے سے زیادہ زور آور قوم سے خائف۔ اس مقصد کا حصول بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ موجودہ معاشی، سیاسی، ثقافتی اور نفسیاتی عوامل اس کے راستہ میں بہت بڑی رکاوٹیں بن کر کھڑے ہیں۔ علاوہ ازیں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ دنیا کی قومیں مختلف قسم کے باطل خداؤں کی پرستش کر رہی ہیں اور چونکہ ہر قوم کا خدا الگ ہے اس لئے وہ ایک دوسرے کو سمجھنے سے بھی قاصر ہیں اگرچہ ایک دوسرے کی زبان ضرور سمجھتے ہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن اس سے ہمیں مایوس نہیں ہونا

لہ قرآن کریم نے اس مثالی معاشرہ کی خصوصیت یہی بتائی ہے ناکہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (پہ)۔ اس میں کسی کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ تفصیل اس اجمال کی اپنے مقام پر آئے گی۔

چاہئے۔ انسان کے اندر ایسی صلاحیتیں موجود ہیں، جو ان تمام موانعت پر قابو پا سکتی ہیں (۲۸۵-۲۸۶)۔

اور یہاں سے ہم اس گوشے کی طرف آتے ہیں جسے قرآن کریم نے "ابلیس یا شیطان" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے جو ہمارے اس موضوع کا سرنامہ ہے۔ لفظ ابلیس کا مادہ (ب ل س) ہے جس کے معنی مایوسی اور ناامیدی کے ہیں، اور لفظ شیطان کا مادہ (ش ط ن) جس کے معنی دور چلے جانے کے ہیں۔ یعنی حدود فراموشی۔ یہ لفظ سرکشی، مخالفت اور بیباکی کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ نیز اس کے معنی جل جانے اور بھڑک اٹھنے کے بھی ہیں۔ اسی شعلہ مزاجی کی وجہ سے کہا گیا ہے کہ شیطان کی تخلیق آگ سے ہوئی (۱۵)۔ (شیطان اور ابلیس) جو کچھ بھی اس سے فی الحقیقت مفہوم ہے) کے لئے یہ دو الفاظ کیوں آئے ہیں، اس کی تشریح آگے چل کر سامنے آئے گی)۔

"مذہب" نے شیطان کو انسان سے الگ، ایک جداگانہ اور خارجی ہستی قرار دیا جو انسان کو برائی پر اکساتا ہے عیسائیت نے اس تصور کو بڑی شد و مد سے پھیلایا۔ اس لئے کہ یہ اس کے پیش کردہ عقیدہ جبریت کی تائید کرتا تھا۔ اور عام لوگوں نے اسے قبول کر لیا کہ اس سے وہ اپنے آپ کو اس خود فریبی میں مبتلا رکھ سکتے تھے کہ گناہ یا جرم کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی۔ اس کا ذمہ دار شیطان ہے۔ قرآن کریم نے اس باطل عقیدہ کی تردید کی اور ابلیس یا شیطان کا ایسا تصور پیش کیا جس کی تائید علمی تحقیق سے ہوتی جا رہی ہے۔ قرآن نے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ بتایا اور اس کی وضاحت کی کہ جب یہ اپنے ارادہ کو غلط طور پر استعمال کرتا ہے تو اسے اس کا شیطانی فعل قرار دیا جاتا ہے اور جب یہ اسے صحیح طور پر استعمال کرتا ہے تو یہ اس کے ثمرات انسانیّت کی دلیل ہوتا ہے۔ یعنی اس نے شیطنت کو خود انسان کا اپنا فعل قرار دیا۔ اور اس کے لئے خود اسی کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ مثلاً سورۃ الاعراف میں ہے کہ فَوَسْوَسَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ (۱۶)۔ یعنی "شیطان نے انہیں بہکا یا" اور دوسری جگہ کہا کہ "ہم نے انسان کو پیدا کیا۔" وَ نَعَلَّمَ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ (۱۷)۔ "اور ہم جانتے ہیں کہ اس کا نفس اسے کس طرح بہکا تا ہے" آپ دیکھئے کہ یہاں بہکانے کے فعل کو ایک جگہ شیطان کی طرف منسوب کیا ہے اور دوسری جگہ اسے خود انسان کا اپنا فعل

۱۔ محسوسیت ایک قدم آگے بڑھی اور اس نے خیر اور شر کے لئے دو الگ الگ خدا تراش لئے۔ خیر کا خدا یزدداں، اور شر کا خدا اہرن۔ ان دونوں میں ابدی طور پر کشمکش جاری ہے۔ اس عقیدہ کو ثنویت (DUALISM) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

قرار دیا ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، انسان کو کچھ جذبات دیئے گئے ہیں جن کے تقاضوں کے پورا کرنے سے اس کی زندگی برقرار رہتی ہے۔ لہذا ان جذبات کی تسکین خود انسانی زندگی کا تقاضا ہے۔ مادی تصویر حیات کی رو سے ان تقاضوں کو (حیوانات کی طرح) جس طرح جی چاہے پورا کیا جاسکتا ہے۔ لیکن قرآنی تصویر حیات کی رو سے یہ ضروری ہے کہ ان تقاضوں کو ان پابندیوں کے دائرے کے اندر رہ کر پورا کیا جائے جنہیں مستقل اقدار خداوندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً افزائش نسل کے لئے جنسی جذبات کی تسکین ضروری ہے۔ ایک شخص ان کی تسکین اپنی بیوی کے ساتھ اختلاط سے کرتا ہے، دوسرا ان کی تسکین کسی پاک دامن، شریف النفس شخص کی عصمت درمی کے ذریعہ۔ جذبات کی تسکین دونوں صورتوں میں ہو جاتی ہے۔ لیکن ایک طریق اپنے اندر خیر کا پہلو لئے ہوئے ہے اور دوسرا طریق شر کا۔ قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ اپنے جذبات کو سرکش اور بیباک نہ رکھو۔ بلکہ ان کی تسکین اقدار خداوندی کی راہنمائی میں کرو۔ چنانچہ اس نے کہا ہے کہ: **أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ** (۲۴)۔ ”کیا تو نے اُس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا الہ بنا لیا۔ (اللہ کے معنی ہوتے ہیں وہ قوت جس کے زیرِ اقتدار زندگی بسر کی جائے۔ اور دوسری جگہ کہا کہ: **وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ** (۲۵)۔ ”اس سے زیادہ راہ گم کردہ کون ہو سکتا ہے جس نے اپنے جذبات کی تسکین، ہدایت خداوندی سے الگ ہٹ کر کی؟“ یعنی قرآن کریم کی رو سے جذبات کی تسکین کوئی برا فعل نہیں۔ ہدایت خداوندی سے سرکشی برت کر ان کا پورا کرنا شر، جرم یا گناہ ہے۔ اسے اس نے شیطانی فعل کہہ کر پکارا ہے اور تاکید کیا ہے کہ **لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ**..... **أَعْبُدُونِي** (۲۶)۔ ”شیطان کی عبادت (محکومیت) مت اختیار کرو، خدا کی معبودیت اختیار کرو“

ان مقامات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قرآن کی رو سے شیطان یا ابلیس کوئی موجود فی الخارج ہستی یا شخصیت نہیں یہ خود انسان کے اپنے ہی فیصلوں کا نام ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے، جہاں کہا ہے کہ

جہاں تا از عدم بیرون کشیدند : ضمیرش سرود بے ہنگام دیدند

بغیر از جان ما سونے کج بود : ترا از آتش ما آفریدند

یہی وجہ ہے کہ (جیسا کہ ہم آگے چل کر قصہ آدم میں دیکھیں گے) انسان اور شیطان بیک وقت زندگی کی اسٹیج پر سامنے آتے ہیں اور شیطان کو انسان کے آخری لمحات زندگی تک ہدایت دیدی گئی ہے۔ گویا انسان اور شیطان کا چولی دامن کا ساتھ

ہے ملاحظہ ہوں آیات ۳۴ ذ ۱۵ ذ ۱۶ ذ ۳۹ — تفصیل آدم کے عنوان میں ملے گی۔

شیطان، چونکہ انسانی ارادوں یا جذبات ہی کا دوسرا نام ہے جو محسوس طور پر نظر نہیں آسکتے، اس لئے شیطان کے متعلق کہا کہ: **إِنَّهُ يَرْتَابُ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ** (۳۴)۔ ”وہ اور اس کے ہم قبیلہ تمہیں ایسے مقامات سے دیکھتے ہیں جہاں تم نہیں نہیں دیکھ سکتے“ اور اسی جہت سے دوسری جگہ کہا: **كَانَ مِنَ الْإِجْرِ** (۱۵)۔ ”وہ ان قوتوں میں سے ہے جو نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہیں“ چونکہ انسانی ارادے اور ان کے فیصلے کثیر التعداد ہوتے ہیں اور مختلف قسم کے پیکروں میں ان کی نمود ہوتی ہے، اس لئے یہاں، جنہیں شیطان کے ہم قبیلہ کہا ہے، دیگر مقامات پر انہیں ”جنود ابلیس“، ابلیس کا لاؤ لشکر یعنی ابلیس کے متبعین کہہ کر پکارا گیا ہے (دیکھئے ۴ ذ ۱۵ ذ ۲۶ ذ ۳۸)۔ چونکہ ہر انسان کا اپنا اپنا شیطان ہوتا ہے اس لئے جب مختلف انسانوں کے شرانگیز اعمال اور تخریب کاریوں کا ذکر کیا گیا تو اسے **شَيْطَانِ الرَّئِيسِ وَالْجِنِّ** (۱۶) کہہ کر پکارا گیا۔ کہیں انہیں **إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ** (۱۷) سے تعبیر کیا گیا۔ اور مجموعی طور پر انہیں **حِزْبَ الشَّيْطَانِ** (۵۹) یعنی شیطان کی پارٹی قرار دیا گیا، جس کے مقابلہ میں **حِزْبُ اللَّهِ** آیا ہے (۶۴) جس سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنے جذبات کی تسکین قوانین خداوندی کی حدود میں رہتے ہوئے کرتے ہیں۔

حِزْبُ الشَّيْطَانِ، یعنی شیطانی پارٹی کے سرغنوں کو بھی شیاطین کہا گیا ہے (دیکھئے ۲۱)۔ حتیٰ کہ ان سرکش قبائل کو بھی، جنہیں حضرت سلیمانؑ نے اپنے احکام کی زنجیروں کا پابند کر کے انہیں بڑے بڑے کاموں پر لگایا تھا (۲۱)۔ یعنی اگر انہیں پابندوں سے آزاد کر دیا جاتا تو وہ قہر کم کی سرکشی اور بغاوت پر اتر آتے۔

حِزْبُ الشَّيْطَانِ میں وہ اقوام غالب بھی شامل ہیں جو خود بھی اقتدار خداوندی سے سرکشی برتنی ہیں اور اپنی مغلوب اقوام کو بھی انہی غلط راہوں پر چلاتی رہتی ہیں۔ اس کے لئے وہ کس قسم کے حربے استعمال کرتی ہیں، انہیں قرآن کریم نے **رَقَصَ ابْلِيسُ** آدمؑ میں بڑے لطیف اور دلکش انداز سے بیان کیا ہے۔ وہاں کہا گیا ہے کہ ابلیس نے خدا سے کہا کہ تو اس آدمؑ (آدمی) کو دنیا میں بھیج۔ اور پھر دیکھ کہ میں اسے کس طرح گمگی کا ناچ بجاتا ہوں۔ اس کے لئے وہ جو طریق اور ذرائع استعمال کرے گا ان کے متعلق کہا گیا: **وَأَسْتَفْزِزُ بَصَوْنِكَ. وَأَجْلِبُ عَلَيْهِمْ بِخِيلِكَ وَرَجِلِكَ. وَشَارِكُهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدَّهُمْ** (۱۶)۔ ”کہیں اس پر اپنی گنڈہ کے ذریعے، جسے آلات ابلاغ کی مدد سے عام کیا جائیگا (مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ) کہیں ان کے خلاف ”پولیس ایکشن“ کیا جائے گا اور قوت کے بل بوتے پر انہیں اپنی مرضی کے مطابق چلایا جائے گا۔ کہیں اقتدار، مدد سے انہیں سیاسی حکومت کے شکنجوں میں جکڑا جائے گا۔ اور کہیں ان کی اولاد کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے گی کہ وہ انہی سرکش جذبات کو لئے ہوئے پروان چڑھے۔ کہیں انہیں دلکش وعدوں سے بہلایا جائے گا۔ یہیں اقوام غالب کے وہ حربے جنہیں ابلیسی ہتھکنڈوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔

انسان کی اپنی بیباک خواہشات نفس ہوں یا اقوام غالب کے اس قسم کے حربے، ان کی بنیادی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ انسان کے غلط اعمال کو نہایت دلکاش، جاذب اور مزین بنا کر دکھاتے ہیں (ملاحظہ ہوں آیات ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹)۔ اگر برائی برائی بن کر سامنے آئے تو انسان اس سے دھوکا نہیں کھاتا۔ اگر جھوٹ بولنے والا اپنے جھوٹ سے فریق مقابل کو اپنا ہمنوا بنا لے اور اُسے اپنی مقصد براری کا آلہ کار بننے کے لئے آمادہ بھی کرے، لیکن آخر میں کہدے کہ میں نے تم سے جو کچھ کہا ہے، وہ سب جھوٹ ہے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ کبھی اس کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ وہ اس کے لئے اسی صورت میں تیار ہوگا کہ اُسے یقین پر یقین دلاتا چلا جائے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، بالکل سچ ہے۔ ابلیسی دسادس کی سب سے بڑی صنعت گری یہ ہوتی ہے کہ وہ جھوٹ کو سچ بنا کر دکھائے۔ انسان کے برے اعمال کے متعلق اُسے یقین دلا دے کہ وہ نیکیاں عمل ہیں، ان میں کسی قسم کی برائی کی بات نہیں۔ ابلیس کا یہ حربہ بڑا کامیاب ہوتا ہے۔ یوں تو اس کی جولا نگاہ انسان کی زندگی کا ہر گوشہ ہے، لیکن جہاں یہ سب سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ وہ ”مذہب“ کی دنیا ہے۔ ”مذہب“ میں انسان، سینکڑوں ہزار ایسے کام کرتا ہے جو یا تو تخریب انگیز ہوتے ہیں یا بلا نتیجہ رہ جاتے ہیں۔

غلط اعمال کو مزین کر کے دکھانا

لیکن ابلیس ان لوگوں کو اس فریب میں مبتلا رکھتا ہے کہ یہ بڑے ”ثواب“ کے کام ہیں۔ ان سے احکام خداوندی کی تعمیل ہوتی ہے اور منشاء خداوندی کی تکمیل۔ ان سے تمہیں جنت مل جائے گی۔ اس اجمال کی تفصیل کے لئے ایک الگ کتاب کی نہیں، تو کم از کم الگ باب کی ضرورت ہے (اور اسے ہم اس کے مقام پر پیش بھی کریں گے، لیکن یہاں ہم اس کی ایک آدھ مثال پر اکتفا کرتے ہیں سورہ کہف میں ہے کہ آؤ! ہم تمہیں بتائیں کہ وہ لوگ کون ہیں جو کہ اعمال انہیں سب سے زیادہ نقصان میں رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غلط کام کرتے ہیں وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا (۱۸)۔ لیکن سمجھتے ہیں کہ ہم بڑی نیکیاں کر رہے ہیں۔ لیکن نیکیاں مصنوعی ہوتی ہیں، حقیقی نہیں ہوتیں۔ ”نتیجہ اس کا یہ کہ فَحِطْلَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَزْنًا (۲۵)۔“ ان کے اعمال بالکل رائیگاں جاتے ہیں۔ ایسے رائیگاں کہ ظہور نتائج کے وقت ان کے تولنے کے لئے میزان تک کھڑی کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ غور کیجئے یہاں ان لوگوں کا ذکر نہیں، جنہوں نے کوئی کام نہیں کیا، جو بے عمل تھے۔ ذکر ان لوگوں کا ہے جنہوں نے بہت سے کام کئے۔ بڑی جگر پاش مشقتیں اٹھائیں، جانکا صعوبات برداشت کیں، یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ بڑے ثواب کے کام ہیں۔ لیکن چونکہ وہ فریب میں مبتلا تھے اس لئے ان کی ساری مشقتیں اور محنتیں رائیگاں گئیں۔ یہ ایسی ملمع شدہ نیکیاں تھیں کہ جب انہیں حقیقت کا ایک تاؤ دو یا گیا تو ان کا اصلی کھوٹ ابھر کر سامنے آگیا۔ اس قسم کی مصنوعی نیکیوں کی ایک محسوس مثال بھی قرآن کریم نے دی ہے۔ اس نے الصلوٰۃ کے متعلق کہا ہے کہ: إِنَّ الصَّلَاةَ تَنَهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكُورُ اللَّهِ أَكْبَرُ (۲۹)۔ ”الصلوٰۃ“

مصنوعی صلوٰۃ

کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان اور معاشرہ ہر قسم کی بے حیائیوں اور بدکرداریوں سے پاک اور صاف ہو جائے گا اور قانونِ خداوندی تمام انسان ساز قوانین پر غالب آجائے گا۔ اگر الصلوٰۃ کا یہ نتیجہ سامنے آتا ہے تو وہ حقیقی صلوٰۃ اور سچی نیکی ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہوتا تو انسان ہزار نمازیں پڑھتا ہے، اس کا یہ عمل مبنی بر حقیقت قرار نہیں دیا جائے گا۔ اس کے لئے قرآن نے کہا ہے: **وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ** (۲۶)۔ جس قسم کی تم مصنوعی نماز پڑھتے ہو اور اللہ کا ذکر کرتے ہو اس سے ہم خوب واقف ہیں۔ یہ سب اعمال بے نتیجہ ہیں۔ تمہاری صنعت گری ہے۔ میزانِ خداوندی میں ان کا پرکھ جتنا بھی وزن نہیں، اسی قسم کے نمازیوں کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ **اَسْرَعَيْتَ الَّذِي يَكْنِزُ بِالْاَدْنٰى** (۲۷)۔ تو نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جو دین کی تکذیب کرتے ہیں؟ یعنی یہ لوگ دین کے منکر نہیں۔ کافراور غیر مسلم نہیں۔ یہ دین کا زبان سے اقرار کرتے ہیں۔ اس کے ارکان کی بھی پابندی کرتے ہیں۔ لیکن محض رسمی۔ یہ نماز بھی پڑھتے ہیں لیکن **لِلْمُصَلِّينَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ** (۲۸)۔ **الَّذِيْنَ هُمْ يُسْرِعُوْنَ وَ يَمْنَعُوْنَ** (۲۹)۔ (یعنی) یہ تباہی ہے ایسے نمازیوں کے لئے جو نماز کے محسوس و مرنی ارکان کو (جو دوسروں کو نظر آ جاتے ہیں) تو بڑے حزم و احتیاط سے ادا کرتے ہیں لیکن صلوٰۃ کے مقصد اور غایت سے بے خبر رہتے ہیں۔ نماز کی اس شدت کے ساتھ پابندی بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ رزق کے ان سرشتیوں پر، جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ضرورت مند کیلئے یکساں طوفان کھلا اور رواں دواں رہنا چاہئے، بند باندھ دیتے ہیں کہ وہ انہی کے تصرف اور ملکیت میں رہیں اور دوسرے ضرورت مند ان سے مستفید نہ ہو سکیں۔ یہ ہے وہ صلوٰۃ، جسے **مَا تَصْنَعُونَ** (مصنوعی) کہہ کر تباہی کا موجب قرار دیا گیا ہے۔

ضمناً آج کل یہ بحث عام ہو رہی ہے کہ ”قرآنی نماز“ کون سی ہے اور اس کے لئے کہا یہ جا رہا ہے کہ قرآن کریم میں اتنے وقتوں کی نماز کا حکم ہے۔ ہر نماز میں اتنی رکعتیں اور ہر رکعت میں اتنے سجدے۔ اس نماز کو قرآنی صلوٰۃ کہا جاتا ہے اور جو نمازیں دوسرے مسلمان پڑھتے ہیں وہ غیر قرآنی صلوٰۃ۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ صلوٰۃ کا جو نتیجہ قرآن کریم نے بتایا ہے وہ نہ اس نماز سے حاصل ہوتا ہے نہ اس نماز سے۔ قرآنی صلوٰۃ وہ ہے جس سے معاشرے بے حیائی اور بدکرداری ختم ہو جائے اور قانونِ خداوندی کی بالادستی قائم ہو۔ جس صلوٰۃ سے یہ نتیجہ مرتب نہ ہو وہ قرآنی صلوٰۃ نہیں کہلا سکتی۔ قرآن کی رو سے **مَا تَصْنَعُونَ** کے ذیل میں آتی ہے۔ قرآن کریم نے اس عظیم حقیقت کو ان بصیرت افروز اور عبرت آموز الفاظ میں نمایاں

کیا ہے کہ: لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوْتُوا دُجُوْهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔ وَلَكِنَّ الْبِرَّ... (۲:۱۷۷)۔ نیکی (اور کشادگی راہ) یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ بر و تقویٰ کی راہ یہ ہے کہ تم ایمان کے بعد کس ایثار اور حسن کردار کا مظاہر کرتے ہو۔ جو ایسا کرتے ہیں وہ اپنے دعویٰ ایمان کو سچ کر دکھاتے ہیں، الہی کو مستفی کہا جائے گا۔ قرآن کریم نے اسی مقام پر رسمیات (FORMALISM) اور غرض و غایت کے فرق کو نمایاں کر کے بتا دیا ہے۔ مقصد، احکام خداوندی کی غرض و غایت کو پورا کرنا ہے جس کی پرکھ ان نتائج سے ہوتی ہے جن کی خود قرآن نے وضاحت کر دی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دین کے عملی نظام میں احکام کے ارکان اور محسوس مظاہر بھی اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ چیزیں دین کی غایت اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں، مقصود بالذات نہیں۔ لیکن ”مذہب“ میں یہی مظاہر، مقصد بن جاتے ہیں۔ اور مقصد نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ احکام کی غایت اور ان کی محض رسمی ادائیگی کا یہی وہ فرق ہے جسے اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:-

یا وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل : یا خاک کے آغوش تسبیح و مناجات

وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خداست : یہ مذہب ملا و نباتات و جمادات

یہ ہیں وہ بے نتیجہ اعمال۔ جنہیں شیطان مزین بنا کر دکھاتا رہتا ہے — علامہ اقبالؒ نے ابلیس کے اس حربے کو اس نظم میں بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے جس کا عنوان ہے — ابلیس کی مجلس شوریٰ — اور جو ان کے آخری مجموعہ کلام — ارمغانِ حجاز — کے حصہ آرد وہیں شامل ہے۔ اس میں بات یوں چلی آ رہی ہے کہ ابلیس کے مشیر اس سے کہتے ہیں کہ ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ زمانے کے تقاضوں سے یہ امت مسلمہ بیدار ہوتی جا رہی ہے اور ہمیں ڈر یہ ہے کہ کہیں پھر سے نظام خداوندی کو قائم نہ کر دے جس سے ہمارا خاتمہ ہو جائے۔ ابلیس اُن سے کہتا ہے کہ تمہارا یہ احساس بالکل بجا ہے لیکن میں تمہیں ایک ایسا گڑ بتانا ہوں جس سے یہ امت کبھی بیدار نہیں ہوگی۔ وہ گڑ یہ ہے کہ ان کے غلط اور مصنوعی اعمال کو ان کی نگاہوں میں ایسا حقیقی بنا کر دکھاؤ کہ یہ اس منسوب میں گم رہیں اور ان نظریات و رسوم میں درمتشدد ہوتے چلے جائیں۔ تم انہیں ان مسائل میں الجھائے رکھو کہ:-

ابن مریم مرگیا یا زندہ جاوید ہے : ہیں صفات ذات حق، حتیٰ سے جُدا یا عین ذات

آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے : یا محمدؐ، جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات

ان نظری مسائل میں الجھا کر:

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے : تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہر ہوں مات

اور اس کا عملی طریق یہ ہے کہ :

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہ ہی میں اسے : پختہ ترکہ و مزاج خانقاہی میں اسے

آپ امت مسلمہ کے احوال و کوائف پر غور فرمائیے اور پھر دیکھئے کہ ابلیس کا یہ حربہ کس قدر کامیاب ثابت ہو رہا ہے جس کی رو سے وہ انکے غلط اور بے نتیجہ اعمال کو مزین بنا کر دکھاتا چلا آ رہا ہے۔ جب تک ہم اس فریب نفس میں مبتلا رہیں گے ہماری حالت کبھی سنور نہیں سکے گی۔ یعنی دین کی طرف آنے کے لئے ”مذہب“ سے نجات حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔

قرآن کریم نے ابلیس کے اس حربہ کو ناکام بنانے کے لئے کیا یہ کہ جہاں کوئی حکم دیا اس کے ساتھ **احکام کے نتائج** ہی بتا دیا کہ اس پر عمل کرنے سے نتیجہ کیا برآمد ہو گا۔ اسے کتاب و حکمت کہتے ہیں۔ یعنی احکام

اور ان کی غرض و غایت)۔ اگر کسی حکم خداوندی پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ وہی نکلتا ہے جو خدا نے (اپنی کتاب میں) بتایا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس حکم پر منشاء خداوندی کے مطابق عمل ہو رہا ہے (اسے دین کہا جائے گا) لیکن اگر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو یا وہ نتیجہ برآمد نہ ہو جو قرآن کریم نے بتایا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس حکم کی تعمیل منشاء خداوندی کے مطابق نہیں ہو رہی۔ اگر ہم اس مقام پر کھڑے ہو کر سوچتے نہیں کہ ہم سے کہاں غلطی ہو رہی ہے جو اس عمل کا قرآنی نتیجہ مرتب نہیں ہو رہا، بلکہ مطمئن ہو کر بیٹھے رہتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ عین منشاء خداوندی کے مطابق ہے اور اس طرح پر عمل کرنے چلے جاتے ہیں تو (قرآنی الفاظ میں) اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان ہمارے غلط اعمال کو مزین بنا کر دکھا رہا ہے۔ اور اس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم نیک کام کر رہے ہیں (اسے مذہب کہا جاتا ہے)۔ یہی وہ اعمال ہیں جن کا میزان خداوندی میں کوئی وزن نہیں ہو گا۔

اور یہاں سے ہم ایک اہم نکتہ کی طرف آ جاتے ہیں۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عیسائیت کے پھیلانے ہوئے عقیدہ کی رُو سے انسان کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ شیطان کی گرفت سے آزاد ہو جائے۔ اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ دورِ حاضر کی علمی تحقیق نے اس عقیدہ اور جبریت کے نظریہ کو باطل قرار دیدیا ہے۔ اور اب وہ اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ انسانی ذات میں اس امر کی صلاحیت موجود ہے کہ وہ حیوانی جذبات کی بیاکیوں پر غالب آجائے۔ یہ وہ حقیقت کشا اور انقلاب انگیز صدا ہے جس کا اعلان، قرآن کریم نے آج سے چودہ سو برس پہلے کر دیا۔ اسے اس نے قصہ ابلیس و آدم میں بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ ابلیس چیلنج پر چیلنج دیتے چلا جاتا ہے کہ میں ابن آدم کو اس طرح گمراہ کروں گا اور اُس طرح تباہ کروں گا۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب یوں ملتا ہے کہ تیری ان تمام سازشوں کے باوجود اِنِّ عِبَادِیْ لَکَیْسَ لَکَ عَلَیْہِمْ

سُلْطٰنٌ (۱۵/۱) میرے بندوں پر تیرا کوئی غلبہ و تسلط نہیں ہو سکے گا۔ جو **ابلیس پر غالب آنے کی صلاحیت** میرے قوانین و اقدار کی محکومیت اختیار کریں گے تو ان پر کبھی غالب نہیں ہو سکے گا۔

اس کا اعادہ مختلف مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً (۱۵۱: ۱۴۸: ۳۸)۔ ایک مقام پر اس کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ ابلیس کی سازشیں کتنی ہی گہری اور اس کے حربے بظاہر کتنے ہی محکم کیوں نہ ہوں، وہ خدا کے مخلص بندوں کے سامنے تاریک بکثرت سے زیادہ مضبوط ثابت نہیں ہوں گے۔ ”إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا“ (۲۵)۔ شیطان کے مکر و فریب بڑے کمزور ہوتے ہیں۔

نفسِ انسانی کی انہی صلاحیتوں کو قرآن کریم نے اس کی تین کیفیات سے تعبیر کیا ہے۔ ایک جگہ کہا ہے کہ ”إِنَّ النَّفْسَ لَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ“۔ ”إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي“ (۱۲۷)۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کا نفس اُسے بُرائی کے لئے اکسارتا رہتا ہے لیکن اس سے وہ لوگ محفوظ رہتے ہیں جو خدا کے سبح رحمت کے سائے تلے آجاتے ہیں۔ یہ اگرچہ قصہ حضرت یوسفؑ میں (عزیز مصر کی بیوی کا قول ہے لیکن قرآن نے اس کی تردید نہیں کی اور جس انداز سے اس نے نفسِ انسانی کی دساؤں انگیزوں کا ذکر کیا ہے، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خود انسان کے اپنے غلط فیصلے اُسے غلط راہیں اختیار کرنے کے لئے اکساتے رہتے ہیں۔ اسی کو نفسِ آمارہ کہا گیا ہے۔ اس کی دوسری حالت کو ”لَوَّاهَةٌ“ (۱۵۱) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ انسانی ذات کی وہ کیفیت ہے جس میں اس کے اندر خیر و شر کی کشمکش بیدار ہوتی ہے۔ پہلے وہ ایک غلط فیصلہ کر بیٹھتا ہے۔ جب اُسے اس کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنے کئے پر نادم ہوتا ہے۔ یاد رکھئے! احساسِ ندامت بھی انسان کی خصوصیت ہے۔ حیوانات میں ندامت کا جذبہ نہیں ہوتا۔ حیوانات کیا، جو بھی کسی روش پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کیا گیا ہو، اس میں احساسِ ندامت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو اپنے فیصلے کی غلطی کا احساس ہے جس سے ندامت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ یہ بہر حال نفسِ انسانی کی کشمکش کی کیفیت ہے۔ اور جب اس کی

نفسِ انسانی کی تین کیفیتیں

ہو جاتی ہے۔ اسے قرآن کریم نے ”النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ“ (۱۲۷) کہہ کر پکارا ہے۔ درجہ حاضری اصطلاح میں اسے متوازن ذات (BALANCED PERSONALITY) کہا جائے گا۔ لیکن یہ اطمینان وہ فریبِ نفس نہیں، جس میں شیطان غلط اعمال کو مزین بنا کر انسان کو دھوکے میں رکھتا ہے۔ یہ اطمینان وہ ہے جو کسی مریض کو شفا یاب ہونے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ تندرستی کا اطمینان اور ہے اور اسپرین کھا کر درد سے (بظاہر) چھٹکارا حاصل کر لینے کا اطمینان اور۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم نے نہ انسانی جذبات کو مذموم اور قابلِ نفرت قرار دیا ہے۔ نہ ان کے فنا کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں تصوف میں نفس کشی کو جہادِ اکبر قرار دیا جاتا ہے، یہ تصور خلافتِ قرآنِ مجید ہے اور علمائے نامک بھی۔ انسانی جذبات کو فنا کیا ہی نہیں جاسکتا۔ انہیں (زیادہ سے زیادہ) دبایا جاسکتا ہے۔ اور ان کے دبائے سے انسان

ایسے نفسیاتی امراض کا شکار ہو جاتا ہے جن کے نتائج فرد اور معاشرہ دونوں کے لئے بڑے تباہ کن ہوتے ہیں۔ انہیں دبا یا جائے تو یہ اپنی نمود اور کار فرمائی کے لئے غیر فطری راہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ اسے نفسیاتی اصطلاح میں بدنہادی یا (PERVERSION) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس قسم کے نفسیاتی عوارض اور اخلاق کا باہمی تعلق کیا ہے، اس کے متعلق علمائے نفسیات کی تحقیقی ملاحظہ فرمائیے (ERICH FROMM) لکھتا ہے :-

نفسیاتی صحت اور نفسیاتی عوارض کا مسئلہ اخلاقیات کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر نفسیاتی عارضہ کسی نہ کسی اخلاقی مسئلہ کا مظہر (یا نمائندہ) ہوتا ہے۔ ”ہیومن ازم“ کے ضابطہ اخلاق کی رو سے، انسانی ذات کی تکمیل و محکمیت میں ناکامی، بجائے خویش اخلاقی ناکامی ہے۔ اس سے بھی زیادہ متعین الفاظ میں، نفسیاتی عوارض کسی نہ کسی اخلاقی مسئلہ کے مظاہر ہوتے ہیں اور نفسیاتی علامات، اخلاقی کشمکش کے حل نہ کرنے کا نتیجہ۔

(MAN FOR HIMSELF P.224)

قرآن کریم نے منافقین کے متعلق جو کہا ہے کہ ”فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ“ (۲)۔ ”ان کے دلوں میں مرض ہوتا ہے“ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۳)۔ ”اور اس کی وجہ سے بڑے الم انگیز عذاب میں مبتلا رہتے ہیں“ تو اس سے مذکورہ صدر حقیقت واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے۔ منافقت اخلاقی کمزوری ہے اور اس سے کسی قسم کے نفسیاتی امراض پیدا ہو جاتے ہیں اس کے ساتھ ہی قرآن میں ہے: وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ (۲)۔ ”منافقین فریبِ نفس میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ شعوری طور پر انہیں اس کا علم نہیں ہوتا“ اس مرض حقیقی اسبابِ علل ان کے تحت الشعور میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔

آپ دیکھئے کہ ”انفس و آفاق کی نشانیاں“ کس طرح قرآنی حقائق کی صداقتوں کی شہادت بنتی چلی جا رہی ہیں۔ بہر حال ہم کہہ رہے تھے کہ قرآن کریم نے کہا یہ ہے کہ انسانی جذبات کی تسکین ضرور کی جانی چاہیے، لیکن ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، جنہیں اقدارِ خداوندی کہا جاتا ہے۔ اس باب میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک قول منسوب کیا جاتا ہے جو (میری قرآنی بصیرت کے مطابق) واقعی حضور کا قول ہو سکتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ حضور نے ایک دفعہ فرمایا کہ ہر انسان کا ایک ابلیس ہوتا ہے صاب نے عرض کیا کہ کیا حضور کا بھی ابلیس ہے؟ ارشاد ہوا، ہاں میرا بھی ابلیس ہے لیکن میں نے اسے مسلمان کر رکھا ہے۔

اسی بصیرت افروز حقیقت کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

کشتن ابلیس کا رے مشکل است ✽ زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آن باشد مسامانش کُنئی کشتہ شمشیر قرآنش کُنئی

اس مقام پر ہمارے سامنے برٹریڈ رسل کا ایک واقعہ آتا ہے۔ رسل کا شمار عصرِ حاضر کے ممتاز ترین مفکرین میں ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ بڑا متشدد دھرمیہ (ATHEIST) تھا۔ اور عیسائیت کے خلاف مجسم بغاوت اس کی کتاب (WHY I AM NOT A CHRISTIAN) نے کلیسا کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ بایں ہمہ، اس نے اپنی خودنوشت سوانح عمری کی تیسری جلد میں (جو اس کی زندگی کے آخری دور — ۱۹۴۷ — ۱۹۶۹ کے حالات پر مشتمل ہے) اپنا ایک واقعہ لکھا ہے جو ہمارے زیرِ نظر موضوع کے اعتبار سے بڑا غور طلب اور عبرت آموز ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

میں اس سے پہلے کبھی یونان نہیں گیا تھا۔ وہاں میں نے جو کچھ دیکھا وہ انتہائی دلکش تھا۔ اس خطہ زمین کی اُن محسوس کامرانیوں کے مظاہر کو دیکھنے کے بعد، جو ہر صاحبِ نظر سے خراج تحسین حاصل کر لیتی ہیں، میں ایک چھوٹے سے گرجا کی طرف چلا گیا جو اُس زمانہ میں تعمیر ہوا تھا جب یونان (عیسائیت کا مذہب اختیار کرنے کے بعد) بازنطینی حکومت کا حصہ بن چکا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس گرجا میں، میں غیر شعوری طور پر اپنے اندر ایک ایسی رات اور سکون محسوس کر رہا تھا جو اس یونان کی عظیم عمارتوں میں نہیں محسوس ہوئی تھی جو اُن کے عہدِ اہنماہیات کی یادگار تھے۔ اس سے مجھے محسوس ہوا کہ عیسائی زادِ نگاہ کی میرے قلب پر، میرے اندازہ و تصور سے کہیں زیادہ عمیق گرفت ہے۔ یہ گرفت میرے معتقدات پر نہیں تھی۔ میرے جذبات اور احساسات پر تھی۔ اس سے مجھے یہ دکھائی دیا کہ عہدِ پارینہ کا یونان، عصرِ حاضر سے جس باب میں مختلف (اور ممتاز) تھا وہ یہ تھا کہ انہیں (عیسائیت قبول کرنے سے پہلے) گناہ کا احساس نہیں تھا اور مجھے یہ محسوس کہ بڑا ہی تعجب ہوا کہ احساسِ گناہ کے عقیدہ کا خود مجھ پر کس قدر گہرا اثر تھا۔ اگرچہ وہ اثر میرے نظریات اور معتقدات پر نہیں، میرے احساسات و جذبات پر تھا۔ (ص ۸۲-۸۳)۔

برٹریڈ رسل جیسے انقلابی مفکر کی یہ کیفیت تھی کہ وہ عمر بھر عیسائیت کے نلات برہنہ شمشیر رہا، لیکن عیسائیت کے بنیادی عقیدہ (اولین گناہ) کا اثر کس طرح اس کے دل کا جزائیموں میں پیوست ہو چکا تھا کہ وہ اپنی عمر کے آخری ایام تک اس سے نجات حاصل نہ

کر سکا۔ وہ اس کے تحت الشعور میں جا گزیں رہا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابلیس کس طرح اعماق قلب میں گم رہتا ہے۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ ”ایمان باللہ تک آنے کے لئے، پہلے کفر بالطاغوت“ ضروری ہے، (۲/۲۸۶) تو اس سے مراد یہی ہے کہ جب تک باطل عقائد و تصورات کو دل کی گہرائیوں سے دور نہ کیا جائے، انسان صداقت اور حقیقت پر ایمان نہیں لا سکتا۔ رسل کے اس واقعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مذہب کے باطل عقائد کی گرفت کس قدر محکم اور مضبوط ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب پرست قوم کا دین کی طرف آنا، ناممکن نہیں تو سخت دشوار ضرور ہوتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ اسلام جیسا مجسم صداقت دین اور حضور نبی اکرم جیسے پیکر صداقت، اس دین کے پیش کرنے والے، لیکن بایں ہمہ، مدینہ کے یہودیوں اور عیسائیوں نے اسے قبول نہ کیا۔ یہ اس لئے کہ ان پر مذہب کی گرفت بڑی شدید تھی۔ ان کے برعکس مکہ کے قریش اس کی آغوش میں آتے چلے گئے۔ اس لئے کہ وہ اگرچہ بت پرست تھے، لیکن کسی مصلحہ مذہب کے پیرو نہیں تھے۔

اس سے ہمیں اس حقیقت کے سمجھنے میں بھی مدد ملے گی کہ آج کا مسلمان (بلکہ صدیوں پیشتر تک کا بھی) قرآن کی آواز کی طرف لبیک کیوں نہیں کہتا؟ ان کی مذہب پرستی ان کے راستے میں حائل ہے۔

یہ ضمنی گوشہ تھا۔ ہم کہہ رہے تھے کہ جذبات کو فنا نہیں کیا جاسکتا، انہیں قرآنی احکام و اقدار کے تابع رکھا جاسکتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے کہا کہ شیطانی وساوس گھومتے گھاتے مومنین کے سامنے بھی آتے ہیں لیکن..... اس ”لیکن“ کیلئے قرآن کے الفاظ دیکھئے۔ فرمایا:-

إِنَّ الْبَشَرِ لَلْغَاثِ إِذَا مَسَّهُمْ طَلِيفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَنَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ (۲/۲۰۰)

قوانین خداوندی کی نگہداشت کرنیوالوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کہیں شیطان کا کوئی خیال گھومتے گھاتے ان کے دل میں آجائے تو وہ فوراً قانون خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں۔ اس سے یوں ہو جاتا ہے جیسے تاریکی میں یکایک روشنی آگئی اور انہیں صاف صاف نظر آنے لگ گیا کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ اس سے ابلیس کی فریب کاریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ اسی کا نام ابلیس کو مسلمان کرنا یا اُسے ”قرآن کی شمشیر سے ذبح کرنا“ ہے، یہی وہ حقیقت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے چیلنج کے جواب میں یہ کہہ کر پیش کیا تھا کہ میرے مخلص بندوں پر تیرا کوئی حربہ کارگر نہیں ہو سکے گا۔



ہم نے شروع میں کہا ہے کہ قرآن کریم نے شیطان کے لئے، شیطان اور ابلیس

شیطان اور ابلیس دونوں الفاظ

دونوں الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس کی وجہ، اس سے پہلے سمجھ میں نہیں آرہی

تھی یہی وہ ”برابر رب“ تھی جو ایک نہایت نازک مرحلہ پر حضرت یوسفؑ کے سامنے آئی تھی (۱۲/۲۰)۔

تھی لیکن اب علم النفس کے انکشافات نے اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھا دیا ہے۔ علمائے علم النفس نے اب ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے۔ جسے (FRUSTRATION-AGGRESSION THEORY) کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے جذبات کی شدت میں صحیح قوانین سے سرکشی برت کر غلط قدم اٹھا لیتا ہے۔ اس کے بعد جب اس کے نتائج و عواقب سامنے آتے ہیں تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس لئے سرکشی اور مایوسی انسانی اقدام کے دو گوشے یا رخ ہوتے ہیں جو باہم گرا لازم و ملزوم ہیں۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ قرآن کریم نے اس کے لئے شیطان اور ابلیس کے الفاظ کیوں استعمال کئے ہیں۔ ابلیس اور شیطان ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ انسان کی کیفیت ہی یہ ہے: وَإِذَا أَعْمَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأْبِجَ بِجَانِبِهِ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يُوَسِّسًا (۱۱۱)۔ ”جب انسان کے حالات مساعد ہوتے ہیں تو قوانین خداوندی سے اعراض برتنا اور بے رخی اختیار کرتا ہے۔ اور جب اس کے اس طرز عمل کے نتیجہ میں، حالات نامساعد ہو جاتے ہیں تو وہ پھر مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔“ یہی شیطنت اور ابلیسیت ہے۔ جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے ”ابلیس“ مایوسی کا مظہر ہے۔ اور شیطان سرکشی کا شعلہ بیباک۔

اب ہم قصہ ابلیس و آدم کی طرف آتے ہیں جس کی تمہید کے لئے اتنی تفصیلی گفتگو کی ضرورت لاحق ہوئی۔ لیکن اس کے لئے ابھی تھوڑے انتظار کی مزید زحمت برداشت کرنی ہوگی۔ تاکہ ہم پہلے ان اصطلاحات کا مفہوم سامنے لاسکیں جو اس داستان میں استعمال کی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے لفظ آدم کو لیجئے:-

آدم

لغت کی رُو سے ”اُدْمَةُ“ کے معنی ہیں قرابت، موافقت اور مل جل کر رہنے کی صلاحیت۔ یہیں سے لفظ آدم ہے۔ حکمائے یونان نے جو انسان کو مدنی الطبع حیوان (SOCIAL ANIMAL) قرار دیا تھا، تو آدم کا لفظ اس کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ اسی آدم کی طرف نسبت سے عربی لفظ آدمی ہے۔ عام بول چال میں اسی کو آدمی کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں جہاں آدم یا بنی آدم کے الفاظ آتے ہیں، ان کی جگہ اگر آدمی کا لفظ رکھ دیا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر بتائیں گے ہمارے ہاں بھی، (محرّف) تورات کے زیر اثر، عام مشہور یہی ہے کہ قرآن کریم میں بیان کردہ قصہ آدم، ایک جوڑے (آدم اور حوا) کی داستان ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ یہ کسی فرد یا ایک جوڑے کی داستان نہیں، بلکہ یہ خود آدمی کی سرگزشت ہے جسے قرآن کریم نے تیشلی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس داستان کا آغاز انسان کی اس حالت سے ہوتا ہے جب اس نے قدیم انفرادی زندگی کی جگہ پہلے پہل تمدنی زندگی شروع کی۔ یعنی قدیم قبائل کی شکل میں

قرآن کریم کی متعدد آیات ایسی ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ آدم سے مراد، انسان یا بشر ہے۔ اور قصہ آدم کسی ایک جوڑے کی داستان نہیں بلکہ یہ خود انسان کی سرگزشت ہے جسے قرآن کریم نے بڑے لطیف اور دلکش محاکاتی (ڈرامائی) انداز سے بیان کیا ہے۔

سورة الحجر میں انسان کی تخلیق سے بات شروع کی گئی ہے (۱۴۱) اور اس کے بعد کہا گیا ہے: **وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا (۱۵۱)**۔ ”جب تیرے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں ایک بشر پیدا کر رہا ہوں“ اور اس کے بعد قصہ آدم سامنے لایا گیا ہے، کہ کس طرح اُسے ملائکہ نے سجدہ اور ابلیس نے انکار کیا (۱۵۴-۱۶۰)۔ اس سے اگلی آیات میں ہے کہ ابلیس نے کہا کہ مجھے اس ”آدم“ کی وجہ سے زائدہ درگاہ کیا جا رہا ہے لیکن آپ دیکھئے گا کہ میں کس طرح **لَا زِيْنَةَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ (۱۶۱)**۔ ”ان سب کو غلط راہوں پر ڈالتا ہوں“ یہاں **هُمْ** جمع کی ضمیر ہے جس کے معنی تمام انسان ہیں اور پھر لفظ **اجمعين** نے اس کی مزید وضاحت کر دی ہے کہ ایک فرد (آدم) یا ایک جوڑے (آدم اور حوا) کا قصہ نہیں، تمام نوع انسان کی داستان ہے۔ (نیز دیکھئے ۳۸-۴۱)۔

سورة بقرہ میں اس داستان کی ابتدا ”آدم اور اس کی بیوی“ سے ہوتی ہے۔ جن کے لئے عربی قاعدے کی رو سے تنزیہ کا صیغہ استعمال کیا گیا (۲)۔ لیکن اس کی اگلی ہی آیت میں ہے: **وَقُلْنَا اهْبِطُوا - بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَكُنْكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرًّا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ (۳)**۔ ”ہم نے ان سب سے کہا کہ تم زندگی کی بلند سطح سے نیچے گر چکے ہو جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم میں سے ایک، دوسرے کا دشمن ہو گا۔ تمہیں کچھ وقت کے لئے کرۂ ارض پر قیام کرنا ہو گا“۔ اس سے اگلی آیت میں ہے کہ آدم نے خدا سے کچھ ہدایات پائیں اور توبہ کی (۴)۔ لیکن اس کے بعد پھر جمع کا صیغہ ہے اور اس میں ”جمعین“ کا لفظ بھی آیا ہے۔ اس کے بعد کہا ہے: **فَاَمَّا يَا تَيْمٰثُكُم مِّمَّنْ هَدٰى فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۵)**۔ ”تمہاری طرف میری جانب سے ہدایت آتی رہے گی، جو ان ہدایات کا اتباع کریں گے انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہو گا نہ حزن“۔ بعینہ یہی اسلوب، آیات (۶-۱۰) میں اختیار کیا گیا ہے اور اسی طرح کے صیغے وہاں بھی استعمال کئے گئے ہیں۔

مذکورہ بالا دو آیات میں تو انسان یا بشر یا آدم کی تخلیق کا ذکر ہے۔ سورة اعراف میں بات بالکل واضح کر دی گئی ہے کہ یہ تذکرہ پوری نوع انسان کا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے: **وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (۱۶)**۔ ”یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتداء کی۔ پھر تمہیں ایک صورت عطا کی“ (ان میں ”کم“

جمع کا صیغہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے مراد پوری کی پوری نوع انسان ہے۔ اور اس کے بعد ہے کہ ”ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو“ اس کے بعد پھر اس داستان کو دہرایا گیا ہے جس میں ابلیس کے انکار اور سرکشی کا ذکر ہے، اور ابلیس کے جواب میں جمع کے صیغے آئے ہیں۔ یعنی (لَا فَعْدَنَّا لَهُمْ) (۱۴)۔ اور (لَا يَتَّبِعُهُمُ بَينَ اَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ) (۱۵)۔ ان آیات سے بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قصہ آدم، بنی نوع انسان ہی کا قصہ ہے۔ بعض آیات میں اس کے لئے ”بنی آدم“ کے الفاظ آئے ہیں۔ مثلاً سورۃ اعراف میں ہے کہ ”اے بنی آدم! ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا ہے“ (۱۶)۔ ”یٰبَنِي اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ“ (۱۷)۔ ”اے بنی آدم! اپنی زیبائش و زینت کا خیال رکھو“ اور اس سے ذرا آگے ہے: ”یٰبَنِي اٰدَمَ اِمَّا يٰتَسَكَّمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَفْصَلُوْنَ عَلَيْكُمْ اَيَّتِي فَمِنْ اَتَقٰى وَاصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ“ (۱۸)۔ ”اے بنی آدم! یعنی نوع انسان) ہم تمہاری طرف اپنے رسول بھیجیں گے جو تم میں سے ہی ہوں گے۔ وہ تمہارے سامنے ہمارے قوانین پیش کریں گے۔ جو لوگ ان قوانین کی نگہداشت کریں گے اور اپنی حالت کو سنوار لیں گے، انہیں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔“ اس سے بھی بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ بنی نوع انسان کے لئے بعض مقامات پر ”ذُرِّيَّةٖ اٰدَمَ“ کے الفاظ بھی آئے ہیں، مثلاً (۱۹) و (۲۰)۔

نبوتِ آدم کا عقیدہ قرآن کریم میں ایک مقام پر البتہ لفظ آدم، انبیائے کرام کے ساتھ آیا ہے۔ جہاں کہا ہے: **اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّالِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِلٰى عِمْرٰنَ عَلٰى الْعٰلَمِيْنَ** (۲۱)۔ ”یقیناً اللہ نے آدم اور نوح اور ابراہیم اور آل عمران کو ان کی ہم عصرا قوام پر فضیلت دی۔“ یہاں آدم کا ذکر حضرت نوح کے ساتھ آیا ہے جس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس سے مفہوم کوئی خاص فرد ہے۔ اور اسی سے یہ کہا جاتا ہے کہ آدم ایک نبی تھے۔ لیکن صرف اتنی بات سے اس نتیجہ پر نہیں پہنچا جاسکتا کہ جس آدم کی داستان قرآن کریم میں آئی ہے، وہ ایک فرد تھا اور فرد بھی نبی۔ پہلی چیز تو یہ کہ آیت (۲۱) میں ”اصْطَفٰى“ کا لفظ آیا ہے اور یہ لفظ قرآن کریم میں غیر انبیاء کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً حضرت مریم کے متعلق (۲۲) اور خود امت محمدیہ کے متعلق (۲۳) میں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ نہ حضرت مریم نہ نبیہ تھیں اور نہ ہی امت محمدیہ کے افراد نبی۔ نبوت کا تو سلسلہ ہی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآن کریم نے ہر مقام پر سلسلہٴ انبیاء کرام کا آغاز حضرت نوح علیہ السلام سے کیا ہے اور دیگر انبیاء کے متعلق کہا ہے کہ وہ ان کے بعد آئے تھے (۲۴)۔

اور سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ قصہ آدم میں کہا گیا ہے کہ خدا نے آدم کو بالتصریح ایک حکم دیا اور آدم نے اس سے معصیت

برقی۔ اس قسم کی معصیت کسی نبی کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ قصہ آدم میں ہر مقام پر کہا گیا ہے کہ ابلیس نے انہیں (آدم اور اس کی بیوی کو) بہکایا، اور وہ اس کے بہکاوے میں آگئے۔ حضرات انبیائے کرام تو ایک طرف (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) ابلیس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: **إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ** (۱۵۱)۔ ”یقیناً میرے بندوں پر تجھے غلبہ حاصل نہیں ہوگا۔“ دیگر مقامات پر عباد کے ساتھ مخلصین کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خدا کے عام مخلص بندوں پر بھی ابلیس غالب نہیں آسکتا تو ایک نبی پر وہ کس طرح غلبہ حاصل کر سکتا تھا۔

ان تشریحات سے واضح ہے کہ جس آدم کی داستان قرآن کریم میں آئی ہے وہ کوئی نبی نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ آدم کسی قبیلہ کے کسی ممتاز فرد کا نام ہو، کیونکہ عربی زبان میں **إِذَا هُرِّكَ** کسی خاندان کے ایسے مثالی فرد کو بھی کہا جاتا ہے جس سے اُس کے قبیلہ کو پہچانا جاتے۔

اب رہا یہ کہ قصہ آدم میں آدم اور اس کی بیوی کا ذکر آیا ہے تو ظاہر ہے کہ جب ہم آدمی کے متعلق گفتگو کریں گے تو اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہوں گے۔ قرآن کریم نے اس قصہ میں عورت کا ذکر خاص طور پر کیوں کیا ہے۔ اس کی وضاحت آگے چل کر سامنے آجائے گی۔

خلیفہ

اس سے اگلی اہم اصطلاح ہے۔۔۔۔۔ خلیفہ۔۔۔۔۔ ہمارے ہاں ایک غلط تصور یہ بھی رائج ہے کہ انسان دنیا میں ”خدا کا خلیفہ ہے“ (خلیفۃ اللہ فی الارض)۔ یہ تصور بھی قرآن کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی انسان کو ”اپنا خلیفہ“ نہیں کہا۔ آدم کے متعلق اتنا ہی کہا ہے کہ **إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً** (۱۵۱)۔ ”اپنا خلیفہ نہیں کہا۔ اس کی تشریح ابھی سامنے آئے گی۔

لفظ خلیفہ کے مادہ (خ۔ل۔ف) کے معنی ہیں کسی کے پیچھے، کسی کے بعد۔ مثلاً ایک قرن کے بعد دوسرا قرن یا ایک نسل کے بعد دوسری نسل۔ ایک قوم جو کسی دوسری قوم کے بعد آئے۔ اس کے لیے ہمارے ہاں صحیح لفظ ”جانشین“ ہے۔ لہذا خلیفہ معنی میں کسی کا جانشین۔ اور یہ مادہ ان معانی میں قرآن کے متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً سورۃ الاعراف میں قوم عاد کے متعلق کہا گیا: **وَاذْكُرْ ذُرِّيَّتًا** **إِذْ جَعَلْنَاهُمْ خُلَفَاءَ مِنْ قَوْمِ نُوحٍ** (۲۵۹)۔ ”تم اس حقیقت کو اپنے سامنے رکھو کہ خدا نے تمہیں قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا“ حضرت نوحؑ نے اس قوم سے کہا کہ اگر تم نے پیغمبات خداوندی پر کان نہ دھرا تو یاد رکھو: **وَيَسْتَخْلِفُونَ**

رَبِّ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (۱۱۵)۔ "خدا تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے آئے گا۔ یعنی انہیں تمہارا جانشین بنا دے گا۔" سورۃ الاعراف میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کچھ دنوں کے لئے اپنی قوم سے الگ ہوتے لگے تو انہوں نے اپنے بھائی ہارون سے کہا اَخْلَفْنِي فِي قَوْمِي (۱۳۳)۔ "میرے بعد تم میرے جانشین بننا" اسی سورۃ میں بنی اسرائیل کے متعلق کہا ہے: فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ (۱۳۴)۔ "ان کے بعد ان کے جانشین ایسے لوگ ہوئے جنہوں نے"

ان مقامات سے واضح ہے کہ خلیفہ کے معنی ہیں کسی کے بعد اس کا جانشین ہونے والا۔ ظاہر ہے کہ یہ جانشین اسی کا ہو سکتا ہے جو موجود نہ ہو۔ کسی کی موجودگی میں اس کے جانشین ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انسان کو اگر اللہ کا جانشین (خلیفہ) تسلیم کیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا خود دنیا میں موجود نہیں۔ انسان اس کے بعد اس کا جانشین مقرر ہوا ہے۔ اور خدا کے متعلق ایسا تصور بالبداهت غلط اور باطل ہے۔ تاریخ میں ہے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کسی نے "یا خلیفۃ اللہ" کہہ کر پکارا۔ آپ نے اسے فوراً ٹوکا اور کہا کہ میں خلیفۃ الرسول ہوں، خلیفۃ اللہ نہیں ہوں۔ انسان دنیا میں خدا کی جانشینی کرنے کے لئے نہیں آیا۔ خدا کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اس کے قوانین کے عملاً نافذ کرنے کے لئے آیا ہے۔ خود قرآن کریم نے، اس کا مقصد تخلیق یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (۵۱)۔ "ہم نے جن و انس کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ ہمارے قوانین کی اطاعت اختیار کریں۔"

انسان درحقیقت ایک ایسی مخلوق کا جانشین ہے جو اس سے پہلے کمرۃ ارض پر

انسان سے پہلی مخلوق موجود تھی لیکن اب ناپید ہو چکی ہے۔ سورۃ الحجر میں ہے: وَالْبَاقَىٰ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السَّمُومِ (۱۵)۔ "اور انسان سے پہلے ہم نے ایک ایسی مخلوق کو پیدا کیا جسے آتشیں مخلوق کہا جائے گا اور جو اب تمہاری نگاہوں سے اوجھل (ناپید) ہے" ماہرین علم الحیات کی تحقیق یہ ہے کہ زندگی کے سلسلہ ارتقاء میں اولیں جرثومہ حیات سے لیکر بن مانس تک کی کڑیاں تو دائرہ تحقیق میں آگئی ہیں، لیکن بن مانس اور انس کے درمیان کی ایک کڑی گم ہے۔ اُسے وہ (MISSING LINK) سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ آیۃ زیر نظر میں ہی گم گشتہ کڑی کی طرٹ اشارہ ہے۔ چونکہ اس کمرۃ ارض پر انسان کی نمود سے پہلے زمین مہینہ نہادہ گوم تھی اس لئے وہ مخلوق ایسی ہوگی جو نسبتاً تیز حرارت میں بھی زندہ رہ سکتی ہو۔ غالباً اسی نسبت سے قرآن کریم نے اسے آتشیں مخلوق کہہ کر پکارا ہے۔

اس آیت سے بہر حال یہ واضح ہے کہ قرآن کریم نے جب کہا تھا کہ: اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (۲/۲۵) تو اس سے مراد یہی تھی کہ ہم اب ایک ایسی مخلوق پیدا کر رہے ہیں جو سابقہ مخلوق کی جانشین ہوگی۔

دنیاوی مملکتوں میں، جانشینی اپنے ساتھ اقتدار لے ہوئے ہوتی ہے۔ یعنی خلیفہ اس جانشین کو کہیں گے، جسے اقتدار مملکت حاصل ہو۔ اسی مفہوم کے پیش نظر قرآن کریم نے جماعتِ مومنین سے کہا ہے کہ تم سے پہلی قومیں جادۂ ہدایت سے منحرف ہو گئیں تو انہیں تباہ کر دیا گیا۔ ثُمَّ جَعَلْنَاکُمْ خَلِیْفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ

بِاِقْتِدَارِ جَانَشِیْنِ | لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ (۲/۲۵) ان کے بعد ہم نے تمہیں دنیا میں ان کا جانشین

بنایا ہے تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو؟ ظاہر ہے کہ خلافت یا جانشینی اقتدار مملکت ساتھ لئے ہوتے ہے۔

لہذا خلیفہ کے معنی ہوں گے کسی کا با اقتدار جانشین۔ اسی نہج سے حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے کہ: اِنَّا جَعَلْنَاکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ۔ فَاحْکُم بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (۳۸/۲۴) "اے داؤد! ہم نے تمہیں تمہارے پیشروؤں کا خلیفہ (جانشین) بنایا ہے۔ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم لوگوں میں الحق کے مطابق فیصلے کرو۔ (حکومت قائم کرو)۔"

اسی قسم کی جانشینی کو خدا نے استخلاف فی الارض سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ سورۃ النور میں ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا سَخَّلْنَا لَیْکُمُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۲۴/۲۵) "تم میں سے جو بھی وحی کی صداقتوں پر ایمان لائے گا اور اس کے مطابق صلاحیت بخش کام کرے گا، اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں استخلاف

فی الارض عطا کرے گا۔ جیسا کہ اس نے ان سے پہلی اقوام کو استخلاف عطا کیا تھا۔"

ضمناً چونکہ جماعتِ مومنین کی صورت میں اس استخلاف کی غرض و غایت یہ بتائی تھی کہ: وَلَیَمْلِکَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمْ الَّذِیْ اُرْضٰی لَهُمْ (۲۵/۲۵) "تاکہ وہ دینِ ممکن ہو سکے جسے خدا نے تمہارے لئے تجویز کیا ہے" اس لئے یہ استخلاف فی الارض

عام بادشاہوں کے استخلاف سے مختص اور متمیز ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں "خلافت" اور "ملوکیت" میں فرق کیا جاتا ہے۔

مَلَائِکَہ

قصۂ آدم میں ایک اور اہم اصطلاح ملائکہ کی آتی ہے۔ بعض لغویین کا خیال ہے کہ اس لفظ کا مادہ (اَلَلَّک) ہے۔ جس کے معنی پیغام رسانی کے ہیں۔ لیکن دوسرے محققین کا قول ہے کہ اس کا مادہ (مَلَّک) ہے جس کے معنی قوت کے

۱۔ استخلاف فی الارض کے متعلق مطالب الفرقان جلد اول، آیات (۱۰/۲) کی تشریحات ملاحظہ فرمائیے۔

ہیں۔ پیغام رسانی کے سلسلہ میں ملائکہ کا جو ذکر قرآن کریم کے مختلف مقامات پر آیا ہے، اُسے متعلقہ مقامات میں بیان کیا جائے گا۔
سُورَتِہُمْ اِنْ مَّلَآئِکَہُ کُوْلِیَّتَہِمْ جَوْثُوْتُ کَے مظاہر ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کو پیدا کیا تو اس کے نظم و نسق کے لئے قوانین وضع کئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ، ان قوانین کی رو سے، اس نظم و نسق کائنات کا فریضہ سرانجام دیتی ہیں، انہیں ملائکہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ طہ میں سموت کے متعلق کہا گیا ہے: "وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَہَا (۲۱)۔" ہم نے ہر سما کی طرف اپنا امر وحی کر دیا، اس سے مراد وہ قوانین خداوندی ہیں جن کی رو سے اجرام فلکی اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ دوسری جگہ ارض و سموت دونوں کے متعلق کہا: "یَنْزِلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُمْ (۲۵)۔" ان میں خدا نے اپنا امر نازل کر دیا۔

مَدَبِرَاتِ اُمُوْرِ الْاٰلِیَیَہِ

اور دوسری طرف سورۃ النّٰزِعَاتِ میں فَالْمَدَبِرَاتِ اَمْرًا (۹) آیا ہے یعنی تدبیر امور کرنے والے۔ خارجی کائنات میں ان امور الہیہ (قوانین فطرت) کے مدبرین سے مراد ملائکہ ہیں۔ سورۃ الاعراف کی آیت (۱۶) میں مختلف عناصر فطرت (سموت، ارض، شمس و قمر اور نجوم وغیرہ) کے متعلق کہا: "مُسَخَّرَاتِ لِّاَمْرِکُمْ (۱۶)۔" خدا نے انہیں اپنے امر کے تابع تسلیم کر رکھا ہے، یعنی یہ سب اس کے قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہیں۔ اور اس کے ساتھ کہا: "ثُمَّ اسْتَوٰی عَلٰی الْعَرْشِ (۱۷)۔" پھر وہ عرش پر مستوی ہو گیا۔ لغوی طور پر عرش کے معنی تخت کے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ جب یہ لفظ خدا کے لئے استعمال ہوگا تو اس سے مراد اُس قسم کا مادی تخت نہیں ہوگا جس پر بادشاہ بیٹھتے ہیں۔ اس سے مراد اقتدار یا مرکزی کنٹرول ہوگا۔ (نیز دیکھئے ۲۱)۔ اور دوسری جگہ ملائکہ کے متعلق کہا: "وِیَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّکَ (۶۹)۔" وہ تیرے رب کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں، ایک اور مقام پر ان کے متعلق کہا:

عرش

حَاقِبِیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ (۳۹)۔ "وہ عرش خداوندی کے گرد گردش کرتے ہیں، یعنی یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّہُمْ (۳۹)۔" اپنے نشوونما دینے والے کے نظام ربوبیت کو وجہ حمد و ستائش بنانے کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں، اسی سبب کے متعلق سورۃ الرعد میں ہے: "وِیُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِہٖ ۝ وَ الْمَلٰٓئِکَةُ مِنْ خِیفَتِہٖ (۱۳)۔" رعد اور ملائکہ

۱۔ علامہ ابن قیم نے کہا ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ قرآن کریم کی آیت: "یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِہٖ (۱۳)۔" میں رعد سے مراد "مَلٰٓئِکَةُ مِنَ الْمَلٰٓئِکَةِ مُوْکِلٌ بِالسَّحَابِ" ملائکہ میں سے ایک ملک ہے جسے بادلوں کے نظام پر مقرر کیا گیا ہے۔

(بحوالہ "فہم الاسماء کا تاریخی پس منظر" از محمد تقی امینی صاحب ص ۱۲۶)

ادیں۔ ملائکہ نظامِ خداوندی کو وجہ حمد و ستائش بنانے کے لئے مقرر ہوا رہتے ہیں۔ — تسبیح کے معنی ہیں کسی مقصد کے حصول کے لئے بھرپور کوشش کرنا۔ پوری پوری قوت صرف کر دینا۔ قرآن کریم میں اکثر مقامات پر جو آیا ہے کہ: سَبِّحْ يٰ ذِي الْعَرْشِ الْمَاجِدِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۲۵)۔ تو اس کے معنی یہی ہیں کہ کائنات کی پسینوں اور بلند یوں میں جو کچھ ہے وہ سب اس پر و گرام کی تمجید کے لئے جو قوانین خداوندی کی رُو سے ان کے لئے متعین کیا گیا ہے، پوری شدت اور بھرپور توانائی سے سبھائی ہیں۔ اسی کو دوسری جگہ ملائکہ کی تسبیح "کہلکہ پکارا گیا ہے" (۳۲)۔

کائناتی قوتیں، قوانین خداوندی کی اطاعت کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں۔ سورہ النحل میں ہے: وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ رَّاٰ لَكُمْ سَكَّةً ۚ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۚ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ۚ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۲۵)۔ "ارض و سموات میں جو کچھ ہے — خواہ وہ جاندار مخلوق ہو یا ملائکہ — قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے۔ اور ان سے کبھی سرکشی نہیں برتتے۔ وہ خدا کے غلبہ و تسلط سے ہمیشہ خائف رہتے ہیں اور جو کچھ انہیں حکم دیا جاتا ہے، بلا چون و چرا اس کی اطاعت کرتے رہتے ہیں۔"

سجدہ ملائکہ | فطرت کی ان ہفتوں (ملائکہ) کے متعلق قصہ آدم میں کہا گیا ہے کہ وہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ سجدہ ریزی کے معنی ہیں، کسی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا۔ اس کے تابع تسخیر ہو جانا۔ اسی جہت سے قرآن کریم نے بنی آدم یا نوریع انسان سے کہا ہے کہ کائنات کی جملہ اشیاء، قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دی گئی ہیں تاکہ وہ ان سے اپنے مقصد کے مطابق کام لے سکیں۔ سورہ حج میں ہے: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَخْتَارُ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ (۲۶)۔ "کیا تم اس پر غور نہیں کرتے کہ زمین میں جو کچھ ہے، خدا نے اُسے تمہارے فائدے کے لئے مسخر کر رکھا ہے؟" دوسری جگہ (۲۷) میں "ارض کے ساتھ سموات بھی آیا ہے۔ اور سورہ جاثیہ میں ہے: وَ تَخَذَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَتَقْوِمٌ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۴۵)۔ "جو کچھ سموات اور جو کچھ ارض میں ہے، ان سب کو خدا نے اپنی طرف سے تمہارے فائدے کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیں غنیمت تک پہنچنے کی بہت سی نشانیاں ہیں" یہ آدم کے سامنے ملائکہ کا سجدہ ہے۔

یعنی انسان، قوانین فطرت کا علم حاصل کر کے، انہی فطرت کو مسخر کر سکتا ہے۔ ان اشیاء میں بعض ایسی ہیں جو ایک لامیت کی حامل ہیں اور بعض وہ، جن میں ایک سے زیادہ خاصیتیں ہیں۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے

ملائکہ کے متعلق کہا: اُولٰٓئِیْ اَاجِیْنَہٗ مَٹْنٰی وَثُلُثَ دَرْبَعٍ - یَزِیْدُ فِی الْخُلُقِ مَا یَشَآءُ (۳۸)۔ عام الفاظ میں اس کا ترجمہ ہے ”دو دو، تین تین، چار چار بازوؤں والے ملائکہ“ اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ ”خدا اپنی مشیت کے مطابق اپنی خلق میں اضافے بھی کرتا رہتا ہے“ سو، کون کہہ سکتا ہے کہ اشیا کے کائنات میں کیا کیا اضافے ہوتے رہتے ہیں یا ان میں کتنی ایسی خاصیتیں ہیں جنہیں ابھی تک انسان دریافت نہیں کر سکا۔

قرآن کریم کی بعض آیات سے ایسا بھی مترشح ہوتا ہے کہ ملائکہ، انسانوں میں نفسیاتی اثرات پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ مثلاً بدر کے میدان میں، جماعت مجاہدین کو جو اطمینان قلب نصیب ہوا تھا، ان کا ذریعہ بھی ملائکہ تھے گئے ہیں (۱۳۵ ذ ۹)۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ کیسے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہم ان موثرات کو دیکھ نہیں سکتے۔ ملائکہ کے یہ لشکر، جو جماعت مجاہدین کے لئے وجہ اطمینان و سکینت ہوتے تھے، ان کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ: لَمْ تَرَوْہَا (۹ ذ ۹)۔ ”تم انہیں دیکھ نہیں سکتے“۔

یہ کچھ اُن ملائکہ کے متعلق ہے جو کارگر کائنات میں، امور الہیہ کی تدابیر کے لئے مامور ہیں، اور جنہیں ہم نے فطرت کی قوتوں سے تعبیر کیا ہے۔ عالم امر میں یہ مدبرات امور الہیہ کس طرح کار فرما رہتے ہیں۔ ہم اس کے متعلق نہ کچھ جان سکتے ہیں، نہ کہہ سکتے۔

اتنا اور سمجھ لینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی سکیموں کے بروئے کار لانے کے لئے کسی کا محتاج نہیں۔ یہ قوتیں، جنہیں ملائکہ کہہ کر پکارا گیا ہے خود خدا کی تخلیق کردہ ہیں اور اسی کے حکم کے مطابق ان امور کو سرانجام دینے پر مامور۔ انسان نے اپنے دور جہالت میں، ان قوتوں کو دیوی اور دیوتا قرار دے کر ان کی پرستش شروع کر دی — ہندوؤں کے ہاں سورج دیوتا، چاند دیوتا، اندر (بادل) دیوتا، گنجا (آگ) دیوی، دیو (ہوا) دیوی۔

دھرتی (زمین)، آما، گنگا مانا وغیرہ۔ دیوی دیوتاؤں کی پرستش اسی توہم پرستی کا نتیجہ ہے۔ عربوں کے ہاں بھی ملائکہ (فرشتوں) کو دیویاں۔ (بلکہ خدا کی بیٹیاں) سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے ان باطل مغفقات کی تردید کی اور ان سب (ملائکہ) کو آدم کے حضور سجدہ ریز بنا کر اس حقیقت کو واضح کیا کہ آدمی ان ”دیوی دیوتاؤں“ کا ساجد نہیں۔

۱۔ یہ جو ہمارے ہاں مشہور ہو گیا کہ ۱۹۶۵ء کی ”پاکستان - بھارت“ جنگ میں، فرشتے مدد کے لئے آئے اور لوگوں نے انہیں کہیں سبز عماموں کے ساتھ، اور کہیں سفید گھوڑیوں پر سوار دیکھا، تو یہ سب انسانی ذہن کے تخیلات اور توہمات تھے۔ جب ملائکہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور جماعت صحابہؓ بھی نہیں دیکھ سکتے تھے تو وہ ہم آپ کو کیسے نظر آجائیں گے؟

مسجود ہے۔ اس سے آپ دیکھئے کہ کتاب نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔ اور مقام آدمیت کس قدر بلند کر دیا۔
 قرآن کریم نے ملائکہ پر ایمان، اسلام لانے کی شرط قرار دیا ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ ملائکہ کو دیوبی دیونا ماننے کی بجائے، فطرت کی وہ قوتیں تسلیم کیا جائے جنہیں اللہ تعالیٰ نے آدمی کے تابع تسخیر کر دیا ہے۔
 اس تمہید کے بعد، اب آئیے قرآن کریم میں بیان کردہ قصہ آدم کی طرف۔ اس میں آپ پر یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ جب تک ان امور اور مہلحات کی اس قدر مبسوط تشریح نہ کر دی جاتی، قصہ آدم سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔

دوسرا باب

آیت ۳۰ تا ۳۹

سرگزشت آدم

- | | |
|----|---|
| ۱ | تخلیق آدم |
| ۲ | ملائکہ کا اعتراض |
| ۳ | علم الاسماء — تسخیر کائنات |
| ۴ | کائنات کے متعلق متشرآنی نظریہ |
| ۵ | سجدۃ ملائکہ — استکبار ابلیس |
| ۶ | مسلک ابلیسی کی گمراہیاں |
| ۷ | جنتِ آدم کی خصوصیات |
| ۸ | آدم کی لغزش — شجر ممنوعہ سے مراد |
| ۹ | مردوں اور عورتوں کی حیثیت |
| ۱۰ | آدم کی باز آفرینی |
| ۱۱ | وحی کی راہنمائی کی ضرورت |
| ۱۲ | اتباع وحی کا نتیجہ — خوف و حزن سے یامو نیست |
| ۱۳ | بائبل میں قصہ آدم |
| ۱۴ | اور ہماری کتب تفاسیر میں - |

دوسرا باب

سرگزشت آدم

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۗ
 قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

۲
۳۰

پہلے باب میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ قرآن کریم میں بیان کردہ قصہ آدم، کسی ایک فرد (یا جوڑے) کی داستان نہیں۔ یہ خود آدمی کی سرگزشت ہے جسے قرآن نے مثیل طور پر محاکاتی انداز میں بیان کیا ہے۔ تصور میں یوں لائیے کہ بارگاہِ ایزدی میں تین فریق کھڑے ہیں۔ درمیان میں آدم، یعنی آدمیت کا نمائندہ۔ ایک طرف ملائکہ، یعنی فطرت کی قوتیں، جو خدا کے متعین کردہ قوانین کے مطابق اس کے پروگرام کی تکمیل میں سرگرم عمل رہتی ہیں، اور تیسرا فریق، ابلیس یعنی آدمی کے وہ سرکش اور بیاک جذبات جو اقدارِ خداوندی کے سوا حلوں میں پابند نہیں رہنا چاہتے۔ بارگاہِ خداوندی سے ملائکہ کو مخاطب کر کے ارشاد ہوتا ہے کہ —————
 ”إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً“ (۱۳۰)۔ ”میں، کمرہ ارض پر ایک نئی مخلوق پیدا کرنے والا ہوں جو اس سے پہلی مخلوق کی جانشین ہوگی“ اس پر ملائکہ کا رد عمل مثبت اور منفی، دونوں حیثیتوں میں سامنے آتا ہے۔ مثبت حیثیت سے تو یہ کہ: ”نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ“ (۱۳۱)۔ اس میں انہوں نے اپنی خدمت گزاری کی رویداد پیش کی ہے اور کہا ہے کہ ہم اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کس طرح سرگرم عمل رہتے ہیں (نُسَبِّحُ) اور اس کے لئے جس حد تک بھی جانا پڑے جاتے ہیں (نُقَدِّسُ)۔ بالفاظِ دیگر، وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ حضور! کیا ہم سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی واقع ہوتی ہے جو کسی اور مخلوق کی تخلیق کی ضرورت لاحق ہو گئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو فرما دیجئے۔ ہم اپنی اس کوتاہی کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور منفی حیثیت سے یہ کہا کہ اس نئی مخلوق کا جو پہلی ہمارے سامنے آیا ہے اس میں ہمیں لگ کی چنگاریاں اور خون کے چھینٹے دکھائی دے رہے ہیں، تو کیا کمرہ ارض پر ایسی مخلوق پیدا کی جائے گی جو فساد انگیزیاں اور خون ریزیاں عام کرے! ہماری سمجھ میں تو یہ بات آئی نہیں۔ بارگاہِ خداوندی سے اس کے جواب میں اتنا ہی کہا گیا کہ ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔

ملائکہ نے کہا تھا کہ **نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ** (۲۶)۔ اس میں تسبیح اور تقدیس کے الفاظ غور طلب ہیں۔ تسبیح کے متعلق سابقہ باب میں مختصر اشارات سامنے آچکے ہیں۔ لیکن یہ تصور مزید وضاحت کا متقاضی ہے۔ اس مادہ (س۔ ب۔ ج) کے بنیادی معنی تیرنے کے ہیں۔ **الْتَّبَاحُ** ایسے تیراک کو کہتے ہیں جو پورے ہاتھ پھیلا کر تیرے۔ اور اسی نسبت سے **الْتَّوَابِعُ** ان گھوڑوں کو کہتے ہیں جو پورے قدم پھیلا کر، انتہائی تیزی سے دوڑیں۔ اس بنیادی مفہوم کی رو سے **سَبِّحْ** کے معنی ہوتے ہیں کسی کام کی تکمیل کے لئے پوری پوری تگ تار کرنا۔ امکان بھر جدوجہد کرنا۔ ہر وقت سرگرداں اور سرگرم عمل رہنا۔ چنانچہ آسمانی کڑوں کی تیز خرامی کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً سورہ یسین میں ہے: **وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ** (۳۶) و (۲۶)۔ ”تمام کڑے اپنے اپنے مدار میں تیرتے پھر رہے ہیں“۔

قرآن کریم کی متعدد آیات میں آیا ہے: **سَبِّحْ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ** (۲۴۰ : ۲۴۱ : ۲۴۲)۔ ”کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں ہر شے خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے انتہائی شدت سے سرگرم عمل رہتی ہے۔“ ضحنا، ان برسہ آیات کے آخر میں کہا گیا ہے: **هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ**۔ یعنی اس خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے جو انتہائی قوت اور غلبہ کا مالک ہے۔ لیکن اس کا غلبہ اور تسلط مستبدانہ نہیں بلکہ حکمت پر مبنی ہے۔ یعنی یہ سب کچھ اس کے متعین فرمودہ قوانین کی رو سے ہوتا ہے۔ دھاندلی سے نہیں۔ سورہ بنی اسرائیل میں ہے: **تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ**۔ **وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ**۔ **وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ**۔ **إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا** (۱۶۴)۔ ”کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی ہر شے، خدا کے پروگرام کی تکمیل اور اُسے درخورد حمد و ستائش بنانے کے لئے سرگرم عمل رہتی ہے۔ لیکن تم ان کی اس سرگرمی عمل (تسبیح) کو سمجھتے نہیں۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ یہ کائنات محفوظ رہے۔ اور اس کی حفاظت کے لئے جو قوتیں سرگرم عمل ہوں وہ بیکار بھڑک اٹھنے والی نہ ہوں بلکہ انتہائی دھیمنے پن سے اپنے فرائض کو انجام دیتی رہیں“۔

اسی طرح سورہ النور میں ہے کہ: **لَا تَرَى فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالطَّيْرِ صَفَاتٍ**۔ **كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ**۔ **وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَفْعَلُونَ** (۲۴)۔ ”کیا تم نظام کائنات پر غور نہیں کرتے کہ اس میں کس طرح ہر شے — جمادات اور نباتات ہی نہیں بلکہ پرندوں تک — اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی کے لئے سرگرم عمل رہتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی تسبیح اور صلوٰۃ سے اچھی طرح واقف ہے۔ یعنی ہر شے یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے فرائض منصبی کیا ہیں (صلوٰۃ کے یہی معنی ہیں) اور یہ بھی کہ اس کا دائرہ کار

کو نسا ہوتا ہے۔ (تسبیح کا یہ مفہوم ہے)۔ اللہ تعالیٰ کو اس کا بخوبی علم ہوتا ہے کہ یہ اپنے اپنے فریضہ کو کس طرح سر انجام دیتے ہیں۔“

بعض آیات میں اس لفظ کو ”استکبار“ کے مقابلہ میں لا کر اس کے مفہوم کو اور بھی واضح کر دیا گیا۔ مثلاً سورۃ حمّٰ میں ہے کہ خَانَ اسْتَكْبَرُوا۔ فَالَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُونَ لَهُ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْأَمُونَ (۵۱)۔ ”اگر یہ لوگ (یعنی حق کو تسلیم نہ کرنے والے) قوانین خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں تو انہیں ایسا کرنے دیجئے۔ اس سے یہ خدائی کائنات کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ اس لئے کہ کائنات کی ہر شے اس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے دن رات سرگرم عمل رہتی ہے اور ان کا اس سے سرکشی برتنا تو ایک طرٹ، وہ اس عمل پیہم اور حرکت مسلسل سے ٹھکتی بھی نہیں“ سورۃ الاعراف میں اسے اور بھی واضح کر دیا گیا جہاں کہا کہ: اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ۔ وَيُسَبِّحُوْنَہٗ وَلَهُ يَسْجُدُوْنَ (۲۵۶)۔ خدا کے ہاں، کوئی شے اس کی اطاعت سے کبھی سرکشی نہیں برتتی۔ وہ سب اپنے اپنے فرائض کی تکمیل کے لئے ہر وقت سرگرم عمل رہتی ہیں اور خدا کے احکام کے سامنے سجدہ ریز۔“

دنیائے انسانیت میں یہی حکم، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے، جماعتِ مومنین کو دیا گیا جہاں کہا گیا: فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (۵۶) ذ (۵۶) ذ (۵۶)۔ یعنی ”تم خدا کی عظیم صفت ربوبیت کو عملاً مشہور کرنے کے لئے سرگرم عمل رہو“ سورۃ الحجر میں ہے: فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُن مِّنَ السَّاجِدِينَ (۱۵)۔ ”اپنے خدا کی صفت ربوبیت کو وجہ حمد و ستائش بنانے کے لئے سرگرم عمل رہو اور اس طرح ان لوگوں کے زمرہ میں شریک ہو جاؤ جو خدا کی محکومیت اختیار کئے ہوئے ہیں“ یہی جماعتِ مومنین کا شعار بتایا گیا ہے (۱۵)۔ یہ پروگرام اتنا طول طویل، صبر آزما اور دشوار گزار تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا گیا کہ آپ اس (پروگرام) کی تفصیل اور جزئیات پر غور و فکر کرنے کے لئے راتوں کو زیادہ نہ جاگا کریں۔ اس لئے کہ: اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا (۳)۔ ”تمہارا سامنے دن بھر کا جو پروگرام ہوتا ہے وہ بڑا فرصت طلب ہوتا ہے“ یہاں بھی سَبْحًا کے معنی واضح ہو جاتے ہیں لیکن اس کے صبر آزما ہونے کے لئے، یہ لفظ جہاں کش کش صاحبِ ضربِ کلیم اور فرعون کے سلسلہ میں آیا ہے وہ بڑا حقیقت کش ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ: اِذْ هَبْ اِلٰیٰ ذُرْعُوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی (۲۴)۔ ”تم فرعون کی طرف جاؤ کہ وہ بڑا ہی سرکش اور مستبد ہوتا جا رہا ہے۔ اسے اس کی ان بیباکیوں سے روکو“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس عظیم مہم کی دشوار گزاریوں کے پیشِ نظر چند ایک درخواستیں پیش کیں اور ان کے ساتھ یہ بھی کہا کہ میرے ساتھ

میرے بھائی ہارون کو بھی بھیج دیجئے تاکہ وہ اس پروگرام میں میرا مددگار بنے۔ اور اس کے بعد ہے۔ کُنْ تَسْبِيحًا
تسبیح اور ذکر کَثِيرًا ذَنْدُ كُرْكَ كَثِيرًا (۳۳:۳۳)۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "تاکہ ہم وہاں
 تیری بہت زیادہ تسبیح کریں اور بہت زیادہ ذکر کریں" اور تسبیح اور ذکر کا جو عام مفہوم ہمارے
 لیا جاتا ہے وہ معلوم ہے۔ اس مفہوم کے پیش نظر سوچتے کہ کیا اس مہم کے سر کرنے کے لئے یہی کچھ کرنا تھا کہ فرعون کو
 الٹی میٹم دینے کے بعد، یہ دونوں بھائی اس کے دربار میں پہنچ کر تسبیح پھیرنے لگیں اور "ہو حق" کی ضربیں لگائیں
 لیکن تسبیح کا جو قرآنی مفہوم اوپر بیان کیا گیا اس سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ تائید اور
 امداد اس لئے مانگی تھی کہ وہ اس پروگرام کی تکمیل کے لئے زیادہ قوت اور شدت کے ساتھ سرگرم عمل ہوں اور ایک ایک
 قدم پر اپنی راہنمائی کے لئے خدا کے قوتوں کو اپنے سامنے لائیں۔ (ذکر کا یہی مفہوم ہے۔ تفصیل اس کی اپنے مقام پر ملے گی)۔
 واضح رہے کہ جن معانی میں تسبیح کا لفظ ہمارے ہاں مروج ہے، یہ شے (یعنی دانے پر دوئی ہوئی تسبیح) عربوں کے
 ہاں غیر معروف تھی۔ اس کا عیسائی راہبوں کے ہاں رواج تھا جنہوں نے اسے غالباً بدھ مت والوں سے لیا تھا۔ نیز
 گنتی (یعنی اتنی دفعہ یہ پڑھو، اتنی دفعہ یہ) کا تصور یہودیوں کے ہاں عام تھا۔ جو ہندسوں کے باطنی معانی پر عقیدہ
 رکھتے تھے۔ درد و ظائف، گنڈے تعویذ، اسم اعظم وغیرہ سب انہی کی اختراعات ہیں۔ یہ بہر حال ایک الگ موضوع ہے۔
 اس مقام پر ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دین کے تصورات و نظریات "مذہب" میں آکر کیا سے کیا ہو جاتے ہیں۔

سُبْحَانَ اللَّهِ قرآن کریم میں "سبحان اللہ" کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ مثلاً سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُصِفُونَ (۱۵:۱۵)۔
 دُورِ کے اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ذاتِ خداوندی کے متعلق انسانی ذہن

جو تصورات بھی قائم کرے، وہ (خدا) اس سے بہت دور، بلند و بالا اور "درامہ الوار" ہے۔ سعدی کے الفاظ میں:

لے برتر از خیال و قیاس و گمان و دہم دہر چہ گفتہ ایم و نویسیم و خواندہ ایم
 دفتر تمام گشت و بیایاں رسیدہ ماہم چنان بہ اول و صف تو ماندہ ایم

ملائکہ نے دوسرا لفظ حَقْدَسْ کہا تھا۔ اس مادہ (ق۔د۔س) کے معنی ہوتے ہیں دور تک چلے جانا۔ اور
 اسی سے قَدَّسَہ کے معنی ہیں "اس نے اس کے تمام نقائص و اسقام کو دور کر دیا" اس لحاظ سے خدا کی صفت
 قَدَّوْسٌ (۵۹:۶۲) کے معنی ہیں ہر قسم کے نقائص و اسقام سے دور اور منزہ۔
 تسبیح و تقدیس کے ان معانی کی رُو سے ملائکہ نے کہا یہ کہ ہمارے ذمہ جو فرائض عائد کئے گئے ہیں، ہم ان کی ادائیگی کے

لتے ہمیشہ سرگرم عمل رہتے ہیں اور اس کے لئے ہمیں جہاں تک بھی جانا پڑے، جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کائنات میں اس نئی مخلوق کی ضرورت کیا ہے — غالبِ حسد کے بغیر کون سے کام بند ہیں؟ —

یہ تو تھا ملائکہ کے ردِ عمل کا مثبت پہلو۔ منفی طور پر انہوں نے کہا کہ جو مخلوق زیرِ تکوین ہے اس کے متعلق تو ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھ سکے کہ: **يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ** | **فساد انگیزیاں اور خون ریزیاں** | **الَّذِينَ آمَنُوا (۲۰۰)۔** ”وہ (آدم) زمین میں فساد مچائے گا اور خون

ریزیاں کرے گا۔“ بارگاہِ خداوندی سے اس کی تردید نہیں کی گئی۔ کہا صرف یہ گیا کہ **إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (۲۰۱)** میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔“ آگے بڑھنے سے پہلے، ہم اس ارشادِ خداوندی کے حسنِ لطافت کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ اللہ تعالیٰ جیسے قادرِ مطلق اور صاحبِ ملکوت و جبروت کے کسی پر دگام پر ملائکہ جیسی مخلوق کی طرف سے اس قسم کا اعتراض یا ردِ عمل کس قسم کی سرزنش (بلکہ سزا) کا مستوجب ہونا چاہئے تھا؟ کوئی دنیاوی حاکم ہوتا تو اپنے زیرِ دستوں کی اس قسم کی گستاخی کے جواب میں انہیں سولی پر ٹانگ دیتا یا ان کی کھال کھینچوا دیتا۔ ساحرین دربارِ فرعون کا اتنا ہی جرم تھا کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیش کردہ صداقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ فرعون کی طرف سے اس کے خلاف کس قسم کے ردِ عمل کا اظہار ہوا تھا۔ اس نے گرج کر کہا تھا کہ ہیں! تم میری اجازت کے بغیر ہی ربِّ موسیٰؑ دہاروئے پر ایمان لے آئے ہو! تم دیکھو! کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں کٹوا کر تمہیں سوئی کٹکاؤں گا (۲۰۲) ایک فرعونِ مصر پر ہی کیا موقوف ہے! ایسے مقام پر دنیا کے ہر فرعون کی طرف سے اسی قسم کے ردِ عمل کا مظاہرہ ہوگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے نہ کسی قسم کے غصہ کا اظہار کیا نہ ملائکہ کی زبردستی کی، کہا تو صرف اتنا کہ تم نے جو کچھ سمجھا ہے، تمہاری کوتاہی علم کا نتیجہ ہے۔ تمہارا علم محدود ہے۔ تم اپنے علم کی بنا پر یہاں تک دیکھ اور سوچ سکتے ہو۔ تم اس باب میں معذور ہو۔ لیکن ہماری نگاہ اس سے بہت آگے جاتی ہے۔ ہم ابھی تمہارے علم میں اضافہ کر دیں گے اور اس کے بعد تم دیکھ لو گے کہ اس نئی مخلوق کی خصوصیات کیا ہیں اور اس کی تخلیق کی ضرورت کیوں پیش آرہی ہے — لیکن یہ بات ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔ سرِ دست آپ ملائکہ کے پیش کردہ اعتراض کی طرف آئیے۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ نئی مخلوق دنیا میں فساد مچائے گی اور خونریزیاں کرے گی۔

’فظِ فساد کی تشریح کے سلسلہ میں اس کتاب کی جلد اول میں زیرِ آیات (۲۰۲) تفصیل سے لکھا جا چکا ہے

میں وہی اصول کار فرماتا تھا جس کی رو سے دنیا کو آزاد قومی مملکتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور جس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مختلف مملکتیں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی فکر کرتی ہیں۔ اور اس طرح ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ ان حالات میں کبھی صالح معاشرتی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ اور رونا صرف یہی نہیں کہ یہ دو عالمگیر لڑائیاں کیوں ہو گئیں۔ رونا تو اس بات کا ہے کہ جب دنیا میں جنگ نہیں ہو رہی ہوتی، تو اس وقت بھی امن قائم نہیں ہو سکتا۔

(THE STATE OF THE WORLD - P. 11-12.)

یہی مفکر آگے چل کر لکھتا ہے کہ ”نیشنلزم، انسانی تاریخ میں سب سے بڑا مفسدہ ہے۔ اس نے کلاس سے پہلے کوئی فساد اٹھاتا نہ عالمگیر ہوا کرتا تھا، نہ انسانی زندگی کو کلی طور پر محیط ہٹا۔“
ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ فساد اور خون ریزی میں باہمی کیا تعلق ہے۔ اور ملائکہ نے انسانی تاریخ کے کس بڑے مفسدہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

جہاں تک جنگ (یعنی قوت کے استعمال) کا تعلق ہے، سیاست نے ایسا نظریہ یا عقیدہ پیش کیا جس کی رو سے قوت کا استعمال کسی حالت میں بھی جائز قرار نہ دیا گیا۔ اس نے اس کی بجائے رحم کا تصور پیش کیا جس کی رو سے یہ کہا گیا کہ اگر کوئی دست دراز تمہارے ایک گال پر پٹا بچہ مارے تو بجائے اس کے کہ تم اس کا ہاتھ روکو، اور اگر اس پر بھی باز نہ آئے تو اس کی کلائی مروڑ کر رکھ دو، تم اپنا دوسرا گال اس کے سامنے کر دو مگر کوئی تمہاری داسکٹ اتارے تو تم اپنا کرتہ خود اتار کر اس کے حوالے کر دو۔ یعنی عیسائیت میں عدل اور نظام عدل قائم کرنے کے لئے قوت کے استعمال کا تصور ہی نہیں۔ یہ خدا کی طرف سے دی گئی

عیسائیت اور جنگ

نہیں۔ ان کی خود سخت تعلیم ہے۔ اس تعلیم کا نتیجہ کیا ہے، اس کے متعلق بھی ہم سے نہیں خود مغرب کے دانشوروں نے پوچھے۔ مشہور مفکر رابرٹ بریٹفون نے اپنی شہرہ آفاق کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) میں ہسپانیہ

سورۃ قرآن کریم نے قوموں کے باہمی فساد کا جذبہ محسوس کر ہی بتایا ہے۔ جہاں کہا ہے: تَتَّخِذُونَ أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ أَنْ تَكُونَ أُمَّةٌ هِيَ أَدْبَىٰ مِنْ أُمَّةٍ (۱۶)۔ ”تم آپس کے معاہدات کو بھی فریب دہی کا ذریعہ بنا لیتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے آگے بڑھ جائے۔“

۱۶۔ ان امور کی مزید تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب — انسان نے کیا سوچا — باب سیاسیات

کے پروفیسر (DR. FALTA DE GRACIA) کا ایک اقتباس نقل کیا ہے، جس میں وہ کہتا ہے :-

عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامافوس ہے جس طرح زمینی دیانت کا۔ یہ اس کے تصور اخلاق سے یکسر باہر کی شے ہے۔ عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے جن پر ظلم و ستم ہوں لیکن خود ظلم و ستم سے ہمیشہ چشم پوشی کی ہے۔ اس نے ان لوگوں کو، جو ظلم و استبداد کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہوں، جنہیں مصائب و شدائد کے ہجوم نے گھیر رکھا ہو، آئینِ محبت کی تعلیم دی ہے۔ انہیں رحم و عفو کا سبق سکھایا ہے، انہیں خدا کی ابویت یاد دلاتی ہے۔ لیکن مذہب اور اخلاق کے اس ہجوم میں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اخلاقی ضوابط کی معراج کبریٰ ہے، عام انصاف اور عام دیانت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ مسیح مقدس "جو و استبداد" کے ستارے انسانوں کے درمیان آسمان سے اترتا ہوا فرشتہ دکھائی دیتا ہے لیکن اس جو و استبداد کی علت معلوم کرنا اُس کے دائرہ شعور سے باہر ہے۔ خیر و شر کا صحیح تصور اس کے حیطہ نگاہ سے خارج ہے۔ یہ ظلم و ستم اس کے نزدیک خدا کی طرف سے گناہگاروں کے لئے ابتلا و آزمائش ہے۔ نظامِ عالم کا خاصہ ہے۔ اس حکومتِ خداوندی کا فیصلہ ہے جو دنیا میں خدائی حقوق کی بنا پر قائم ہے۔

(P.P. 332-333)

اسی بنا پر عصرِ حاضر کا عظیم مفکر (WHITE-HEAD) لکھتا ہے کہ :-

انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے اُسے اگر موجودہ معاشرہ میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

(ADVENTURES OF IDEAS—P. 18)

عیسائیت کی اسی تعلیم اور اس کے بے پناہ پروپیگنڈہ کا اثر ہے کہ اسلام کے خلاف اس قسم کے اعتراضات عام ہوتے چلے آ رہے ہیں کہ یہ خون ریزیوں کا مذہب اور جنگ و قتال کا دین ہے۔ ان اعتراضات اور اسلام کی صحیح تعلیم کے متعلق تو ہم آگے چل کر تفصیل سے لکھیں گے جہاں جہاد کے متعلق گفتگو کی جائے گی۔ یہاں اتنا بتادینا کافی ہوگا کہ قوت کا استعمال ہر مقام پر ممنوع قرار نہیں پاسکتا۔ اور یہ وہ حقیقت ہے جس کا انکشاف، ہمارے دور کے علم النفس (سائیکالوجی) نے بڑی عمدگی سے کیا ہے۔ مثلاً (ERICH FROMM) اپنی کتاب میں جذبہ تغلب (AGGRESSION) یعنی قوت کے استعمال پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ سمجھنا غلط ہے کہ تغلب ہر قسم کا ناجائز اور غلط شرفِ انسانیت ہے۔ تغلب کی دو قسمیں ہیں۔ یعنی (BENIGN AGGRESSION) جائز

تغلب کی دو قسمیں

اور (MALIGNANT AGGRESSION) مذموم۔ شیر اگر فطرت کے تقاضے کے مطابق اپنی بھوک مٹانے کے لئے ہرن پر حملہ کرتا ہے تو یہ کوئی جرم یا ناجائز فعل نہیں۔ لیکن اگر کوئی شکاری (بھوک کے لئے نہیں بلکہ) محض تفریح کی خاطر ہرن پر گولی چلاتا ہے تو اخلاقی ضابطہ نگاہ سے یہ مذموم تغلب ہو گا۔ اگر کوئی ظالم کسی مظلوم کے سینے میں پھرا گھونپنے کیلئے ہاتھ اٹھاتا ہے تو اس کا یہ اقدام مجرمانہ ہے لیکن اگر کوئی شخص اس مظلوم کی جان بچانے کے لئے اس ظالم کی کلائی مردرد دیتا ہے، یا اس کی مزاحمت پر اسے گولی مار دیتا ہے، تو یہ تغلب نہ صرف یہ کہ ناجائز نہیں بلکہ انسانیت کی حفاظت کیلئے ضروری بھی ہے۔

قرآن اور قوت کا استعمال:

اور یہی ہے وہ تغلب جس کی قرآن کریم نے نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ عند الضرورت اس کی تاکید بھی کی ہے۔ قرآن کریم کے نزدیک انسانی جان کی قیمت کتنی بڑی ہے، اس کے متعلق اس نے کہا ہے کہ: مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ - فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا (۳۳)۔ ”یاد رکھو! جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق ہلاک کر دیا (یعنی بجز اس کے کہ اسے جرم قتل کی سزا کے لئے ہلاک کیا جائے یا فساد کو روکنے کی خاطر) تو یوں سمجھئے گویا اس نے پوری نوع انسان کو ہلاک کر دیا۔ وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا (۳۴)۔ ”اور جس نے کسی ایک کی جان کو بھی ہلاکت سے بچا لیا تو یوں سمجھئے گویا اس نے تمام نوع انسان کو زندگی عطا کر دی“ ایک طرف تو اس کے نزدیک انسانی زندگی کی یہ قدر و قیمت ہے، لیکن دوسری طرف وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کوئی سرکش اور مستبد انسان، یا انسانوں کا گروہ، مظلوم اور کمزور انسانوں پر گونہ عافیت تنگ کر دے اور ان کی ہلاکت و تباہی پر اتر آئے تو اسے اس ظلم و استبداد سے روکنے کے لئے پہلے سمجھنا چاہئے، اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئے تو قوت کے زور سے اسے اس دراز دستی سے روک دینا چاہئے۔ قرآن کی اصطلاح میں اس قسم کی جنگ کو قتال فی سبیل اللہ (یعنی نوع انسان کی حفاظت کے لئے اللہ کی راہ میں جنگ) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ سورۃ بقرۃ میں ہے کہ: وَكُلًّا دَفَعَ اللَّهُ النَّاسَ بَعْضُهُمْ بِبَعْضٍ تَفْسَدَاتِ الْأَرْضِ - وَلَئِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ (۲۵۱)۔ ”اگر خدا ایسا انتظام نہ کرے (یعنی اس کی اجازت نہ دے) کہ ظلم و ستم کرنے والے افراد کی روک تھام، انصاف پر درگروہ، قوت کے زور سے کریں، تو کرة ارض پر فساد ہی فساد برپا ہو جائے۔ لیکن خدا نوع انسان کو اپنے سایہ عاطفت میں رکھنا چاہتا ہے اس لئے اس نے عدل پر در انسانوں کو تاکید کر رکھی ہے کہ وہ ایسے مقام پر پوری پوری قوت سے کام لیں اور ظالموں کے ظلم کو روک دیں“ اس نے جماعتِ مومنین کو، جہاں پہلی بار جنگ کی اجازت دی ہے، تو وہ بھی ایسا ہی موقعہ تھا۔ اور اس میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ: وَكُلًّا دَفَعَ اللَّهُ النَّاسَ بَعْضُهُمْ بِبَعْضٍ لَهْدًا مَّتَّ حَوَامِعُ وَبِيعَ

وَصَلَوۡۃٌ وَمَسْجِدٌ يُذْکَرُ فِیْہَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا۔ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنۡ یَّشَآءُ۔ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیُّ عَزِیْزٌ (۲۲)۔ اگر خدا ایسا انتظام نہ کرتا کہ انسانوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کے جوہر و ستم کی روک تھام کر سکے تو دنیا سے مذہبی آزادی کا خاتمہ ہو جاتا اور یہود و نصاریٰ کی خالقائیں اور یہودیوں کی پرستش گاہیں اور مسلمانوں کی مساجد سب منہدم ہو جاتیں۔ لیکن خدا نے ایسی جماعت (امت مسلمہ) اٹھا کھڑی کی ہے جو اس قسم کے سرکش گروہوں کی روک تھام کا انتظام کرے گی۔ اور چونکہ ان کا یہ عمل خدا کے متعین کردہ پروگرام کی خاطر ہوگا اس لئے خدا بھی ان کی مدد کرے گا۔ وہ بڑی قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے۔“

اسی سلسلہ میں اس نے دوسری جگہ کہا ہے کہ جماعت مومنین کا فریضہ ہے کہ کوئی مظلوم اُسے کہیں سے بھی مدد کے لئے پکارے وہ اس کی مدد کو پہنچیں۔ ظالم کے تیردوں کے سامنے سینہ سپر ہو کر کھڑے ہو جائیں۔ اپنی جانیں دے دیں تاکہ ان مظلوموں، کمزوروں اور ناتوانوں کی جانیں بچ جائیں (۲۷)۔ اس قسم کی جنگ میں دونوں فرجیں اُسے سامنے کھڑی ہوں گی اور سطحی نگاہ سے دیکھنے والے اُسے ان کی باہمی جنگ قرار دیں گے۔ لیکن قرآن کریم نے ایک گروہ کے متعلق کہا ہے کہ ان کی یہ جنگ ”قتال فی سبیل اللہ“ ہے اور دوسرے گروہ کی جنگ ”قتال فی سبیل الطاغوت“ (۲۹)۔ اسی کو (ERICH FROMM) نے (BENIGN AGGRESSION) اور (MALIGNANT AGGRESSION) کی اصطلاحات سے تعبیر کیا ہے۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ بارگاہِ خداوندی سے ملائکہ کو جواب ملا کہ ہمارے مقابلہ میں تمہارا علم محدود ہے اس لئے تم نہیں جانتے کہ اس نئی مخلوق کی کیا خصوصیات ہیں۔ اسے ہم جانتے ہیں۔ اگر بات کو یہیں چھوڑ دیا جاتا تو ظاہر ہے کہ اس سے بھی ملائکہ کو کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن بارگاہِ خداوندی نے مناسب سمجھا کہ ملائکہ پر واضح کر دیا جائے کہ خود ان کے مقابلہ میں اس نئی مخلوق کی قوتوں کی کیا کیفیت ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم میں ہے :-

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا، ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔

۲۱
۳۱

آیت کے پہلے چار الفاظ کا عام ترجمہ یہ ہے کہ ”خدا نے آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھا دیئے“ جہاں تک عَلَّمَ کا تعلق ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا نے آدم کو یہ سب کچھ خود سکھا دیا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے انسان میں اس قسم کی صلاحیت رکھ دی جس کی بناء پر اس کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ ان کا علم حاصل کر سکے۔

علم الاسماء

علم کس چیز کا؟ تمام کی تمام اشیائے کائنات کے اسماء کا۔ اس میں اسماء کا لفظ قابل غور ہے۔ اسماء اسم کی جمع ہے جس کا مادہ (س۔م۔و) ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہیں کسی شے کی وہ خصوصی علامت، جس سے وہ شے پہچانی جاسکے اور دوسری اشیاء سے متمیز ہو سکے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی شے کا محض نام جاننا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا تاوقتیکہ ہم اُس شے کو پہچان نہ سکیں اور اس کی خصوصیت کا علم نہ ہو جو اسے دوسری چیزوں سے متمیز کرتی ہے۔ اسی لئے صاحب مفردات (امام راغب اصفہانی) نے اس لفظ (اسماء) پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب تک مستمی کا علم نہ ہو اس کے اسماء کا علم کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ یعنی جب ہم پانی کہیں تو ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کیا شے ہے اور اس کی خصوصیات کیا؟ اس اعتبار سے دیکھئے تو نام (اسماء) بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ آپ سوچئے کہ اگر مختلف اشیاء کے اپنے نام نہ ہوں، یا ہمارے سامنے ایسی چیزیں رکھی ہوں جن کے ہم نام نہ جانتے ہوں تو اس سے کتنی دشواری پیدا ہو جاتے گی۔ یہی وجہ ہے کہ سائنسدان جب کوئی نیا انکشاف یا کوئی نئی شے ایجاد کرتے ہیں تو اس کا کوئی نہ کوئی نام ضرور رکھتے ہیں۔ اس باب میں ایک مغربی ڈاکٹر کہتا ہے کہ:-

آدم پر تمام زندہ اشیاء کا نام رکھنے کی ذمہ داری عائد کی گئی۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری اور مشکل کام تھا۔ اس لئے کہ جن چیزوں کا نام نہیں رکھا جاتا ان کے خواص بھی غیر متعین رہ جاتے ہیں۔ اور جن چیزوں کے غلط نام رکھے جاتے ہیں اُن سے بڑے نقصان پہنچتے ہیں۔ لہ

لہذا علم الاسماء کے معنی ہیں اشیائے کائنات کی ماہیت، کیفیت، خواص اور متمیزات کا علم۔ بالفاظ دیگر علوم طبیعی کی تحصیل کی صلاحیت جس میں علوم سائنس کے تمام گوشے آجاتے ہیں۔

ضمناً ڈاکٹر (TYLER) نے کہا ہے کہ غلط نام رکھنے سے بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ طبیعی دنیا میں اس سے کس کس قسم کے نقصانات پہنچتے ہیں، اس سے قطع نظر، معتقدات کی دنیا میں یہ چیز کس قدر گمراہی اور بناہی کا باعث بنتی ہے وہ بھی بالکل واضح ہے۔ قرآن کریم نے کفار یا مشرکین سے کہا ہے کہ جنہیں تم اپنا معبود سمجھتے ہو وہ بجز ایں نیست کہ اَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا اَنْتُمْ وَ

غلط ناموں کی تباہ کاریاں

اَبَاءُكُمْ (۲/۱۱۱)۔ یونہی کچھ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھے ہیں، یہ درحقیقت وہ نہیں۔ تم انہیں خدا کہتے ہو، یہ خدا نہیں۔ تم انہیں معبود سمجھتے ہو یہ معبود نہیں۔ تم نے ان کے یہ غلط نام رکھ چھوڑے ہیں۔ مَا اَنْزَلَ

اللہُ بِہَا مِنْ سُلْطٰنٍ (۱۲)۔ ”خدا نے اس کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی۔“ اس سے ظاہر ہے کہ معتقدات کی دنیا میں کسی کا نام رکھنے کے لئے بھی خدائی سند کی ضرورت ہوگی۔ یہ جو ہمارے ہاں بڑے بڑے آستانے، مزارات اور درگا ہیں سجدہ گاہ، نام بن رہی ہیں، ان کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے بڑے بڑے نام رکھ دیئے گئے ہیں اور ان ناموں کو شہرت دے دی گئی ہے۔ اگر ان کے ایسے نام نہ رکھے جلتے اور ان کے لئے ایسا پراپیگنڈا نہ کیا جاتا تو وہ مٹی کے ڈھیر اور پتھر کے تودوں سے زیادہ کچھ حیثیت نہ رکھتے۔ آپ ایسے قبرستانوں سے آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں جن میں کسی قبر کا بڑا نام نہ رکھا گیا ہو یا اس پر رفیع الشان عمارت نہ تعمیر کی گئی ہو۔ لیکن جہاں کسی قسم کا مقدس نام ہو، یا بلند اور پر شوکت عمارت، تو وہ آپ کے لئے مرکز توجہ اور داعی سجدہ بن جاتا ہے۔ انہیں محض قبریں کہتے (یعنی انہیں ان کے اصلی نام سے پکار دیتے)۔ وہ کبھی وجہ جس ساقی نام نہیں بن سکیں گی۔ یہ بہر حال ضمنی گوشہ تھا۔ اب پھر اصل موضوع کی طرف آئیے۔

کہا یہ گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں اشیائے کائنات کی ماہیت معلوم کرنے کی صلاحیت رکھ دی۔ اسے قوانین فطرت کا علم کہا جائے گا۔ انسان جن اشیائے فطرت کے خواص و ماہیت کا علم حاصل کر لیتا ہے اور وہ قوانین معلوم کر لیتا ہے جن کے تابع وہ سرگرم عمل رہتی ہیں، وہ اشیاء اس کے تابع تسخیر ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ ان سے جو چاہے کام لے سکتا، یہی وہ عظیم حقیقت ہے جس کی وضاحت کے لئے قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر یہ کہا ہے کہ خدا نے اشیائے کائنات کو انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ یعنی انہیں غیر متبدل قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ جب انسان ان قوانین کا علم حاصل کر لیتا ہے تو وہ ان اشیاء کی مضر قوتوں کو مسخر کر لیتا ہے اور اس سے مختلف فائدے اٹھاتا ہے۔ کہیں اس نے کہا ہے کہ اس نے تمہارے لئے چاند اور سورج کو مسخر کر دیا (۱۴) کہیں کہا

تسخیر فطرت

ہے کہ رات اور دن کو مسخر کر دیا۔ (۱۴/۱۲ ذ ۳۹/۳۵ ذ ۳۹)۔ کہیں یہ کہ تمہارے لئے دریاؤں، سمندروں اور ان میں چلنے والی کشتیوں کو مسخر کر دیا۔ (۱۴/۱۲ ذ ۳۹/۳۵ ذ ۳۹) اس طرح متفرق اشیاء کا ذکر کرنے کے بعد جامع طور پر کہا کہ: سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ (۲۲) ”جو کچھ زمین میں ہے اس سب کو تمہارے لئے مسخر کر دیا“ کہیں کہا کہ: سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (۲۱)۔ ”کائنات کی پستیوں اور بلندیوں، ارض و سموت میں جو کچھ ہے، اُسے تمہارے لئے مسخر کر دیا“ اور سورۃ جاثیہ میں اسے جامع حیثیت سے ان الفاظ میں بیان کر دیا کہ: وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۲۵)۔ ”ارض و سموت میں جو کچھ ہے، اس سب کو من جانب اللہ تمہارے

لئے تسخیر فطرت کے متعلق پہلے باب میں بھی ضمنی اشارت آچکے ہیں۔ اس جگہ اُس اجمال کی تفصیل دی جاتی ہے۔

لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں حقیقت تک پہنچنے کی ٹہنی نشانیوں ہیں۔

اس آیت میں لفظ جَمِيعًا، اُس لفظ کٹھا کی تفسیر ہے جو (۲/۲۱۱) میں اوپر آچکا ہے۔ ذرا اس کی وسعت کو تصور میں لائیے۔ کہا یہ گیا ہے کہ کائنات کی جملہ موجودات کی کیفیت و ماہیت اور ان کے خواص و خواہر کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت انسان میں رکھ دی گئی ہے۔ پہلے تو مجملاً اس کائنات کو لیجئے جس کی وسعتوں اور پہنائیوں کے تصور سے بھی انسانی فکر عاجز آ جاتی ہے۔ اور پھر اس میں جس قدر گونا گوں اشیاء ہیں (یعنی فطرت کی قوتیں اور ان کے مظاہر) انہیں تصور میں لائیے۔ اور اس کے بعد سوچئے کہ انسانی علم کے امکانات کس قدر لا محدود اور نابید کنار ہیں۔ ہم اپنے دور کو سائنس کے انکشافات کی گویا معراج کبریٰ سمجھتے ہیں لیکن ہمارے سائنسدانوں کو خود اس کا اعتراف ہے کہ ہم رنیوٹن کے الفاظ میں ”علم کے سمندر کے کنارے بچوں کی طرح سیپ اور گھونگھے اکٹھے کرنے سے آگے نہیں بڑھ پاتے“ (HAECKEL) اپنی کتاب (RIDDLES OF THE UNIVERSE) کے آخری باب میں لکھتا ہے کہ:-

ہمیں اس امر کا اعتراف کر لینا چاہئے کہ نیچر کی کنہ و حقیقت سے ہم آج بھی اسی قدر بے خبر ہیں جس قدر آج سے دو ہزار چار سو سال پیشتر حکمائے یونان، یا دو سو سال پہلے نیوٹن اور اسپینوزا، یا سو سال پہلے کائنات اور گوتے بے خبر تھے۔ ہمیں تو بلکہ اس امر کا بھی اعتراف کر لینا چاہئے کہ ہم جس قدر اس جوہر کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے کائنات مرکب ہے۔ اور مادہ اور توانائی، جس کے خصائص ہیں، وہ اوجہ بنتا جا رہا ہے۔ ہم اس کی محسوس شکلوں کا اور ان کی ارتقائی منازل کا علم تو حاصل کر سکتے ہیں، لیکن ان محسوس شکلوں کے پیچھے جو اصل حقیقت ہے اس کے متعلق ہم کچھ بھی نہیں جان سکتے۔ (PAGE-310)

سر جیمز جینز ہمارے دور کا علم الافلاک کا سب سے بڑا ماہر تسلیم کیا جاتا ہے وہ اپنی مشہور کتاب (THE MYSTERIOUS UNIVERSE) کے خاتمے پر لکھتا ہے کہ:-

جو کچھ کہا گیا ہے اور جو نتائج تجربتاً پیش کئے گئے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ وہ تمام محض قیاسی اور غیر یقینی ہیں۔ ہم نے اس مسئلہ پر بحث کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیا عہد حاضر کی سائنس ان مشکل مسائل کے متعلق، جو ہمیشہ کے لئے ماورائے سرحد ادراک رکھے گئے ہیں، کچھ کہہ سکتی ہے؟ ہم زیادہ سے زیادہ روشنی کی ایک مدہم سی کرن دیکھ پاتے ہیں۔ اس سے زیادہ ہم کوئی دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ کرن بھی فریب نگاہ ہی ہو۔ اس لئے کہ اس باب میں ہمیں کچھ دیکھنے کے لئے اپنی آنکھوں پر بہت بوجھ ڈالنا پڑتا ہے۔ سو آج

یہ دعویٰ قطعاً نہیں ہو سکتا کہ دورِ حاضرہ کی سائنس کوئی یقینی اعلان کر سکتی ہے۔ بلکہ انب یہ ہے کہ سائنس کو چاہئے کہ اس قسم کے اعلان کرنا چھوڑ دے۔ علم کے دریا کا رخ اکثر اوقات پیچھے کی طرف لوٹتے بھی گیا گیا ہے۔

سائنسدانوں کے اس قسم کے اعترافات و اعلانات کے پیشِ نظر شاید کوئی سطح میں مایوس ہو کر بیٹھ جائے کہ جب اشیاء کائنات کی کنہ اور حقیقت اور خواص و متمیزات کے متعلق علم حاصل کرنا ہمارے لئے ممکن ہی نہیں تو اس کے لئے اس قسم کی جانکاہ کوششوں سے فائدہ کیا ہے۔ لیکن تیسرے ان کریم کا طالب علم تو نہ ایسا کہہ سکتا ہے اور نہ اس طرح مایوس ہو کر بیٹھ سکتا۔ اس لئے کہ اس کے خدا کا ارشاد ہے کہ: عَلَّمَہَا اَدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّہَا (۲/۳۱)۔ ”آدمی میں تمام اشیاء کائنات کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت ودیعت کر کے رکھی گئی ہے“ لہذا اس کا ایمان یہ ہو گا کہ انسان ان کوششوں میں آگے بڑھتا جائیگا اور اشیائے فطرت (کُلُّہُمْ) کا علم حاصل کر کے رہے گا۔ اس ضمن میں (SIR FRANCIS YOUNG HUSBAND) کا ایک اعلان بڑا حقیقت کشا، بصیرت افروز اور امید افزا ہے۔ اس نے (THE MYSTERY OF NATURE) کے عنوان سے ایک حقائق پرور مقالہ لکھا ہے جو مشہور کتاب (THE GREAT DESIGN) میں شامل ہے۔ وہ اپنے مقالہ کے آخر میں لکھتا ہے:-

سائنس سے ہم آخر الامر جو سبق سیکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ علم کوئی انتہاء نہیں۔ ہمیں سائنس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ ہم فطرت کے متعلق سب کچھ معلوم نہیں کر سکیں گے۔ جو علم ہم حواس کے ذریعے حاصل کرتے ہیں، اس کی بھی کوئی انتہاء نہیں۔ محسوسات تو فطرت کی گہرائیوں کے بہت اچھے ہوئے جزیرے یا کنارے ہیں۔ ہم صرف فطرت کا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔ ہم اس چہرے کے بدے ہوئے آئناہ کا بھی مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ لیکن جوں جوں ہم ان گہرائیوں میں جاتے ہیں یہ حقیقت پختہ ہوتی جاتی ہے کہ ان کے پیچھے کوئی ایسی قوت ہے جو ہماری نگاہوں سے پنہاں ہے۔ اس قوت کو جاننے کی آرزو ہمارے دل میں ہمیشہ چمکتی رہے گی۔ لیکن یہ شاید کبھی معلوم نہیں ہو سکے گی۔

اس قسم کا احساس ہم پر مایوسی طاری کر دیتا لیکن ہمارا تجربہ یہ ہے کہ جوں جوں ہم اس سمندر کی گہرائیوں میں اترتے ہیں، ہمارے مسرت بڑھتی جاتی ہے۔ رموزِ فطرت ہمیں آوازیں دے دے کر آگے بلاتے ہیں اور ہم طوعاً و کرہاً ان کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اس کے بعد ہمیں اس تنگ و تنگ کا صلہ بھی مل جاتا ہے۔ ہم جتنا گہرائیوں میں جاتے ہیں اتنا ہی اپنے آپ کو بلندیوں پر پاتے ہیں۔ لہذا ہمیں اس میدان میں آگے ہی لگے بڑھتے

جانا چاہتے۔ اور ہم آگے بڑھتے جائیں گے، کبھی رک کر کھڑے نہیں ہوں گے۔ بلانے والے کی آواز میں کچھ ایسی دلکشی ہے کہ ہمارے قدم مجبوراً اس کی طرف اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ اور اٹھتے چلے جاتیں گے۔ (۲۵۴-۲۵۵)

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے تسخیرِ فطرتِ آدم (آدمی) کا فریضہ بتایا ہے۔ **یہ مقام آدم ہے**۔ یعنی یہ فقط مقامِ آدم ہے جس میں کافر اور مومن سب شامل ہیں۔ مقامِ مومن

اس سے بہت آگے ہے۔ جہاں تک مقامِ آدم کا تعلق ہے اس میں مومن بھی شریک ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہیں یہ کہا ہے کہ: **إِنَّ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّمُؤْمِنِينَ (۲۵۶)**۔ یہ حقیقت ہے کہ ارض و سموات میں مومنین کے لئے آیات ہیں۔ اس سے اگلی آیت میں ہے: **إِنَّ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ (۲۵۷)**۔ کہیں انہیں لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُتَّقُونَ (۲۵۸) کہا ہے۔ یعنی کائنات میں متقیوں کے لئے آیات ہیں۔ ان، اور اسی قسم کی دیگر آیات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے مومن اور متقی ہونے کیلئے تسخیرِ فطرت ضروری ہے۔ اس سے واضح ہے کہ جنہیں ہم علومِ سائنس کہتے ہیں ان کی تحصیل کے بغیر ایمان اور تقویٰ بھی مکمل نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے کائنات پر غور و فکر کی تاکید کے بعد کہا ہے کہ **تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ تَتْلُوهَا عَلَيْكَ الْحَقُّ (۲۵۹)**۔ یہ اللہ کی آیات ہیں جنہیں خدا حق نے ساتھ تیرے سامنے پیش کرتا ہے جو لوگ اس کے بعد بھی

حق پر ایمان نہیں لاتے ان سے پوچھو کہ: **فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَ اللَّهِ وَآيَاتِهِ يُؤْمِنُونَ (۲۶۰)**۔ یہ لوگ اللہ اور اس کی اس قسم کی آیات کے بعد اور کس چیز

پر ایمان لائیں گے؟ آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے اس مقام پر کتنی عظیم حقیقت بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا پر ایمان لانے کے دو گوشے ہیں۔ ایک اشیائے فطرت پر غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچنا کہ کائنات کے نظام کو ایک علیم و خبیر، مستی اپنے حکم، اٹل اور تعمیری قوانین کی رو سے چلا رہی ہے۔ اور دوسرے، خدا کی کتاب، قرآن کریم میں تفکر و تدبر۔ اسی اعتبار سے صحیفہ فطرت اور قرآن کریم دونوں کو ”خدا کی کتابیں“ کہا جاسکتا ہے۔ اول الذکر میں انسان کی طبعی زندگی کے متعلق رہنمائی ہے اور ثانی الذکر میں اس کی انسانی زندگی سے متعلق ہدایات۔ آپ صحیفہ فطرت کو کتاب اللہ (قرآن کریم) کا ضمیمہ کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قوانینِ فطرت بھی اسی خدا کے متعین فرمودہ ہیں جس خدا نے دوسرا مجموعہ قوانین، قرآن کے اندر عطا کیا ہے۔ بنا بریں قوانینِ فطرت کی تحقیق و کاوش بھی خدا کی ”عبادت“ کا ایک گوشہ ہے۔ یعنی اس کے متعین فرمودہ قوانین کی تحقیق اور ان کا اتباع۔ ہمارے ہاں جن لوگوں کو ”علماء“ کہا جاتا ہے ان کے مبلغِ علم کا ہر ایک کو علم ہے۔

انہیں نہ قوانینِ فطرت کا علم ہوتا ہے نہ قرآنی قوانین کا۔ قوانینِ فطرت کا تو بہر حال کچھ علم نہیں ہوگا۔ یہ ان کے دائرہ تعلیم میں داخل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن آپ دیکھئے کہ قرآن کریم علماء مرن لوگوں کو کہتا ہے۔ سورۃ فاطر میں ہے: **الَّذِينَ تَتَوَكَّلُ اللَّهُ**

مِنَ السَّمَاءِ مَاءً - فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهَا - وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيَضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا - وَغَرَابِيبُ سُودٍ (۳۵) ”کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ کا قانون کس طرح بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے انواع و اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ پھر تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ پہاڑوں میں کس کس انداز کے سرخ و سفید طبقات ہیں جن کے رنگ اور اقسام مختلف ہیں۔ ان میں بعض سرخ ہیں، بعض گہرے سیاہ رنگ کے اور اسی طرح دیگر مختلف رنگوں کی تھیں“ وَهِيَ النَّاسِ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَلِكَ (۳۸)۔ ”اور اسی طرح انسانوں اور دیگر جانداروں اور مویشیوں کے بھی مختلف اقسام ہیں“

آپ نے دیکھا کہ ان آیات میں کون کون سے امور کا ذکر ہو رہا ہے۔ کائنات کے مختلف گوشوں کا بساط فطرت کے متنوع شعبوں کا، سائنس کے مختلف علوم کا جن میں طبیعیات، نباتیات، حیوانیات، فضایات، ارضیات اور انسانیات کے تمام شعبے آ جاتے ہیں۔ ان علوم و فنون کے تذکرہ کے بعد فرمایا: إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ (۳۸)۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بندوں میں سے علماء ہی وہ ہیں جن کے دل پر اس کی عظمت و ہیبت چھا جاتی ہے۔ کیونکہ وہ علی و جبر البصیرت، اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ خدا کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے اور کس طرح اس عظیم کارگاہ کائنات کو ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھ کر اس کی منزل مقصود کی طرف لئے جا رہا ہے۔

ادریہاں سے ہماری شکر کا رخ ایک اور سمت کی طرف مڑ گیا۔ پہلے کہا گیا کہ علم، لاشیاء۔ مقام آدم ہے جس میں کافر اور مومن سب شریک ہیں۔ جو انسان بھی صحیح خطوط پر محنت اور کوشش کرے گا، فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے گا۔ سوال یہ ہے کہ پھر کافر اور مومن میں فرق کیا ہے؟ اور یہ فرق کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ یہ نکتہ غور طلب اور وضاحت کا متقاضی ہے۔

سیکولر ازم کے متعلق اس کتاب کی پہلی جلد میں تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے۔

کائنات کے متعلق سیکولر نظریہ (ملاحظہ ہوں آیات ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱

اور نگاہ کا زاویہ ہو غلط تو اس سے انسانیت کو جس قدر نقصان پہنچتا ہے، اس کی تلافی ممکن نہیں۔ اس سلسلہ میں افلاطون کی نمایاں مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس نے کائنات کے متعلق یہ باطل نظریہ پیش کیا، اور اس اڑھائی ہزار سال میں دنیا کی قریب قریب ہر قوم اس سے متاثر ہو گئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بجائے اس کے کہ انسان کائناتی قوتوں کو مسخر کرنے کی کوشش کرتا، وہ اسے محض وہم و خیال تصور کر کے اس سے بیگانہ ہو کر بیٹھ گیا۔ ہندوستان کی ویدانت نے اس کا بڑا گہرا اثر لیا اور اسے مذہبی تقدس کا رنگ دیکر یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ کائنات اپنا وجود نہیں رکھتی، وجود صرف برہما (خدا) کا ہے جس نے اشیائے کائنات کی شکل میں روپ دھار رکھا ہے۔ پراکرتی (مادی دنیا)

وحدت الوجود کا نظریہ

محض (یا) فریب) کا جال ہے۔ یہ ہندو دھرم کا تصوف تھا۔ اسی نے ہمارے ہاں وحدت الوجود کا لبادہ اڑھا اور اس تصوف کی بنیاد بنا جس کا بانی شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کو قرار دیا جاتا ہے۔ ابن عربی کی بھی یہی کیفیت تھی، کہ ذہن بڑا راست تھا اور نگاہ کا زاویہ غلط، وحدت الوجود کے فریب تخیل نے مسلمانوں جیسی ہمتی عمل و حرکت قوم کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ علامہ اقبالؒ نے اسی بت پر افلاطون کے متعلق لکھا ہے کہ :-

راہب دیرینہ افلاطون حکیم از گردہ گو سفندانِ متدیر
بر تخیل ہائے مافراں رواست جامِ او خوابِ آور و گیتی رباست
گو سفندے در لباسِ آدم است حکمِ او بر جانِ صوفی محکم است
قوم باز سکرِ او مسموم گشت خفت و اندوختِ عملِ محروم گشت

مغرب کے مادہ پرست

مغربی محققین و مفکرین نے افلاطون کی اس افیون سے پیچھا چھڑایا تو وہ افراط کی طرف نکل گئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ کائنات مادی ہے اور مادہ کے سوا کسی شے کا وجود ہی نہیں یہ کائنات کسی نہ کسی طرح محض ہنگامی طور پر وجود میں آگئی ہے۔ کچھ قوانین ہیں جن کی رو سے یہ ایک بے روح مشینری کی طرح مصروف حرکت ہے۔ اس کی نہ کوئی غرض و غایت ہے نہ منزل مقصود۔ نہ اس کے پیچھے کوئی بصیر و خیر قوت ہے نہ اس کے آگے کوئی دلیلِ راہ۔ کائنات کے متعلق اس قسم کا تصور مغربی محققین کا پیدا کردہ نہیں، یہ تصور بھی قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ مغربی محققین نے صرف اسے جلادی ہے اور (بزرگم خویش) اس کی تائید میں دلائل و شواہد پیش کئے ہیں۔ قرآن کریم نے کائنات کے متعلق ان ہر دو تصورات کی شدت سے تردید کی۔ اس نے کہا کہ یہ بھی غلط ہے کہ :-

ہستی کے مت فریب ہیں آجائیو اسد عالم تمام حلقہ دامِ خیال ہے

اور یہ کہنا بھی باطل ہے کہ نہ اس کے پیچھے کوئی علیم و خیر قوت ہے نہ اس کے سامنے کوئی غرض و غایت۔ اس کے برعکس اس نے اعلان کیا کہ:-

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا - ذَلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا -
فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ (۳۸)۔

”ارض وسموات اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اُسے ہم نے باطل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔“ **قرآنی نظریہ کائنات** کے مقابلہ میں لفظ حق آتا ہے۔ حق کے معنی ہیں کسی چیز کا اس طرح موجود، واقع اور

ثابت ہو جانا کہ اس کے واقع ہونے یا ثابت ہونے سے انکار نہ کیا جاسکے۔ حق، ہر ناقابل انکار حقیقت کو کہا جاتا ہے۔ نیز حق، اس نظریہ یا مسلمہ کو کہتے ہیں جو تعمیری نتائج پیدا کرے جو اپنی بکری ثابت، محکم اور امٹ ہو۔ باطل چونکہ حق کی ضد ہوتا ہے اس لئے اس کے معنی ہوں گے ایسی شے جو فی الواقعہ موجود نہ ہو جو ثابت اور محکم نہ ہو۔ جس سے تعمیری نتائج پیدا نہ ہوں۔ جس کی کوئی غرض و غایت نہ ہو۔ باطل کے ان معانی کے پیش نظر آپ مندرجہ بالا آیت کے اُن الفاظ پر غور کیجئے جن میں کہا گیا ہے کہ ہم نے کائنات کو باطل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ فی الواقعہ موجود ہے۔ اس کی غرض و غایت ہے۔ یہ تعمیری نتائج پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس سے افلاطون کے نظریہ اور مغرب کے مادہ پرستوں کے تصور، دونوں کی تردید ہو گئی۔ قرآن کریم کے نزدیک کائنات کے متعلق صحیح تصور کو کس قدر اہمیت حاصل ہے، اس کا اندازہ اس آیت کے اگلے الفاظ سے لگ سکتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ کائنات کو باطل تصور کرنا کفر ہے اور محض ظن و قیاس پر مبنی۔ یعنی نہ یہ علم پر مبنی ہے نہ صداقت پر۔ ایسا سمجھنے والے مومن نہیں، کافر ہیں۔“

کائنات کو باطل تصور کرنے کا جو نتیجہ مندرجہ بالا آیت میں بتایا گیا ہے، وہ بڑا ہی غور طلب ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ اس تصور کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانوں کی سعی و عمل کی کھیتیاں بھلس کر رہ جائیں گے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، کائنات کے متعلق یہ تصور کہ یہ محض فریب تخیل ہے، انسانیت کو مفلوج بنا دینے کا موجب بنا۔ اور اب مغربی محققین کا یہ نظریہ، کہ اس کی کوئی

سلہ چونکہ کائنات میں خود انسان بھی شامل ہو جاتا ہے، اس لئے مغرب کے مادی نظریہ کی رو سے انسان کے متعلق بھی یہی کہا گیا کہ اس کی تخلیق کی بھی کوئی غرض و غایت نہیں۔ اسے یونہی بے مقصد پیدا کر دیا گیا ہے۔ — کاروان زندگی بے منزل است۔ قرآن کریم نے اس باطل تصور کی بھی یہ ہلکے تر وید کر دی کہ: اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْتُكُمْ عَبَثًا (۳۳)۔ ”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بے غرض و غایت بے مقصد، پیدا کر دیا ہے۔“ فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ (۳۴)۔ ”ایسا کہ خدا کے شایان شان نہیں۔“ (تفصیل اس اجمال کی اپنے مقام پر آئے گی)۔

غرض و غایت نہیں، انسان کو حیوان بنا دینے کا باعث۔ اس قسم کی زندگی کو قرآن نے جہنم کا عذاب قرار دیا ہے جس میں اس وقت ساری دنیا ماخوذ ہے۔ اس سے اگلی آیت میں قرآن کریم نے ان دونوں نظریات کے حامل گروہوں میں خط امتیاز کھینچ کر رکھ دیا۔ یعنی وہ گروہ، جو تخلیق کائنات کو باطل سمجھتا ہے اور وہ گروہ جو اسے حق تسلیم کرتا ہے۔ اس آیت میں کہا گیا ہے:-

أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ (۳۸)۔

”ان سے پوچھو کہ کیا ہم ان لوگوں کو، جو کائنات کے باحق ہونے پر ایمان رکھیں اور پھر ایسے پروگرام پر عمل پیرا ہوں جو اشیائے کائنات کی مضر ممکنات کو بیدار کریں اور انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا موجب بنیں، ان لوگوں کے برابر متساویں کر کے جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر، کیا متقین اور فجار ایک جیسے ہو جائیں گے؟“ اس میں مفسدین کا لفظ قابلِ غور ہے۔ اسی فساد کی طرف تو ملائکہ نے اشارہ کیا تھا! ان دونوں گروہوں میں فرق کر کے بارگاہِ ایزدی نے ملائکہ کو بتادیا کہ ان کے سامنے ایک ہی گروہ ہے دوسرا نہیں۔ یہ دوسرا گروہ کس طرح وجود میں آئے گا۔ وہ کہاں سے راہنمائی حاصل کرے گا۔ اس کے متعلق اس سلسلہ کی اگلی آیت میں کہا:-

كُتِبَ الْأَنْزِلَانِ مُبَارَكٌ لِّدَّ بَرُّوْا أَيْتِيْهِمْ وَلِيَتَذَكَّرُوْا أُولَئِكَ الْاَلْبَابِ (۳۹)۔

یہ راہنمائی انہیں اس کتاب میں ملے گی جسے ہم نے اسے رسول! تیری طرف نازل کیا ہے۔ یہ راہنمائی یکسر خیر و برکت کا موجب ہے۔ لیکن یہ حاصل انہی کو ہوگی جو اس کے قوانین پر غور و فکر سے کام لیں اور عقل بصیرت کی روش سے انہیں ہمیشہ اپنے سامنے رکھیں۔ اس سے سیکور لازم کے حامیوں اور وحی سے انکسار صیبا کرنے والوں میں فرق کر کے بتادیا۔

مندرجہ بالا آیت (۳۹) میں کہا گیا ہے کہ ہم نے کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا۔ یہ منفی پہلو تھا۔ مثبت طور پر کہا کہ:-

خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ. إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ (۲۹)۔

”اللہ تعالیٰ نے ارض و سموات کو باحق پیدا کیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے حقیقت تک پہنچنے کی بڑی نشانیاں ہیں جو وحی کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں“ وحی کی صداقت پر یقین رکھنے والے تو وہ لوگ ہیں جن کے متعلق سورۃ آل عمران میں کہا گیا ہے کہ: إِنَّ

فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ - لَا آيَةً لِّأُولِي الْأَلْبَابِ (۳۹)۔

”یہ حقیقت ہے کہ ارض و سما کی تناسل... اور ریل و نہار کی گردش میں صاحبانِ عقل و بصیرت کیلئے

مقامِ مومن

عظیم نشانیاں ہیں تا یہ صاحبانِ عقل و بصیرت کون ہیں؟ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا - سُبْحَنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۳۹)۔

”یہ وہ لوگ ہیں جو کھڑے، بیٹھے، لیٹے، قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں اور کارگاہِ کائنات کی تخلیق پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کے متعلق تحقیق و تدقیق کے بعد پورے حتم و یقین کے ساتھ پکار اٹھتے ہیں کہ اگلے نشوونما دینے والے! تو نے اس بحرِ العقول کا رگاہِ کائنات کو باطل طور پر پیدا نہیں کیا۔ تیری ذات اس سے بہت بلند ہے کہ تو یوں ہی باطل تخلیق کرے۔ ہماری آرزو یہ ہے کہ ہم اس طرح کے وہم میں مبتلا نہ ہو جائیں جس سے ہماری سعی و عمل کی کھیتیاں مجلسِ کمرِ راکھ ہو جائیں۔ اس سے اگلی آیت میں یہ بتا دیا کہ اس ”عذابِ نار“ کا محسوس و مشہود نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ یہ کہ رَبَّنَا إِنَّكَ مَن تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ۔

دنیا میں ذلت کی زندگی

وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِن أَنْصَارٍ (۱۴۱)۔ ”عذابِ جہنم میں مبتلا وہ قوم ہوتی ہے جو دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہے۔ ایسی قوم کا دنیا میں کوئی مددگار نہیں ہوتا۔“

آپ اقوامِ عالم پر ایک چھلکتی ہوئی نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ قرآنِ کریم نے ان چند الفاظ میں کیسی عظیم الشان حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ دنیا کی جس قوم نے افلاطونی فریب پر مبنی ویدانت یا تصوف کو مسلکِ زندگی بنایا وہ تسخیرِ کائنات کی طرف سے بے بہرہ ہو گئی۔ انہی اقوام کو مذہب پرست کہا جاتا ہے جو مادی دنیا اور اس کی خوشنمایوں کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھ کر ان سے کنارہ کش رہنے میں قربِ خداوندی کی جھلک دیکھتی ہیں۔ یہ قومیں ان اقوام کے مقابلہ میں، جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتی ہیں، نہایت ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ یہ اپنی ضروریاتِ زندگی تک کے لئے ان قوموں کی محتاج اور دستِ نگر ہوتی ہیں، اور وہ قومیں اس امداد کی جو قیمت وصول کرتی ہیں، وہ ہمارے سامنے ہے۔ یعنی ان کی سیاسی غلامی اور محکومی۔ قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ اس قسم کی قوموں کا کوئی حامی و ناصر نہیں ہوتا۔ یہ قومیں، جنہیں اپنا حامی و ناصر سمجھتی ہیں (یعنی جو نظرِ بظاہر ان کی امداد کرتی ہیں) وہ درحقیقت ان کی ہمدرد اور دوست نہیں ہوتیں۔ وہ ان کی احتیاج کا فائدہ اٹھا کر ان کا پورا پورا استحصال کرتی ہیں۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآنِ کریم نے جو کہا تھا کہ کائنات کو باطل نہیں، بالحق پیدا کیا گیا ہے تو اس کا حقیقی مفہوم کیا ہے، اور مقصود و مطلوب کیا۔ اب رہیں وہ قومیں جو وحی کی راہنمائی سے کام نہ لیتے ہوئے تخلیقِ کائنات کو جس میں انسان بھی شامل ہیں (بے غرض و غایت سمجھتی ہیں، وہ انسانوں کی تمدنی دنیا میں بھی وحی کی راہنمائی سے کام نہیں لیتیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فطرت کی بے پیلہ قوتوں

مادہ پرستی کی تباہ کاریاں

کو مسخر کر کے انہیں ایک دوسرے کی ہلاکت اور تباہی کے لئے صرف کرتی ہیں۔ پروفیسر جوڈ اس باب میں لکھتا ہے:-

انیسویں صدی، سائنس کی ظفر مندی کا زمانہ تھا۔ سائنس نے یہیں سستا کوئلہ اور کپاس دی اور ذرائعِ رسل و وسائل

میں انقلاب پیدا کر دیا۔ دیگر سینکڑوں طریق سے انسانی زندگی میں تبدیلیاں پیدا کر دیں اور آسائش کے سامان مہیا کر دیئے۔ لیکن سائنس ایک دودھاری تلوار تھی جس نے انسانوں کو وہ قوتیں عطا کر دیں جن کا طریق استعمال وہ نہیں جانتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی قتل و غارت گری کی استعداد میں اضافہ ہو گیا اور اس طرح اس کی تہذیب، تباہی کے جہنم کے کنارے تک پہنچی۔ انیسویں صدی نے صرف سائنس کی ترقی دیکھی اور یہ ہمارے لئے چھوڑ دیا کہ ہم دیکھیں کہ سائنس کی اس ترقی کے ساتھ ساتھ انسانیت میں کس طرح تنزل واقع ہوتا چلا گیا۔

(GOOD AND EVIL — PAGE 119)

اسن سٹائن عصر حاضر کا عظیم ترین سائنسدان ہے۔ وہ اس ضمن میں لکھتا ہے:-

ہمارے دور کے سائنسدانوں کی قلبی حالت ایلفرڈ نوبل کی سی ہو گئی ہے۔ ایلفرڈ نوبل نے ایک ایسا ”بھکسے اڑ جانے والا“ مادہ ایجاد کیا تھا جو اس زمانے میں سب سے زیادہ ہلاکت انگیز تھا۔ اس سے اس کے ضمیر پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے اپنے جرم کا کفارہ ادا کرنے کے لئے نوبل پرائز کا اعلان کیا جو ہر سال اس شخص کو دیا جاتے جو دنیا میں قیام امن کا سب سے بڑا موجب ہو۔ ہمارے سائنس دان، جنہوں نے اس قدر ہلاکت انگیز ایجادات کی ہیں، اپنے آپ کو ضمیر کی اسی چھنی سوزش میں مبتلا پاتے ہیں۔ یہ اگر جرم کا احساس نہیں تو کم از کم ذمہ داری کے احساس کا نتیجہ ضرور ہے۔

(OUT OF MY LATER DAYS)

ہمارے دور کے سائنسدانوں، مدبروں، مفکروں، سیاستدانوں کی یہی قلبی کیفیت ہے جسے قرآن کریم نے ”غذاب النار“ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا گروہ مؤمنین کا ہے جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق نوع انسانی کی منفعت کے لئے استعمال میں لاتا ہے۔ اس سے ہمارے سامنے تین قسم کی قومیں آگئیں۔

(۱) وہ قوم، جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے، انہیں وحی خداوندی کی روشنی میں عالمگیر انسانیت کی ربوبیت کے لئے استعمال کرتی ہے۔ اسے جماعت مؤمنین کہا جائے گا۔

تین گروہ

(۲) وہ قوم، جو فطرت کی قوتوں کو تو مسخر کر لیتی ہے لیکن انہیں دوسروں کی ہلاکت اور تباہی اور اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے استعمال کرتی ہے، یہ مقام آدم ہے، جس کا نتیجہ یُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (پٹے) ہے۔ اور

(۳) وہ قوم جو فطرت کی قوتوں کو مسخر ہی نہیں کرتی۔ یہ مذہب پرست اور تصوف زدہ قوم ہے جو انتہائی ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہے۔ اور چونکہ قرآن کریم کا فیصلہ یہ ہے کہ جو یہاں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرے اور اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائے۔ وہ آخرت میں بھی ذلیل و خوار ہوگا۔ اس لئے اس قوم کی دنیا بھی تباہ ہوتی ہے اور عاقبت بھی خراب۔

تخلیق کائنات کی غرض و غایت کیا ہے، یہ ایک الگ موضوع ہے جسے کسی دوسرے مقام پر تفصیل سے پیش کیا جائے گا۔ اس وقت ہم صرف قرآن کریم کی ایک آیت سامنے لانا چاہتے ہیں جس سے اصولی طور پر واضح ہو جائے گا کہ جہاں تک ہمارا

تعلق ہے، تخلیق کائنات سے مقصد کیا ہے۔ سورۃ جاثیہ میں ہے: **وَخَلَقَ تَخْلِيقَ كَائِنَاتِ كَامَقْصِدِ** | **اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ بِالْحَقِّ - وَلِتُجْزِيَ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا**

كَسَبَتْ. وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۲۵)۔ ”خدا نے ارض و سموات کو باحق پیدا کیا ہے۔ اس لئے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے اور کسی پر کسی قسم کا ظلم نہ ہو“ اس سے ظاہر ہے کہ تخلیق کائنات کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خدا کا قانون مکافات عمل بروئے کار آجائے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے، ہمیں اس کا علم نہیں۔ لیکن جو قوم تخلیق کائنات کی اس غرض و غایت پر ایمان رکھے وہ خدا کے قانون مکافات عمل پر پورے پورے حتم و یقین کے ساتھ ایمان رکھے گی۔ اور یہی وہ قوم ہے جو فطرت کی قوتوں کو فساد اور خونریزیوں کا موجب بنانے کے بجائے، انہیں عالمگیر انسانیت کی ربوبیت کا ذریعہ بنائے گی۔ ہم نے اوپر کہا ہے کہ یورپ کے انیسویں صدی کے محققین اور مفکرین نے یہ نظریہ وضع کیا کہ کائنات کی کوئی غرض و غایت نہیں۔ یہ یونہی بے مقصد وجود میں آگئی ہے اور اس کا منطقی نتیجہ یہ کہ اپنی طبعی زندگی کی پرورش کے سوا، خود انسانی زندگی کی بھی کوئی غرض و غایت نہیں۔ لیکن اب وہاں کے مفکرین نے کروٹ بدلی ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ نہ کائنات کی تخلیق بے مقصد ہے اور نہ ہی انسانی زندگی بے غرض و غایت۔ وہاں کا ایک مفکر (F.W. JONES) اپنی کتاب (DESIGN AND PURPOSE) کا اختتام ان الفاظ پر کرتا ہے:-

اگر انسان نے اپنی فکر میں تبدیلی پیدا کر لی کہ انسانی زندگی بلا مقصد نہیں تو اس سے نوع انسان کو بے وفائہ پہنچے گا۔ انسانی زندگی کو بلا مقصد تسلیم کرنے سے یہ بھی تسلیم کیا جاتے گا کہ تمام ذی حیات اشیاء اور غیر ذی حیات اشیاء، غرضیکہ پوری پوری کائنات بلا مقصد ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک دن، انسان، شاہراہ حیات پر اس طرح گامزن ہو کہ اسے نظر آجائے کہ اُس کے ساتھ تمام سلسلہ کائنات اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جو اس کا منتہا ہے۔ نگاہ ہے اور یہ اس کائنات کا ایک ہمسفر ہے۔ اس شاہراہ کائنات پر تمام افراد کارواں کے حقوق یکساں ہیں۔ اس شاہراہ کے منتہی کا ہمیں علم نہیں، لیکن اس سے ہم اس حقیقت کا احساس تو کر سکتے ہیں کہ یہ بات کائنات کے بس میں نہیں کہ وہ اس راہ اور اس پر چلنے والے افراد کارواں کو فنا کر سکے۔ تاریخ کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں یہ احساس بھی ضروری ہو گیا ہے کہ کائنات کا یہ عظیم القدر سلسلہ ایک مقصد کا ثبوت پیش کر رہا ہے اور ہر انسانی زندگی، خواہ وہ کسی قدر غیر اہم کیوں نہ ہو۔ اس کائناتی مقصد کا جزو ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک اور ضمنی اشارہ بھی لائق توجہ ہے۔ کائنات کی تخلیق کے سلسلہ میں قرآن کریم نے ایک جگہ کہا ہے: وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لِعِبَادٍ. مَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ. وَلَكِنْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (۳۸-۳۹)۔ ”ہم نے ارض و سماءات، اور جو کچھ ان کے درمیان ہیں، اسے محض کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔ اُسے بالحق پیدا کیا ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے“ ہندوؤں کے ہاں برہما (یعنی ان کے تصور کے خدا) کو نٹ راجن کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یعنی ”کھلاڑیوں کا راجہ“، سب سے بڑا کھلاڑی۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ برہما نے اس دنیا کو کھیل اور تفریح کے لیے پیدا کر دیا ہے۔ اسی جہت سے اُسے نٹ راجن کہتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان کے اس باطل عقیدہ کی بھی تردید کر دی۔ اور اس کی حقیقت کر دی کہ یہ خدا کے شایان شان ہی نہیں کہ وہ محض کھیل و تفریح کی خاطر اس قسم کے تماشے کرتا رہے۔ وہ خود اتحق ہے اور اس کا ہر ارادہ اور ہر کام حق پر مبنی۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ کیسی کیسی عظیم حقیقتوں کو اپنے اندر مضمر رکھتا ہے۔

ۛ

اب آئیے پھر اصل موضوع کی طرف۔ آیت (۳۱) میں کہا یہ گیا ہے کہ خدا نے آدم میں یہ صلاحیت رکھ دی کہ وہ قوانین فطرت کا علم حاصل کرے، فطرت کی قوتوں کو اپنے مصرف میں لائے۔ اور اس میں (کُلُّهَا) کا اضافہ کر کے یہ بتا دیا کہ فطرت کی کوئی قوت بھی ایسی نہیں جو اس کے دائرہ تسخیر سے باہر رہ جائے۔ اس کے بعد (اسی تشبیہ یا محاکاتی انداز میں) کہا کہ خدا نے پھر ان اشیائے کائنات کو ملائکہ کے سامنے رکھا اور ان سے کہا کہ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ دنیا میں کسی نئی مخلوق کی ضرورت نہیں، ہم مملکتِ خداوندی کے نظم و نسق کو سرانجام دینے کے لئے کافی ہیں اور ہمارے ہی ہاتھوں خدا کا تخلیقی پروگرام اپنے مقصد تک پہنچ جائے گا، تو ذرا تم ان اشیاء کے خواص و خواہر اور ان کی مضمرات و ممکنات کے متعلق بتاؤ۔ اس کے بعد ہے:-

قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ۔

۲
۳۲

ملائکہ نے اپنے عجز کا اعتراف کر لیا اور کہا کہ ”ہمیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا علم آپ نے ہمیں دیا ہے۔ اس سے زیادہ نہ ہمیں انفرادی کوئی معلومات حاصل ہیں اور نہ ہی ان کی تحصیل کی صلاحیت ہمارے اندر۔ کہاں آپ کا لامحدود علم اور حکمت اور کہاں ہمارا محدود علم! ان دونوں میں نسبت ہی کیا ہو سکتی ہے!“

یہاں بھی ایک عظیم حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کائنات کی ہر ذی حیات یا غیر ذی حیات شے اپنے قومی اور خواص

کا علم تو رکھتی ہے لیکن کوئی شے کسی دوسری شے کے متعلق کچھ علم نہیں رکھتی۔ سونے کو کچھ علم نہیں کہ لوہا کیا ہوتا ہے۔ بکری کو کچھ علم نہیں کہ بچھل میں کیا کیا خواص پوشیدہ ہیں۔ ان کے اس شعور کو عام اصطلاح میں شعورِ سادہ (SIMPLE CONSCIOUSNESS) کہا جاتا ہے۔ جب ہم نے کہا ہے کہ انہیں صرف اپنے متعلق ”علم“ ہوتا ہے تو اسے بھی درحقیقت علم نہیں کہا جائے گا۔ ان میں جبلی طور پر کچھ خاصیتیں ہوتی ہیں جن کا، ان سے، مختلف مواقع پر اظہار ہوتا رہتا ہے۔ انہوں نے نہ ان خاصیتوں کا علم کہیں سے حاصل کیا ہوتا ہے نہ ان میں اس سے زیادہ علم حاصل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے متعلق ملائکہ نے کہا ہے کہ:

(وَعَلَّمَ لَنَا اِلٰهًا مَا عَلَّمُنَا)۔ اس کے بعد ہے :-

قَالَ يَا اٰدَمُ اَنْبِئْهُمْ بِاسْمَائِهِمْ۔ فَلَمَّا اَنْبَاَهُمْ بِاسْمَائِهِمْ۔ قَالَ لَلَّهِمْ اَقْلُ تِلْكَمُ
اِنِّیْ اَعْلَمُ غِیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۔

۲
۳۳

اس پر ”خدا نے آدم سے کہا کہ تم انہیں ان کی خاصیتوں، صلاحیتوں، یا کنہ و حقیقت کے متعلق بتا دو کہ وہ کیا ہیں۔ جب آدم نے انہیں یہ بتا دیا تو خدا نے انہیں (ملائکہ کو) کہا کہ کیا اب تمہاری سمجھ میں یہ بات آتی جو ہم نے کہا تھا کہ جو کچھ ہم جانتے ہیں، تم نہیں جانتے۔۔۔۔۔“

غیب و شہود کا مفہوم مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں آیت (۲) کی تشریح کے ضمن میں بتایا جا چکا ہے۔ اسے ایک بار پھر سامنے لے آئیے۔ اس وقت ہم صرف اتنا دھڑ دینا کافی سمجھتے ہیں کہ جب کوئی

شے صرف علمِ خداوندی میں ہو اور محسوس طور پر وجود میں نہ لائی گئی ہو اس کی اس حالت کو ”غیب“ کہیں گے۔ اور جب وہ محسوس طور پر سامنے آجائے تو اسے مشہود کہا جائے گا۔ اسی طرح جس شے کی کوئی مضر صلاحیت ہنوز محسوس طور پر سامنے نہ آئی ہو اسے بھی غیب کہا جائے گا۔ اور جب وہ علمِ انسانی میں آجائے تو اسے مشہود کہہ کر پکارا جائے گا۔ سو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے کہا کہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ تمہارے سامنے صرف مشہود و محسوس کائنات ہے۔ اور ہم، ان اشیائے کائنات کا، علم رکھتے ہیں جو ہنوز ہمارے علم و ارادے میں ہیں اور جو محسوس و مرنی طور پر سامنے نہیں آئیں۔ (وہ جو کہا جائے: بِرَزْدِیْنِ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَاءُ) (۳)۔ وہ اپنی مخلوق میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔ تو اس سے یہی مراد ہے)۔ اور دوسرے یہ کہ تم مختلف اشیاء کی مضر صلاحیتوں سے واقف نہیں۔ بنا بریں تمہارا علم بے حد محدود ہے۔ اس کے برعکس، ہم ارض و سما اور ان میں پھیلی ہوئی جملہ اشیاء کے غیب و مشہود دونوں سے واقف ہیں۔ اور یہی ہمارا وہ علم ہے جس کا ایک گوشہ ہم نے اس نئی مخلوق — آدم — میں ودیعت کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کا مظاہرہ ابھی ابھی ہو چکا ہے۔

اس آیت کے اگلے الفاظ اس حقیقت کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔ لیکن ان کا غلط مفہوم یا ترجمہ بڑی گراہی کا موجب

بن جاتا ہے۔ ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ خدا نے ملائکہ سے کہا کہ ”ہم جانتے ہیں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم ہم سے چھپاتے ہو۔ اس کے یہ معنی ہوتے کہ ملائکہ کو یہ قوت بھی حاصل ہے کہ وہ اپنی بعض باتوں کو خدا سے چھپائے رکھیں۔ آپ غور کیجئے کہ اس سے ملائکہ اور خود خدا کے متعلق کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے۔ ان الفاظ میں درحقیقت غیب اور شہادت کے تصور کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔ آپ اشیائے کائنات پر غور کیجئے۔ یہ تخلیق کائنات کے وقت سے دنیا میں موجود ہیں، لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ ایک وقت میں ان کی کوئی ایک مضر صلاحیت یا خاصیت نمود میں آتی ہے۔ جوں جوں ارتقاء کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے، یا انسانی تحقیق آگے بڑھتی جاتی ہے، ان اشیاء کے مضر خواص آہستہ آہستہ بے نقاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اسی ایٹم (ATOM) کو لیجئے۔ دنیا میں موجود تو یہ پہلے دن سے تھا لیکن اس کی ساری خاصیتیں (POTENTIALITIES) مضر تھیں، پوشیدہ تھیں، مخفی تھیں، زیر نقاب تھیں۔ محسوس طور پر ان کی نمود نہیں ہوتی تھی۔ اور آج اسی ایٹم کی یہ مخفی اور مضر صلاحیتیں اس طرح نمود میں آ رہی ہیں کہ ان سے کام لیتے ہوئے انسان چاند تک پہنچ گیا ہے۔ اور ابھی تو ان خاصیتوں کے نمود کی شاید پہلی ہی منزل ہے۔ یہ ہے اشیائے کائنات کی وہ حالت، جسے مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ (پہ) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اور اس کے بعد یہ ہے ان کی نمود کے بعد کی کیفیت جسے مَا تَبْدُوْنَ (پہ) کہا گیا۔ ملائکہ سے کہا یہ گیا کہ ہم نے جو علم آدم میں ودیعت کر کے رکھ دیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کا دست تحقیق تمہاری ان خاصیتوں کو بھی بے نقاب کر کے رکھ دے گا جو آج، اور تو اور خود تمہاری اپنی نگاہوں سے بھی پوشیدہ ہیں۔ یہ ہے اس نئی مخلوق کا مقام اور وہ خصوصیت جس سے تم عاری تھے، اور جس کا اسے حامل بنایا جا رہا ہے۔ تمہاری مضر خاصیتوں کی نمود اس کے ہاتھوں سے ہو گی۔ علامہ اقبالؒ نے (بال جبریل میں) اسی منظر کی اپنے مخصوص اور شگفتہ انداز میں عکاسی کی ہے۔ ایک سین میں یہ دکھایا گیا ہے:

میلادِ آدم کا منظر کہ فرشتے آدم کو جنت سے کس طرح رخصت کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ اس آدم سے کہتے ہیں :-

تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر؛ کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرالی
اس کے بعد اگلا سین وہ ہے جس میں ریح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے۔ اس میں ارض آدم سے کہتی ہے کہ :-
کھول آنکھ، زمین دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوہ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ ایام جدائی کے ستم دیکھ، جحف دیکھ
بے تاب نہ ہو، معرکہ بیم ورجا دیکھ
سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشائے دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے

ناپید ترے بحرِ تحسین کے کنارے پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرکے

تغیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ:

یہ تھا وہ مقامِ آدم، جسکی لالکہ کے سامنے، دستِ یزداں نے خود نقاب کشائی کی۔

اقبالؒ نے پیامِ مشرق میں، اس منظر کو فارسی زبان میں پیش کیا ہے، اور اس سے بھی کہیں زیادہ جوشِ جلال کے ساتھ۔ جی نہیں چاہتا کہ میں قارئین کو اس سے محروم رکھ کر آگے بڑھ جاؤں۔ میں نے اس منظر کو اپنے مقالہ ”آدم کی کہانی“ میں (جو اب میری کتاب — اقبال اور قرآن — میں شائع ہو چکا ہے) محاکاتی انداز میں پیش کیا ہے۔ تخلیقِ آدم کے مرحلہ اول سے آگے بڑھتے ہوئے میں نے لکھا ہے کہ ”ہزار سال کی گردشوں کے بعد اس مشتِ خاک نے ایک متعین صورت اختیار کی۔ بکھری ہوئی شوخیاں سمٹ کر بجلیاں بن گئیں۔ زمین کانپنی، آسمان تھر تھرایا، چاند کا صاغر زریں چھلک گیا۔ ستاروں کے ننھے سے دل دہل گئے، فضا میں ایک شور اٹھا اور:

نعرہ زد عشق کہ خونی جگر سے پیدا شد حُسنِ لرزید کہ صاحبِ نظر سے پیدا شد

فطرتِ آشفّت کہ ز خاکِ جہانِ مجبور خود گرے خود شکنے، خود نگرے پیدا شد

خبرِ گدازِ گردوں سے شبستانِ ازل حذر لے پردگیاں، پردہ دے پیدا شد

آرزو بے خبر از خویش باغوشِ حیات چشمِ داگرد و جہانِ دگرے پیدا شد

زندگی گفت کہ در خاکِ تپیدم ہم عمر

تا ازین گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

اقبالؒ کی فارسی نظموں کا اردو میں ترجمہ بہت مشکل ہے۔ ترجمہ میں یوں بھی اصل کی روح مسلّی جاتی ہے۔ لیکن اس نظم

کا ترجمہ علامہ اسلم جیرا چپوریؒ نے کیا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان اشعار کو اردو دان طبقہ کو سمجھانے کے لئے اس سے زیادہ موزوں الفاظ ملنے مشکل ہیں۔ وہ ترجمہ یہ ہے:-

عشق چیخ اٹھا کہ اک خونیں جگر پیدا ہوا حُسنِ کانپ اٹھا کہ اک صاحبِ نظر پیدا ہوا

فطرتِ آشفّت کہ خاکِ عالمِ مجبور سے ایک خود گرے خود شکن اور خود نگر پیدا ہوا

پہنچے گردوں سے شبستانِ ازل میں یہ خبر پردہ دارو! ہوشیار! اک پردہ در پیدا ہوا

آرزو تھی زندگی کی گود میں سوئی ہوئی اک کھکھولی، اک جہانِ خیر و شر پیدا ہوا

زندگی بولی کہ تھی میں آئے گل میں مضطرب

بائے آج اس گنبدِ بے در میں در پیدا ہوا

علامہ اسم نے ان اشعار کے ترجمہ کے بعد، کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہے :-
 مسکرا کر یہ ملائک سے کہا ابلیس نے لو! تمہارا اک حریف تازہ تر پیدا ہوا
 چرخ سے آئی ندائے ساکنان بحر و بر اک جہاں آشوب، ظالم فتنہ گر پیدا ہوا
 جس کی غلطیہ زمین و آسمان چکر میں تھے مادِ فطرت کا وہ نورِ نظر پیدا ہوا
 تھا فضائے عالمِ ناسوت کا بربط خموش
 آخر اس سازِ کہن کا زخمہ در پیدا ہوا

آدم کے اس مقام سے آگاہ ہو جانے کے بعد ملائکہ کا جو ردِ عمل ہو سکتا تھا، وہ ظاہر ہے۔ قرآن نے اسے ان الفاظ میں پیش کیا ہے :-

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ﴿۳۳﴾

ملائکہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ تسخیرِ فطرت کے متعلق جو کچھ پہلے لکھا جا چکا ہے اس کی روشنی میں ملائکہ کا سجدہ کسی مزید تشریح کا محتاج نہیں۔ ہمارے ہاں تو سجدہ کا مفہوم اتنا ہی رہ گیا ہے کہ نماز میں اپنی پیشانی کو زمین پر ٹکا دیا جائے لیکن سجدہ کے بنیادی معنی کسی کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا، کسی کی اطاعت اختیار کر لینا ہیں۔ قرآن کریم میں بیشمار مقامات پر یہ لفظ انہی معانی میں آیا ہے۔ سورۃ النحل کی ان دو آیات کو ایک دفعہ پھر سامنے لائیے جن میں کہا گیا ہے کہ :-
 وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ - يَخَافُوْنَ رَّبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ ذِيْفَعْلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

”کائنات میں جو کچھ ہے، خدا کے حضور سجدہ ریز ہے۔ وہ ہمارے سامنے کی جاندار مخلوق ہو یا ملائکہ، سب قوانین خداوندی کے اطاعت گزار ہیں۔ وہ اس سے کبھی سرکشی نہیں برتتے۔ وہ سرکشی برتنے کے انجام سے خائف رہتے ہیں۔ جو حکم انہیں دیا جاتا ہے، وہ بلا چون و چرا اس کے مطابق عمل کرتے ہیں“ دوسری جگہ ہے ”إِنَّ الَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ - وَيَسْتَحِوْنَهُ - وَلَهُ يَسْجُدُونَ - (۱۶۳)۔“ ”تیرے رب کے ہاں جو مخلوق ہے وہ اس کی محکومیت سے سرکشی نہیں برتنے۔ جو فراموش انہیں تفویض کئے گئے ہیں وہ ان کی سرانجام دہی میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ یعنی وہ خدا کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں“ ان آیات میں سجدہ کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

اس آیت (۲۶۶) میں کہا گیا ہے کہ ملائکہ نے تو آدم کو سجدہ کر دیا، لیکن ابلیس نے ایسا نہ کیا۔ اس نے اس سے انکار کیا، اور انکار ہی نہیں، اس سے سرکشی برتی، اور اس طرح کفر کا ارتکاب کیا۔ قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی آدم کی سرگزشت کا تذکرہ آیا ہے، وہاں اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ ملائکہ نے تو سجدہ کر دیا لیکن ابلیس نے اس سے سرکشی برتی۔ [ملاحظہ ہوں آیات ۱۱: ۱۵، ۱۶: ۲۸، ۱۷: ۶۱، ۲۰: ۸۴، ۲۱: ۲۸، ۲۲: ۳۱، ۲۳: ۱۱۷، ۲۴: ۳۱، ۲۵: ۳۱، ۲۶: ۲۸، ۲۷: ۱۱، ۲۸: ۱۱، ۲۹: ۱۷، ۳۰: ۲۸، ۳۱: ۲۱، ۳۲: ۱۷، ۳۳: ۷، ۳۴: ۱۱، ۳۵: ۱۱، ۳۶: ۱۱، ۳۷: ۱۱، ۳۸: ۱۱، ۳۹: ۱۱، ۴۰: ۱۱، ۴۱: ۱۱، ۴۲: ۱۱، ۴۳: ۱۱، ۴۴: ۱۱، ۴۵: ۱۱، ۴۶: ۱۱، ۴۷: ۱۱، ۴۸: ۱۱، ۴۹: ۱۱، ۵۰: ۱۱، ۵۱: ۱۱، ۵۲: ۱۱، ۵۳: ۱۱، ۵۴: ۱۱، ۵۵: ۱۱، ۵۶: ۱۱، ۵۷: ۱۱، ۵۸: ۱۱، ۵۹: ۱۱، ۶۰: ۱۱، ۶۱: ۱۱، ۶۲: ۱۱، ۶۳: ۱۱، ۶۴: ۱۱، ۶۵: ۱۱، ۶۶: ۱۱، ۶۷: ۱۱، ۶۸: ۱۱، ۶۹: ۱۱، ۷۰: ۱۱، ۷۱: ۱۱، ۷۲: ۱۱، ۷۳: ۱۱، ۷۴: ۱۱، ۷۵: ۱۱، ۷۶: ۱۱، ۷۷: ۱۱، ۷۸: ۱۱، ۷۹: ۱۱، ۸۰: ۱۱، ۸۱: ۱۱، ۸۲: ۱۱، ۸۳: ۱۱، ۸۴: ۱۱، ۸۵: ۱۱، ۸۶: ۱۱، ۸۷: ۱۱، ۸۸: ۱۱، ۸۹: ۱۱، ۹۰: ۱۱، ۹۱: ۱۱، ۹۲: ۱۱، ۹۳: ۱۱، ۹۴: ۱۱، ۹۵: ۱۱، ۹۶: ۱۱، ۹۷: ۱۱، ۹۸: ۱۱، ۹۹: ۱۱، ۱۰۰: ۱۱]۔ ملائکہ کے سجدہ اور ابلیس کے انکار و سرکشی سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اگر قوانین فطرت کا علم حاصل کرے تو فطرت کی قوتیں، تمام کی تمام، اس کے سامنے جھک سکتی ہیں کہ وہ ان سے جس طرح جی چاہے کام لے لیکن انسان کے اپنے جذبات، احکام خداوندی اور مستقل اقدار کی اطاعت سے سرکشی برتتے ہیں۔ اور یہی وہ گوشہ ہے جہاں ہدایت خداوندی کی ضرورت پڑتی ہے، اور جس کا ذکر آگے چل کر آتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں عام عقیدہ یہ ہے (اور اکثر تفاسیر میں بھی یہی لکھا ملتا ہے) کہ ابلیس ملائکہ ہی میں سے تھا۔ بلکہ بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ وہ معلم الملکوت (یعنی فرشتوں کا استاد) تھا۔ لیکن یہ خیال بالبداهت غلط ہے۔ ملائکہ کے متعلق تو قرآن کریم نے ہر مقام پر یہ کہا ہے کہ: هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ (۲۶۶)۔ ”ملائکہ کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے“۔ دوسری جگہ ہے: لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (۲۶۷)۔ ”جو کچھ انہیں خدا کی طرف سے حکم ملتا ہے وہ اس کے مطابق کام کرتے ہیں اور کبھی معصیت خداوندی اختیار نہیں کرتے“۔ لہذا جب ملائکہ کے متعلق قرآن کریم نے یہ کہا ہے تو ابلیس کس طرح ملائکہ میں سے ہو سکتا ہے، جس کا پہلی بار تعارف ہی یہ کہہ کر دیا گیا کہ ابلیس دَاٰسَتْکُمْ بَارِئٌ (۲۶۶)۔ اور ہر جگہ اسے دہرایا گیا ہے۔ یہ غلط فہمی آیت (۲۶۶) میں لفظ اِلَّا کے غلط مفہوم سے پیدا ہوئی۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ان میں سے یہ کہا گیا ہے کہ اور ملائکہ نے تو سجدہ کر دیا لیکن ابلیس نے نہ کیا۔ اس مفہوم کی رو سے ابلیس کو ملائکہ کے زمرے میں شمار کر لیا گیا۔ ہم عربی گرامر کی تشریحات میں الجھے بغیر ”اِلَّا“ کا مفہوم اردو زبان کی عام عبارات کی رو سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ”اور مرد تو آگئے لیکن زبید نہیں آیا“ اس سے واضح ہے کہ زبید بھی مرد ہے۔ یعنی وہ مردوں میں سے ایک ہے۔ لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ ”مرد تو سب آگئے لیکن زبید نہیں آئی“ تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ زبید مردوں میں سے نہیں، وہ کوئی اور جنس (عورت) ہے۔ آیت (۲۶۶) میں ”اِلَّا ابْلِیْسَ“ کے یہی معنی ہیں۔ یعنی ملائکہ نے تو سجدہ کر دیا لیکن ابلیس نے اس سے انکار کر دیا۔ اس سے واضح ہے کہ ابلیس ملائکہ میں سے نہیں تھا۔ ہم نے یہ وضاحت **ابلیس کا انکار** اس غلط فہمی کے رفع کرنے کی غرض سے ضروری سمجھی ہے جو ہمارے ہاں متداول چلی آرہی ہے، ورنہ ملائکہ اور ابلیس کا جو مفہوم پہلے بیان ہو چکا ہے اس کے پیش نظر اس قسم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ابلیس ملائکہ میں سے تھا۔ ملائکہ فطرت کی قوتیں ہیں، ابلیس خود انسان کے اپنے سرکش جذبات۔ ابلیس کی سرکشی کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ایک ایسا عمیق نکتہ ہے جو ایک عظیم حقیقت کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ یعنی عقیدہ

اَنفُسَنَا۔ وَاِنْ لَّمْ تَقْنُصُوْا لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۳۳)۔ ”اے ہمارے نشوونما دینے والے!

ہم نے خود اپنے خلاف زیادتی کی ہے، ہم سے بھول ہوئی، چوک ہوئی۔ اگر
معصیتِ ابلیس و آدم میں فرق | تو ہماری حفاظت کا سامان عطا نہیں فرمائے گا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔“

اس کے جواب میں اس سے کہا گیا کہ آدم! تم نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ اس کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اور آئندہ کیلئے محتاط رہنے کا وعدہ کر لیا۔ لہذا تمہاری اصلاح کا امکان ہے۔ اگر تم اس کے بعد ہماری رہنمائی کی پیروی کرو گے تو تم اس لغزش کے نقصان رساں نتائج سے بھی محفوظ رہو گے، اور آئندہ کے لئے بھی تمہیں زندگی کی خوشگواریاں نصیب ہوں گی۔ یعنی قرآن کریم کی رو سے اصلاح کا امکان اس شخص کے لئے ہے جو اپنے فیصلہ اور عمل کی ذمہ داری کو قبول کرتا ہے۔ اس کے برعکس جب ابلیس سے پوچھا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا تو اس نے اپنے فیصلہ اور عمل کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ میں ایسا کرنے والا کون ہوں، تو نے مجھے گمراہ کیا۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اس قسم کا عقیدہ رکھنے والوں میں اصلاح کا امکان ہی نہیں ہوتا۔ اس سے آپ غور فرمائیے کہ یہ جو ہمارے ہاں ایک ایک سانس میں دُھرایا جاتا ہے کہ ————— وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے ————— سب کچھ خدا ہی کے حکم سے ہوتا ہے۔ انسان تقدیر کا پابند ہے۔ اپنی قسمت کے ہاتھوں مجبور ہے۔ قرآن کریم اس عقیدہ اور نظریہ کے متعلق کیا کہتا ہے، اس کے لئے مطالب الفرقان جلد اول میں آیات (۱/۱۰۰) کی تشریحات میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اسے بھی ایک نظر دیکھ لیجئے۔ نیز میری مستقل تصنیف ————— کتاب التقدير ————— کا مطالعہ بھی مفید رہے گا۔

اقبال اور ابلیسی کردار | علامہ اقبالؒ نے اپنی کتاب ”ضربِ کلیم“ میں تقدیر کے عنوان سے ایک بڑی بلیغ اور دلکش نظم لکھی ہے جس میں ابلیس کے ان اقدامات اور ان کے نتائج کو بڑے حسین انداز میں

جاگرایا گیا ہے۔ بہتر ہو کہ آپ اسے خود ملاحظہ فرمائیں۔ وہ نظم یہ ہے :-

تقدیر

(ابلیس و یزدان)

ابلیس

اے خدا کے کن فکاں مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر | آہِ زندانیِ نزدیکِ دور و دیر و زور

حرفِ استکبارِ تیرے سامنے ممکن نہ تھا | ہاں مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود

یزدان

کب کھلا تجھ پر یہ راز، انکار سے پہلے کہ بعد !

ابلیس

بعد اے تیری تجلی سے کمالات وجود!

(فرشتوں کی طرف دیکھ کر)

یزداں

پستی فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اے کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود،
مے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام ظالم اپنے شعلہ سوزاں کو خود کہتا ہے دود!
(ماخوذ از محی الدین ابن عربی) لے

اسی سرگزشت سے ایک اور بات بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔ ابلیس کی خطا فکر غلط بینی، یا بناء استدلال کی کجی کا نتیجہ تھی۔ انسان میں اس قسم کی غلطیوں کا امکان ہے۔ ان کی تلافی کا طریق یہ ہے کہ جس وقت اس غلطی کا علم ہو جائے، اس سے رجوع کر لیا جائے۔ لیکن جس غلطی کا انسان اپنے آپ کو ذمہ دار ہی تسلیم نہ کرے، وہ اس کی جذباتی بکروی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کی تلافی ممکن نہیں۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ ابلیس کی پیش کردہ دلیل بڑی گمراہ کن تھی۔ اس نے اپنی بڑی
پیدائشی امتیاز کا باطل نظریہ اور آدم کی کہتری کے لئے دلیل یہ دی تھی کہ میری پیدائش آگ سے ہوئی اور آدم
کی مٹی سے۔ یعنی اس نے پیدائشی امتیاز کے تصور کو اپنے لئے وجہ فضیلت قرار دیا تھا۔ قرآن کریم کی رو سے پیدائشی تفریق و
امتیاز کا نظریہ باطل ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ یکساں واجب التکریم ہوتا ہے (۲۹)۔ برہمن، کشتری، ویش اور شود
کے امتیازات انسانوں کے خود ساختہ ہیں۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ مدارج کا معیار ہر شخص کے اعمال،
یعنی اس کا کردار و عمل ہے (۳۰)۔ لہذا یہ کہنا کہ میں پیدائش کی رو سے کسی دوسرے انسان سے نفس داعی ہوں، باطل نظریہ ہے۔

لے حیرت ہے کہ ابن عربی نے ابلیس کے صاحب الادب اور اس کے بعد جبریت کو کس طرح عفو و عسفن بنایا۔ وہ تو وعدۃ الوجود کا قائل
ہی نہیں، السابق الاول ہے۔ اور وحدت الوجود کے عقیدہ کی رو سے ابلیس کا انگ وجود تسلیم ہی نہیں کیا جاسکتا۔ ابن عربی نے
تو فرعون کے متعلق کہا ہے کہ "اُسے ایک طرح سے حق حاصل تھا کہ کہے اذآرنگھ الاصلیٰ۔ کیونکہ فرعون ذات حق سے جدا نہ تھا۔ اگرچہ
اس کی صورت فرعون کی تھی۔ (فصول حکم۔ کلمہ موسویہ)۔ بہر حال جو کچھ کہا گیا ہے وہ ہے بڑا دلچسپ اور معنی خیز۔

آگے بڑھنے سے پہلے سجدہ کے متعلق ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ سجدہ کا مفہوم، کسی اطاعت اور محکومیت اختیار کرنا ہے۔ قرآن کریم نے انسان کے متعلق واضح طور پر کہہ دیا کہ اُسے صرف احکام و قوانین خداوندی کی اطاعت کرنی چاہیے، کسی اور کی نہیں۔ اسی کا نام عبارتِ خداوندی ہے۔ سورۃ حج میں ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمُ (حج: ۶۲)** ”اے جماعتِ مومنین! تم صرف اپنے رب

سجدہ کا مفہوم

کا رکوع و سجود و عبودیت اختیار کرو“ اس میں رکوع و سجدہ اور عبادت کو مرادف معانی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اور ان تمام الفاظ سے مراد اطاعتِ خداوندی ہے۔ سورۃ النجم میں ہے: **فَاسْجُدْ وَاقِلْ (نجم: ۵۳)** ”اللہ کو سجدہ کرو۔ یعنی اس کی محکومیت اختیار کرو“ یہاں سے بھی سجدہ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اس سے مراد عبودیتِ خداوندی ہے۔ قرآن کریم نے شرفِ انسانیت کا بلند ترین مقام ”عبودیت“ بتایا ہے، اس نے دیگر انبیائے کرام کو بھی خدا کے عبد کہہ کر پکارا ہے۔ اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی لقب سے نوازا ہے۔ عبودیت کا مفہوم اس کتاب کی جلد اول میں آیات (۱۰۶ ذ ۲۶) میں واضح کیا جا چکا ہے۔ اس مقام پر اتنا دہرا دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم نے جو یہ کہا کہ ملائکہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے تو اس سے اس نے اس باطل نظریہ کی تردید کر دی جس کی رو سے مظاہرِ فطرت کو دیوی دیوتا سمجھ کر، انسان ان کے سامنے سجدہ ریز ہوتا تھا۔ جہاں تک خود انسانوں کا تعلق ہے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ: **مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّصُوَّةَ۔ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي ذُوْنِ اللَّهِ۔ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّيْنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔ وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا السَّلَاطِكَةَ وَالنِّسْيَانَ أَرْبَابًا۔ أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (ہج: ۱۷)** ”کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ خدا اُسے ضابطہ قوانین، حکومت اور نبوت تک بھی کیوں نہ عطا کرے، کہ وہ لوگوں سے یہ کہنا شروع کرے کہ تم خدا کے احکام کی جگہ میرے احکام کی اطاعت کرو۔ اس کی تعلیم بھی ہوگی کہ تم سب اس کتابِ خداوندی کی اطاعت سے جس کی تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور جس پر غور و تدبیر کرتے ہو، ربانی یعنی خدا کے نظامِ ربوبیت کے علمبردار بن جاؤ۔ اُسے بھی نہیں کہنا چاہیے کہ تم ملائکہ کی پرستش شروع کر دو یا نبیوں کو خدا بنا لو۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم تو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے کا عہد کرو اور وہ تمہیں کفر کی تعلیم دے، ایسا کسی کو نہیں کرنا چاہیے“ یہ ہے مقامِ آدمیت یعنی کائنات میں، خدا کے قوانین کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کرنا۔

مقامِ عبودیت کی سرفرازیاں

شُرک اس لئے جرمِ عظیم نہیں کہ اس سے (معاذ اللہ) خدا کو غصہ آجاتا ہے کہ تم نے اوروں کو میرے جیسا (خدا) کیوں تسلیم کر لیا؟ یہ اس لئے ظلمِ عظیم ہے کہ اس انسانِ شرفِ انسانیت کے مقام سے گر جاتا ہے۔ شرفِ انسانیت کا مقام یہ ہے

کہ انسان ایک خدا کے قوانین کی اطاعت اختیار کر کے، ساری کائنات میں سرفرازانہ زندگی بسر کرے۔ یہی وہ توحید ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیے۔ کہ انسان خدا کا عجد بننے کے بعد کس طرح ہر قسم کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس عجدیت کو سجدہ خداوندی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہ ہے وہ سجدہ خداوندی، جس کا حکم قرآن کریم میں دیا گیا ہے، لیکن اب جس کا مفہوم، نماز میں اپنی پیشانی کو زمین پر رکھ دینے میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نماز کا یہ سجدہ بھی ضروری ہے اور اس کی ایک خاص چیز ہے۔ انسانی ارادہ اور اس کی جسمانی حرکات میں ایک خاص ربط باہمی ہے۔ اسے (PARALLELISM) کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بلکہ جب آپ کسی کو سلام کہتے ہیں تو آپ کا ہاتھ غیر شعوری طور پر ماتھے کی طرف اٹھ جاتا ہے۔ جب آپ کے دل میں کسی کے احترام کا جذبہ بیدار ہوتا ہے تو آپ کا سر خود بخود جھک جاتا ہے۔ خوشی کی خبر سن کر آپ کا چہرہ متماٹھتا ہے۔ ندامت میں آپ کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ غصہ میں آپ غیر شعوری طور پر چلا کر بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ محبت کا اظہار بڑی لطافت و نزاکت لئے ہوتا ہے۔ انسانی جذبات اور ان کے محسوس مظاہر کا یہ ربط غیر شعوری بھی ہے اور بڑا اہم بھی۔ آپ کسی شعلہ نوا مقرر سے کہتے کہ وہ اپنی تقریر کے دوران کسی قسم کی حرکت نہ کرے ساکت و صامت کھڑا ہوتا چلا جائے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ چند منٹ تک بول کر اکتا جائے گا۔ اور اس کی ان چند منٹ کی تقریر بھی بڑی غیر مؤثر ہوگی۔

خدا کی اطاعت کے جذبہ کے اظہار کے لئے اس قسم کے جسمانی مظاہر ناگزیر بھی ہیں اور ضروری بھی۔ ان کے بغیر انسان کی تسکین نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کی جسمانی حرکات کو (FORMALISM) کہا جاتا ہے۔ یعنی رسوم و مظاہر۔ نماز میں قیام و رکوع و سجود یا حج میں طواف کعبہ، انہی جذباتی تقاضوں کی تسکین کا ذریعہ ہیں۔ دین کے پروگرام میں ان کی جگہ

رسوم و مظاہر بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس میں یہ رسوم و مظاہر تو باقی رہ جاتے ہیں، اطاعت کی روح گم ہو جاتی ہے۔ اس میں سارا زور ان مظاہر کی باقاعدگی اور پابندی سے ادائیگی پر دیا جاتا ہے۔ اور اطاعت خداوندی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ جو شخص نماز میں اس طرح سجدہ ادا کرے کہ اس کے ساتوں اعضاء — دونوں پاؤں کے پنجے، دونوں گھٹنے، دونوں ہاتھ اور ماتھا — زمین کے ساتھ لگ جائیں، اس کے متعلق کہا جاتا ہے

لے ان حقائق کو جلد ادل میں بیان کیا جا چکا ہے۔ ملاحظہ ہوں صفحات (۱۲۳ - ۱۲۰)۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس مقام پر ان کا اعادہ ضروری سمجھا گیا ہے — اور ایسا تو مطالب الفرقان میں اکثر ہوتا رہے گا۔

کہ اس نے صحیح سجدہ ادا کر لیا خواہ اس سجدہ کی ادائیگی کے وقت وہ دل میں طاغوتی فیصلوں کے بروئے کار لانے کے پروگرام کی تفصیلات ہی کیوں نہ طے کر رہا ہو۔ ابلیس ان مظاہر کو کس طرح مزین بنا کر دکھاتا رہتا ہے۔ اس کے متعلق ہم، باب اول میں تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔ اقبالؒ نے اس سجدہ میں جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ **وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ** (۹۶)۔ یعنی ”سجدہ کر اور خدا کے قریب ہو جا“ اور ہمارے رسمی سجدوں میں بڑے دلکش انداز میں فرق کر کے بتایا ہے۔ وہ اپنی مثنوی ”پس چہ باید کرد“ میں کہتے ہیں :-

مرد آزادے چو آید در سجدہ در طوافش گرم رو چرخ کہود
وہ خدا سے آرزو کرتے ہیں کہ :-

نہ خواہم این جہان و آں جہاں را مرا پس کہ دائم رمز جاں را
سجودے دہ کہ از سوز و سرورش بوجد آرم زین و آسمان را
خدا کے حضور صحیح سجدہ کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق کہتے ہیں :-

مسلمانیم و آزادانہ مکنانیم بدوں از حلقہ نہ آسمانیم
بما آموختند آں سجدہ کو فے بہائے ہر خداوندے بدانیم

یعنی وہ سجدہ، جس سے دنیا میں خدائی کے ہر وعیدار کی قدر و قیمت معلوم ہو جاتی ہے۔ یعنی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اُسے کتنے میں خریدا جاسکتا ہے۔ کتنا بڑا ہے یہ مقام جو انسان کو، خدا کے حضور سجدہ عطا کر دیتا ہے۔ اور اس کے بعد اقبالؒ (بجاری موجودہ حالت پر اشکبار ہوتے ہوئے) بعد حسرت و یاس پکارا اٹھتا ہے کہ :-

وہ سجدہ روح زمین جس سے کانپ جاتی تھی ؛ اُسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب
وہ مسلمان سے کہتا ہے کہ یاد رکھ !

وہی سجدہ ہے لائق اہتمام ؛ کہ جو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

آستانِ خداوندی پر سر جھکا کر دنیا کے بڑے سے بڑے آستانہ سے مستانہ دار، سرفراز دے نیاز گذر جانا، یہ ہے اس سجدہ کا نتیجہ جو بارگاہِ خداوندی میں ادا کیا جاتا ہے۔ یعنی خدا کی محکومیت اختیار کرنے کا نتیجہ۔

مذہب میں عبادت انفرادی ہوتی ہے لیکن دین تو اجتماعیت کا نظام ہے۔ اس میں ہر عمل کا نتیجہ، جہاں انسان کی اپنی ذات استحکام کا موجب بنتا ہے، وہاں وہ دین کے نظام کے تنگ کا ذریعہ بھی قرار پاتا ہے۔ اسی کو اجتماعیت کہتے ہیں، اور اسی قسم کا ہے وہ سجدہ، جس کے متعلق اقبالؒ کہتا ہے کہ :-
خدا نصیب کرے ہند کے امانوں کو ؛ وہ سجدہ، جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیغام

تحریک پاکستان کے دوران، نیشنلسٹ علما اور اقبالؒ اور ان کے ہمراؤں کے درمیان یہی نکتہ باعث نزاع تھا۔ ان علماء کا موقف یہ تھا کہ جبہ انگریز کے چلے جانے کے بعد اہل ہند کی اپنی حکومت قائم ہو جائے گی تو اس میں مسلمانوں کو اعتقادات اور عبادات کی پوری پوری آزادی حاصل ہوگی۔ اس لئے، مسلمانوں کے لئے ان کی الگ آزاد مملکت کا مطالبہ اسلام کا تقاضہ نہیں۔ ان کے برعکس، اقبالؒ کا پیش کردہ نظریہ یہ تھا کہ اسلام ان انفرادی اعتقادات اور عبادات کا نام نہیں۔ اسلام اس دین کا نام ہے جس میں حکمرانی صرف تو انہیں خداوندی کی ہوتی ہے اور اس کے لئے مسلمانوں کی آزاد مملکت کا وجود لایمفک ہے۔ یہی تھی وہ حقیقت، جسے انہوں نے ان چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا تھا کہ:-

ملا کو جو ہے بند میں سجدے کی اجازت :- نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

بہر حال یہ گفتگو تھی اس سجدے کے متعلق جس کا حکم امت مسلمہ کر دیا گیا تھا۔ اس لئے ہم پھر اپنے موضوع کی طرف پلٹتے ہیں۔
یعنی ابلیس و آدم کی آدیزش کی طرف۔

۴

ملا کہ نے آدم کو سجد کیا۔ ابلیس نے سرکشی اختیار کی، اس پر ابلیس سے کہا گیا: قَالَ اخْرِجْ مِنْهَا مَذْعُومًا مَدْحُورًا۔ لَمَنْ يَبْعَكَ مِنْهُمْ لَا مَلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ أَجْمَعِينَ (۳۸)۔ "خدا نے کہا کہ تو اس حالت سے نکل جا۔ تو ذلیل دھنکارا ہوا ہے۔ ذریعہ آدم میں سے جو تیرا اتباع کرے گا تو ان لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ دوسری جگہ ہے: قَالَ فَاخْرِجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَاجِعٌ (۳۹)۔ "خدا نے اس سے کہا کہ تو یہاں سے نکل جا۔ تو قیامت تک (ہمیشہ ہمیشہ کیلئے) زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم رہے گا" (۴۰)۔

دافع رہے کہ خدا نے ابلیس سے یہ کچھ جو کہا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اسے (خدا کو) (معاذ اللہ) غصہ آگیا کہ ابلیس نے اہل حکم کیوں نہ مانا۔ غصہ تو انسانی جذبہ اور کمزوری ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے جذبات سے منزہ اور بلند ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ابلیس کی طرف سے جس پستی کردار کا مظاہرہ ہوا، یہ اس کا فطری نتیجہ تھا۔ جیسا کہ اس کتاب کی پہلی جلد میں سورۃ الفاتحہ کی تشریح کے ضمن میں بتایا گیا ہے، خدا کا غضب و حقیقت انسان کے غلط اعمال فطری نتائج کا نام ہے۔ ہم باب اول میں اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ سرگزشت آدم کا سارا بیان تمثیلی ہے اور اس کا انداز محاکاتی۔ لہذا خدا کی طرف سے ابلیس کو یہ حکم بھی تمثیلی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ابلیس کی طرف سے کس قسم کی پستی کردار کا مظاہرہ ہوا تھا جس کا فطری نتیجہ زندگی کی خوشگوار یوں سے محرومی اور ذلت و خواری تھا، پہلی چیز تو یہ کہ اُس نے

اپنے بیدار نشی امتیاز کو وجہ فضیلت بتایا۔ یہ اس کی پست ذہنیت کی دلیل تھی۔ دوسرے یہ کہ اس نے اپنے انکار کے لیے پہلے تو دلیل پیش کی جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اس کا اعتراف کیا کہ یہ انکار اس نے اپنے ارادہ سے کیا ہے جس کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ اور اس کے بعد، جب اس انکار کے عواقب سامنے آئے تو عقیدہ جبر میں پناہ لینے لگا اور اپنے اس انکار کا ذمہ دار اپنے بچائے خدا کو قرار دیدیا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ قَالَ ارْعَبْنَكَ هَذَا الَّذِي كَرِهْتَ عَلَىٰ (۱۶۱) اَلْبَلِیْسُ نے خدا سے کہا کہ یہ مخلوق جسے تو نے میرے مقابلے میں واجب انگریز قرار دیا ہے؛ تو دیکھ کہ میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ یہ جذبہ حسد ہے جو درحقیقت احساس کمتری کی دلیل بنتا ہے۔ دورِ حاضر کے نفسیاتی تجزیہ نے یہ بھی بتایا ہے کہ سرکش اور مستبد حکمرانوں کا جذبہ رعونت اور انانیت، درحقیقت اُن کے احساس کمتری کی تخلیق ہوتا ہے۔ کمتری کا یہ احساس انہیں بد وقت ستا رہتا ہے اور وہ اس کی تسکین دوسروں کو اذیت دیکر حاصل کرتے ہیں اسے اصطلاح میں (SADISM) کہا جاتا ہے۔ وہ جب تک قوت و اقتدار کے مالک رہتے ہیں، بڑے جری اور دیر نظر آتے ہیں، لیکن جونہی ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے، وہ انتہائی درجہ کے بزدل ثابت ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن نے داستانِ صاحبِ ضربِ کھنیم اور فرعون کی ایک کڑی میں بڑے بصیرت افروز انداز میں بیان کیلئے فرعون کی فرعونیت تو ضربِ المثل ہے۔ لیکن اس میں بتایا یہ گیا ہے کہ جب وہ ڈوبنے لگا تو اس نے چلا کر کہا: اٰهَنْتُ اَنَّهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْ اٰهَنْتُ بِهٖ بَنُوْاۤ اِسْرَآءِیْلَ وَاَفَا هِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (۱۶۲) میں اس حقیقت پر ایمان لاتا ہوں کہ اس خدا کے سوا، جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں، کوئی خدا نہیں۔ اور اس طرح میں زمرہِ مسلمین میں شامل ہوتا ہوں۔“ نظرِ بظاہر چاہئے تو یہ تھا کہ خدا کی طرف سے اُسے شاباش دی جاتی کہ تو بالآخر ایمان لے لیا۔ تو نے بہت اچھا کیا۔ لیکن خدا کی طرف سے اس کا جواب یہ بلا آگیا۔ وَقَدْ عَصِیْتَ قَبْلُ۔ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ (۱۶۳) ”تو ساری عمر حق و صداقت سے سرکشی برتا رہا۔ ملک میں فساد برپا کرتا رہا۔ تیری سرکشی اور استبداد و دنا آشنا تھی۔ لیکن اب جب موت تیرے سامنے آئی ہے تو تو اس سے بچنے کے لئے ایمان کا اظہار کر رہا ہے۔ یہ تیرے کردار کی انتہائی پستی کی دلیل ہے۔ یہ صغیرِ خودی ہے۔ اس لئے تیرے اس اقرار اور ایمان کا ہماری میزان میں ”پرکھ جتنا بھی وزن نہیں“

یہی وہ کردار ہے جس کا مظاہرہ ابلیس کی طرف سے ہوا۔ اسی لئے خدا نے اس سے کہا تھا: اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِیْنَ (۱۶۴) ”تو بڑا ہی پست فطرت ثابت ہوا۔“ یہ ہیں وہ حقائق، جو ابلیس کو راندہ درگاہ قرار دیئے جانے کے سلسلہ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ آپ ان حقائق پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ دنیائے بڑے بڑے سرکش اور مستبد فراعنہ کا صحیح کردار کس طرح بے نقاب ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔

بہر حال، ابلیس کو جب اس طرح دھتکارا گیا تو وہ انتقام پر اتر آیا۔ اس نے بدرگاہِ
ابلیس کا جذبہ انتقام خداوندی عرض کیا کہ آپ مجھے اور آدم کو رزم گاہِ حیات میں آزاد چھوڑ دیجئے اور پھر

دیکھئے کہ میں اُسے کس طرح ننگی کا ناچ نہچاتا ہوں۔ لیکن اس کے لئے ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ اس مقابلہ میں ایسا نہ ہو کہ جب
 میں اُسے پکھاڑ کر اس کی پھاتی پر چڑھ بیٹھوں تو آپ میرا ٹینٹا دبا دیں۔ یہ تو منصفانہ کشتی قرار نہیں پائے گی۔ آپ مجھے اس کا
 اطمینان دلائیے کہ جب تک کہ وہ ارض پر آدم کا وجود باقی ہے گا، مجھے بھی اس وقت تک مہلت دی جائے گی۔ قَالَ اَنْظِرْنِي اِلٰى
قیامت تک مہلت يَوْمٍ يُبْعَثُونَ۔ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ (۱۵-۱۴)۔ ابلیس نے کہا کہ مجھے
 آخری وقت تک مہلت دیجئے اور خدا نے اس سے کہا کہ میں یہ شرط منظور ہے تمہیں

اور آدم کو براہِ مہلت دی جائے گی۔ یہی الفاظ دیگر مقامات پر بھی آئے ہیں (دیکھئے ۱۵/۱۴ ذ ۲۸)۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ابلیس کا محلِ انتقام بھی سراسر بے جا تھا۔ آدم نے اس کے خلاف کچھ نہیں کیا تھا اس لئے اس
 سے انتقام کس بات کا؟ اسے (ابلیس کو) شکایت یہ تھی کہ خدا نے آدم کو اس سے افضل کیوں قرار دیا ہے؟ اگر وہ اسے اپنے
 خلاف زیادتی سمجھتا تھا تو اسے اس کے لئے (معاذ اللہ) خدا سے انتقام لینا چاہئے تھا۔ لیکن خدا کے سامنے سنجہ کشتی کی تو
 اُسے نہ جرات تھی، نہ اس کی ہمت۔ وہ اس کی (خدا کی) قوتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے آدم (بیچارے) کو کمزور
 اسامی دیکھ کر اُسے، اپنی آتشِ انتقام کے فرو کرنے کا ذریعہ بنایا۔ یہ بھی اس کی پستی کردار کی علامت تھی۔ دوں ہمت مستبد
 سرکشوں کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ طاقت و حریت کو تو کچھ نہیں کہتے۔ اپنا غصہ کمزوروں اور ناتوانوں پر نکالتے ہیں خواہ ان کو کئی
 قصور بھی نہ ہو۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید، انسانی کیریئر کی کمزوریوں کو کس طرح ابلیس کے روپ میں پیش کئے چلا جاتا ہے!
 بہر حال، ابلیس نے خدا سے مہلت مانگی جو اُسے مل گئی۔ جب وہ اس سے مطمئن ہو گیا، تو اس نے اپنے چیلنج کو دھرایا اور کہا
 کہ اب تو دیکھ کہ میں بنی آدم کو تیرے سیدھے راستہ سے بہکانے کے لئے کس کس قسم کی راہزنی سے کام لیتا ہوں۔ میں ان کے
 دائیں طرف سے حملہ کروں گا اور بائیں طرف سے۔ ان کے سامنے سے آؤں گا اور ان کے پیچھے سے۔ چاروں طرف سے انہیں گھیر
 لوں گا اور پھر تو دیکھے گا کہ ان میں اکثریت کس طرح تیری ناشکر گزار ہوتی اور میرے اشاروں پر ناپختہ ہے (۱۶-۱۵)۔ دوسرے
 مقام پر ہے کہ میں ان کے ہر غلط فیصلہ اور اقدام کو ان کی نگاہوں میں بڑا مزین بنا کر دکھاؤں گا اور اس طرح انہیں تیرے
 راستہ سے گمراہ کر دوں گا (۱۷-۱۶)۔ سورۃ ص میں ہے کہ جب اس سے کہا گیا کہ تو یہاں سے دور ہو جا، اور اس کے بعد اس کی
 مہلت طلبی کی درخواست کو منظور کر لیا گیا تو: فَعِزَّتْكَ۔ لَا تُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ (۳۸)۔ اس نے کہا، تیری عزت
 جبروت کی قسم! تو دیکھ کہ میں انہیں کس طرح گمراہ کرتا ہوں۔ اس آیت میں فَعِزَّتْكَ (۳۸) کا لفظ بڑا ہی پُر معنی ہے۔

ابلیس خدا کے جلال و جبروت کا قائل ہے۔ اس کی لامحدود قوتوں کا معترف ہے۔ اس کی عزت و اقتدار کی قسم کھاتا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے کہ دیکھ! میں تیری اس چیمیتی مخلوق کو کس طرح گمراہ کرتا ہوں؟ ابلیس کو یہ کہنے کی جرأت کس وقت ہوئی؟ اس وقت جب خدا کی طرف سے اُسے یہ ضمانت مل گئی کہ اُسے اور آدم کو برابر کی مہلت دی جاتی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی کشمکش اور آویزش میں خدا دخل نہیں دے گا۔ اور اس کے بعد جو خدا کی طرف سے کہا گیا، اور خود ابلیس نے بھی اس کا اقرار کیا کہ ”خدا کے مخلص بندوں پر اس کا کوئی زور نہیں چل سکے گا“ تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ بند خدا دخل نہیں دے گا۔ اپنے جذبات کو اقدارِ خداوندی کے ساحلوں میں محدود رکھیں گے اور شر کی قوتوں کو

اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیں گے۔ یہ ان کی اس قوت کا نتیجہ ہوگا جو انہیں اقدارِ خداوندی کی اطاعت سے حاصل ہوگی۔ یہ نہیں کہ شر کی قوتوں کو خدا خود مغلوب کرے گا اور اس کا کریڈٹ (CREDIT) اس کے مخلص بندوں کو ملے گا۔ خیر و شر کی کشمکش نہایت منصفانہ ہوگی۔ اس میں نہ کسی سے رعایت برتی جائے گی نہ کسی کا راستہ روکا جائے گا۔ یہاں، بلا رُوح رعایت، قوت کا مقابلہ قوت سے ہوگا۔ اسی کا نام قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ ان امور کی تشریح بابِ اول میں، ابلیس کے عنوان میں ہو چکی ہے۔ اس میں البتہ ایک لفظ ایسا آیا تھا جس کی وضاحت کو ہم نے موجودہ مقام پر اٹھا رکھا تھا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ ابلیس نے خدا سے کہا کہ تو مجھے یومِ قیامت تک مہلت دے اور پھر دیکھ کہ میں کس طرح لَاحِثَتِکَ ذَرِیَّتَہٗ اِلَّا قَلِیْلًا (۱۶)۔ اس میں آحِثَتِکَ کا لفظ غور طلب ہے۔ ابلیس نے کہا یہ کہ تو دیکھ کہ میں کس طرح اس

پر کاٹھی ڈالتا ہوں۔ اسے اپنا مرکب بناتا ہوں۔ اس پر سواری کرتا ہوں۔ کسی کو اپنے احتناک کی رسوائیاں تابع فرمان بنانے کے لئے عام طور پر یہی الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن گھوڑے پر سواری کرنے کے بھی مختلف انداز ہوتے ہیں۔ ایک انداز تو یہ کہ گھوڑے پر نہایت خوشنما، قیمتی زین کسی جائے ۱۰ اس کے منہ میں مرصع لگام دی جائے۔ ماتھے پر طاؤسی کھنٹی لگائی جائے اور اس انداز سے اس پر سواری کی جائے۔ سواری تو اس طرح بھی ہوتی ہے لیکن اس میں پھر بھی گھوڑے کا کچھ وقار قائم رہتا ہے۔ دوسری طرف آپ اس منظر کو سامنے لائیں کہ گاؤں کے کچھ رط کے کسی ٹٹو کو گھیر لیں۔ ان کے پاس نہ زین ہو نہ لگام۔ ایسے میں وہ کرتے یہ ہیں کہ کہیں سے کوئی ٹوٹی پھوٹی رسی لیکر اس سے گھوڑے کا منہ اور ٹھوڑی باندھ دیتے ہیں اور اُسے لگام کے طور پر ہاتھ میں تھام کر اس پر سواری کرتے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ اس انداز کی سواری، اس گھوڑے کے لئے اذیت رساں ہی نہیں بلکہ اس کی ذلت و رسوائی کی تصویر بھی سامنے لاتی ہے۔ سواری کے اس انداز کو عربوں کے ہاں ”احتناک“ کہا جاتا تھا۔ اس سے بات بھی سمجھ میں آ جائے گی کہ ابلیس نے خدا سے جو یہ کہا کہ: اَرَاۤءَ یٰنٰکَ ہٰذَا الَّذِیْ کَرَّمْتَ عَلَیْ (۱۶)۔ ”یہ مخلوق مجھے تو، اس قدر واجب التکریم بتا رہا ہے،

تو دیکھیں گے کہ میں اس سے کس طرح احتناک کا سلوک کر کے اسے ذلیل و خوار کرتا ہوں، تو اس کا عملی مفہوم کیا تھا۔

ضمناً۔ عصر حاضر کے ماہرین علم النفس کا تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ (SADISTIC TENDENCIES) رکھنے والے مستبد ارباب قوت (ڈکٹیٹروں) کا مسلک ہی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مخالفین کو جسمانی اذیت دیکر ہلاک کریں۔ انہیں جتنی لذت اپنے سرفیوں کو ذلیل و خوار کرنے سے حاصل ہوتی ہے، اتنی لذت ان کی موت سے نہیں ملتی۔ وہ انہیں زیادہ سے زیادہ عرصہ تک زندہ رکھنا چاہتے ہیں، لیکن انتہائی ذلت و خواری کی زندگی میں! اس سے انہیں انتہائی سرور و کیف حاصل ہوتا ہے۔ ابلیس کے احتناک سے یہی مقصود ہے۔

بہر حال، ابلیس نے یہ کہا۔ اس پر بارگاہ ایزدی سے جواب ملا کہ ہم جانتے ہیں کہ تو اس کے لئے کیا کیا حربے استعمال کرے گا۔

وَأَسْتَفْزِزُ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ. وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمُ بِخَيْلِكَ. وَرَجُلِكَ. وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ. وَعِذْهُمْ. وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا (۱۶)۔ ان میں بعض کو تم اپنے پروپیگنڈے کے زور سے گڑبڑا کر ان کے مقام سے ہٹا دو گے۔ جو اس طرح خائف نہ ہوں گے، ان پر بڑے بڑے لشکرے کر چڑھ دوڑو گے۔ ایسے لشکر، جن میں سوار اور پیادے سب شامل ہوں گے۔ بعض مقامات پر تم انہیں مالی امداد دینا شروع کر دو گے اور انہیں کاروبار میں اپنا شریک کر لو گے اور اس طرح اقتصادی تغلب سے انہیں اپنا جمنو بنا لو گے۔ بعض جگہ ایسی تعلیم کا بھی کھول دو گے جن سے ان کی آنے والی نسلیں خود بخود تمہارے رنگ میں رنگی جائیں۔ تم ان سے بڑے بڑے دلکش وعدے کر دو گے حالانکہ تمہاگوئے سب فریب پر مبنی ہوں گے۔ اور یہ تمہارے فریب میں آجائیں گے۔ یہ ہیں وہ طریقے، جنہیں تم بنی آدم کے 'احتناک' کے لئے اختیار کر دو گے، جیسا کہ ہم پہلے باب میں ابلیس کے زیر عنوان لکھ چکے ہیں (یہ وہ ابلیسی حربے ہیں، جنہیں اقوام غالب، کمزور قوموں کو مغلوب کرنے کے لئے اختیار کرتی ہیں، اور عصر حاضر میں اس کے مظاہرے نمایاں طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ لیکن ابلیس کے اس چیلنج کے جواب میں، ہر مقام پر یہی کہا گیا کہ: إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ (۱۷)۔ "میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چل سکے گا۔" اور "عباد" کی تشریح سابقہ صفحات میں ہمارے سامنے آچکی ہے۔ یعنی ایک خدا کی حکومت اختیار کر کے، ساری کائنات پر حکومت کرنے والے۔

بہر حال، شیطان نے یہ چیلنج دیا، جسے خدا نے قبول کر لیا اور پھر۔

۲
۳۵

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ۔

”اور ہم نے آدم سے کہا کہ تو اور تیری زوج، جنت میں رہو۔ اس میں سے جہاں سے جی چاہے، سیر ہو کر کھاؤ، پیو۔ پابندی صرف اتنی ہے کہ اس شجر کے قریب نہ پھٹکنا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ بڑی زیادتی ہو جائے گی۔“ انہی الفاظ کو (۲/۳۵) میں بھی دہرایا گیا ہے۔ اور یہاں سے ایک اور عظیم حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس ”جنت“ کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس میں، جہاں سے جی چاہے کھاؤ اور سیر ہو کر کھاؤ۔ یعنی یہاں تمہیں، رزق فراوانی اور کشادہ سے ملے گا۔ اور اس میں میری اور تیری“ کی کوئی تفریق نہیں ہوگی۔ جہاں تمہیں بھوک لگے وہاں یہ رزق موجود ہوگا، اور کوئی یہ نہیں کہے گا کہ یہ میری ملکیت ہے تم نے اسے کیسے لے لیا۔

ہم گذشتہ باب میں بتا چکے ہیں کہ ”سردگشت آدم“ میں انسانی زندگی کے اس قدیم دور سے آغازِ سخن کیا گیا ہے جب اس نے پہلے پہل، بل جُل کر رہنا شروع کیا۔ یعنی قدیم قبائلی زندگی کا دور۔ ماہرین علم الانسان کی تحقیق یہ ہے کہ قدیم قبائلی زندگی میں ذاتی ملکیت کا تصور نہیں تھا۔ حتیٰ کہ اُن کی زبان میں ”ملکیت“ کے لئے کوئی لفظ ہی نہیں تھا۔ اس میں ”استعمال“ کا لفظ بلتا ہے، ”ملکیت“ کا نہیں۔ اس دور میں آبادی مہنوز کم تھی اور زمین بڑی کشادہ۔ اس لئے سامانِ زیست کی بڑی فراوانی تھی۔ اور چونکہ کسی نے زمین پر لکیریں کھینچ کر اُن خطوں کو اپنی ذاتی ملکیت میں نہیں لیا تھا، اس لئے معاش کی کیفیت یہی تھی کہ جہاں سے کسی کا جی چاہے، پیٹ بھر کر کھالے — پیٹ بھر کر کھالے (رَغَدًا) کے معنی یہ ہیں کہ اس دور میں سامانِ رزق کے جمع کر کے رکھنے (HOARDING) کا تصور بھی نہیں تھا۔ رزق سے مقصود اپنی ضرورت پوری کرنا تھا، نہ کہ خزانہ و دفاتن کی رو سے دوسروں کو اس سے محروم رکھنا۔ یہ تھی وہ جنتی زندگی جس کا ذکر قصہ آدم میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس جنت کی مزید تفصیل سورۃ طہ میں ان الفاظ میں دی گئی ہے کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوعَ فِيْهَا وَلَا تَعْوٰی۔ وَاِنَّكَ لَا تَظْمَؤُ فِيْهَا وَلَا تَضْحٰی (۲۰/۱۱۸)۔ اس میں تمہیں نہ تو روٹی کی فکر ستائے گی نہ کپڑے کی، نہ پیاس کا

خوف ہوگا نہ سورج کی گرمی کا۔ تمہارے لئے کھانے کو روٹی، پینے کو پانی، پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان، سب کچھ بلا تردد اور بلا مشقت موجود ہوگا۔ لیکن ابلیس کی کوششیں یہ ہوگی کہ تمہیں

ان سے محروم کر دے۔ اس لئے کہیں اس کے پھندے میں نہ پھنس جانا (۲۰/۱۱۸)۔ اس کا طریقہ یہ ہوگا کہ تم ہماری راہنمائی کی پیروی کرو۔ یاد رکھو! وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَّلَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ اَعْمٰی (۲۰/۱۱۸)۔ جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی، اور جس کی یہاں روزی تنگ

ہوگی وہ قیامت میں بھی اندھا ہی اٹھایا جائے گا۔“ آپ نے غور فرمایا کہ آدم کی جنت کیا تھی اور ابلیس نے اُسے اُس جنت سے نکال دینے کے لئے کیا کیا ترکیبیں سوچی تھیں۔ پھر آپ نے اس پر بھی غور کیا کہ اللہ تعالیٰ نے قوانینِ خداوندی کے اتباع کا نتیجہ رزق کی فراوانی بتایا ہے، اور ان سے اعراض برتنے کا نتیجہ معیشت کی تنگی قرار دیا ہے۔ سورۃ النحل میں ہے:-

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّن كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنعُمِ اللَّهِ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (۱۶)

”خدا اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعہ واضح کرتا ہے۔ ایک بستی تھی جس کے رہنے والے نہایت امن اور اطمینان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس میں ہر طرف سے سامانِ رزق بڑی فراوانی سے چلا آتا تھا۔ لیکن انہوں نے خدا کی ان نعمتوں کی ناشکر گزاری کی۔ ان سے کفر برتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ اور یہ نتیجہ تھا ان کے اُس معاشی نظام کا، جسے انہوں نے خود وضع کیا تھا۔ خدا کا متعین فرمودہ نظام ایسا نہیں ہوتا۔“

وہ تھی آدم کی جنت، جس میں امن بھی تھا اور اطمینان بھی اور اس کے ساتھ رزق کی وسراوانی بھی۔ اس کے بعد جب انسانوں نے اپنا وضع کردہ معاشی نظام اختیار کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان سے امن بھی چھن گیا اور اطمینان بھی — اور بھوک کا عذاب ان پر مسلط ہو گیا۔ یہ تھا آدم کا اس جنت سے نکل جانا، جس کا ذکر ذرا آگے چل کر سامنے آتا ہے۔ ہم مطالب الفرقان جلد اول میں زیرِ آیت (۲/۲۹) وضاحت سے بتا چکے ہیں کہ نظامِ خداوندی میں ذرائعِ رزق پر ذاتی ملکیت نہیں ہوتی۔ زمین رزق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اور اس سے مقصود یہ کہ تمام مخلوق کو ان کی ضرورت کے مطابق سامانِ پرورش میسر آتا ہے۔ یہ ہے نظامِ خداوندی۔ اس کے برعکس، انسانوں کا خود ساختہ نظام ہے جس میں بالادست طبقہ، زمین کے لامحدود رقبوں کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے لیتا ہے تاکہ زیر دست طبقہ اپنی روٹی تناک کے لئے ان کا محتاج اور دست نگر ہو۔ اور پھر یہ (زبردست) لوگ، ان کمزوروں اور ناداروں کی احتیاج کا ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں اپنی غلامی اور محکومی کی زنجیروں میں جکڑے رکھیں۔

یہاں ایک اور حقیقت بھی غور طلب ہے۔ قرآنِ کریم نے جب جنتِ آدم کے **مرد اور عورتیں دونوں** متعلق کہا کہ اس میں ”آدم اور اس کی زوج“ دونوں یکساں طور پر رہیں گے تو

اس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ سامانِ زیست میں مردوں اور عورتوں، دونوں، کا حصہ ہوگا۔ یہ نہیں کہ مرد سامانِ زیست کا مالک بن بیٹھے اور عورت اس کی محتاج رہے۔

آیت (۲/۲۳) میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ قوانینِ خداوندی سے اعراض برتیں گے ان کی روزی تنگ ہو جائے گی اور

وہ قیامت کے دن بھی اندھے اٹھائے جائیں گے۔ اس سے ایک اور عظیم حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ جو قوم یہاں ذلت و خواری اور تنگی اور مفلسی کے عذاب خداوندی میں مبتلا ہوگی وہ عاقبت میں بھی ذلیل و خوار ہوگی۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ اَعْمٰی فَهَوٰی اِلَیْهِ الْاٰخِرَةُ اَعْمٰی۔ وَاَصْلُ سَبِيْلًا (۱۶/۱۶)۔

”یہاں کا اندھا قیامت میں بھی اندھا ہوگا بلکہ اس سے بھی گمراہ“ اس کا واضح ہے کہ جو قوم اس دنیا میں ذلیل و خوار اور محتاج ہوگی (اور اس ہیچ زندگی پر مطمئن ہو کر بیٹھ رہے گی) اس کی عاقبت بھی خراب ہوگی۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا :- جو آج خود افرور و جگر سوز نہیں ہے

وہ قوم نہیں لائق ہنگامہ فردا :- جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

چونکہ ہم اس موضوع پر جلد اول میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ اس لئے اس کی مزید تشریح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔



قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ آدم سے کہا گیا کہ تم اس جنت میں خوش و خرم رہو سہو۔ اس میں سے، جہاں سے جی چاہے، کھاؤ پیو۔ لیکن دیکھنا اس ”شجر“ کے قریب نہ جانا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ جنتی زندگی تم سے چھین لی جائے گی۔

سوال یہ ہے کہ یہ ”شجر“ کونسا تھا جس کے قریب جانے سے آدم کو منع کیا گیا تھا؟ اس کی تفسیر میں بہت

کچھ کہا گیا ہے۔ بائبل میں تو اسے ”علم کا درخت“ (TREE OF KNOWLEDGE) بتایا گیا ہے۔ لیکن یہ تو بالبداهت غلط ہے۔ قرآن کریم نے تو آدم کی پہلی خصوصیت

ہی یہ بتائی ہے کہ اُسے خدا نے تحصیلِ علم کی صلاحیت عطا فرمائی (۲/۳۱)۔ اور یہی علم تھا جسکی بنا پر اُسے ملائکہ پر فضیلت حاصل ہوئی۔ قرآن کریم میں علم کی اس قدر فضیلت بیان کی گئی ہے کہ اس کی روشنی میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ خدا نے آدم کو علم کے قریب جانے سے منع کر دیا تھا۔

بائبل میں یہ بھی ہے کہ وہ درخت ”خیر و شر کی تیز“ کا تھا۔ یہ بھی غلط ہے۔ اگر آدم کو خیر و شر میں تمیز کرنے سے روکا گیا تھا تو یہ مقام آدم کی حیوانات سے بھی پست سطح زندگی ہوئی۔ قرآن کریم کی رو سے تو قصۃ ابلیس و آدم سے بنیادی طور پر مقصود ہی خیر و شر کی تیز ہے۔

یہ بائبل میں تھا۔ اور ہمارے ہاں یہ کہہ کر قصۃ ہی ختم کر دیا گیا کہ یہ گیہوں کا درخت تھا۔ یہ مفہوم ایسا سطحی ہے کہ

اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

عربی زبان میں ہر وہ چیز جو مجتمع ہو کر، کسی وجہ سے متفرق ہو جائے "شجر" کہلاتی ہے۔ درخت کو بھی شجر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنی جڑ اور تنے کی حد تک مجتمع ہوتا ہے اور اس کے بعد مختلف شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔ اسی لئے شجر بینہم کے معنی ہیں باہمی اختلاف کی وجہ سے آپس میں جھگڑنا، تفرقہ پیدا کر لینا۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ہے: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيَسْلَمُوا تَسْلِيمًا (۲۴)۔ اے رسول! تیرا خدا اس حقیقت پر شاہد کہ یہ لوگ کبھی مومن قرار نہیں پاسکتے تا وقتیکہ یہ اپنے ان معاملات میں، جن میں یہ باہمی اختلاف کرتے ہوں، تجھے اپنا حکم تسلیم نہ کر لیں اور پھر اس کے بعد ان کی کیفیت یہ ہو کہ تیرے فیصلے سے سرتابی تو ایک طرف، یہ اس سے اپنے دل میں بھی کسی قسم کی گرائی محسوس نہ کریں۔ ان کا مسلک یہ ہو کہ تیرے فیصلے کے سامنے، اپنا سر ہی نہیں، دل بھی جھکا دیں۔ اس آیت میں "شجر بینہم" کا مفہوم واضح ہے۔ "مشاجرت" کہتے ہیں باہمی منازعت اور مخالفت کو ہیں۔

شجر کا مفہوم اوپر بیان کیا گیا ہے اسے ایک بار پھر سامنے لائیے۔ یعنی کسی شے کا پہلے مجتمع ہونا اور پھر بھٹ کر الگ الگ ہو جانا۔ باہمی تفرقہ پیدا کر لینا۔ قرآن کریم میں نوحؑ کی ابتدائی زندگی اور اس کے بعد اس مشاجرت کے متعلق سورۃ یونس میں کہا ہے: وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً ۖ فَاخْتَلَفُوا (۱۰)۔ "شروع میں تمام نوع انسان، امت واحدہ تھی۔ یعنی ایک عالمگیر برادری۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے باہمی اختلاف کیا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔" اور دوسری جگہ ہے کہ ان کے اختلافات کو رفع کر کے انہیں پھر سے امت واحدہ بنا دینے کے لئے خدا نے آسمانی سلسلہٴ رشد و ہدایت شروع کیا (۲۳)۔ اس سے مشاجرت کا نقشہ سامنے آ گیا جس سے آدم کو منع کیا گیا تھا۔ اس سے کہا یہ گیا تھا کہ تم ایک عالمگیر برادری بن کر رہنا۔ ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جانا۔ اگر تم نے ایسی روش اختیار کر لی تو یاد رکھو! اس جنتی زندگی کا سارا نقشہ بگڑ جائے گا۔ کوئی شے اپنے مقام پر نہیں رہے گی۔ (ظلم کے بنیادی معنی یہی ہیں)۔ تمہاری معیشت تنگ ہو جائے گی۔ افلاس اور بھوک عام ہو جائے گی۔ تم طبقات میں بٹ جاؤ گے اور تم میں جنگ جہاد شروع ہو جائیں گے، اور ملائکہ نے جس خدشہ کا اظہار کیا تھا کہ یہ نئی مخلوق فساد انگیزیاں اور خوں ریزیاں شروع کر دے گی، وہ حقیقت بن کر سامنے آ جائے گا۔ یاد رکھو! ابلیس کی پوری پوری کوشش یہ ہو گی کہ تم میں باہمی اختلاف پیدا ہو جائے۔ تم خاندانوں، قبیلوں، نسلوں اور قوموں میں بٹ جاؤ اور پھر ایک خاندان دوسرے خاندان کا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا اور ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی ہو جائے۔ دیکھنا، ایسا نہ کرنا، ورنہ یہ جنت چھن جائے گی۔

اور دنیا جہنم بن جائے گی۔

غور کیجئے۔ قرآن کریم نے ابلیسی سازش کی تمام تفصیل کو کس طرح ایک لفظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ ”مشاجرت“ یعنی نوع انسان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ اسی بنا پر اقبالؒ نے (جاوید نامہ میں) ابلیس کو خواجہ اہل فراق کے لقب سے ملقب کیا ہے۔ ”تفرقہ ڈالنے والوں کا سرخیل“

اور اس کے بعد ہے:-

فَازَلَهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا۔ فَاخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ۔ وَقُلْنَا اهْبِطُوا
بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ۔

۲
۳۶

”شیطان نے ان کے پاؤں میں لغزش پیدا کر دی، وہ پھسل گئے“ ایک جگہ ہے: وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ (۱۳۱)۔ اور آدمؑ نے ارشاد خداوندی سے معصیت کی اور اس طرح صحیح راستہ سے بھٹک گیا: دوسری جگہ ہے: فَتَنَسَىٰ۔ وَلَهُ نَجْدٌ لَّهُ عَزْوَٰهَا (۱۳۲)۔ ”آدمؑ نے صحیح راستہ کو ترک کر دیا۔ ہم نے اُسے تختہ ارادے والا نہ پایا“

ابلیس نے آدمؑ سے کہا کہ: مَا نَهَكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَنْ تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ (۱۳۳)۔ ”خدا نے جو تمہیں اس شجر کے قریب جانے سے منع کر دیا ہے تو یہ اس لئے کہ تم کہیں ملائکہ نہ بن جاؤ یا تمہیں حیات جاوداں حاصل نہ ہو جائے“ دوسری جگہ ہے: قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْئَلُ (۱۳۴)۔ ”شیطان نے آدمؑ سے کہا کہ میں تجھے ایک ایسے درخت کا پتہ نشان بتاتا ہوں جس کا پھل کھانے سے تمہیں حیات

جاوید حاصل ہو جائے گا اور ایسی مملکت مل جائے گی جس پر کبھی زوال نہ آئے گا“ یہ حقیقت ہے کہ انسان مرنا نہیں چاہتا۔ حیاتِ دوام کی خواہش اس کے دل میں ہمیشہ انگڑائیاں لیتی رہتی ہے۔ اب حیات کی تلاش اور خضر و سکندر کی ملاقاتوں کے افسانے، اس کی اس خوابیدہ آرزو کی بیدار تعبیریں ہیں۔ لیکن اس کی یہ آرزو، نہ آج تک پوری ہوئی ہے نہ ہوگی۔ جو انسان اس دنیا میں آیا وہ موت کا شکار ہو گیا۔ لہذا طبعی طور پر تو کسی فرد کا ہمیشہ کے لئے زندہ رہنا ممکن نہیں۔ اس کے لئے اس کے خود غرضی کے جذبات نے ایک اور راہ سمجھائی اور اس سے کہا کہ تم اپنی اولاد کے ذریعے مرنے کے بعد بھی زندہ رہ سکتے ہو۔ اولاد سے تمہارا نام روشن ہو گا۔ یہ وہ بڑا تہ ہے جو آگے چلتا ہے۔ اولاد سے خاندان کی طرح پڑتی ہے۔ خاندان پھیل کر قبیلہ بنتا ہے۔ قبیلہ کی وسعتیں، نسل کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور ان کے ذریعے ان کے مورثِ اعلیٰ، ان کے آباؤ اجداد، ان کے اسلاف کا نام روشن رہتا ہے۔ ابلیس نے آدمؑ کے کان میں یہی افسوں پھونکا۔ اس نے کہا کہ عالمگیر برادری کا تصور

ایک فریب ہے۔ انسانیت کے ہجوم میں گم ہو کر، ایک فرد اپنا جداگانہ **حیات جاوید بوساطتِ اولاد** تشخص کھودیتا ہے۔ اس ازدحام میں تمہیں حیاتِ دوام کیسے حاصل

ہو سکتی ہے؟ اس کا ذریعہ تمہاری اولاد ہے اور اس کے بعد اولاد در اولاد کا منفرد اور متمیز سلسلہ۔ یہ ہے وہ المیسی وسوسہ، جسے قرآن کریم نے ”جنسی اختلاط“ کی ایمائیت (SUGGESTIVENESS) سے مختلف مقامات پر بیان کیا ہے۔ سورۃ الاعراف میں ہے:

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْآتِهِمَا. وَقَالَ. مَا نَهَكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَنْ تَكُونَا مَلَكَيْنِ. أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ
وَقَاَسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ (۲/۳۴)

”شیطان نے آدم کے کان میں یہ افسوس پھونکا کہ خدا نے جو تمہیں کہا ہے کہ تمام انسانوں کو ایک عالمگیر برادری کی حیثیت سے ہونا چاہئے تو اس سے اس کا مقصد یہ ہے کہ تم کہیں بہت بڑی قوتوں کے مالک نہ بن جاؤ، یا حیاتِ جاوید حاصل نہ کرو۔ تم ہمیشہ زندہ رہنا چاہتے ہو تو آؤ میں تمہیں اس کا طریق بتاتا ہوں۔ تم زندہ رہ سکتے ہو۔ اپنی اولاد کے ذریعہ۔ یوں وہ افزائشِ نسل کو مقصودِ حیات بنا کر، انسان کو حیوان کی سطح پر لے آیا اور زندگی کے بلند مقصد کو اس کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ اس نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس میں میرا اپنا کوئی فائدہ نہیں۔ میں یہ سب کچھ تمہاری خیر خواہی کیلئے کہہ رہا ہوں“

فَدَلَّاهُمَا بِغُرُورٍ. فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا. وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ. وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا. أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكَ الشَّجَرَةِ. وَأَقُلْتُ لَكُمَا إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُبِينٌ (۲/۳۵)

”چنانچہ اس نے اس قسم کی باتوں سے انسان (مرد اور عورت) کو بہکا دیا اور انہیں ان کے مقامِ بلند سے گرا دیا۔ ان کے ستر کے مقام پر پردہ ہو گئے اور چونکہ انسانی سطحِ زندگی پر حیا کا جذبہ بھی نمودار ہو جاتا ہے اس لئے (تمثیلی انداز میں یوں سمجھو کہ) انہوں نے ستر کے ان مقامات کو پتوں سے چھپانے کی کوشش کی۔ اس پر خدا نے ان سے کہا کہ میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ تم انسانی زندگی کے بلند مقصد کو چھوڑ کر، حیوانی سطحِ زندگی پر نہ آ جانا؟ میں نے تمہیں (WARN) کر دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اس کے فریب میں مت آ جانا“ اسی حقیقت کو آیت (۲/۳۶) میں بھی دھرایا گیا ہے۔

یہ تھا وہ فریب، جس سے انسان کے پست جذبات نے اسے، بلند انسانی سطح سے گرا کر زندگی کی حیوانی سطح پر پہنچا دیا۔

یاد رہے کہ جنسی جذبات کی تسکین اور افزائش نسل (اولاد پیدا کرنا) معیوب و ممنوع نہیں۔ قرآن کریم نے تو انہیں وجہ زینت قرار دیا ہے (۱۸/۱۷)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر مال اور اولاد تمہارے بلند انسانی مقاصد کے راستے میں حائل ہو جائیں تو یہ بہت بڑا فتنہ بن جاتے ہیں (۱۸/۲۸)۔ بہر حال، یہ ہے آدم کے ستر کھل جانے کا وہ مفہوم، جو ہم سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی نظر آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ ابلیس کی افسوس سازی سے آدم کے مقامات ستر برہنہ ہو گئے تو اس کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ محض افزائش نسل کو مقصودِ حیات سمجھ لینے کے معیوب اور مذموم نتائج جب انسان کے سامنے آتے تو، بجائے اس کے کہ وہ اس روشنی زندگی کو ترک کر دیتا، اس نے ان عیوب برہنگی کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ذاتوں، برادریوں، نسلوں اور نسل کی بنا پر قومیتوں کے جس قدر فوائد گنائے جاتے ہیں، وہ انہی عیوب کی پردہ پوشی کی ناکام کوششیں ہیں۔

بہر حال، قرآن کریم نے جو کچھ کہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ انسان سے کہا یہ گیا کہ تم ایک عالمگیر برادری کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا۔ اس سے تمہاری زندگی جنت کی خوشگوار یوں کی حامل رہے گی۔ لیکن اگر تم نسل پرستی کی بنا پر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تو اس سے یہ جنت تم سے چھن جائے گی۔ اگر تم نے اس نسل پرستی کو منطقی دلائل کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کی تو یہ خود فریبی ہوگی۔ اس سے تم انسانیت کے بلند مقام سے نیچے گر جاؤ گے، اسی کو ”ہبوطِ آدم“ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا ذکر اسی آیت کے اگلے حصہ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ لیکن اس نکتہ پہنچنے سے پہلے ایک اور نکتہ بھی غور طلب ہے۔

آیہ زیرِ نظر میں ایک لفظ ایسا ہے جس میں حقائق کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ اس میں کہا گیا ہے: فَازْلِهْمَا الشَّيْطَانُ (۱۸/۲۸) اس میں ”هُمَا“ کی ضمیر وہ نقطہ ہے جس میں (جیسا کہ ہم نے کہا ہے) بڑے اہم اور صیرت افروز حقائق پوشیدہ ہیں۔ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ شیطان نے ان دونوں (مرد اور عورت) کے پاؤں میں لغزش پیدا کر دی۔

بائبل میں یہ کہا گیا ہے کہ شیطان نے آدم کی بیوی کو بہکایا اور آدم اپنی بیوی کی باتوں میں آگیا۔ اس بنا پر عیسائیت

سے دیگر زبانوں میں واحد اور جمع۔ دو صیغے ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں تین۔ یعنی واحد (ایک کے لئے)۔ تثنیہ (دو کے لئے) اور جمع (دو سے زیادہ کے لئے)۔ ضمیر (هُوَ) واحد غائب (مذکر) ضمیر ہے جس کے معنی ہیں ”وہ ایک“۔ هُمَا ضمیر تثنیہ غائب (مذکر اور مؤنث) ہے جس کے معنی ہیں ”وہ دونوں“۔ اور هُمْ ضمیر جمع غائب (مذکر) ہے جس کے معنی ہیں ”وہ سب“۔ قرآن کریم میں لغزشِ آدم کے سلسلہ میں هُمَا کی ضمیر آئی ہے جس سے مراد یہ ہے کہ شیطان نے آدم اور اس کی زوج (مرد اور عورت) دونوں کو بہکایا۔

عیسائیت میں عورت کا مقام | گناہِ اول کا مجرم عورت کو قرار دینا ہے اور مرد کو اس سے بری الذمہ ٹھہراتی ہے۔ اس جرم کی بنا پر اس کے نزدیک عورت دنیا میں تمام مصائب

کا سرچشمہ ہے، اس لئے انتہائی قابلِ نفرت مخلوق۔ عیسائیت کا مقدس لٹریچر، عورت کے خلاف طعن و تشنیع سے بھرا پڑا ہے۔ ان کے بڑے بڑے (SAINTS) عورت کو ملعون و مردود قرار دینے میں بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی تجرد کی زندگی بسر کی اور وہ بھی تجرد کی زندگی کو وجہِ تقرب خداوندی سمجھتے ہیں۔ انہی کے تتبع میں، ان کے ہاں کی (NUNS) بھی تجرد کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ یعنی "جنسی آلائش" سے دور رہتی ہیں۔ دنیائے عیسائیت میں، صدیوں تک یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ عورت میں روح بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ سینٹ پال کا قول ہے کہ "جو عورتیں غیر شادی شدہ ہیں یا بیوہ، میں انہیں تلقین کروں گا کہ میری طرح غیر شادی شدہ رہیں؛ اس کے بعد اس نے کہا:-

آدمی عورت سے پیدا نہیں کیا گیا، عورت آدمی سے پیدا کی گئی ہے۔ آدمی عورت کے لئے پیدا نہیں کیا گیا، عورت آدمی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ گیمجے میں عورتوں کو خاموش بیٹھے رہنا چاہئے۔ انہیں بولنے کی اجازت نہیں۔ قانون کی رو سے انہیں مردوں کے مقابلہ میں کم تر درجہ پر رہنا چاہئے۔ اگر انہیں کسی بات کے معلوم کرنے کی ضرورت پڑے تو گھر جا کر اپنے خاوندوں سے پوچھ لیا کریں۔ عورت کے لئے یہ بات بڑی بے عزتی کی ہے کہ وہ گرجے میں بات کرے۔ (سینٹ پال)

ایک اور سینٹ (HIEVONYMUS) کا قول ہے کہ "عورت، شیطان کا دروازہ، برائیوں کی راہ اور پچھو کا ڈنگ ہے۔" ان کا عقیدہ یہ ہے کہ عورتیں بہشت میں نہیں جاسکتیں۔ اس سے یہ دشواری پیش آتی کہ پھر حضرت مریمؑ کے متعلق کیا کیا جاتے۔ سینٹ (THOMAS) نے اس کا حل یہ بتایا کہ حضرت مریمؑ اور ان کے ساتھ ان تمام عورتوں کو جو کفارہ پر ایمان رکھنے کی بنا پر بہشت میں جانے کے قابل قرار دی جائیں گی، مرد بنا دیا جائے گا۔ بلکہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہاں تذکیر و انثیت کا امتیاز ہی اٹھ جائے گا۔

عیسائیوں کے ہاں تو ایسے عقائد پیدا ہونے ہی تھے لیکن انتہائی بد قسمتی کہ خود ہم (مسلمان بھی) اس سے محفوظ نہ رہے۔ ہم نے ان عقائد کو ان سے مستعار لیا اور پھر انہیں اسلام عورت کی حیثیت خود ہمارے ہاں | کا جڑ بن کر اپنے لٹریچر میں شامل کر لیا۔ عیسائیت کا عقیدہ یہ

تھا کہ پہلے آدم کو پیدا کیا گیا اور جب اس نے تنہائی محسوس کی تو پھر اس کی پسلی سے اس کی بیوی نکالی گئی۔ آپ غور کیجئے کہ یہی تصور، خود ہمارے ہاں بھی کس طرح حقیقت تسلیم کر لیا گیا۔ تفسیر ابن کثیر کا شمار ہمارے ہاں کی مستند ترین تفاسیر میں ہوتا ہے۔ اس میں پیدائشِ آدم کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ:-

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ابلیس کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کا علم ظاہر کر کے پھر ان پر اونگھ ڈال دی گئی اور ان کی بائیں پسلی سے حضرت حوا کو پیدا کیا۔ جب آنکھ کھول کر حضرت آدم نے انہیں دیکھا تو اپنے خون اور گوشت کی وجہ سے اُن سے انس و محبت پیدا ہوئی۔ پھر پروردگار نے انہیں ان کے نکاح میں دیا اور جنت میں رہائش کا حکم عطا ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کے جنت میں داخل ہو جانے کے بعد حضرت حوا پیدا کی گئیں۔ حضرت ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ وغیرہ صحابہ سے مروی ہے کہ ابلیس کو جنت سے نکلانے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں جگہ دی گئی لیکن تن تنہا تھے۔ اس وجہ سے ان کی نیند میں حضرت حوا کو ان کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ جاگ کر انہیں دیکھ کر پوچھنے لگے کہ تم کون ہو اور کیوں پیدا کی گئی ہو۔ حضرت حوا نے فرمایا کہ میں ایک عورت ہوں اور آپ کے ساتھ رہنے اور تسکین کے لئے پیدا کی گئی ہوں۔ لے

دوسری جگہ ہے کہ:-

صحیح حدیث میں ہے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور سب سے بلند پسلی سب سے زیادہ بڑھی ہے پس تو اگر اسے سیدھی کرنے کی کوشش کرے گا تو تو اسے توڑ دے گا اور اگر اس میں کچھ کچی باقی چھوڑتے ہوئے فائدہ اٹھانا چاہے گا تو بیشک فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ لے

اس تفسیر اور روایات کی روش سے (جن کے متعلق بدقسمتی سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں، حالانکہ ان کے وضعی ہونے میں کوئی شک شبہ نہیں رہ جاتا)۔ ایک تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ عورت کا وجود مقصود بالذات نہیں۔ وہ مرد کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ چونکہ وہ بڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے، اس لئے وہ سیدھی ہو ہی نہیں سکتی۔ جو شخص اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرے گا وہ اسے توڑ دے گا۔ یعنی یہ ٹوٹتے ٹوٹ جاتے گی لیکن سیدھی نہیں ہوگی۔ لہذا اس کی کچی کو برداشت کرتے ہوئے اس سے فائدہ اٹھا لینا چاہئے۔

لے ترجمہ اردو مولانا محمد جونا گڑھی پارہ اول ص ۵۵۔

لے پارہ چہارم ص ۶۶۔

اس کے بعد آپ دیکھتے کہ اس ٹیڑھی پسلی کو سیدھا کرنے کے لئے کس قسم کی (وضعی) روایات حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی حیثیت سے ہمارے ہاں راہ پاگئیں اور ہماری تفسیروں کا حصہ بن گئیں۔ سورة النساء میں ایک آیت ہے: **الْبِرَّ جَالٍ قَوَّامُونَ عَلَى النَّسَاءِ** (۲۴)۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے ”مرد عورتوں پر حاکم یا وار و غہ ہیں“۔ اس ترجمہ کا مدار ان روایات پر ہے جو اس ضمن میں ہمارے ہاں متداول ہیں۔ تفسیر ابن کثیر (سورة النساء پارہ پنجم میں ہے کہ:-

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ عورتوں کو مردوں کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک عورت نے نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے خاوند کی شکایت کی کہ اس نے اسے تھپڑ مارا ہے۔ پس آپ نے اسے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا جو یہ آیت انری، اور بدلہ نہ دلوایا گیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک انصاری اپنی بیوی صاحبہ کو لئے ہوئے حاضر خدمت ہوئے۔ اس عورت نے حضورؐ سے کہا کہ یا رسول اللہ! میرے اس خاوند نے مجھے تھپڑ مارا، جس کا نشان اب تک میرے چہرے پر موجود ہے۔ آپ نے فرمایا اسے حق نہ تھا۔ وہیں یہ آیت اتری کہ ادب سکھانے کے لئے مرد عورتوں پر حاکم ہیں تو آپ نے فرمایا کہ میں نے اور چایا تھا اللہ نے اور چایا۔ (ص ۲)

آگے بڑھنے سے پیشتر، ذرا دل تھام کر سوچئے کہ اس فقرہ کی زد کہاں جا کر پڑتی۔ یعنی (اس روایت کی رُو سے)..... حضورؐ نے فرمایا یہ کہ میں تو چاہتا تھا کہ عورتوں کو بدلہ لینے کا حق مل جائے لیکن جب خدا ہی چاہے تو میں کیا کروں (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)۔ اسی تفسیر میں آگے چل کر لکھا گیا ہے کہ:-

ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ نوڈیوں کو مار دہیں۔ اس کے بعد ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ آئے اور عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! عورتیں آپ کے اس حکم کو سن کر اپنے مردوں پر دلیر ہو گئی ہیں۔ اس پر حضورؐ نے انہیں مارنے کی اجازت دیدی۔ اب مردوں کی طرف سے دھڑا دھڑا مار پیٹ شروع ہوتی اور بہت سی عورتیں شکایتیں لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تو آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ سنو! میرے پاس عورتوں کی فریاد پہنچی ہے۔ یاد رکھو! تم میں سے جو اپنی عورتوں کو زور و کوب کرتے ہیں وہ اچھے آدمی نہیں۔

اس کا صحیح غہوم اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔

اس بات بیویوں کی ہورہی ہے۔ کیا انہی کو نوڈیاں کہہ کر پکارا گیا ہے؟

حضرت اشعثؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت فاروقؓ کا مہمان ہوا۔ اتفاقاً اس روز میاں بیوی میں کچھ ناچاکی ہو گئی۔ اور حضرت عمرؓ نے اپنی بیوی صاحبہ کو مارا۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے اشعثؓ: تین باتیں یاد رکھ: جو میں نے آنحضرتؐ سے سن کر یاد رکھی ہیں، ایک تو یہ کہ مرد سے یہ نہ پوچھا جائے کہ اس نے اپنی عورت کو کس بنا پر مارا ہے، دوسری یہ کہ وتر پڑھے بغیر سونا مت اور تیسری بات راوی کے ذہن سے نکل گئی۔ (ص ۲۰-۲۱)

اسی تفسیر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ :-

رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ اسوئے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کو سجدہ کرے، تو عورت کو حکم کرتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ بخاری شریف میں ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے اور وہ انکار کر دے تو صبح تک فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔ صحیح مسلم میں ہے کہ جس رات کوئی عورت بطور رد ٹھنکے اپنے خاوند کے بستر کو چھوڑے رہے تو صبح تک اللہ تعالیٰ کی رحمت کے فرشتے اس پر لعنتیں کرتے رہتے ہیں (ص ۲۱)۔

یہ تو ہمارے ہاں کے مرد و مذہب کی رو سے عورت کی حیثیت ہے مردوں کے مقابلہ میں۔ جہاں تک عورتوں کے گناہوں اور برائیوں کے سرچشمہ ہونے کا تعلق ہے اس سے بھی ہماری کتب روایات بھری پڑی ہیں۔ مثلاً (احادیث کی صحیح ترین کتاب) بخاری شریف میں کہا گیا ہے کہ :-

حضرت ابو ہریرہؓ مروی ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت کبھی نہ سڑتا اور اگر حواء نہ ہوتی تو کوئی عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی۔ (بخاری، کتاب پیدائش انبیاء)

دوسری روایت ہے :-

حضورؐ نے فرمایا کہ میرے پیچھے، مردوں پر کوئی فتنہ عورتوں سے زیادہ باعث مضرت نہیں۔ (بخاری کتاب النکاح)

ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ ”نحوست تین چیزوں میں ہے، عورت، گھر، گھوڑا“ (بخاری کتاب النکاح)

اسی سلسلہ میں ایک اور روایت ہے کہ :-

حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے جنت میں دیکھا تو وہاں اکثریت فقیروں کی پائی گئی اور دوزخ میں دیکھا تو اکثریت عورتوں کی نظر آئی۔ (بخاری، کتاب الانبیاء)۔

یہ روایات وضعی ہیں | صاف نظر آ رہا ہے کہ اس مقصد کے پیش نظر کہ مسلمان اس پر اعتراض نہ کر سکیں کہ بائبل میں یا عیسائیت کے عقائد کی رُو سے عورت کو کس قدر قابلِ نفرت ٹھہرایا گیا ہے، ہودیوں

اور عیسائیوں نے خاص سازش کے ماتحت اس قسم کی روایات وضع کیں اور انہیں ہماری کتبِ احادیث میں داخل کر دیا۔ انہوں نے تو ایسا کیا ہی تھا لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ان وضعی روایات کو احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرار دیکر سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ اس قسم کی روایات کی نسبت، حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی کس طرح صحیح قرار پا سکتی ہے۔ یہی نہیں کہ خود نہیں سوچتے، جو ”سوختہ بخت“ یہ کہہ دے کہ ایسی روایات کی نسبت، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح معلوم نہیں ہوتی، اُسے ”منکر حدیث“ قرار دیکر دائرہ اسلام سے خارج کر دیتے ہیں!

ظاہر ہے کہ اس قسم کی روایات اور تفاسیر کا اثر آگے بھی بڑھنا تھا۔ چنانچہ ہمارے ہاں کے ”احکام شریعت“ میں دیکھئے کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی کیا حیثیت قرار دی گئی ہے۔ شریعت سے آگے بڑھ کر، تصوف کی طرف آئیے تو وہاں عیسائیوں کے (SAINTS) کے خیالات، صوفیائے کرام میں عام نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی تجرد کو متاہل زندگی پر ترجیح دی جاتی ہے۔ عورتوں کے متعلق حضرت علی، جویریؓ (داتا گنج بخشؒ) کا ارشاد ہے کہ:-

بہشت میں پہلا فتنہ جو آدم پر مقدر ہوا، اس کا اہل سبب عورت تھی۔ پہلے پہل جو فتنہ دنیا میں ظاہر ہوا یعنی ہابیل و قابیل کی لڑائی۔ اس کا سبب بھی عورت تھی۔ اور جب خدا نے چاہا کہ دو فرشتوں (ہاروت و ماروت) کو سزا دے تو اس کا سبب بھی عورت کو قرار دیا۔ اور آج دینی اور دنیاوی تمام فتنوں کے اسباب کا ذریعہ بھی عورتیں ہیں۔ روایات و تفاسیر اور شریعت و طریقت سے جب بات آگے بڑھ کر شاعری تک پہنچی تو پھر — اللہ دے اور بندے لے — پوچھتے مت کہ اس مجبور و مقہور مخلوق کے خلاف کیا کیا نہ کہا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے:-

چہ خوش گفت جمشید بارائے زن کہ یا پردہ یا گور بہ حوائے زن
اگر نیک بودے سر احوال زن زناں را مزن نام بودے نہ زن

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۱) کہ حضورؐ نے جہنم میں عورتوں کی اکثریت دیکھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ عورتیں، دنیا میں ”مائیں“ تھیں تھیں؟ اگر مائیں تھیں — اگر سب کی سب نہیں تو ان میں سے بیشتر مائیں ہوں گی — تو پھر اس کا کیا جواب کہ ان کے پاؤں کے نیچے توجرت تھی لیکن وہ خود جہنم میں تھیں! صاف نظر آتا ہے کہ ایسی وضعی روایات کو پیش کرنے والے جب عورت کے متعلق بات کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں ”بیوی“ ہوتی ہے۔ عورت کی کوئی اور پوزیشن نہیں ہوتی — اور بیوی ہمارے ارباب شریعت کے نزدیک جنس کا رسد سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

۱۔ یا قتباً س غالباً ”کشف المحجوب“ ہے۔ لیکن ہم نے اسے ہفتہ وار مجلہ ”منہاج“ لاہور کی اشاعت بہت پہلے ستمبر ۱۹۵۴ء سے لیا ہے۔

مشو، ایمن از زن کہ زن پارساست کہ خربستہ بہ، گرچہ، وزداشتناست

قرآن کریم نے نہ تو کہیں یہ کہا ہے کہ عورت کو مرد کی پسلی سے پیدا کیا گیا، اور نہ ہی یہ کہ گناہ اول کا موجب عورت تھی۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا کہ **فَاَزَلَهُمَا الشَّيْطَانُ (۱۳۳)**۔ شیطان نے عورت کو نہیں بہکایا۔ عورت اور مرد دونوں اس کے فریب میں آگئے۔ اس سے آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم نے مرد اور عورت دونوں کی حیثیت یکساں قرار دی ہے۔ اس نے جب کہا ہے کہ **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۱۳۲)** ہم نے بنی آدم کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ تو اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ قرآن کریم نے ان دونوں کی حیثیت یکساں قرار دی ہے اور انہیں **مرد اور عورت ہم دوش** یکساں انسانی صلاحیتوں کا پیکر بتایا ہے۔ اس موضوع پر ہم تفصیل سے تو اس

کے اپنے مقام پر لکھیں گے۔ اس وقت صرف دو ایک آیات ملاحظہ فرمائیے:-

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ - وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ - وَالْقَنَاتِ وَالْقَنَاتِ - وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ - وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ - وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ - وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ - وَالصَّامِتِينَ وَالصَّامِتَاتِ - وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ - وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ - أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا (۳۳)

اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی اطاعت سے اپنی ذات کی تکمیل کر سکتے ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے (الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ)۔ اگر مرد اس پارٹی (جماعت) کے رکن بن سکتے ہیں جو خدا کے قانون کے اہل نتائج پر یقین رکھتے ہوئے امنِ عالم کی ذمہ دار ہو تو عورتیں بھی اس جماعت کی اسی طرح رکن ہو سکتی ہیں (الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ)۔ اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنی استعداد کو اس طرح سنبھال کر رکھیں کہ ان کا استعمال صرف قانونِ خداوندی کے مطابق ہو تو یہی صلاحیت عورتوں میں بھی ہے (الْقَنَاتِ وَالْقَنَاتِ)۔ اگر مرد اپنے دعویٰ یا کوپس کر دکھانے کے اہل ہیں، تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں (الصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ)۔ اگر مرد ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو عورتیں بھی رہ سکتی ہیں (الصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ)۔ اگر مرد اس خصوصیت کے حامل ہو سکتے ہیں کہ جوں

۱۔ میں تحقیق سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ اشعار نظامی گنجوی کے ہیں یا فردوسی کے۔ بہر حال یہ ہیں ہمارے ہاں رائج۔

۲۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے قرآن کریم نے اس کے لئے تنبیہ کا صیغہ (یا ضمیر) استعمال کیا ہے جہاں واحد کا صیغہ ہے وہاں بصر آدم کہا گیا ہے۔ (دیکھئے ۱۱۸ ذ ۳۱)

اُن کی صلاحیتیں بڑھتی جائیں، وہ شاخ ثمر دار کی طرح قانون خداوندی کی اطاعت میں جھکتے چلے جائیں، تو یہ خصوصیت عورتوں میں بھی ہے (وَالْخٰشِعٰتِ وَالْخٰشِعٰتِ)۔ اگر مردوں میں ایثار کا مادہ ہے تو عورتوں میں بھی ہے۔۔۔۔۔ (وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ)۔ اگر مرد اپنے آپ پر ایسا کنٹرول رکھ سکتے ہیں کہ انہیں جہاں سے روکا جائے وہ رُک جائیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے (وَالصّٰمٰتِ وَالصّٰمٰتِ)۔ اگر مرد اپنے جنسی میلانات کو ضبط کی پابندی میں رکھ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں (وَالْحٰفِظٰتِ فَرْوَجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ)۔ اگر مرد قانون خداوندی کو شعوری طور پر سمجھنے اور اسے ہر وقت پیش نظر رکھنے کے اہل ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی اہلیت ہے (وَالذّٰکِرٰتِ) اللہ کثیراً وَالذّٰکِرٰتِ) جب یہ صلاحیتیں، دونوں میں موجود ہیں تو ان کے نتائج بھی دونوں کے لئے یکساں طور پر موجود ہونے چاہئیں۔ لہٰذا نظام خداوندی میں دونوں کے لئے حفاظت کا سامان اور اجر عظیم موجود ہے (اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا)۔

قرآن کی ان تفصیل پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ زندگی کا وہ کونسا گوشہ ہے جس کے متعلق یہ کہا گیا ہو کہ مرد میں تو اس کی صلاحیت ہے اور عورت میں نہیں۔ مرد تو یہ کچھ کر سکتا ہے اور عورت نہیں کر سکتی۔ مرد تو یہ کچھ بن سکتا ہے لیکن عورت نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ مرد اور عورت دونوں کے صلاحیت بخش اعمال نتیجہ خیز ہوں گے اور دونوں دوش بدوش جنت میں داخل ہوں گے۔ گھر کی جنت میں، معاشرے کی جنت میں اور پھر اس زندگی کے بعد، اگلی زندگی کی جنت میں (وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی۔ وَهُوَ هُوَ مِنْ۔ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا) (۲/۲۲۳)۔ ان میں سے کسی کے کام کا نتیجہ ضائع نہیں گا۔ (لَا اُضِیْعُ عَمَلٌ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی) (۲/۱۹۸)۔

اس میں شبہ نہیں کہ تقسیم کار کے اصول کے مطابق زندگی کے کچھ وظائف ایسے ہیں جو عورتوں کے لئے مختص ہیں۔ (مثلاً جنین کی حفاظت، بچہ کی پرورش اور ابتدائی تربیت وغیرہ) اس کے لئے اس کی جسمانی ساخت کے بعض گوشے بھی مردوں سے مختلف ہیں اور نفسیاتی طور پر بھی بعض ایسی منفرد خصوصیات، جو اس کے ان فرائض زندگی کی ادائیگی کے لئے معاون بن سکیں۔ مثلاً بچے کے لئے محبت اور پیار کا جذبہ اور ایثار و قربانی کی صلاحیت۔ ایثار اس قسم کا کہ، جنین ماں کے خون سے مرتب ہوتا ہے۔ اس کی پیدائش کے بعد اس کی پرورش کا انحصار ماں ہی کے عطا کردہ رزق (دودھ) پر ہوتا ہے۔ ماں میں سہارا اور برداشت کا مادہ اس قدر فراوان ہوتا ہے کہ وہ بچے کے ہر قسم کے تقاضہ کو نہایت تحمل اور خندہ پیشانی سے پورا کئے جاتی ہے اور اس کے لئے اس سے کسی صدمہ یا معاوضہ کی متمنی نہیں ہوتی۔ یہ، اور اسی قسم کی دیگر خصوصیات ہیں۔

جن میں عورت منفرد ہوتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس میں زندگی کے دوسرے گوشوں میں کارفرمائی کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ قرآن کریم نے امت مسلمہ (مملکت اسلامیہ) کا سب سے اہم فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرار دیا ہے۔ اس میں اس نے مرد اور عورت دونوں کو برابر کا شریک ٹھہرایا ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے: **وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ** **أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ**۔ **يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ**۔ **وَلِيَقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ**۔ **أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ**۔ **إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ** (۹)۔ ”مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق اور دوست ہیں۔ یہ دونوں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ نظام صلوٰۃ قائم کرتے اور زکوٰۃ دہی کا اہتمام کرتے ہیں۔ یعنی یہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہیں اللہ اپنی رحمتوں کے سایہ عاطفت میں رکھے گا اور یہ سب اس کی بے پایاں قوت و حکمت کی رو سے ہو گا۔“ آپ سوچتے کہ اس سے بڑھ کر (مردوں اور عورتوں کی) مساوات کی شہادت اور کونسی ہو سکتی ہے؟

❖

اس ضمنی گوشے کے بعد پھر آئیے اصل موضوع کی طرف۔ آیت (۲/۱۲۴) پہلے پوری درج کی جا چکی ہے۔ اس میں خدا نے آدم سے کہا تھا کہ تم نوع انسان کی عالمگیر برادری کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا۔ اس سے تمہاری حنقی زندگی برقرار رہے گی۔ لیکن اس کی خود غرضی کے جذبات نے اُسے بہکا دیا اور اس نے نسلی امتیازات کی رو سے اس برادری کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس جنت سے نکال دیا گیا۔ قرآن کریم میں اسے ”ہبوط“ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہاں بھی یہ لفظ آیا ہے اور اس کے بعد (۲/۱۲۵) اور (۲/۱۲۶) میں بھی ”ہبوط“

ہبوطِ آدم سے مراد

کے معنی ہوتے ہیں کسی بلند سطح سے پست سطح کی طرف آ جانا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ زندگی، جس میں نوع انسانی ٹکڑوں میں نہیں بٹی تھی اور اس طرح ان میں میری اور تیری کی تمیز پیدا نہیں ہوتی تھی، بلند سطح زندگی تھی۔ ایسی زندگی جس میں کسی فرد کو اپنی طبعی ضروریات زندگی کی طرف سے کوئی تردد نہیں تھا۔ نہ ہی اُسے کسی قسم کا خوف اور حزن تھا۔ وہ اس بلند مقام سے نیچے گرا۔ اس کی وحدت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانوں کا ایک گروہ اپنے ہی جیسے انسانوں کے دوسرے گروہ کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ اس سے قتل و غارت گری عام ہوئی۔ دوسری طرف ”میری اور تیری“ کی تفریق کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالادست گروہوں نے دسائل رزق کو اپنے قبضہ میں لے لیا جس سے زیر دست گروہ نان شبینہ تک کے لئے ان کے محتاج ہو گئے۔ قرآن کریم نے اس پست سطح زندگی کا نقشہ ان دو لفظوں میں کھینچ کر رکھ دیا ہے کہ:۔ **بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ** (۲/۱۲۶)۔ ”تمہارا ایک گروہ دوسرے گروہ کا دشمن اور حریف بن جائے گا“۔ یہی الفاظ

غیر اشتراکی مملکتیں ہیں جن کے تدریب ۷۵ کروڑ شہری، دنیا کے ذرائع پیداوار کا بیشتر حصہ ہتھیا لیتے ہیں۔ یہ لوگ باقی دنیا کے لئے ساز و سامان تیار کرتے ہیں اور اس سے حاصل کردہ دولت کی بنا پر، ایسے بلند معیار کی زندگی بسر کرتے ہیں جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان کے مد مقابل ایک سو ترقی پذیر (UN-DEVELOPED) غریب مملکتوں کی تدریب و ڈار ب آبادی ہے جس میں سے کروڑوں نفوس بھوک اور امراض کی وجہ سے موت کے سائے تلے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس وقت تک یہ تصادم بین الاقوامی مذاکروں میں تقریروں اور قراردادوں، تجویزوں اور معاشی مشوروں تک محدود ہے۔ لیکن ان محروم قوموں کا دباؤ اس قدر بڑھتا جا رہا ہے کہ بعض مغربی سیاستدان اسے پوری کی پوری نسل انسانی کے لئے ”ٹائم بم“ قرار دے رہے ہیں۔ ان سیاستدانوں میں مملکت برطانیہ کا وزیر (REG PRENTICE) جیسا مدبر بھی شامل ہے۔ خطرہ کے اس بڑھتے ہوئے احساس کا نتیجہ ہے کہ بعض سیاستدانوں کا خیال ہے کہ ان مفلس اور نادار قوموں کے ہاتھ جن اگر ایٹمی توانائی کے بم آگئے تو یہ دو لہند قوموں کو چیلنج دیدیں گے کہ یا تو اپنی جمع شدہ دولت ہمارے حوالے کر دو ورنہ ہم پورے کرۃ ارض کو تباہ کر کے رکھ دیں گے۔ اگر ایسا نہ بھی ہوا تو بھی یہ قومیں دنیا کے معاشی نظام کو تو... تہ و بالا کر کے ضرور رکھ دیں گی۔

اول فروری ۱۹۷۶ء میں، منیلا کے مقام پر، اقوام متحدہ کے زیر اہتمام، ان (۷۷) اقوام کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جو معاشی امور میں ترقی پذیر اقوام سے بہت پیچھے (UN-DEVELOPED) ہیں۔ اس کانفرنس کے چیرمین... (فرڈیننڈ مارکس) نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا کہ دنیا کی آبادی کا ستر فی صد حصہ غریبوں پر مشتمل ہے :-

اگر دنیا کے ذرائع رزق کی منصفانہ تقسیم نہ ہوئی تو سوال یہ نہیں ہو گا کہ ”بسا ہو گا یا نہیں“ سوال یہ ہو گا کہ البسا کس وقت ہو گا کہ دنیا کے غریب اٹھیں گے اور دو لہند کو چیلنج دیں گے کہ ان ذرائع رزق سے ہمارا پورا پورا حصہ ہمارے حوالے کر دو۔ یاد رکھو! ”جنگ یا موت“ کا تباہ کن خطرہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ (جو پاکستان، انڈیا، سوویت یونین) اقبالؒ نے بہت پہلے، استحصال پسند اقوام سے کہہ دیا تھا کہ یاد رکھو! خدا نے ملائکہ کو حکم دے دیا ہے کہ :- اٹھو! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو :- کا رخ امراء کے در و دیوار ہلا دو وہ وقت اب آگیا ہے۔

بہر حال، بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۴) کی یہ محسوس مشہور تفسیر ہم سب کے سامنے ہے، اور یہ پیدا کردہ ہے اس مشاجرت کی، جس کے تباہ کن نتائج سے قرآن کریم نے آدم کو آگاہ کیا تھا۔

آدم سے کہا گیا کہ تم نے ہر حال ایک مدت تک کے لئے اس زمین پر زندگی بسر کرنی ہے۔ اس سے تمہیں مفر نہیں۔ لہذا تمہارے لئے سوچنے کا مقام ہے کہ تم اسی قسم کی کرب و اذیت کی جہنمی زندگی بسر کرنا چاہو گے یا ایسی زندگی، جو پھر سے تمہارے فردوسِ گمشدہ کی بازیابی کا موجب بن سکے۔

قرآن کریم نے یہاں کہا ہے کہ: وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ أَحْبَبٍ (۲/۳۶)۔ ”مستقر کا لفظ کس قدر حقیقت کشا ہے، اسے ہم جلد اول میں (نظریۂ ارتقاء کے تحت) واضح طور پر بیان کر چکے ہیں (ملاحظہ ہوں آیات ۱۰ تا ۱۲)۔ اس کے علاوہ اس کا ذکر، اسی جلد کے باب اول میں بھی آچکا ہے۔ اگر کوئی شے ایک ہی مقام پر ٹھہری ہوئی ہو تو اُسے جامد کہا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی ایسی شے ہو جو حرکت کرتی چلی آ رہی ہو اور کچھ وقت تک سستے کے لئے کسی ایک مقام پر ٹھہر جائے، اور اس کے بعد اسے پھر آگے چلنا ہو، تو اس کی اس وقتی آرام گاہ کو اس کا مستقر کہا جائے گا۔ قرآن کریم نے اس ایک لفظ میں زندگی کے ارتقائی مراحل کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے اور مغرب کے اُس مادی نظریہ کی تردید بھی کر دی جس کی رد سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی اس کے سفرِ ارتقاء کی آخری منزل ہے، اس کے بعد اسے آگے نہیں بڑھنا۔ قرآن کریم نے کہا کہ تم نے کرۂ ارض پر کچھ وقت کے لئے زندگی بسر کرنی ہے۔ یہ زندگی اس نہج کی بسر کرو کہ تمہاری موجودہ ضرورتیں بھی پوری ہوتی رہیں اور اس کے ساتھ ہی تم اس قابل بھی بن جاؤ کہ زندگی کی اگلی منزلیں بھی بحسن و خوبی طے کر سکو۔

اس آیت میں دوسرا لفظ ”متاع“ آیا ہے۔ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں، وہ سامان جو ضروریاتِ سفر کے لئے کافی ہو۔ اسی لئے اَلْمَتَاعُ اس چیز کو کہتے ہیں، جس سے تھوڑے سے وقت کے لئے فائدہ حاصل کیا جائے۔ (تحتج کے معنی فائدہ حاصل کرنے (UTILITY) کے ہیں، ملکیت کے نہیں) اس سے بھی قرآن کریم نے اپنے پیش کردہ معاشی نظام کی طین اشارہ کر دیا۔ یعنی یہ بتا دیا کہ دنیا میں سامانِ رزق فائدہ حاصل کرنے کے لئے ہے، ملکیت میں لینے کے لئے نہیں۔ اور اس فائدہ حاصل کرنے میں تمام بنی آدم کیساں طور پر شریک ہیں، کیونکہ اس کا خطاب آدم سے ہے۔ ————— یعنی پوری نوحِ انسان ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس تنذیر کے بعد آدم کو ویسے ہی چھوڑ دیا گیا یا اسے یہ بھی بتایا گیا کہ جو جنت اس سے چھین چکی ہے اس کی بازیابی کی کوئی صورت بھی ہے؟ اُسے یہ بتایا گیا، کیونکہ ابدی مایوسی تو ابلیس کے لئے تھی جس میں اصلاح کی صلاحیت نہیں تھی۔ آدم میں اصلاح کی گنجائش تھی اس لئے اسے اپنی اس محدودی کو فائز الملامی میں بدلنے کا طریق بتایا گیا۔ اور وہ اگلی آیت میں ہمارے سامنے آتا ہے:-

فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ - فَتَابَ عَلَيْهِ - إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ -

۲
۳۷

یہاں سے ایک عظیم انقلاب ہمارے سامنے آتا ہے۔ اشیائے کائنات کے متعلق قرآن کریم نے بتا دیا کہ جس نہج پر انہوں نے زندگی بسر کرنی ہے اس کا علم، خود ان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ اُسے اُن کی جبلت (INSTINCTS) کہتے ہیں۔ اشیائے کائنات کی تسخیر کے سلسلہ میں کہہ دیا کہ انسان کو اس امر کی صلاحیت دیدی گئی کہ وہ ان کا علم حاصل کر کے انہیں مسخر کر لے۔ لیکن یہ جو انسان نے باہمی مشاجرت سے اپنی زندگی کو جہنم بنالیا تھا، اس سے نکلنے کے لئے — یایوں کہتے کہ فردوس گم گشتہ کی بازیابی کے لئے انسان کو خدا کی راہنمائی کی ضرورت تھی اسے وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وحی کے متعلق تفصیلی گفتگو تو اس کے اپنے مقام پر آئے گی۔ اس وقت صرف اتنا بتا دینا کافی

وحی کی راہنمائی کی ضرورت

ہو گا کہ وحی وہ راہنمائی ہے جس میں کسی انسان کی ذاتی فکر اور اکتسابی علم کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے خدا کسی برگزیدہ شخصیت کو منتخب کر لیتا تھا۔ اسے یہ راہنمائی خدا کی طرف سے براہ راست ملتی تھی اور وہ اُسے کسی قسم کی آمیزش کے بغیر، دوسرے انسانوں تک پہنچا دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ انسانوں نے جو باہمی اختلافات پیدا کر لئے تو ان کا مٹانا، ان کے اپنے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے لئے خدا کی راہنمائی کی ضرورت تھی جس کا سلسلہ اس زمانے سے شروع کر دیا گیا جب انسانوں میں یہ اختلافات نمودار ہوئے۔ آپ سورۃ یونس اور سورۃ بقرہ کے اُن دو آیات کو ملا کر پڑھتے جو پہلے بھی گزر چکی ہیں۔ ان سے یہ مفہوم واضح ہو جائے گا۔ سورۃ یونس میں کہا گیا ہے کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً - فَاخْتَلَفُوا (۱۰/۱)۔ ”تمام انسان ایک برادری کی شکل میں رہتے تھے۔ لیکن بعد میں انہوں نے باہمی اختلافات پیدا کر لئے“ اور سورۃ بقرہ میں ہے: كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ - وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيُحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ (۲/۲۱۳)۔ ”تمام انسان امت واحدہ کی شکل میں رہتے تھے پھر انہوں نے باہمی اختلافات پیدا کر لئے اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے تو ان اختلافات کو مٹانے کیلئے (خدا نے انبیائے کرام کی بعثت کا سلسلہ شروع کیا جو انہیں اسکر بتاتے تھے کہ وحی خداوندی کی روشنی میں زندگی بسر کرنے کا نتیجہ کس قدر خوشگوار ہو گا اور اس کی خلاف ورزی کے نتائج کس قدر تباہ کن ہوں گے۔ ان (انبیاء) کے ساتھ خدا نے ضوابط و قوانین نازل کئے تاکہ وہ انسانوں کے باہمی اختلافی معاملات کا، حق و صداقت کے ساتھ فیصلہ کریں“ یہی ہے وہ حقیقت، جس کے لئے کہا ہے: فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ (۲/۳۷) یعنی ”آدم کو خدا کی طرف سے راہنمائی ملی“

تَلَقَّیْ (مادہ ل. ق. ی) کے بنیادی معنی ہیں کسی کے سامنے آنا۔ یا کسی سے کچھ چاہ کرنا۔ خدا کی طرف سے انسانوں کو جو راہنمائی بذریعہ وحی ملتی تھی اس کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ سورۃ القصص میں ہے: وَمَا كُنْتَ تَرْجُو أَن يُلَقَّیْ إِلَيْكَ الْكِتَابُ (۲۸)۔ اے رسول! تو اس کی توقع ہی نہیں رکھتا تھا کہ تجھے خدا کی طرف سے ضابطہ قوانین القامہ کیا جائیگا۔ بلکہ — یعنی بذریعہ وحی دیا جائے گا۔ دوسری جگہ ہے: یُلَقَّیْ الرُّوحَ مِنْ أَحَدِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ (۱۶۶) — خدا اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اپنے امر کے مطابق وحی عطا کر دیتا ہے۔ علاوہ بریں خود زیر نظر آیت (۲۶) سے اگلی آیت میں یہ ہکمر بات بالکل واضح کر دی کہ: فَاصْبِرْ صَبْرًا صِدْقًا (۲۷)۔ ”جب میری طرف سے تمہیں ہدایت ملے گی۔“ صِدْقًا ”صِدْقًا“ نے بات واضح کر دی کہ اس سے مراد خدا کی طرف سے ملنے والی راہنمائی ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ خدا نے آدم (انسان) سے کہہ دیا کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہوگی کہ تم اپنے اختلافات کو خود مٹا سکو۔ یہ اختلافات ہماری وحی کی روشنی ہی میں مٹ سکیں گے۔ یہ وہ حقیقت ہے، جسے تسلیم کرنے پر خود پوپ کے مفکرین اور مدیرین بھی مجبور ہو رہے ہیں۔ اقوام عالم میں جو اختلافات پیدا ہو چکے ہیں انہوں نے انتہائی کوشش کر دی تھی کہ انہیں وہ خود مٹا سکیں لیکن وہ اپنی ان کوششوں میں ناکام رہے۔ انہوں نے پہلے لیگ آف نیشنز قائم کی لیکن وہ بھی اس مقصد کے حصول میں بری طرح ناکام رہی۔ مسٹر (EMERY REVES) نے (THE ANATOMY OF PEACE) کے نام سے ایک مختصر لیکن بڑی اہم کتاب لکھی ہے۔ وہ اس میں کہتا ہے :-

لیگ آف نیشنز ناکام رہ گئی۔ اس لئے کہ وہ انٹرنیشنلزم کے غلط عقیدہ پر قائم ہوتی تھی۔ اس عقیدہ پر کہ مختلف قوموں کے درمیان صلح قائم رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے نمائندوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے اختلافات معاملات کا تصفیہ باہمی مذاکرات کے ذریعہ کر لیا کریں۔ (کس قدر غلط تھا یہ تصویر)۔ ان تنازعات کا حل ممکن ہی نہیں جب تک قوموں کے باہمی تعلقات کی بنیاد میں اصلاح نہ ہو جائے (اور وہ بنیاد ہے انٹرنیشنلزم)۔ (P. 161)

اس کے بعد وہ کہتا ہے :-

ہم انٹرنیشنلزم سے کافی کھیل چکے ہیں۔ جو مسئلہ دنیا کے سامنے پیش ہے وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں

سے ہمارے ہاں ہونی کے متعلق کشف والہام کے ساتھ القامہ کا لفظ بھی بولا جاتا ہے اور جس سے مراد خدا کی طرف سے علم حاصل ہونا ہی جاتی ہے۔ ہم متعدد مقامات پر بتا چکے ہیں کہ ختم نبوت کے بعد، خدا کی طرف سے براہ راست علم ملنے کا تصور ہی غلط ہے، خواہ اس کے لئے کوئی اصطلاح بھی کیوں نہ استعمال کی جائے۔ نام بدل دینے سے حقیقت نہیں بدل جایا کرتی۔

کے حل کرنے ہو (وہ تو خود قوموں کا پیدا کردہ ہے) وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہذا کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم، خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے، اس کا حل دریافت کرے۔ اس مسئلہ کا حل انسانی عالمگیریت (UNIVERSALISM) میں ہے۔ ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے اوپر جا کر، خالص انسانی سطح پر، دنیا میں امن قائم کرنا چاہتی ہے۔ (P. 164)

خالص انسانی سطح پر یہ مقصد کیسے حل ہو سکے گا؟ اس کے متعلق یورپ کا ایک اور مفکر (J. M. MURRAY) کہتا ہے کہ:-

چونکہ انسانوں کے دل سے خدا کا عقیدہ نکل گیا ہے اس لئے اس خالی مکان پر نیشنلزم کے شیطان نے قبضہ کر لیا ہے۔ اب انسانوں کو ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو نیشنلزم کے جذبہ پر غالب آ سکے۔

(ADAM AND EVE, P. 66-67)

قرآن کریم نے اسے وحی کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ جواب اپنی حقیقی، منزہ اور مکمل

کلمات اللہ

شکل میں، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ یہی وہ ”کلمات“ ہیں جن کا ذکر آیت (۲/۲۶) میں کیا گیا ہے۔ کلمہ (جس کی جمع کلمات ہے) کے عام معنی بات کے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں یہ لفظ وحی خداوندی کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ سورۃ الاعراف میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا ہے: **يَوْمَئِذٍ يَخْلُقُ اللَّهُ سَائِرَ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ** (۷۷/۱۸)۔ ”وہ خدا اور اس کی وحی پر ایمان رکھتا ہے“ یہی وہ کلمات اللہ ہیں جن کے متعلق سورۃ الانعام میں کہا ہے: **وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ**۔ **وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ** (۲/۲۶) ”تیرے رب کے قوانین، صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ اس کے کلمات میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں۔ خدا سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے“

(نیز دیکھئے ۱۱/۴۴ : ۱۸/۱۸)۔

وہ نظریہ حیات، یا نظام زندگی، جو وحی خداوندی پر مبنی ہو، اسے بھی قرآن کریم نے کلمہ کہہ کر پکارا ہے اور اس کی محکیت اور خوشگوار نتائج کو ایک مثال کی رو سے یوں سمجھایا ہے: **الْمُتَرَكِّفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ**۔ **تُؤْتِي مَآكِلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا**۔ **وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْمَثَالَ لِلنَّاسِ كَعَلْمِهِمْ يَتَذَكَّرُونَ** (۱۲/۶۵)۔ ”ذرا اس مثال پر غور کرو۔ طیب نظریہ زندگی کی مثال، ایک ایسے عمدہ پھلدار درخت کی سی ہے جس کی جڑیں پائال میں، محکم اور استوار ہوں، اور اس کی شاخیں فضائے آسمانی میں جھولے جھول رہی ہوں۔ وہ درخت قانون خداوندی کے مطابق ہر زمانہ اور ہر موسم میں پھل دیتے جاتا ہے۔ اللہ اس طرح، مجرد حقائق کو محسوس مثالوں کے ذریعہ واضح کر دیتا ہے تاکہ لوگ انہیں اچھی طرح سمجھ سکیں“

اس کے برعکس و مَثَلُ کَلِمَةِ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ يَتَّبِعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ. وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ. وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ (۱۲۴)۔ غلط نظریہ زندگی اور نظام حیات کی مثال ایک ایسے نیکے درخت کی سی ہے جسکی کھوکھلی سی جھڑیوں کے اوپر ہی ہو جو یہی ایک جھٹکے سے اکھڑ جائے۔

”اس طرح اللہ اس محکم نظریہ زندگی کی رد سے، جماعتِ مومنین کو ان کی دنیاوی اور اخروی زندگی، دونوں میں ثبات اور تمکین عطا کر دیتا ہے۔ اور جو لوگ، اس نظام سے سرکشی برتتے ہیں، ان کی کوششیں رائیگاں چلی جاتی ہیں، یہ سب کچھ ان کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔“ صحیح اور غلط نظریات زندگی اور نظام حیات میں باہمی کشمکش شروع سے چلی آرہی ہے۔ اس کشمکش میں، بعض اوقات، جماعتِ مومنین کو میدانِ جنگ میں بھی اترنا پڑتا ہے۔ ان کی اس جنگ کا مقصد یہ بتایا ہے کہ: وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَى. وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا (۹)۔ ”تاکہ خدا کفار کے نظریہ زندگی کو مغلوب کر دے اور اللہ کی طرف سے عطا کردہ نظام حیات غائب آجائے۔“ اسی قسم کی جنگ کے متعلق دوسری جگہ ہے: وَيُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُخَيِّطَ الْحَقَّ بِكَلِمَتِهِ. وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ. لِيُخَيِّطَ الْحَقَّ وَيَبْطِلَ الْبَاطِلُ. وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ (۱۱)۔ ”اللہ یہ چاہتا ہے کہ اپنے کلمات (قوانین) کے ذریعے حق کو ثابت کر دے اور اس سے سرکشی برتنے والوں کی جڑیں کاٹ دے۔ یاد رکھو! ان لڑائیوں سے مقصد حق کو ثابت اور تمکین، اور باطل کو محو کر دینا ہے۔ خواہ یہ بات مجرمین پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرتی ہو“ (نیز دیکھئے ۲۶ تا ۴۷)۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ کلمت اللہ سے مراد وہ قوانین خداوندی ہیں جو روح کی رو سے عطا کئے گئے ہوں اور کلمہ سے مراد وہ نظریہ زندگی یا نظام حیات، جو ان قوانین کی بنیادوں پر استوار ہو۔ اس حکم یا نظریہ زندگی کا اصل الاصول یہ ہے کہ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ۔ ”اقتدار کا حق، خدا کے سوا کسی کو نہیں۔“ یہ کلمہ کا حقیقی مفہوم ہے۔ لیکن جب کسی نظریہ کی روح گم ہو جاتے اور اس کے صرف الفاظ باقی رہ جائیں تو پھر کلمہ خداوندی، اس کلمہ میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کے الفاظ ہم دن رات دہراتے رہتے ہیں اور اس کا کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔ حالانکہ خدا نے یہ کہا تھا کہ کلمہ طیبہ کی مثال، اس درخت کی سی ہے جو ہر زمانے میں اپنے پھل دیتا ہے۔ اور یہ پھل، دنیا کی زندگی اور آخرت دونوں میں حاصل ہوتے ہیں۔ دنیا میں اس کی محسوس اور مرنی شکل جماعتِ مومنین کا ثبات اور استحکام ہے (۱۲۴)۔ یہ آیات پہلے درج کی جا چکی ہیں (قرآن کریم نے دوسری جگہ کہا ہے: اَلَيْسَ يَصْعَدُ الْخَلَاةُ الطَّيِّبُ. وَانْعَمَلُ السَّالِحُ بِرُوحِهِ دَهِجًا)۔ خدا کے عطا کردہ طیب نظریہ حیات میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ اپنے زورِ دروں سے بلند ہوتا جائے۔ لیکن اگر اس کے ساتھ انسانوں کے اعمالِ صالحہ بھی شریک ہو جائیں تو پھر وہ برق رفتاری

سے رفعت اور بلندی حاصل کر لیا ہے، خدا کا متعین فرمودہ نظریہ حیات از خود آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے اور زمانے کے تقاضوں سے انسان اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ اسے اختیار کرے۔ لیکن اس کی رفتار بڑھی سست ہوتی ہے۔ (خدا کا ایک ایک یوم ہمارے حساب و شمار سے ہزار ہزار برس (۲۵) بلکہ پچاس پچاس ہزار برس (۱۰۰) کا ہوتا ہے) لیکن جب اس کے ساتھ حق و صداقت پر چلنے والی جماعت کا زور بازو شامل ہو جاتا ہے تو یہ اپنے نتائج ہمارے حساب اور شمار کے مطابق مرتب کر دیتا ہے۔ جیسا کہ عہد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذین معہ میں ہوا۔ (لیکن یہ ایک جداگانہ موضوع ہے جس پر تفصیلی گفتگو اپنے مقام پر آئے گی)۔

آدم نے جب خدائی راہنمائی اختیار کر لی تو (یوں سمجھئے کہ) اس کی توبہ قبول ہو گئی۔ یعنی وہ صحیح راستہ پر چل پڑا۔ توبہ کا تفصیلی مفہوم، مطالبہ فرقان، جلد اول میں بڑی تفصیل سے آچکا ہے۔ (دیکھئے تشریح زیر آیت (۱/۲۶)۔) یہاں غلطی کا بیان کیا ہے کہ جب آدم نے اپنا رخ صحیح سمت کی طرف کر لیا تو خدا نے بھی اپنی توجہ اس کی طرف منعطف کر دی۔ وہ تواب اور رحیم ہے۔ ہم جلد اول میں مسئلہ تقدیر پر بحث کرتے ہوئے یہ بتا چکے ہیں کہ انسان، جس قسم کا راستہ اختیار کرتا ہے، اسی قسم کے قوانین خداوندی کا اطلاق اس پر ہو جاتا ہے۔ (دیکھئے جلد اول آیات (۱/۱۷) (۱/۲۶) (۱/۲۷) (۱/۲۸) (۱/۲۹) (۱/۳۰) (۱/۳۱) (۱/۳۲) (۱/۳۳) (۱/۳۴) (۱/۳۵) (۱/۳۶) (۱/۳۷) (۱/۳۸) (۱/۳۹) (۱/۴۰) (۱/۴۱) (۱/۴۲) (۱/۴۳) (۱/۴۴) (۱/۴۵) (۱/۴۶) (۱/۴۷) (۱/۴۸) (۱/۴۹) (۱/۵۰) (۱/۵۱) (۱/۵۲) (۱/۵۳) (۱/۵۴) (۱/۵۵) (۱/۵۶) (۱/۵۷) (۱/۵۸) (۱/۵۹) (۱/۶۰) (۱/۶۱) (۱/۶۲) (۱/۶۳) (۱/۶۴) (۱/۶۵) (۱/۶۶) (۱/۶۷) (۱/۶۸) (۱/۶۹) (۱/۷۰) (۱/۷۱) (۱/۷۲) (۱/۷۳) (۱/۷۴) (۱/۷۵) (۱/۷۶) (۱/۷۷) (۱/۷۸) (۱/۷۹) (۱/۸۰) (۱/۸۱) (۱/۸۲) (۱/۸۳) (۱/۸۴) (۱/۸۵) (۱/۸۶) (۱/۸۷) (۱/۸۸) (۱/۸۹) (۱/۹۰) (۱/۹۱) (۱/۹۲) (۱/۹۳) (۱/۹۴) (۱/۹۵) (۱/۹۶) (۱/۹۷) (۱/۹۸) (۱/۹۹) (۱/۱۰۰) (۱/۱۰۱) (۱/۱۰۲) (۱/۱۰۳) (۱/۱۰۴) (۱/۱۰۵) (۱/۱۰۶) (۱/۱۰۷) (۱/۱۰۸) (۱/۱۰۹) (۱/۱۱۰) (۱/۱۱۱) (۱/۱۱۲) (۱/۱۱۳) (۱/۱۱۴) (۱/۱۱۵) (۱/۱۱۶) (۱/۱۱۷) (۱/۱۱۸) (۱/۱۱۹) (۱/۱۲۰) (۱/۱۲۱) (۱/۱۲۲) (۱/۱۲۳) (۱/۱۲۴) (۱/۱۲۵) (۱/۱۲۶) (۱/۱۲۷) (۱/۱۲۸) (۱/۱۲۹) (۱/۱۳۰) (۱/۱۳۱) (۱/۱۳۲) (۱/۱۳۳) (۱/۱۳۴) (۱/۱۳۵) (۱/۱۳۶) (۱/۱۳۷) (۱/۱۳۸) (۱/۱۳۹) (۱/۱۴۰) (۱/۱۴۱) (۱/۱۴۲) (۱/۱۴۳) (۱/۱۴۴) (۱/۱۴۵) (۱/۱۴۶) (۱/۱۴۷) (۱/۱۴۸) (۱/۱۴۹) (۱/۱۵۰) (۱/۱۵۱) (۱/۱۵۲) (۱/۱۵۳) (۱/۱۵۴) (۱/۱۵۵) (۱/۱۵۶) (۱/۱۵۷) (۱/۱۵۸) (۱/۱۵۹) (۱/۱۶۰) (۱/۱۶۱) (۱/۱۶۲) (۱/۱۶۳) (۱/۱۶۴) (۱/۱۶۵) (۱/۱۶۶) (۱/۱۶۷) (۱/۱۶۸) (۱/۱۶۹) (۱/۱۷۰) (۱/۱۷۱) (۱/۱۷۲) (۱/۱۷۳) (۱/۱۷۴) (۱/۱۷۵) (۱/۱۷۶) (۱/۱۷۷) (۱/۱۷۸) (۱/۱۷۹) (۱/۱۸۰) (۱/۱۸۱) (۱/۱۸۲) (۱/۱۸۳) (۱/۱۸۴) (۱/۱۸۵) (۱/۱۸۶) (۱/۱۸۷) (۱/۱۸۸) (۱/۱۸۹) (۱/۱۹۰) (۱/۱۹۱) (۱/۱۹۲) (۱/۱۹۳) (۱/۱۹۴) (۱/۱۹۵) (۱/۱۹۶) (۱/۱۹۷) (۱/۱۹۸) (۱/۱۹۹) (۱/۲۰۰) (۱/۲۰۱) (۱/۲۰۲) (۱/۲۰۳) (۱/۲۰۴) (۱/۲۰۵) (۱/۲۰۶) (۱/۲۰۷) (۱/۲۰۸) (۱/۲۰۹) (۱/۲۱۰) (۱/۲۱۱) (۱/۲۱۲) (۱/۲۱۳) (۱/۲۱۴) (۱/۲۱۵) (۱/۲۱۶) (۱/۲۱۷) (۱/۲۱۸) (۱/۲۱۹) (۱/۲۲۰) (۱/۲۲۱) (۱/۲۲۲) (۱/۲۲۳) (۱/۲۲۴) (۱/۲۲۵) (۱/۲۲۶) (۱/۲۲۷) (۱/۲۲۸) (۱/۲۲۹) (۱/۲۳۰) (۱/۲۳۱) (۱/۲۳۲) (۱/۲۳۳) (۱/۲۳۴) (۱/۲۳۵) (۱/۲۳۶) (۱/۲۳۷) (۱/۲۳۸) (۱/۲۳۹) (۱/۲۴۰) (۱/۲۴۱) (۱/۲۴۲) (۱/۲۴۳) (۱/۲۴۴) (۱/۲۴۵) (۱/۲۴۶) (۱/۲۴۷) (۱/۲۴۸) (۱/۲۴۹) (۱/۲۵۰) (۱/۲۵۱) (۱/۲۵۲) (۱/۲۵۳) (۱/۲۵۴) (۱/۲۵۵) (۱/۲۵۶) (۱/۲۵۷) (۱/۲۵۸) (۱/۲۵۹) (۱/۲۶۰) (۱/۲۶۱) (۱/۲۶۲) (۱/۲۶۳) (۱/۲۶۴) (۱/۲۶۵) (۱/۲۶۶) (۱/۲۶۷) (۱/۲۶۸) (۱/۲۶۹) (۱/۲۷۰) (۱/۲۷۱) (۱/۲۷۲) (۱/۲۷۳) (۱/۲۷۴) (۱/۲۷۵) (۱/۲۷۶) (۱/۲۷۷) (۱/۲۷۸) (۱/۲۷۹) (۱/۲۸۰) (۱/۲۸۱) (۱/۲۸۲) (۱/۲۸۳) (۱/۲۸۴) (۱/۲۸۵) (۱/۲۸۶) (۱/۲۸۷) (۱/۲۸۸) (۱/۲۸۹) (۱/۲۹۰) (۱/۲۹۱) (۱/۲۹۲) (۱/۲۹۳) (۱/۲۹۴) (۱/۲۹۵) (۱/۲۹۶) (۱/۲۹۷) (۱/۲۹۸) (۱/۲۹۹) (۱/۳۰۰) (۱/۳۰۱) (۱/۳۰۲) (۱/۳۰۳) (۱/۳۰۴) (۱/۳۰۵) (۱/۳۰۶) (۱/۳۰۷) (۱/۳۰۸) (۱/۳۰۹) (۱/۳۱۰) (۱/۳۱۱) (۱/۳۱۲) (۱/۳۱۳) (۱/۳۱۴) (۱/۳۱۵) (۱/۳۱۶) (۱/۳۱۷) (۱/۳۱۸) (۱/۳۱۹) (۱/۳۲۰) (۱/۳۲۱) (۱/۳۲۲) (۱/۳۲۳) (۱/۳۲۴) (۱/۳۲۵) (۱/۳۲۶) (۱/۳۲۷) (۱/۳۲۸) (۱/۳۲۹) (۱/۳۳۰) (۱/۳۳۱) (۱/۳۳۲) (۱/۳۳۳) (۱/۳۳۴) (۱/۳۳۵) (۱/۳۳۶) (۱/۳۳۷) (۱/۳۳۸) (۱/۳۳۹) (۱/۳۴۰) (۱/۳۴۱) (۱/۳۴۲) (۱/۳۴۳) (۱/۳۴۴) (۱/۳۴۵) (۱/۳۴۶) (۱/۳۴۷) (۱/۳۴۸) (۱/۳۴۹) (۱/۳۵۰) (۱/۳۵۱) (۱/۳۵۲) (۱/۳۵۳) (۱/۳۵۴) (۱/۳۵۵) (۱/۳۵۶) (۱/۳۵۷) (۱/۳۵۸) (۱/۳۵۹) (۱/۳۶۰) (۱/۳۶۱) (۱/۳۶۲) (۱/۳۶۳) (۱/۳۶۴) (۱/۳۶۵) (۱/۳۶۶) (۱/۳۶۷) (۱/۳۶۸) (۱/۳۶۹) (۱/۳۷۰) (۱/۳۷۱) (۱/۳۷۲) (۱/۳۷۳) (۱/۳۷۴) (۱/۳۷۵) (۱/۳۷۶) (۱/۳۷۷) (۱/۳۷۸) (۱/۳۷۹) (۱/۳۸۰) (۱/۳۸۱) (۱/۳۸۲) (۱/۳۸۳) (۱/۳۸۴) (۱/۳۸۵) (۱/۳۸۶) (۱/۳۸۷) (۱/۳۸۸) (۱/۳۸۹) (۱/۳۹۰)

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنِ تَّبِعَ
هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۚ

”ہم نے آدم سے کہا کہ زندگی کے اس بلند مقام سے گر کر تم اس کی پست سطح پر تو آ گئے ہو لیکن تمہاری یہ گراوٹ ابدی محرومی نہیں۔ ہماری طرف سے تمہیں (ہمارے رسولوں کی معرفت) راہنمائی ملے گی۔ سو جو بھی اس راہنمائی کا اتباع کرے گا تو وہ لوگ، خوف اور حزن سے مامون ہو جائیں گے۔“ ”ہدایت“ کی تفصیل تو پہلی جلد میں گزر چکی ہے۔ یہاں اتباع ہدایت کا جو نتیجہ بتایا گیا ہے وہ بڑا اہم ہے۔ یعنی خوف اور حزن دونوں سے مامونیت۔ خوف، عام طور پر بیرونی خطرات اور نقصانات کے احساس کو کہا جاتا ہے،

خوف اور عزن سے مامونیت

اور حزن کے معنی ہوتے ہیں، افسردگی، پڑمردگی، پریشانی، خاطر، اندوہ و ملال، جسے عام الفاظ میں دل کا ڈوب جانا کہتے ہیں۔ ہر چند یہ لفظ ہر قسم کے حزن ملال کے لئے بولا جاتا ہے لیکن عرب اسے معاشی پریشانی کے لئے خاص طور پر بولتے تھے۔ چنانچہ حَدَّثَنَا الرَّجُلُ الْإِنْسَانُ کے اُن متعلقین، اہل و عیال کو کہا جاتا ہے جن کی تکلیف سے اُسے پریشانی ہوتی ہو اور وہ ان کے لئے سامانِ رزق کا اہتمام کرے۔

عصرِ حاضر کے علم النفس کی تحقیق یہ ہے کہ انسان کی کم بیش تمام نفسیاتی الجھنوں اور اعصابی عوارض کا بنیادی سبب خوف ہے۔ (یاد رہے کہ انگریزی زبان میں خوف کو (FEAR) اور حزن کو (GRIEF) کہا جاتا ہے)۔ خوف سے انسانی ذات یوں کہیں کہ گھٹ کے مر جاتی ہے اور اس کا لازمی نتیجہ حزن ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اس نظام کی بنیادی خصوصیت جو قوانینِ خداوندی پر مبنی ہو، یہ بتائی ہے کہ اس میں کسی کو نہ کسی قسم کا خوف ہو گا نہ حزن۔ سورۃ طہ میں ہے: وَمَنْ يَعْمَلْ مِنْ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَفُ ظُلُمًا وَلَا نَضًا (۲۳)۔ ”جو شخص قوانینِ خداوندی کی صداقتوں کو تسلیم کر کے، اُن کے مطابق صلاحیت بخش کام کرے گا تو اُسے نہ کسی قسم کی نا انصافی اور دھاندلی کا خوف ہو گا، نہ استحصال کا ڈر“ دوسری جگہ ہے: فَسَنُيَسِّرُهُمْ يُسْرًا ۖ فَلَا يَخَافُ بِخَسَاوَةٍ وَلَا دَهْشَةً (۲۴)۔ ”جو کوئی خدا پر ایمان لاتا ہے، اُسے نہ اپنے حقوق میں کمی یا سلب و نہب کا اندیشہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی ذلت و رسوائی کا خوف“ اسی کو اس نے جنتی زندگی سے تعبیر کیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ (۲۵)۔ ”تم جنتی مسافر میں داخل ہو جاؤ جہاں تمہیں نہ کسی قسم کا خوف ہو گا نہ حزن“ بارگاہِ ایزدی سے پکار کر کہا جائے گا کہ: يُعْبَادُ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ (۲۶)۔ ”اے میرے بندو! اب تمہیں نہ کسی قسم کا خوف ہو گا نہ حزن“ یہ زندگی حاصل کس طرح سے ہوگی، اس کے متعلق سورۃ حٰجّہ میں کہدیا کہ:-

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا سَتَنْزِلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ. نَحْنُ أَوْلَىٰ بِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ. وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ (۲۷)۔

جو لوگ اس حقیقت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے اور پھر اپنے اس اقرار اور ایمان پر اس طرح جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہیں کر سکتی تو ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ جو ان سے کہتے ہیں کہ تم نہ کسی قسم کا خوف کرو اور نہ ہی افسردہ خاطر ہو۔ تمہارے لئے

اس جنتی معاشرہ کی خوشخبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق ہوں گے۔ اُس جنتی زندگی میں ویسا ہی ہوگا جیسا تم چاہو گے، اور وہ سب کچھ ملے گا، جسے تم طلب کرو گے۔

یہی ہیں وہ خوش نصیب جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنا دوست (اولیاء اللہ) کہا ہے اور ان کی خصوصیت یہ بتائی ہے: (اَخْوَفُ عَلَيْهِمُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ) (۲۴)۔ ضمناً اس نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا ہے کہ اولیاء اللہ کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا۔ یہ وہی لوگ ہیں: الَّذِينَ اٰمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ (۲۵)۔ جنہیں مومن اولیاء اللہ اور متقی کہا جاتا ہے اور ان کی پہچان یہ ہے کہ: لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ (۲۶)۔ اُن کی اس دنیا کی زندگی بھی ہر قسم کی خوشگوار یوں کی حامل ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی۔ اس کے بعد کہا کہ یہ کوئی ہنگامی یا عارضی بات نہیں کہ کبھی ایسا ہوگا اور کبھی ایسا نہیں ہوگا۔ لَا تَبْدِلُ لِحٰکِمَتِ اللّٰهِ ذٰلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۲۷)۔ ”یہ خدا کا غیر متبدل قانون ہے۔ اور یہ بڑی عظیم کامرانی ہے، جسے حاصل ہو جائے“ دنیاوی زندگی میں خوشگوار یوں کے متعلق قرآن کریم نے دوسری جگہ کہہ دیا کہ: وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمْ اَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۳۸)۔ ”تمہیں نہ افسردہ خاطر ہونے کی ضرورت ہے نہ غمگیں۔ اگر تم مومن ہو تو تم سب پر غالب آکر رہو گے“ یعنی ”لَا خَوْفٌ عَلَیْہُمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُونَ“ کا عملی ثبوت یہ ہے کہ وہ قوم تمام مخالفین پر بالادست ہو، مغلوب محکوم ہر قسم کے خوف اور حزن کا شکار ہوتا ہے اور مومن کی زندگی مغلوب محکوم کی نہیں، غالب اور بالادست کی زندگی ہے۔ لَا یَحْزَنُہُمْ الْفَرَقُ الْاَکْبَرُ (۲۱)۔ بڑے سے بڑا حادثہ بھی ان کے دل میں پریشانی اور افسردگی پیدا نہیں کر سکتا، وہ نہایت استقامت سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں اور اس پر غالب آ جانے کے بعد، یہ کہتے ہوئے، بکھنور رب العزت سجدہ شکر انجام لاتے ہیں۔ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ (۳۵)۔ ”کس قدر قابلِ حمد و ستائش ہے وہ ذات، جس نے ہمارا حزن دور کر دیا“ لفظ مومن کا تو مادہ ہی، امن (م۔ ن) ہے اور الخوف باہمد کر متضاد ہیں۔ اس لئے مومن، خوف اور حزن سے مامون ہوتا ہے۔ اور جس کی زندگی خوف سے مامون ہو، وہ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار نہیں ہو سکتا۔ (ERICH FROMM) کی یہ تحقیق پہلے سامنے آچکی ہے کہ مثالی زندگی وہ ہے جس میں کسی کی کشتی ہم کا خوف نہ ہو۔ اسی کر قرآن کریم نے ”نفس مطمئنہ“ سے تعبیر کیا ہے۔ (۸۹)۔

یہ ہے وہ زندگی، جس کا وعدہ آدم سے کیا گیا، اس شرط کے ساتھ کہ وہ خدا کی طرف سے عطا کردہ راہنمائی کا اتباع

کرے۔ جو ایسا نہ کریں، ان کے متعلق وہیں کہدیا :-

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ
هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔

۲
۳۹

”جو لوگ، اس حقیقت کی صداقت سے انکار اور ہمارے قوانین کی تکذیب کریں گے، تو ہمارے قانون مکافات کے مطابق ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس جائیں گی اور وہ مستقل عذاب کی زندگی جیتیں گے“ یعنی جب تک وہ اس غلط روش کو ترک نہیں کریں گے، ذلت و خواری اور تباہی و بربادی کی زندگی سے نکل نہیں سکیں گے۔

یہاں کفر کے ساتھ تکذیب بھی کہا گیا ہے۔ تکذیب کا مفہوم تو تفصیل طلب ہے جو اپنے مقام پر آئے گا۔ یہاں اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ کفر قوانین خداوندی (قرآنی صداقتوں) سے یکسر انکار ہے۔ اور اس میں تکذیب خود بخود آ جاتی ہے۔ لیکن جب کفر اور تکذیب کا الگ الگ بیان ہو تو وہاں تکذیب کا مفہوم یہ ہوگا کہ زبان سے تو ان صداقتوں کا اقرار کیا جائے لیکن عمل ان کے خلاف کیا جائے۔ یعنی عملاً اپنے دعوائے ایمان کی تکذیب کی جائے۔ جیسا کہ سورۃ الماعون میں کہا گیا ہے کہ: ”تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا ہے جو زبان سے تو دین کا اقرار کرتے ہیں لیکن عملاً اُسے جھٹلاتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جو ان لوگوں کو جو معاشرہ میں بے یار و مددگار رہ جائیں۔ دھتکارتے ہیں اور جو کسی وجہ سے محتاج ہو جائیں ان کی روٹی کا انتظام نہیں کرتے۔ یہ وہ نمازی ہیں جو رسمی نمازیں تو پڑھتے ہیں لیکن صلوٰۃ کی غرض و غایت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اور رزق کے ان سرچشموں کو جنہیں بہتے پانی کی طرح رواں دواں رہنا چاہئے تھا بند لگا کر روک لیتے ہیں رَحْمَۃً لَّیْسَ بِہَا تکذیب کی نمایاں مثال۔

لہذا قرآن کریم کی رو سے، کفر اور تکذیب دونوں کا نتیجہ عذابِ جہنم ہے۔

یہ ہے وہ سرگزشتِ آدم، جو قرآن کریم میں، انتہائی حسین اور بلیغ، تمثیلی انداز میں بیان کی گئی ہے

نِکَمَ بَارِئِ گشت

یہ سرگزشتِ آدم نہیں، انسانیت کی تاریخ ہے۔ آپ اس تاریخ پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس کی ایک ایک تفصیل کس طرح قرآنی صداقتوں کی شہادت بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ جہاں تک اس طبعی کائنات کا تعلق ہے، انسان نے علوم فطرت کی تحصیل سے اس مٹی کے گھروندے کو کیسے کیا نہیں بنادیا۔ ذرا اس دور کو سامنے لائیے جب انسان نے پہلے پہل اس زمین پر تمدنی زندگی شروع کی اور اس کے بعد اس کی آج کی زندگی پر غور کیجئے۔ آپ کو صاف نظر آجائے گا کہ اس کی مشاطگی نے کائنات کے گیسوؤں کو کس طرح سنوارا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے مخصوص، شوخ انداز

میں ایک نظم لکھی ہے جس کا عنوان ہے ”محاورہ مابین خدا اور انسان“ — اور وہ یوں ہے :-

خدا

جہاں رازِ یک آب و گل آفریدم تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاکِ پولادِ ناب آفریدم تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہاںِ چمن را
قفص ساختی طائرِ نغمہ زن را

انسان

تو شب آفریدی چرخِ آفریدم سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

(پیام مشرق)

اس حقیقت سے قطع نظر کہ انسان نے اس خارجی کائنات کے حسن میں، کس قدر اضافہ کیا ہے، اس نظم میں ایک بڑا پر معنی اشارہ ہے۔ انسان نے خدا کے ان اعتراضات کا جواب تو دیدیا جی کا تعلق خارجی کائنات سے تھا، لیکن اس کے عائد کردہ پہلے اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اعتراض یہ تھا کہ

جہاں رازِ یک آب و گل آفریدم تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی

انسان کے پاس اس کا جواب ہے ہی نہیں۔ خدا نے نوعِ انسان کو امت واحدہ کی شکل میں پیدا کیا تھا۔ اس نے اُسے ٹکڑوں میں بانٹ دیا اور پھر ان ٹکڑوں کو یکجا کرنے کے لئے اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ انسانی تاریخ کے یہ دونوں گوشے باہم مدگر اس قدر متضاد و متخالف ہیں کہ ان پر غور کرنے سے انسان محو حیرت رہ جاتا ہے کہ ایک گوشے میں اس قدر بلندی اور دوسرے میں اس قدر پستی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تسخیرِ کائنات تو اس علم کی رُو سے کی جاسکتی تھی (اور کر لی گئی) جس کی تحصیل کی جتنی اس کے اندر رکھ دی گئی تھی۔ لیکن اس کی ذاتی اور تمدنی زندگی صحیح خطوط پر، وحی کی راہنمائی ہی میں جاوہ پیمایا ہو سکتی تھی جسے اس نے نظر انداز کر دیا۔ اس کا عبرت آموز نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ اقبالؒ نے ان دونوں گوشوں کے تقابل کو ان الفاظ میں اجاگر کیا ہے :-

عشقِ نابید و خردی گزشت صورتِ مار عقل کو تارِ فرماں نظر کرنے سکا
 ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرنے سکا
 جس نے سوچ کی شعاعوں کو گرفتار کیا زندگی کی شبِ تاریک محسوس کرنے سکا
 زندگی کی شبِ تاریک تو، سائنس کے علوم سے نہیں، وحی کی شمعِ جہاں تاب ہی سے روشن ہو سکتی ہے۔ اسی لئے اقبالؔ نے
 اقوامِ مغرب کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ :-

چارہ این است کہ از عشقِ گشتادے طلیم پیشِ اوسجدہ گزایم و مراوے طلیم
 اقوامِ مغرب! آج اس روشنی کے لئے تڑپ رہی ہیں۔ اے کاش! کوئی اللہ کا بندہ شمعِ قرآنی ہاتھ میں لے کر ان کی راہنمائی کرے
 تو آدم کو پھر سے وہ جنت مل جائے، جس کی بازیابی کے لئے وہ اس قدر وقفِ اضطراب ہے۔

پھر اس طرح خود حاصل کردہ جنت، اور جنتِ آدم میں ایک معیاری فرق بھی ہے۔ وہ جنتِ آدم کو اس کے حسنِ عمل
 کے نتیجہ میں نہیں ملی تھی۔ ”بخشش“ کے طور پر عطا ہو گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ ایک لغزش سے چھن گئی۔ لیکن جو جنتِ
 انسانی اعمال کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے، وہ دائمی ہوتی ہے۔ اس جنت کے متعلق بارگاہِ خداوندی سے اعلان ہو گا کہ
جنتِ آدم اور جنتِ مومن میں فرق فَلَكُمْ الْجَنَّةُ أَوْذَنْتُمْوهَا بِأَعْمَالِكُمْ تَعْمَلُونَ (۱۱۳)
 ”یہ وہ جنت ہے جس کا نہیں تمہارے اعمال بدلے میں مالک بنایا جا رہا ہے۔“

خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا۔ یہ لوگ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ وَعَدَ اللَّهُ حَقًّا۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے جو بنی حقیقت
 ہے۔ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا (۱۱۴) اور خدا سے زیادہ بات کا سچا کون ہو سکتا ہے۔

یہ ہے دونوں جنتوں میں فرق۔ ایک بخشش کے طور پر ملی ہوئی دوسری اپنے حسنِ کردار کے صلہ (نتیجہ) میں حاصل
 کی ہوئی۔ اقبالؔ کے الفاظ میں :-

آلِ بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ تاجِ عزتِ عمل تست جنانِ چہرے ہست
 یہ جنت وہ ہے جس کے متعلق ”روحِ ارضی“ نے آدم کے استقبالِ یہ کہا تھا کہ :-

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شر میں آباد ہے اک نازہ جہاں تیرے ہنر میں
 چھتے نہیں بخشے ہوئے فردوسِ نظر میں جنتِ تری پہاں ہے تیرے خونِ جگر میں

لے پیکرِ گل! کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

لہذا یہ جنت چھن کیسے سکتی ہے!

موضوع تو ختم ہو گیا لیکن اس کا ایک ضمیمہ باقی ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب مختلف مذاہب کے پاس، ان کی (مبینہ) آسمانی کتابیں موجود ہیں تو پھر یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ اب حق و صداقت کی راہ، صرف قرآن کریم کے اندر ہے اور کہیں نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا کی کسی قوم کے پاس وہ کتاب اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں موجود نہیں جو ان کے دین کے داعی نے انہیں خدا کی طرف سے دی تھی۔ ان کتابوں کو انسانی تحریف نے کچھ کا کچھ بنا کر رکھ دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سرگزشتِ آدم، سابقہ انبیائے کرام کی طرف وحی میں بھی بیان کی گئی تھی چنانچہ **تورات میں قصہ آدم** | بائبل میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ لیکن آپ یہ دیکھئے کہ اس کتاب میں یہ قصہ کس انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں پہلے تو یہ کہا گیا ہے کہ :-

خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا (تورات کتاب پیدائش ۱/۲۶)۔

اس کے بعد قصہ آدم کی بعض تفصیلات ملاحظہ فرمائیے۔ جنتِ آدم کے متعلق ہے :-

اور خداوند خدا نے عدن میں، پورب کی طرف ایک باغ لگایا اور آدم کو جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا۔ اور خداوند خدا نے ہر درخت کو جو دیکھنے میں خوشنما اور کھانے میں خوب تھا اور باغ کے بیچوں بیچ حیات کے درخت اور نیک و بد کی پہچان کے درخت کو زمین سے اُگایا۔ اور عدن سے ایک ندی باغ کے سیراب کرنے کو نکلی اور وہاں سے تقسیم ہو کر چار سرے نہروں کے بنی۔ پہلی کا نام منیون جو حویلیہ کی ساری زمین کو گھیرتی ہے۔ وہاں سونا ہوتا ہے۔ اور اس زمین کا سونا اچھا ہے۔ اور وہاں موتی اور بلور بھی ہیں اور دوسری نہر کا نام جیحو ہے جو کوش کی ساری زمین کو گھیرتی، اور تیسری کا نام دجلہ ہے جو اسور کے پورب جاتی ہے اور چوتھی نہر کا نام فرات ہے (پیدائش ۲/۱۰)۔

قرآن نے انسانی سرگزشت کو تیشی رنگ میں بیان کیا ہے اس لئے اس میں کسی قسم کا نام نہیں لیا گیا۔ کیونکہ اس طرح وہ تمثیل نہ رہتی، تاریخ کا واقعہ بن جاتی۔

شجر ممنوعہ کے متعلق لکھا ہے :-

اور خداوند خدا نے آدم کو لے کر باغ عدن میں رکھا کہ اس کی باغبانی اور نگہبانی کرے۔ اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دیکر کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل کھایا کر لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت سے نہ کھانا کیونکہ جس

دن تو اسے کھاتے گا، ضرور مرے گا (پیدائش ۲/۲۹)۔

انسان کو نیک و بد کی پہچان وحی کے ذریعہ کرائی جاتی ہے۔ لہذا، اس شجر کے قریب آنے سے منع کرنے کے کیا معنی؟

آدم کی بیوی کی پیدائش کے متعلق لکھا ہے:-

اور خداوند خدا نے آدم پر بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی، ایک عورت بنا کر آدم کے پاس لایا۔ اور آدم نے کہا کہ اب یہ میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور گوشت میں سے گوشت ہے۔ اس سبب سے وہ ناری کہلاتے گی کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی۔ اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑ دے گا اور اپنی جڑو سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے۔ اور وہ دونوں آدم اور اس کی جڑو و ننگے تھے اور شرمائے نہ تھے (پیدائش ۲/۲۴)۔

اس کے بعد یہ مذکور ہے کہ کس طرح سانپ نے (ابلیس نے نہیں بلکہ سانپ نے) اس عورت کو بہکایا اور اس نے شجر ممنوعہ کا پھل خود بھی کھایا اور اپنے خداوند کو بھی کھلایا۔ اس کے بعد:-

اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز، جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا، سنی۔ اور آدم اور اس کی جڑو نے آپ کو خداوند خدا کے سامنے سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔ تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا کہ تو کہاں ہے؟ وہ بولا کہ میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور ڈرا کیونکہ میں ننگا ہوں۔ اس نے میں نے اپنے آپ کو چھپایا۔ اور اس نے کہا کہ تجھے کس نے بتایا کہ تو ننگا ہے؟ کیا تو نے اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھے کو حکم کیا تھا کہ اسے نہ کھانا؟ آدم نے کہا کہ اس عورت نے مجھے تو نے میری ساتھی کر دیا مجھے اس درخت سے دیا اور میں نے کھایا۔ تب خداوند خدا نے عورت سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا؟ عورت بولی کہ سانپ نے مجھ کو بہکایا تو میں نے کھایا۔ (پیدائش ۳/۱۳-۱۴)

چنانچہ اس حبرم کی پاداش میں:-

اس نے (یعنی خداوند خدا نے) عورت سے کہا کہ میں تیرے حمل میں تیرے درد کو بہت بڑھاؤں گا اور درد سے تو لڑکے جننے گی اور اپنے خصم کی طرف تیرا شوق ہوگا اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔ (پیدائش ۳/۱۶)

اور آدم سے کہا کہ:-

اس واسطے کہ تو نے اپنی جڑو کی بات سنی اور اس درخت سے کھایا، جس کی بابت میں نے تجھے حکم کیا کہ اس سے مت کھانا۔ زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس سے کھائے گا اور

وہ تیرے لئے کانٹے اور اونٹ کٹارا اُگائے گی اور تو کھیت کی نبات کھائے گا۔

اس کے بعد مذکور ہے کہ :-

اور خداوند خدا نے کہا۔ دیکھو کہ انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک ہو گیا اور اب ایسا نہ ہو کہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کہ درخت سے بھی کچھ لے اور کچھ کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے۔ اس لئے خداوند خدا نے اس کو باغ عدن سے باہر کر دیا تاکہ وہ زمین کی، جس میں سے وہ لیا گیا تھا، کھیتی کرے۔ چنانچہ اس نے آدم کو نکال دیا اور باغ عدن کی پورب کی طرف کروڑوں کو چمکتی تلوار کے ساتھ جو چاروں طرف پھرتی تھی مقرر کیا کہ درخت حیات کی نگہبانی کریں۔ (پیدائش ۲۲-۲۳)

آپ نے غور فرمایا کہ اس قصہ کی مذکورہ صدر تفصیل میں کس طرح زمین کی پستی اور خاک کی کثافت جھلک رہی ہے صاف نظر آتا ہے کہ یہ انسانی تخیلات کی عکاسی ہے وحی کا بیان نہیں۔ اتنا ہی نہیں، اس کے بعد، کتاب پیدائش کے چھٹے باب کی پانچویں سے آٹھویں آیت میں ہے:

اور خداوند نے دیکھا کہ زمین پر انسان کی بدی بہت بڑھ گئی اور اس کے تصور اور خیال روز بروز بد ہی ہوتے جاتے ہیں۔ تب خداوند زمین پر انسان کے پیدا کرنے سے پھٹا یا اور نہایت دلگیر ہوا۔ اور خداوند نے کہا کہ میں انسان کو جسے میں نے پیدا کیا، روتے زمین پر سے مٹا دوں گا۔ انسان کو اور حیوان کو بھی کیڑے کوٹے اور آسمان کے پرندوں تک، کیونکہ ان کے بنانے سے پھٹتا ہوں۔ مگر نوح پر خداوند نے ہر بانی سے نظر کی۔ یہ "حقائق" کسی تبصرہ کے محتاج نہیں۔

دھی خداوندی میں آمیزش | سابقہ آسمانی کتابوں کے ساتھ ایسا کچھ کیوں ہوا اس کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ :-

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ - فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ - ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ أَيْتَهُ - وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ - (۲۲)

لے رسول! ہماری دھی کے ساتھ ہوتا یہ رہا ہے کہ ہمارا ایک فرستادہ بنی آتا، لوگوں تک ہمارا پیغام پہنچاتا، اس کے بعد شیطان صفت لوگ اس کی دھی میں اپنی طرف سے آمیزش کر کے اُسے کچھ سے کچھ بنا دیتے۔ اس کے بعد خدا ایک اور رسول بھیجتا اور سابقہ دھی کو اس آمیزش سے پاک اور صاف کر کے اپنے قوانین کو پھر سے محکم کر دیتا۔ اس لئے کہ خدا کو ہر بات کا علم ہوتا ہے اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔

یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے دین خالص، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے، قرآن کریم میں محفوظ کر دیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا کہ اس میں کوئی تحریف یا آمیزش نہ کر سکے اور اس کے بعد وحی کے سلسلہ کو ختم کر دیا۔ اسے ختم نبوت کہا جاتا ہے۔

چونکہ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے رکھا تھا اس لئے یہ تو ممکن نہیں تھا کہ اس کتاب میں کسی قسم کا رد و بدل کیا جاسکے لیکن شیطان صفت لوگوں نے اس کیلئے ایک اور تدبیر نکالی۔ اس تدبیر کے متعلق قرآن کریم نے سورۃ الانعام میں کہا ہے کہ وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيْطَانِ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ - يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا (۶/۱۱۲)۔ جو نبی بھی آیا، شیطان صفت لوگ، خواہ ان کا تعلق شہری بستیوں سے یا صحرائی آبادیوں سے، اس کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے، اس کیلئے وہ باہمی خفیہ سازشیں کرتے اور عوام کو بہکانے کے لئے طرح طرح کی ملمع سازی کی باتیں کرتے۔ یہ ملمع سازی کی باتیں وہ ہیں، جو وضعی روایات کی شکل میں ہماری کتب احادیث میں داخل کر دی گئیں اور پھر انہیں کی بنیادوں پر قرآن کریم کی تفسیر لکھی گئیں۔ چونکہ ان روایات کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے اس لئے انہیں تقدس حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب حالت یہاں تک بگڑ چکی ہے کہ یہی ملمع سازی کی باتیں اصل اسلام بن گئی ہیں اور مستبدان کا مصرف صرف اتنا رہ گیا ہے کہ از یاسین او آساں بمیری — انہی ملمع سازوں کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ:-

وضعی روایات

ذرا سی بات تھی اندیشہ عجم نے جسے بڑھا دیا ہے فقط زیب داستان کے لئے قصہ آدم میں اس ”زیب داستان“ کے لئے کیا کچھ بڑھایا دیا گیا ہے اس کی کچھ مثالیں ہم پہلے دیکھ چکے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ حوا کو کس طرح آدم کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ اسی تفسیر (ابن کثیر) میں خود تخلیق آدم کے متعلق، روایات کی سند سے، کہا گیا ہے کہ:-

پھر آدم علیہ السلام کی مٹی اٹھائی گئی جو چکنی اور اچھی تھی۔ جب اس کا خمیر اٹھا تب اس سے حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور چالیس دن تک وہ یونہی پتلے کی شکل میں رہے۔ ابلیس آتا تھا اور اس پر لات مار کر دیکھتا تھا کہ وہ بجتی مٹی تھی، جیسے کوئی کھوکھلی چیز ہو۔ پھر منہ کے سوراخ سے گھس کر پیچھے کے سوراخ سے اور اس کے خلاف آتا جاتا رہا اور کہتا رہا کہ درحقیقت یہ کوئی چیز نہیں ہے اگر میں اس پر مسلط ہو گیا تو اسے برباد کر کے چھوڑ دوں گا اور اسے مجھ پر مسلط کیا گیا تو میں ہرگز تسلیم نہ کروں گا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان میں روح پھونکی اور وہ سر کی طرف سے شیچے کی طرف آئی تو جہاں جہاں تک پہنچتی

رہی، خون گوشت بنتا گیا، جب ناف تک روح پہنچی تو اپنے جسم کو دیکھ کر خوش ہوئے اور بھٹ سے اٹھنا چاہا لیکن نیچے کے دھڑ میں روح نہیں پہنچی تھی اس لئے اٹھ نہ سکے۔ اسی جلدی کا بیان اس آیت میں ہے: وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا۔ یعنی انسان بے صبر اور جلد باز ہے۔ نہ تو خوشی میں صبر نہ رنج میں۔ جب روح جسم میں پہنچی اور چھینک آئی تو کہا: الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا بِرَحْمَتِكَ اللّٰهُ۔ (ابن کثیر: پارہ اول، ص ۸۳)

یہ آج سے چھ سات سو سال پہلے کی بات تھی (حافظ عماد الدین ابن کثیر کی وفات ۷۲۸ھ میں ہوئی) عصر حاضر کے مفتیؒ سے آگے بڑھے اور ان کی طرح پر یہ مصرعہ لگایا کہ:-

حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تخلیق کے بعد حضرت آدم نے اپنے گرد و پیش کو دیکھا تو انہیں قسم کی مخلوق نظر آئی۔ طرح طرح کے جانور، چرندے و پرندے نظر آئے۔ لیکن ایسی کوئی مخلوق جو اپنی ہم جنس ہو اور جس سے انس و سکون حاصل ہو، نظر نہ آئی۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بڑی وحشت سی ہوئی اور دل ہی دل میں تمنا اور آرزو پیدا ہوئی کہ مجھے کوئی ایسی مخلوق نصیب ہو جلتے جس کی رفاقت اور معیت سے مجھے چین اور سکون ملے۔ چنانچہ دوسرے جمعہ کو جب کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام عالم خواب میں تھے اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے بائیں پہلو کو چیر کر ایک حسین و جمیل اور خوبصورت عورت پیدا کرو جو آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے موجب تسکین ہو۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت حوا کو آدم کی بائیں پسلی سے پیدا کیا گیا۔ بہر حال آدم کے بائیں پہلو کو چیر کر پیدا کیا گیا ہو یا بائیں پسلی سے پیدا کیا گیا ہو، دونوں صورتوں میں حضرت آدم کو کوئی تکلیف اور کوئی درد محسوس نہیں ہوا اور بغیر تکلیف کے اللہ نے حضرت حوا کو پیدا فرما دیا۔ حضرت آدم جب نیند سے بیدار ہوئے تو دیکھا کہ انہیں کی جنس سے ایک مخلوق عورت کی شکل میں، ان کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ہے۔

حضرت آدم نے پوچھا کہ تو کون ہے؟ غیب سے آواز آئی کہ یہ ہماری کنیز اور بندی ہے۔ اس کا نام حوا ہے اور اس کو ہم نے تمہاری رفاقت اور تمہارے انس کے لئے پیدا کیا ہے۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو چھونے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا تو وحی کے ذریعے اللہ کا حکم پہنچا کہ آپ اس وقت تک اسے نہیں چھو سکتے جب تک اس کا ہر ادا نہ کریں۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا کہ اسے پروردگار! اس کا ہر کیا ہے۔ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس کا ہر یہ ہے کہ محمد اور آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر دوس بار درود بھیجا جائے۔ حضرت آدم نے دریافت کیا کہ اے اللہ! محمد کون ہیں؟ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

آپ کی اولاد میں گدہ ذات ہے جو خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں اور ان کی اہمیت یہ ہے کہ اگر ان کو پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو تمہیں یعنی آدم کو بھی پیدا نہ کیا جاتا۔ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دس مرتبہ محمدؐ اور آل محمدؐ پر درود بھیجا اور ملائکہ کی شہادت کے ساتھ دونوں کے مابین عقدِ نکاح قائم ہوا اور اس جمعہ کے آخری حصہ میں فرشتوں کو حکم ملا کہ یا قوت اور سچے موتیوں کے زیور اور لباسِ زینت سے حضرت حوا کو آراستہ کر کے دونوں کو جنت میں داخل کر دیا جائے۔

یہ اقتباس ہے اُس درس قرآن کا جو کماچی کے (مشہور مولانا) احتشام الحق تھانوی صاحب نے ارزاں فرمایا تھا اور جو اخبار ”سیرت“ (لاہور) کی تیسری مئی ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ یہ اقتباس ہم نے محض مثلاً پیش کر دیا ہے ورنہ اس میں کسی خاص مولانا کی تخصیص نہیں۔ ہمارے ہاں کے دارالعلوموں میں یہی کتبِ روایات و تفاسیر پڑھائی جاتی ہیں۔ اور انہی کی بنا پر وہاں کے فارغ التحصیل طلباء کو ”علماء“ کے زمرے میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ اس لئے ہمارے ہاں کے ہر محراب و منبر سے یہی قصے دہرائے جاتے ہیں۔ ان کی انہی افسانہ طرازیوں کے پیش نظر اقبالؔ نے کہا تھا کہ :-

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر :- تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پازند
غنیمت ہے کہ خدا کی کتاب کے الفاظ ان کی دستبرد سے محفوظ ہیں۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ ۔

خلاصہ

جب زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی پیکرِ انسانی میں پہنچی اور مشیت کے پروگرام کے مطابق وہ وقت آیا کہ انسان اپنے سے پہلی آبادیوں کی جگہ زمین میں آباد ہو (۱۱)، تو کائناتی قوتوں کو اس پر تعجب ہوا اس لئے کہ اس سے پہلے کائنات میں کوئی ایسی مخلوق نہیں تھی جسے قوانینِ خداوندی میں مجالِ سرِ تاب ہو (۱۲-۱۳)۔ لیکن اس جدید مخلوق کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا جا رہا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی بھی کر سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے عرض کیا کہ بارِ الہا! یہ کس قسم کی مخلوق ہے جسے اب زمین میں بسایا جا رہا ہے؟ یہ نیرے قانون سے سرکشی برتے گا جس کا نتیجہ ناہمواریاں اور خونریزی ہوگا۔ اس کے برخلاف ہم ہیں کہ جو فرائض ہمارے سپرد کئے گئے ہیں ہم ان کی انجام دہی میں ہمیشہ سرگرم عمل رہتے ہیں (۱۴) اور تیرے پروگراموں کو دیرِ حمد و ستائش بنانے کے لئے جہاں تک جانا پڑے جاتے ہیں۔ اس پر خالقِ کائنات نے کہا کہ تمہیں اس جدید پروگرام کو تم نہیں سمجھ سکتے۔ ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں۔

انسان میں اس امر کی امکانی استعداد رکھ دی گئی تھی کہ یہ ان قوانین کا علم حاصل کر سکے جن کے مطابق مختلف اشیائے کائنات سرگرم عمل ہیں۔ اشیائے کائنات میں سے ہر ایک صرف اپنی خصوصیات سے باخبر ہوتی ہے دیگر خصوصیات کا انہیں کوئی علم نہیں ہوتا۔ لیکن آدم میں جملہ اشیائے کائنات کی خصوصیات کا علم حاصل کرنے کی استعداد رکھ دی گئی جس سے اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان اشیاء میں ربط باہمی کیا ہے۔ اور ان میں اس قسم کے روابط پیدا کر کے کیا کچھ ظہور میں لایا جاسکتا ہے۔ ان کائناتی قوتوں سے کہا گیا کہ اگر تم اپنے اس خیال میں پختے ہو کہ یہ جدید مخلوق تمہارے مقابلہ میں فروتر ہے، تو بتاؤ! کیا تمہیں بھی یہ استعداد حاصل ہے؟

اس پر انہوں نے عجز سے اپنی گردن جھکا دی اور کہا کہ تیرے پروگرام ہماری حدِ نگاہ سے آگے ہوتے ہیں۔ ہم تو صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا ہمیں علم دیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ اکتساباً کچھ معلوم کر لینے کی ہم میں استعداد ہی نہیں۔ تجھے کائنات کا کلی علم ہے اور تو ہی اپنے پروگرام کی غرض و غایت سے باخبر ہے۔

جب اس طرح انسانی ممکنات کی یہ پہلی جھلک ان کے سامنے آگئی تو ان سے کہا گیا کہ ہم کائنات اور اس میں پیدا کی جانے والی مخلوق کے متعلق وہ کچھ جانتے ہیں جو تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تم سے مراد دست کیا کچھ ظہور میں آ رہا ہے اور تمہاری مضر صلاحیتیں کیا ہیں (جن کی نمود انسان کے ہاتھوں ہوگی)۔ اس پر کائناتی قوتیں سب انسان کے سامنے جھک گئیں، لیکن ایک چیز ایسی بھی تھی جس نے اس کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اس نے سرکش اختیار کی۔ یہ تھے انسان کے خود اپنے جذبات جن کے غالب آ جانے سے اس کی عقل و فکر ماؤٹ ہو جاتی ہے اور، اتنی بڑی قوتوں کا مالک، خود اپنے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے، اور اس پر چاروں طرف سے مایوسیاں چھا جاتی ہیں۔

ان صلاحیتوں کے ساتھ انسان کو دنیا میں بسایا گیا۔ اس کی ابتدائی زندگی کا نقشہ یہ تھا کہ اس کی ضروریات بہت محدود تھیں اور سامانِ نشوونما کی بڑی فراوانی تھی (۲۱/۱۱۸) اس نظامِ معیشت کی خصوصیات یہ تھیں کہ:

(۱) اس میں ”میری“ اور ”تیری“ کا امتیاز نہیں تھا۔

(۲) ”رزق“ کھانے پینے کے لئے تھا، ذخیرہ کرنے کے لئے نہیں

(۳) ”رزق“ ہر جگہ میسر تھا اور پیٹ بھر کر کھانے کے لئے میسر (۲۲/۱۱۸)

اس اندازِ معیشت کا نتیجہ یہ تھا کہ ان میں نہ باہمی تصادم تھا نہ تزاؤ۔ نہ اختلاف تھا، نہ افتراق۔ تمام انسان ایک برادری کی طرح رہتے تھے (۲۳/۱۱۸)۔ چنانچہ ان سے کہہ دیا گیا کہ اگر تم نے باہمی اختلاف شروع کر دیتے تو یہ جنتی زندگی تم سے

چھن جائے گی اور تم (زندگی کے بلند مقاصد تو ایک طرف) سامانِ زیست کے حصول کے لئے بھی جانکاہ مشقتوں میں مبتلا ہو جاؤ گے (۲/۱۱۱) کوئی شے اپنے صحیح مقام پر نہیں رہے گی اور اس طرح تم خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھو گے۔ لیکن انسان پر اس کی انفرادی مفاد پرستیوں کے جذبات غالب آگئے اور اس نے اپنے خود ساختہ نظام کے مطابق زندگی بسر کرنی شروع کر دی۔ انسانی برادری نسلوں قبیلوں اور قوموں میں تقسیم ہو گئی۔ جس نے زیادہ قوت فراہم کر لی وہ زنی کے سرچشموں پر قابض ہو گیا۔ اس سے اس کی وہ جنتی زندگی چھن گئی۔ انسان مختلف گروہوں میں بٹ گیا، اور ایک گروہ دوسرے گروہ کا دشمن ہو گیا۔ ان میں مفادِ خویش کی پیچیں حائل ہو گئیں۔

لیکن دنیا میں انسانی زندگی کوئی ایک آدھ دن کی بات نہ تھی کہ یوں بھی گزر ہو جاتا۔ اس نے یہاں ایک مدت تک رہنا اور سامانِ زیست سے ہر ایک نے فائدہ اٹھانا تھا۔ تو کیا انسان کے لئے اس کی خود پیدا کردہ مصیبت کا کوئی حل نہیں تھا؟ اس کا حل تو تھا لیکن یہ، اس کے عقل کے بس کی بات نہیں تھی۔ عقلِ انسانی ہر فرد کو اس کے مفاد کے تحفظ کی راہیں تو بتا سکتی ہے، عالمگیر انسانیت کے امن و سلامتی کا طریق نہیں بتا سکتی۔ یہ اس نظریۂ زندگی اور نظامِ حیات کی رد سے ممکن تھا جو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی مل سکتا تھا، اور جسے اختیار کرنے سے اسے پھر سے وہی جنتی زندگی حاصل ہو سکتی تھی۔

چنانچہ جب جنت کی زندگی اس سے چھن گئی تو اس سے کہہ دیا گیا کہ تمہارے لئے مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ خواہ تم سب کے سب غلط راستے پر چل نکلو پھر بھی مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ ہماری طرف سے، ہمارے رسولوں کی معرفت (۲/۱۱۲) تمہاری طرف راہنمائی آتی رہے گی۔ جو لوگ اس راہنمائی کے مطابق زندگی بسر کریں گے وہ ہر قسم کے خون و ہراس سے محفوظ رہیں گے (۲/۱۲۳-۱۲۴)۔

لیکن جو لوگ اس راہنمائی کے قبول کرنے سے انکار کریں گے اور اس کی صداقتوں کو جھٹلائیں گے، تو، ہمارے قانونِ مکافات کے مطابق وہ مستقل عذاب کی زندگی جتیں گے۔ اس دنیا میں بھی، اور اس کے بعد بھی۔ کائناتی قوتوں کو مستحکم کر لینا مقامِ آدم ہے (یعنی کائنات میں انسان کا صحیح مقام) اور ان قوتوں کو وحیِ خداوندی کے مطابق عالمگیر انسانیت کی بہبود کی خاطر استعمال کرنا، مقامِ موس ہے۔ اگر ان قوتوں کو مختلف قومیں اپنی خواہشات اور ذاتی مفاد کے لئے استعمال کریں تو اس کا نتیجہ عالمگیر فساد ہے۔

یہ ہے سرگزشتِ آدم کا تئیشی بیان اور اس کا ماحصل۔

تیسرا باب

(داستانِ بنی اسرائیل — منزلِ اقل)

آیات ۲/۳۰ - ۲/۳۶

- ۱۔ تاریخ کی اہمیت
- ۲۔ تاریخ اور قرآنِ کریم
- ۳۔ مارکس کا نظریہ تاریخ
- ۴۔ قانونِ مکافاتِ عمل
- ۵۔ قوموں کے عروج و زوال کے اصول
- ۶۔ بنی اسرائیل کی تاریخ
- ۷۔ حضرت موسیٰؑ کی داستانِ حیات
- ۸۔ بنی اسرائیل پر انعاماتِ خداوندی
- ۹۔ تورات کی تاریخ
- ۱۰۔ دین کا سب سے بڑا مخالف ۔ مذہب پرست طبقہ
- ۱۱۔ حق و باطل کی کشمکش
- ۱۲۔ زکوٰۃ کا مفہوم
- ۱۳۔ دینِ اجتماعی نظام کا نام ہے
- ۱۴۔ تشکیلِ امت
- ۱۵۔ مرکزِ ملت ۔ قبلہ۔

تیسرا باب

داستان بنی اسرائیل — منزل اول

لِبَنِي إِسْرَٰئِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ۔ وَأَوْفُوا بِعَهْدِي۔ وَأَوْفِ بِعَهْدِكُمْ۔ وَإِيَّايَ فَارْهَبُوا۔

۲
۳۰

سابقہ باب کا اختتام ان دو آیات پر ہوا ہے جن میں نوع انسان سے کہا گیا ہے کہ تمہاری طرف ہدایت خداوندی آتی رہیں گی جو قوم ان کے مطابق زندگی بسر کرے گی اسے نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حسرت، اور جو قوم ان کی خلاف ورزی کرے گی اس کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس جائیں گی، وہ تبسا ہی اور بربادی کے جہنم کی زندگی بسر کرے گی“ (۲/۳۸-۳۹)۔ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کی تمام بنیادی تعلیم اسی قسم کے دعویٰ پر مشتمل ہے۔ یعنی اس میں کہا یہ گیا ہے کہ اگر یوں کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا، اور یہ بات محض ہنگامی یا وقتی نہیں ہو گی بلکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔ قرآن کریم میں قانون کا لفظ نہیں آیا لیکن آج کی اصطلاح میں اسی کو قانون کہا جاتا ہے۔ بنابرین قرآن کریم کی بنیادی تعلیم اسی قسم کے غیر متبدل قوانین پر مشتمل ہے۔ اسے قانون مکافات عمل بھی کہا جاتا ہے اور مستقل اقدار خداوندی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے ان قوانین کی صداقت پر یقین حکم کو ایمان کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ لیکن یہ ایمان علی وجہ البصیرت لایا جاتا ہے یہ اندھی عقیدت کا نام نہیں ہوتا (۲/۲۴۵)۔ سوال یہ ہے کہ ان قوانین کی صداقت پر علی وجہ البصیرت ایمان لایا کس طرح جاتا ہے؟ اسے خود قرآن کریم نے آیت (۲/۲۴۵) میں ان الفاظ میں واضح کر دیا کہ: **بَلْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كَذِبًا مُّوْجِعًا لِّعِبَادِهِ**۔ **وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَاْوِيلُهُ۔ كَذَّٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ** (۲/۲۴۵) اس آیت جلیلہ میں قرآنی دعویٰ کے پرکھنے کے تین طریقے بتائے گئے ہیں۔ پہلا طریق یہ ہے کہ انسان کو اس قدر علم حاصل ہو کہ وہ اس کی روشنی میں ان دعویٰ پر غور و فکر کر سکے۔

قرآن فہمی کے طریق

جب انہیں علم و بصیرت کی روشنی میں، خالی الذہن ہو کر، پرکھا جائے گا تو ان کی صداقت نکھر کر سامنے آجائے گی۔ یہ وہ طریق ہے جس کی رو سے قرآنی قوانین کو ان دانشوروں کے سامنے پیش کئے جانا چاہئے جو کسی حقیقت کو معروضی طبع پر (OBJECTIVELY) سمجھنے اور پرکھنے کے مدعی ہوں، یا اس کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ علامہ اقبالؒ نے جب نطشہ کے متعلق کہا تھا کہ :-

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں : تو اقبال اُسکو سمجھانا مقامِ کبریا کیا ہے

تو اس سے یہی طریقِ افہام و تفہیم مقصود تھا۔

لیکن مذہب پرست طبقہ اس طریق کی طرف بشکل آسکتا ہے۔ وہ اپنے ذہن کو ان معتقدات سے آسانی پاک اور صاف نہیں کر سکتا جو اس میں روایتاً اور وراثتاً سما چکے ہوں۔ وہ انہیں ابدی حقائق اور غیر متبدل صداقتیں سمجھتا ہے اور ان پر ذرا سی تنقیدی نگاہ ڈالنے کو بھی کفر اور الحاد قرار دیتا ہے اس طبقہ کو علم و بصیرت اور دلائل و براہین کی رو سے قرآنی حقائق سمجھاتے جا ہی نہیں سکتے۔ انہی کے متعلق اقبال نے کہا تھا کہ:

بیاں میں نکتہ توحید آ تو سکتا ہے تیرے دماغ میں بُت خانہ ہو تو کیا کہیے

اس کے لئے قرآنِ کریم میں بیان کردہ دوسرے طریق کو لیجئے۔ قرآن کا پیش کردہ دین محض ایک نظریہ نہیں، وہ ایک عملی نظام ہے۔ یا بالفاظِ دیگر سائنٹیفک طریق کار۔ اس نقطہ نگاہ سے قرآن کے دعاوی بنیادی فامولوں کی حیثیت اختیار کر لیں گے جن کی صداقت کے پرکھنے کا طریق یہ ہو گا کہ ان پر عمل کر کے دکھا دیا جائے کہ ان سے وہی نتائج مرتب ہوتے ہیں یا نہیں، جن کا اس نے دعویٰ کیا ہے۔ اسے اصطلاح میں استنتاجی طریق کار کہتے ہیں۔ یہ ہے وہ طریق، جس کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے اعلان کرایا گیا کہ: قُلْ يَتَقَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ اِنِّي عَامِلٌ فَاَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ اِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۶﴾ اے رسول! اپنی قوم سے کہہ دو کہ جو دعاوی میں پیش کرتا ہوں ان کے متعلق نظری بحث و جدل کی ضرورت نہیں۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ جو پروگرام میں پیش کرتا ہوں اس کا عملی نتیجہ زندگی کی خوشگواریاں ہوں گی۔ تم کہتے ہو کہ نہیں یہ دعویٰ غلط ہے۔ جو پروگرام ہم پیش کرتے ہیں اس کا نتیجہ فلاح و بہبود ہو گا۔ اس بحث کو فیصلہ تک پہنچانے کا طریق یہ ہے کہ تم اپنے پروگرام پر عمل کرتے رہو، میں اس میں دخل نہیں دوں گا۔ اور مجھے اپنے پروگرام پر عمل کرنے دو، اور اس میں تم مداخلت نہ کرو۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔“

اس کے بعد کہا کہ اگر تم اس کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے تو پھر تیسرا طریق کار یہ ہے کہ تم اقوامِ گزشتہ کے احوال و کوائف پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ جس قوم نے اس پروگرام کی مخالفت کی، جو میں پیش کر رہا ہوں دیکھو کہ ان کی طرف مبعوث انبیاء کرام نے بھی ایسا ہی پروگرام پیش کیا تھا اس کا انجام کیا ہوا۔ اس کے لئے تمہیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ اقوام تمہارے گھر کے دو پیش کے علاقوں میں آباد تھیں۔ تمہیں ان کی سرگزشتوں کا بھی علم ہے اور ان کی اجر ٹی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات ان شاہراہوں پر اب تک موجود ہیں جن پر تم صبح شام سفر کرتے رہتے ہو۔ ان اقوام کا مالی، خود میرے دعاوی

کی صداقت کا ثبوت بن جائے گا۔

قرآنی قوانین کی صداقت کے پرکھنے کے بہتین طریق خود قرآن مجید نے بتاتے ہیں۔ ان میں سے تیسرے طریق کار کو تاریخی شواہد کہا جاتا ہے اور اس سے تاریخ کی اہمیت ہماری سمجھ میں آ جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حیوان اور انسان میں ایک اہم امتیازی نشان تاریخ بھی ہے۔ حیوانات کی حالت یہ ہے کہ وہ ہزار ہا سال گزرنے کے بعد بھی اسی مقام پر ہوتے ہیں جہاں ان کی نوع کا پہلا حیوان تھا (مثلاً جو بکری آج ہمارے سامنے آتی ہے وہ انہیں خاصیتوں اور صلاحیتوں کی حامل ہوتی ہے جو دس ہزار سال پہلے کی بکری میں پائی جاتی تھیں)۔

تاریخ کی اہمیت

لیکن، اس کے برعکس، آج کا انسان خاصیتوں اور صلاحیتوں، نیز احوال و ظروف کے اعتبار سے دس ہزار سال پہلے کے انسان سے یکسر مختلف ہے۔ وہ انسان کیڑے پنہنا اور گھر بنانا تک بھی نہیں جانتا تھا۔ آج کا انسان چاند کی سیر بھی کر آیا ہے۔ انسان کی اس ترقی کا راز اس میں ہے کہ ایک نسل یا ایک زمانہ کا انسان اپنے تجربات و مشاہدات کو اگلی نسل تک منتقل کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس علمی، تجرباتی، مشاہداتی نتائج کے منتقل کرنے کی روئیداد کو تاریخ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی کا صدقہ ہے کہ ہر نسل کے انسان کو اپنی زندگی اور اس کی جدوجہد کا آغاز، ابجد سے نہیں کرنا پڑتا۔ قرنہا قرن کی انسانی جدوجہد کا ماحصل، ہزار ہا سال کی مسلسل تنگ و ناز کا پنچوڑ، اقوام و ملل کی سینکڑوں پشتوں اور نسلوں کا اندوختہ، ہر نئی نسل کو ورثہ مل جاتا ہے اور وہ اپنی جدوجہد کا آغاز وہاں سے کرتی ہے جہاں اُسے سابقہ نسل نے چھوڑا تھا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ انسان اپنے تاریخی سرمایہ سے جو اس قدر فیضیاب ہوتا ہے تو اس کا راز کیا ہے؟ اس کا راز یہ ہے کہ کائنات میں خدا کے غیر متبدل قوانین کا فرما ہے۔ اس لئے جس بات کا جو نتیجہ آج سے ہزار ہا سال پہلے برآمد ہوا تھا وہی بات اگر آج دہرائی جائے گی تو اس کا وہی نتیجہ مرتب ہوگا۔ انسان کی طبیعی زندگی میں حقیقت ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے ثبوت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ سنکھیا جس طرح آج سے دس ہزار سال پہلے مہلک تھا اسی طرح آج بھی قاطع حیات ہے۔ سیلاب جو تباہیاں حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں لایا کرتا تھا وہی تباہیاں ہماری آنکھوں کے سامنے راوی، چناب اور سندھ کی طغیانیوں سے برپا ہو جاتی ہیں۔ لیکن قرآن کریم اس سے ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ جس طرح تمہاری طبیعی زندگی میں خدا کے اٹل قوانین فطرت کا فرما ہے، اسی طرح تمہاری اجتماعی زندگی بھی اس کے متعین کردہ قوانین کے تابع رہتی ہے۔ جن قوانین کے اتباع سے آج سے پانچ ہزار سال پہلے کی قوموں نے سر بلند و سرفرازی حاصل کی تھی ان کے اتباع سے آج بھی وہی نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس، جن قوانین کی خلاف ورزی سے اس زمانہ کی قومیں تباہ ہوئی تھیں ان سے روگردانی کا نتیجہ آج بھی تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

یہ کتبہ، کہ جو عمل ایک دفعہ ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے اس سے ہر بار ویسا ہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ سائنس یا فلسفہ کہلاتا ہے۔ ہم آج (SCIENCE OF HISTORY) یا (PHILOSOPHY OF HISTORY) کے الفاظ عام طور پر سنتے ہیں اور ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ یہ علوم، عصر حاضر کے سائنسدانوں یا فلاسفوں کی تحقیق و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ ہیسگل کی (PHILOSOPHY OF HISTORY) اس باب میں مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ لیکن کم لوگوں کو معلوم ہے کہ تاریخ کو بطور ایک سائنس یا فلسفہ کے، پہلی بار، قرآن کریم نے پیش کیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن تاریخ کے مطالعہ پر اس قدر زور دیتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ: وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ آيَاتٍ مُّبَيِّنَاتٍ (۲۳۳)۔ ہم نے تمہاری طرف اپنے واضح قوانین نازل کئے، جن کے تابع تمہاری حیات اجتماعیہ کا رفرما رہتی ہے، اور ان قوانین کے ساتھ، وَمَثَلًا لِّلَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُمْ (۲۳۳)۔ اقوام سابقہ کے حالات اور کوائف بھی نازل کئے، جن میں، ان لوگوں کے لئے، جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے بچنا چاہتے ہیں، ماسا بن عبرت و مواعظت ہے۔ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ (۲۳۳)۔

اسی حقیقت کو قرآن کریم نے دوسرے مقام پر ایک اور انداز میں بیان کیا ہے۔ آپ نے یہ الفاظ تو اکثر سنے ہوں گے کہ ”تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے“ (HISTORY REPEATS ITSELF)۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ تاریخی واقعات اسی شکل و صورت میں بار بار رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ بار بار اس حقیقت کا ثبوت ہم پہنچاتی رہتی ہے کہ فلاں انداز زندگی کا نتیجہ فلاں قسم کا ہوگا۔ اور فلاں روش کے نتائج فلاں نوعیت کے۔ قرآن کریم نے سورۃ الحج میں اقوام سابقہ کی سرگزشتیں پیش کرنے کے بعد کہا کہ: وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَلِ وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ (۱۵۱)۔ ”اے رسول! ہم نے تجھے زندگی کے وہ بنیادی اصول دیئے جن کے مطابق اعمال حیات اپنا نتیجہ مرتب کرتے ہیں اور دوسرے وہ متعدد تاریخی واقعات، جو اس امر شہادت پیش کرتے ہیں کہ ان قوانین کی رو سے فی الواقعہ اسی قسم کے نتائج مرتب ہوں گے“ قرآن کریم میں اقوام سابقہ کے احوال و کوائف اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج اس کثرت سے بیان ہوئے ہیں کہ ان کی تفصیل پیش کرنے کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہوگی۔^۱ عدم گنجائش کی بنا پر، ہم اس مقام پر ان میں سے چند ایک واقعات اور ان کے نتائج پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں لیکن، قبل اس کے کہ ہم اس وضاحت کی طرف آئیں، صہناً ایک اور نکتہ کا پیش کرنا بھی ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ ہمارے دور میں ایک اور گوشہ کی طرف مارکس کا نظریہ تاریخ

ایک خاص نظریہ پیش کیا ہے۔ اس نظریہ کا بانی تو جرم فلاسفر میگل ہے لیکن اس وقت، چونکہ دنیا میں عام چرچا مارکسی نظریہ کا ہے، اس لئے ہم اسی کے تعارف تک اپنے آپ کو محدود رکھتے ہیں۔ اس نظریہ کا ملخص یہ ہے کہ ایک معاشی نظام پیدا ہوتا ہے، پروان چڑھتا ہے، پھلتا پھولتا ہے لیکن جب وہ اپنے عہد شباب کو پہنچتا ہے تو اس میں ایک اور نظام نمودار ہو جاتا ہے جو اس سے پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے اور وہ اس پہلے نظام کی جگہ لے لیتا ہے۔ پھر اس نظام کی جگہ ایک اور نظام لے لیتا ہے جو اس کے سابق نظام کی ضد ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ تغیرات واضعاً واذل سے جاری ہے اور ابد تک جاری و ساری رہے گا۔ کائنات میں نہ کوئی نظریہ، تصور یا عقیدہ غیر متبدل ہے نہ ان پر متفرع کوئی نظام تغیرنا آشنا۔ یہاں ہر شے تغیر پذیر ہے۔ اس نظریہ کو جدلیت یا (DIALECTICISM) کہا جاتا ہے۔ جب مارکس سے پوچھا گیا کہ وہ کونسی قوت ہے جو سلسلہ تغیرات و اضداد کو اس نظم و ضبط کے ساتھ رو بہ عمل لاتی چلی جاتی ہے تو اس نے کہا ایسا "تاریخی وجوب" (HISTORICAL NECESSITY) کی رو سے ہوتا ہے "تاریخی وجوب" ایک ایسی اصطلاح ہے جو استعمال تو اس کثرت اور شد و مد سے کی جاتی ہے لیکن جس کا متعین مفہوم آج تک نہیں بتایا جاسکا۔ (NECESSITY) یا وجوب کے معنی ہوتے ہیں ایسی بات جو بہر حال ہو کر رہے۔ اسے (HISTORICAL DETERMINISM) بھی کہتے ہیں۔ یعنی تاریخی جبریت۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں ایسا بہر حال ہو کر رہتا ہے۔ کوئی قوت اسے روک نہیں سکتی۔ انسان اس کے خلاف کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ یعنی اس نظریہ کی رو سے، انسان صاحب اختیار و ارادہ ہونے کی بجائے مجبور محض بن کر رہ جاتا ہے۔ اسے تاریخ کی مادی تعبیر بھی کہا جاتا ہے۔ اس تصور کی رو سے کہا یہ جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں جس قدر محرکات سامنے آتے ہیں، ان کا جذبہ محرک محض معاشی تھا۔ انسان کے سامنے مسئلہ سارا روٹی کا ہے، اس کے سوا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ حق و باطل، خیر و شر، ہدایت و ضلالت، نیکی اور بدی وغیرہ کے تصورات یا امتیازات، سب واہم ہیں۔ بالفاظ دیگر، اس نظریہ کی رو سے انسان اور حیوان میں کوئی فرق ہی رہتا۔ دونوں کا مسئلہ روٹی کا ہے، اور اس کا حل ہو جانا مقصود حیات۔

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی ہو گی کہ مارکسی نظریہ تاریخ، نہ صرف قرآنی نظریہ کی ضد ہے بلکہ کیسے غیر سائنسی (UN-SCIENTIFIC) بھی ہے۔ قرآنی نظریہ کی رو سے، انسان کے ہر عمل کا ایک مخصوص نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مارکسی نظریہ کی رو سے تاریخ انسانیت میں، انسان کے اختیار و عمل کا کوئی دخل نہیں۔ تاریخی وجوب کی اندھی قوت ایک نظام متشکل کرتی ہے اور کچھ عرصہ کے بعد، اس نظام کی عمارت کو خود ہی مسمار کر کے اس کی جگہ اس کے خلاف دوسرا نظام متشکل کر دیتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو تاریخ انسانیت، انسانی اعمال و کردار کے نتائج کی تاریخ نہیں، تاریخی وجوب کی اندھی قوت کی کارفرمائی کی داستان ہے۔ اس نظریہ کی کمزوری بدیہی ہے۔

اس ضمنی گوشہ کے بعد پھر آجائے پیش نظر موضوع کی طرف، جس میں کہا یہ جارہا تھا کہ قرآن کریم نے اقوام سابقہ کی سرگزشتوں کو بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے اور مقصد اس سے یہ بتانا ہے کہ قوموں کا انجام اس روش کے مطابق ہوتا ہے جسے وہ اپنی اجتماعی زندگی کے لئے اختیار کرتی ہیں۔ قانونِ خداوندی کی اس کارفرمائی کو وہ "سنت اللہ" سے تعبیر کرتا ہے۔ مثلاً وہ سورۃ المؤمن میں آغاز کلام اس طرح کرتا ہے: اَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ كَانُوا أَكْثَرًا مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثَارًا فِي الْأَرْضِ۔ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۲۴)۔ "اے رسول! کیا یہ لوگ، جو قرآنی قوانین کی صداقت کے خلاف اس قدر سرکشی برت رہے ہیں، زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان لوگوں کا انجام دیکھ لیتے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ وہ لوگ تعداد میں بھی ان سے زیادہ تھے اور قوت اور ملکی استحکام میں بھی ان سے بڑھ چڑھ کر۔ لیکن جب ان کی غلط روش کے نتائج ان کے سامنے آئے تو ان کی یہ قوتیں ان کے کسی کام نہ آسکیں۔" ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ: فَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِنْهُمْ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ سُنَّتَ اللَّهِ بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ۔ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (۲۵)۔ "جب ان کے رسول، ان کے پاس واضح قوانینِ خداوندی لے کر آئے تو بجلے اس کے کہ یہ ان پر غور و فکر کرتے، وہ اسی میں مگن ہو کر بیٹھے رہے جو آباد اجداد سے ان کے ہاں رشتہ چلا آ رہا تھا۔ انہوں نے ان رسولوں کا مذاق اڑایا لیکن اس استہزاء نے خود انہی کو چاروں سے گھیر لیا۔ فَلَمَّا دَاوَّا بِأَسْنًا قَالُوا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهُ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ مُشْرِكِينَ (۲۶)۔ "جب ان کی تباہی محسوس شکل میں ان کے سامنے آگئی تو چلانے لگے کہ ہم ہم خدا کے یکتا و یگانہ پر ایمان لاتے ہیں اور ان جھوٹے خداؤں کا انکار کرتے ہیں جنہیں ہم خدائی، قدر میں شریک تصور کیا کرتے تھے۔ لیکن ان کا یہ ایمان و اقرار ہمت کا وقفہ گزر جانے کے بعد تھا، اس لئے یہ انہیں تباہی سے بچانہ سکا۔ فَلَمَّا يَكُنُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ كَتَارًا وَبَاسَنًا۔ سُنَّتَ اللّٰهُ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهِ۔ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ (۲۷)۔ "جب تباہی ان کے سر پر آن کھڑی ہوئی تو ان کا یہ ایمان انہیں کچھ فائدہ نہ دے سکا۔ یہ کوئی ہنگامی حادثہ نہیں تھا۔ یہ سنت اللہ ہے یعنی خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل جو اسی انداز سے کارسزما چلا آ رہا ہے اور جس سے انکار کرنے والے آخر الامر تباہی کا شکار ہو کر رہتے ہیں۔"

یہ سنت اللہ کسی ایک جماعت، ایک زمانہ یا ایک مقام تک محدود نہ تھی۔ یہ عالمگیر قانونِ خداوندی ہے۔ اس لئے جہاں کہیں بھی انسان تھا، خدا کا یہ قانون کارفرما رہا۔۔۔۔۔ امام گزشتہ میں بھی ادرآج بھی — سُنَّتَ اللّٰهُ فِي السَّابِقِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ۔ وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِسَتِهِ تَبْدِيلًا (۳۳)۔ "خدا کا یہ مقررہ قانون ان لوگوں

مشکل یہ ہے کہ جب کوئی شخص عقل کا اندھا بن جائے تو اس کی وہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں جو ماتھے میں گڑی ہوتی ہیں، ایسے لوگوں کے دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں مستور ہیں۔“

قرآن کریم نے اتنا ہی نہیں کیا کہ تاریخ کی اہمیت پر زور دیا اور لوگوں کو اقوام گذشتہ کی سرگزشتوں کے مطالعہ کی تاکید کی۔ اس نے ان اصول و قوانین کی بھی وضاحت کر دی جن کے مطابق قوموں کو سرفرازیں اور خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں اور جن کی خلاف ورزی سے وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ ان کا تفصیلی ذکر تو اپنے اپنے مقام پر آئے گا۔ یہاں ہم چند ایک کا ذکر مثال کے طور پر کرتے ہیں۔ پہلی بات تو اس نے یہ کہی کہ

قوموں کے عروج و زوال کے اصول

قوموں کی موت و حیات (یعنی عروج و زوال) کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہوتا جو بغیر کسی سبب اور علت کے وجود میں آجائے۔ اس نے کہا کہ یاد رکھو! لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ (۸)۔ ”اس کا رگہ سعی و عمل میں جو زندہ رہتا ہے دلیل برہان کی رو سے زندہ رہتا ہے اور جو ہلاک ہوتا ہے وہ بھی قاعدہ اور قانون کے مطابق ہلاک ہوتا ہے۔ یہ اس خدا کا متعین فرمان ہے۔“

قانون ہے جو سب کچھ جانتا اور سناتا ہے۔ اس قانون کا اصل الاصول یہ ہے کہ إِنَّ اللَّهَ لَا يَغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (۱۱)۔ ”کسی قوم کی جو حالت بھی ہو، خدا اس میں کبھی تبدیلی نہیں کرتا ناؤتیکہ وہ قوم، خود اپنے اند نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کر لے“ یہاں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ قوموں کا عمل اور کردار ان کی ذہنیت (نفسیات) کے مطابق ہوتا ہے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں ”ایمان“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس اصولی نکتہ کے بعد اس نے پھر وہ جراثیم بنائے جن کے نتیجہ میں قومیں تباہ ہوتی ہیں، کہیں کہا کہ: وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ (۱۲) ”یاد رکھو! ایسا برگز نہیں ہو سکتا کہ تمہارا نشوونما دینے والا کسی قوم کو یونہی ناخن ہلاک کر دے ورنہ اچھا کہ اس قوم میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہو“ دوسری جگہ فرمایا: فَهَلْ يَهْلِكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ (۱۳) ”وہی قوم ہلاک ہوتی ہے جو حق و صداقت کے راستے چھوڑ کر غلط راہیں اختیار کر لیتی ہے“ کہیں کہا کہ یہ یاد رکھو! تباہیاں بُرا دیاں یونہی تقدیر کی رُڈ سے نہیں آجائیں۔ یہ انسانوں کی خود اپنی لائی ہوئی ہوتی ہیں۔ فَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (۹)۔ ”خدا کسی قوم پر ظلم و زیادتی نہیں کرتا۔ لوگ اپنے اوپر خود ہی زیادتی کرتے ہیں۔“ سورۃ الشوریٰ میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کر دیا: وَمَا آصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ (۹۲)۔ ”جو مصیبت بھی تمہیں پہنچتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہے۔“

قوموں کی ہلاکت کا مفہوم | اس موضوع کو ختم کرنے سے پہلے ایک اور نکتہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم

میں قوموں کی تباہی اور بربادی کے لئے ”ہلاکت“ اور ان کی سرفرازی و کامرانی کے لئے ”حیات“ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ہلاکت کے یہ معنی نہیں کہ وہ قوم طبعی طور پر (PHYSICALLY) اس دنیا سے مٹ جاتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قوم پوری کی پوری صفحہ آرض سے مٹ جائے اور اس کی صرف داستانیں باقی رہ جائیں۔ لیکن ہلاکت کے معنی اس سے وسیع ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے قوموں کی ہلاکت کے یہ معنی بھی ہیں کہ وہ حکومت و سطوت، عزت و اقبال کی بندیوں سے گر کر نکبت و زوال کے جہنم میں جا گریں۔ ایسی قوم کے افراد زندہ رہتے ہیں، سانس لیتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں لیکن ان کی حیات اجتماعیہ (ملی زندگی) مٹ چکی ہوتی ہے، خواہ تعداد کے لحاظ سے وہ کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ ہے قوموں کی ہلاکت۔ بعض قومیں اس طرح تباہ ہوتی ہیں کہ ان میں حیات، نو کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ لیکن جن قوموں میں اس کی صلاحیت موجود ہو، باز آفرینی کے مواقع اُن کے سامنے آتے ہیں اگر وہ ان سے فائدہ اٹھائے تو اپنی کھوئی ہوئی عظمتوں کو دوبارہ حاصل کر سکتی ہے۔ اور یہی ہے وہ مقصد، جس کے لئے قرآن کریم داستان بنی اسرائیل کو سامنے لایا ہے، جس کا آغاز آیت زیر نظر، یعنی (۲) سے ہوتا ہے۔



سوال یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس اہم حقیقت کی وضاحت کے لئے آغاز کلام داستان بنی اسرائیل کیسے کیا ہے؟ حالانکہ ان سے بھی پہلے کی متعدد اقوام

داستان بنی اسرائیل

کا ذکر قرآن کریم کے مختلف مقامات پر موجود ہے۔ اس کی دو بڑی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن کریم کی اولین مخاطب قوم (عربوں) کے ہاں قدیم اقوام کی یا تو زبانی داستانیں مشہور تھیں اور یا ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات۔ اُن اقوام کے زندہ افراد ان کے سامنے نہیں تھے۔ اس کے برعکس یہودی ان کے گرد و پیش بڑی تعداد میں آباد تھے اور ان کی اس وقت کی زندگی بھی، قرآن کریم کے دعاوی کی متحرک شہادت کی طرح اُن کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ دوسرے یہ کہ قدیم اقوام کے متعلق قرآن کریم نے یہی بتایا ہے کہ جب ان کے جرائم حد سے بڑھ گئے تو ایک رسول ان کی طرف آیا جس نے انہیں، ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا اور صحیح روش اختیار کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اس سے سرکشی برتی اور تباہ ہو گئیں۔ اس کے برعکس بنی اسرائیل وہ قوم ہے جو مصر میں فراعنہ کی غلامی میں جکڑی ہوئی تھی۔ وہاں سے انہیں آزادی ملی۔ فلسطین میں با اختیار زندگی بسر کرنے لگے اور آہستہ آہستہ عروج و اقبال کی ان بندیوں کا نتیجہ بنے جو سطوت و ادد و دی اور شوکت سلطانی کے پیکروں میں تاریخ کے اوراق پر جلوہ بزدکھائی دیتی ہیں۔ اس کے بعد وہ پھر قعر مذلت میں گر گئے اور گرتے ہی چلے گئے۔ ! الفاظ دیگر، یہ وہ قوم ہے جس کی تاریخ اس امر کی شہادت بہم پہنچاتی ہے کہ تو انہیں خداوندی کی اطاعت سے کس قسم

کی سرفرازیں حاصل ہوتی ہیں اور ان کے خلاف درزی سے قوم پر کس قسم کی تباہیاں آتی ہیں۔ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے تاریخی شواہد کا آغاز بھی داستان بنی اسرائیل سے کیا ہے اور اس کے بعد اس کے اہم ٹکڑے بھی مختلف مقامات پر سامنے لایا ہے۔ ان کی داستان زندگی کے بہ گوشے تو اپنے اپنے مقام پر سامنے آتے ہیں گے لیکن ان کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس قوم کا اجمالی سا تعارف بھی کرا دیا جائے۔

تعارف | حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا ذکر قرآن کریم میں آتا ہے۔ حضرت اسحق علیہ السلام، جن کے حصہ میں سرزمین فلسطین کی سرداریاں آئیں۔ اور حضرت اسمعیل علیہ السلام جنہیں دنیا میں ”خدا کے اولین گھر“ کی تولیت نصیب ہوئی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت اسحق علیہ السلام کے بیٹے تھے اور ان کا لقب اسرائیل تھا۔ اسی نسبت سے ان کی ذریت، دنیا میں، بنی اسرائیل کے نام سے متعارف ہوئی۔ حضرت یعقوب کے چوتھے بیٹے کا نام یہودہ (JUDA) تھا۔ ان کی نسل کا قبیلہ جس علاقہ پر حکمران تھا اُسے بھی (JUDA) کہا جاتا تھا۔ اسی نسبت سے انہیں (اور ان کے ساتھ حضرت یعقوب کے ایک اور بیٹے بن یامین کی نسل کو) یہودی کہتے تھے اور باقی قبائل کو بنی اسرائیل۔ لیکن بعد میں یہ تفریق باقی نہ رہی اور بنی اسرائیل اور یہودی سے عام طور پر ایک ہی مفہوم لیا جانے لگا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا وطن کنعان (فلسطین) تھا۔ ہم آگے چل کر (سورۃ یوسف میں) دیکھیں گے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کس طرح غلامی کی حالت میں مصر پہنچے اور پھر اپنے حسن سیرت اور بلند صلاحیتوں کی بنا پر وہاں تلک حاصل کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے والد بزرگوار اور قبیلہ کو مصر بلا لیا۔ چار سو برس تک یہ مصر میں رہے۔ یہیں بڑھے، پھولے پھلے اور جو قبیلہ پہلے چند نفوس پر مشتمل تھا۔ اس عرصہ میں ایک کثیر التعداد قوم بن گیا۔ یہ ہے وہ زمانہ، جس سے قرآن کریم میں بیان کردہ داستان بنی اسرائیل کی ابتداء ہوتی ہے۔ تاریخی قیاسات بتاتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا زمانہ قریب (۱۷۰۰-۱۶۰۰ ق م) تھا۔ اس اعتبار سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ قریب (۱۴۰۰-۱۳۰۰ ق م) ہونا چاہیے۔

فرعون مصر | اس داستان میں فرعون کا لفظ بھی بار بار آتا ہے۔ یہ کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں بلکہ شاہان مصر کا لقب تھا۔ مصر کے لوگ دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ آمن راع (سورج کا دیوتا) ان سب میں بڑا تھا۔ مصر کے بادشاہ، دیوتاؤں کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا لقب فاراع (یعنی سورج دیوتا کا اوتار) قرار پا گیا۔ قریب تین ہزار سال قبل مسیح سے لے کر سکندر کے زمانے تک فرعون کے قریب تیس خاندان مصر پر حکمران رہے۔ ان کا آخری خاندان اہل فارس کا تھا جسے سکندر نے ۳۳۲ ق م میں شکست

دی تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں (عام قیاس کے مطابق) ہیکسوس (HYKSOS) کا خاندان برسر حکومت تھا، جنہیں عارفہ کہتے تھے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یہی خاندان مصر پر حکمران تھا اور یہ کہ ان کے (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے) ابتدائی زمانہ کے فرعون کا نام ریمسیس ثانی (RAMESES-II) تھا، اور خروج کے وقت کا بادشاہ، اس کا بیٹا متفتاح (MERNE-PTAH)، اگرچہ بعض شواہد اس کی تردید کرتے ہیں، چنانچہ یہ سب قیاسات ہیں جن سے قرآن کریم بحث نہیں کرتا۔ اس لئے کہ اس کا کام۔۔۔۔۔ اُن حقائق اور نتائج کو پیش کرنا ہے، جو ان داستانوں میں مضمر ہیں۔ اس کا منصب وقائع نگاری نہیں۔

ہم کہہ رہے تھے کہ اس چار سو سال کے عرصہ میں، بنی اسرائیل مصر میں ایک مستقل قوم کی حیثیت اختیار کر گئے تھے اور اہل مصر سے الگ تھلگ نظر آتے تھے۔ جب یہ (حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں) مصر میں آئے تھے تو یہ بڑی عزت و تکریم کے مالک تھے، لیکن رفتہ رفتہ وہاں کے بادشاہوں نے انہیں اپنی محکومی اور غلامی کے شکنجہ میں جکڑ لیا۔ ان کی اسی کرب و شدت اور ذلت و پستی کی انتہا کا زمانہ تھا جب ان میں صاحب ضربِ کلیم، حضرت موسیٰ علیہ السلام، مبعوث ہوئے۔ میں نے اپنی کتاب — برقی طور — میں ان کی اس زمانہ کی زندگی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے :-

فسادِ آدمیت کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ تین گوشے نمایاں طور پر ابھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ استبدادِ حکومت کی سرکش طغیانیاں۔ برہمنیت کی خواب آور فریب کاریاں اور سرمایہ داری کی پُر سکوت آشامیاں۔ ان میں سے ہر فتنہ بچاؤ خوین گلا گھونٹنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ذرا سوچئے کہ جس دور میں بیک وقت سطحِ ارض پر سبعیت اور بربریت کے ایسے ہولناک عفریت، فضا میں تباہی دہر بادی کے ایسے ہلاکت انگیز جراثیم اور دریا کی پرسکون ردا نیوں کے نیچے ایسے خوفناک نہنگ و اژدر موجود ہوں، وہاں مخلوقِ خدا پر کیا گزر رہی ہوگی؟ تاریخِ مصر کا یہی دور تھا جس کا تذکرہ قرآن کریم میں اس شرحِ دبسط سے آیا ہے۔ فرعون، استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ۔ ہامان، برہمنیت کی ابلیسانہ روباہ بانڈیوں کا پیکر۔ اور قارون سرمایہ داری کی لعنت کا بہت بڑا نمائندہ۔ تینوں یک جا، اور ان کے آہنی پنجے میں (بنی اسرائیل کی شکل میں) تڑپتی پھڑکتی، بلبلائی انسانیت!

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اس محکومیت کی زندگی سے نجات دلا کر، سینا کی وادیوں میں آزادی سے ہمکنار کر لیا۔ وہاں یہ بڑھے، پھوٹے، پھلے۔ ایک عظیم مملکت کے مالک ہوئے جو حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔ اس کے بعد یہ قوم باہمی تشدد و افتراق کے عذاب میں گرفتار ہوئی۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ان کے دد اسباط (یہودہ اور بن یامین) پر مشتمل ایک سلطنت تھی جس کا مرکز بیتلہم تھا۔

اور ان کے باقی دس اسباط (بنی اسرائیل) پر مشتمل دوسری سلطنت، جس کا دار الحکومت سماریہ تھا۔ آٹھویں صدی قبل مسیح میں اہل سیریا نے سماریہ کی سلطنت کو تباہ کر دیا اور بنی اسرائیل کو گرفتار کر کے نینوائے گئے۔ قوم بنی مرکزیت کھو کر، کس طرح ریت کے ذروں کی طرح اڑتی پھرتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ ان کا نام و نشان تک صفحہ ہستی سے مٹ جاتا ہے، اس کی عبرت انگیز شہادت ان دس اسباط پر مشتمل قوم بنی اسرائیل کا انجام ہے۔ آج محققین کی بڑی سے بڑی خوردبین بھی یہ نہیں بتا سکتی کہ یہ اسباط بالآخر کہاں گم ہو گئے۔ ادھر ادھر سے قیاسی سراغ لگائے جاتے ہیں۔

کچھ حصہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ افغانستان اور سرحد کی پہاڑیوں میں افغانوں کی صورت میں مشکل ہے، حال ہی (۱۹۷۶ء) میں پشتو اکاڈمی پشاور یونیورسٹی کی طرف سے

گمشدہ اسباط

ایک ضخیم کتاب شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے — تواریخ حافظ رحمت خانی — مع حواشی۔ اس کے حواشی میں بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے کہ جملہ افغان، حضرت یعقوبؑ کی اولاد، بنی اسرائیل سے ہیں۔ اور ایک حصہ کے متعلق قیاس ہے کہ وہ ہندوستان میں ہندوؤں کا روپ دھارے ہوئے ہے۔ یہ بہر حال محض قیاسات ہیں۔ یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اپنی مرکزیت کھو کر یہ عظیم الشان قوم کن کن صحراؤں میں جذب اور کون کون سے بیابانوں میں دفن ہو گئی۔ جو قوم بھی اپنی ملی مرکزیت کی حفاظت نہیں کرتی اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔ وہ دوسری قوموں میں اس طرح مدغم ہو جاتی ہے کہ بعد میں ان کی جداگانہ ہستی کا سراغ تک نہیں ملتا۔ یہ تھا انجام بنی اسرائیل کے ایک حصہ کا۔ اب اس کے دوسرے حصہ کی طرف آئیے جو یہودہ کے نام سے متعارف تھا۔ ان پر پھوٹی پھوٹی تباہیاں تو آتی رہیں۔ لیکن دو حادثات ایسے گزرے جنکی ہلاکت آخرینی کی نظیر آسمان کی آنکھ نے شاید اس سے پہلے کہیں نہ دیکھی ہوگی۔ یہ قرآن کریم نے ان دو حوادث کی طرف خصوصیت سے اشارہ کیا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا (۱۰۶) ہم نے کتاب (یعنی تورات) میں بنی اسرائیل کو اس سے آگاہ کر دیا تھا کہ تم ضرور ملک میں دو مرتبہ فساد برپا کر دگے اور بڑی ہی سخت درجہ کی سرکشی اختیار کر دگے، ضمناً یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ بات ان کی تباہی کی تھی لیکن ذکر ان کی سرکشی کا کیا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ ان کی تباہی قوانین خداوند سے سرکشی برتنے ہی کا نتیجہ تھی۔ دوسری جگہ کہا ہے: لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن بَنِي إِسْرَٰئِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُدَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ - ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ (۵)۔ ”جب بنی اسرائیل نے

حق و صداقت سے کفر اختیار کیا تو پہلے حضرت داؤد علیہ السلام نے اُوپر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں واٹسگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ان کی اس سرکشی اور حدودِ مسمومشی کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم رہ جائیں گے۔
بخت نصر کا حملہ | ان میں سے پہلی تباہی بابل کے بادشاہ بنوکدنصر (بخت نصر) کے ہاتھوں رونما ہوئی اس نے ۶۰۶ ق م میں حملہ کیا اور یہودیوں کے دینی اور سیاسی مرکز ہرشلیم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یہ قتل و غارت گری اور سلب و نہب کا ایسا جانگداز سانحہ تھا جو تاریخ انسانیت میں ضرب المثل بن چکا ہے۔ اس سے نہ صرف یہودیوں کی سلطنت تباہ ہوئی بلکہ ان کی قومیت کا بھی شیرازہ بکھر گیا۔ ان کی مرکزیت فنا ہو گئی۔ اور غلامی اور محکومی کی بڑی سے بڑی اذیتیں اور مصیبتیں جو کسی قوم پر آ سکتی ہیں، سب یکجا ہو گئیں۔ یہی وہ قیامت صغریٰ تھی جس کے متعلق قرآن نے کہا کہ: **فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَٰئِهِمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ۔ فَجَاسُوا خِلَالَ اللَّيْلِ يَارَ۔ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا (۲۶)۔** ”جب ان دو حادثوں میں سے پہلا حادثہ رونما ہوا تو ہم نے بنی اسرائیل پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دیا جو بڑے ہی خوفناک اور طاقتور تھے۔ وہ ان کی آبادیوں کے اندر گھس گئے اور انہیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیا یہ ان کے انہی جبرائیم کا نتیجہ تھا جس سے انہیں پہلے متنبہ کر دیا گیا تھا لیکن وہ ان سے باز نہ آئے تو یہ دارنگ پوری ہو کر رہی۔“ بخت نصر نے ہرشلیم کو لوٹا، جلایا، یہودیوں کا قتل عام کیا اور بقیۃ السیف کو قید کر کے اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ یہ یہودیوں کے لئے پہلی دارنگ تھی۔ ان پر اس کا اچھا اثر ہوا اور ان کے دل، ایک حد تک، اطاعتِ خداوندی کی طرف مائل ہو گئے۔ چنانچہ ایک سو برس کے اندر فارس کے تین شہنشاہ — خورس — دارا اور ارتخششتا ان کی امداد پر آمادہ ہو گئے۔ انہوں نے ہرشلیم کی دوبارہ آبادی اور

ہیکل کی تعمیر کی اجازت دیدی۔ چنانچہ ہیکل کی تعمیر ۵۲۰ ق م میں شروع ہو کر ۴۵۰ ق م میں تکمیل کو پہنچی اور اس کے بعد خانماں خراب اور آوارہ وطن یہودی پھر سے اپنی اجڑی ہوئی بستیوں میں آکر آباد ہونے شروع ہو گئے اور یوں ان کی مردہ جماعت نے قریب ایک صدی کے انقلاب کے بعد دوبارہ زندگی حاصل کر لی۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم نے کہا ہے **شَعَرَدَدْنَا لَكُمْ اُكْتَرَةً عَلَيْهِمْ۔ وَآمَدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ۔ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِیْرًا (۲۷)۔** ”پھر ہم نے زمانہ کی گردش تمہارے دشمنوں کے خلاف اور تمہارے حق میں کر دی۔ اور مال و دولت کی فراوانی اور افرادی قوت کی کثرت سے تمہاری مدد کی اور اس طرح تم پھر ایک بڑی قوم بن گئے۔“ ملتِ یہودیہ کی باز آفرینی کی یہی داستان ہے جسے تورات میں حزقی ایل نبی کے خواب کے استعارہ میں یوں بیان کیا گیا ہے :

حزقی ایل نبی کا خواب

خدا کا ہاتھ مجھ پر تھا اور اس نے مجھے خدا کی روح میں اٹھالیا اور اس دادی میں جو ہڈیوں سے بھر پور تھی، مجھے اتار دیا اور مجھے ان کے آس پاس چوگرد پھرایا۔ اور دیکھو وہ دادی کے میدان میں بہت تھیں۔ اور دیکھو وہ نہایت سوکھی تھیں۔ اور اس نے مجھے کہا کہ آدم زاد! کیا یہ ہڈیاں جی سکتی ہیں؟ میں نے جواب میں کہا کہ اے خداوند یہوداہ تو ہی جانتا ہے۔ پھر اس نے مجھے کہا کہ تو ان ہڈیوں کے اوپر نبوت کر اور ان سے کہہ کہ اے سوکھی ہڈیوں تم خداوند کا کلام سنو۔ خداوند یہوداہ ان ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے کہ دیکھو تمہارے اندر روح داخل کر دوں گا اور تم جیو گے اور تم پر نیس بٹھلاؤں گا اور گوشت چڑھاؤں گا اور تمہیں چمڑے سے مڑھوں گا۔ اور تم میں روح ڈالوں گا اور تم جیو گے اور جانو گے کہ میں خداوند ہوں۔ سو میں نے حکم کے بموجب نبوت کی اور جب میں نبوت کرتا تھا تو ایک شور ہوا اور دیکھ ایک جنبش اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں۔ ہر ایک ہڈی اپنی ہڈی سے۔ اور جو میں نے نگاہ کی تو دیکھ نسیں اور گوشت ان پر چڑھ آئے اور چمڑے کی ان پر پوشش ہو گئی۔ پھر ان میں روح نہ تھی۔ تب اس نے مجھے کہا کہ نبوت کر۔ تو ہوا سے نبوت کر لے آدم زاد! اور ہوا سے کہہ کہ خداوند یہودایوں کہتا ہے کہ اے سانس! تو چاروں ہواؤں میں سے آ! اور ان مقتولوں پر پھونک کہ وہ جیتیں سو میں نے حکم کے بموجب نبوت کی اور ان میں روح آئی اور وہ جی اُٹھے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے۔ ایک نہایت بڑا لشکر۔ تب اس نے مجھے کہا کہ اے آدم زاد! یہ ہڈیاں سارے اہل اسرائیل ہیں۔ دیکھ یہ کہتے ہیں کہ ہماری ہڈیاں سوکھ گئیں اور ہماری امید جاتی رہی۔ ہم تو بالکل فنا ہو گئے۔ اس لئے تو نبوت کر اور ان سے کہہ کہ خداوند یہودایوں کہتا ہے کہ دیکھ اے میرے لوگ میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تمہیں تمہاری قبروں سے باہر نکالوں گا اور اسرائیل کی سرزمین میں لاؤں گا۔ اور اے میرے لوگ جب میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تم کو تمہاری قبروں سے باہر نکالوں گا تب جانو گے کہ خداوند میں ہوں اور میں اپنی روح تم میں ڈالوں گا اور تم جیو گے اور میں تم کو تمہاری سرزمین میں بساؤں گا۔ تب تم جانو گے کہ مجھ سے خداوند نے کہا اور پورا کیا۔ (حزقی ایل ۳۴-۱)

قرآن میں ذکر | اور اس واقعہ کو مترآن کریم نے اپنے مخصوص تیشی انداز میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:-

اَوْحَاٰنَاۤیْ مَّرَّ عَلٰی قَدْرِیَّةٍ وَهِيَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوۡشِہَا۔ قَالَ اِنِّیْ یُحٰی ہٰذِہِ اللّٰہُ

بَعْدَ مَوْتِهَا - فَأَمَّا نَفْسُ اللَّهِ مِائَةَ عَامٍ - ثُمَّ بَعَثْنَاهُ - قَالَ كَمْ لَبِثْتَ - قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا
أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ - قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ إِلَى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ
وَانْظُرْ إِلَى حِمَارِكَ - وَلِنَجْعَلَ لَكَ آيَةً لِلنَّاسِ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا - ثُمَّ
نَكْسُوهَا لَحْمًا - فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۵۹)۔

ایک شخص کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جس کے مکانات مسمار ہو کر کھنڈر بن چکے تھے۔ اس نے کہا کہ کیا اس قسم کی دیران بستی کو، اس کی موت کے بعد، پھر سے زندگی مل سکتی ہے؟ اللہ نے اسے ایک سو سال تک موت کی حالت میں رکھا اور اس کے بعد اسے دوبارہ زندگی عطا کر دی اس سے پوچھا گیا کہ تم بھلا کتنی مدت تک اس حالت میں رہے ہو؟ اس نے کہا بس ایک آدھ دن۔ اللہ نے کہا تم سو سال تک اس حالت میں رہے ہو اب میں دیکھو، کہ تمہارا کھانا اور پانی تک خراب نہیں ہوا۔ اسی طرح تمہارا گدھا بھی (دیسے کا ویسا) کھڑا ہے۔ یہ اس لئے کیا گیا ہے کہ تم لوگوں کے لئے اس بات کی نشانی بن جاؤ (کہ قانون خداوندی کی رو سے مردہ اقوام کو بھی زندگی مل سکتی ہے)۔ کیا تم جنین کی حالت پر غور نہیں کرتے کہ ہم کس طرح، خون کے ٹوٹھڑے سے ہڈیاں ابھارتے ہیں انہیں سخت کرتے ہیں۔ اور پھر ان پر گوشت پوست چڑھا کر، انہیں ایک جیتا جاگتا بچہ بنا دیتے ہیں۔

جب اس مثال کے ذریعے اس پر بات واضح ہو گئی تو اس نے کہا کہ ہاں! اب میں نے سمجھ لیا ہے کہ اللہ نے ہر شے کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں اور ان پر، اس کا پورا پورا کنٹرول ہے۔ موت اور حیات کے فیصلے بھی انہی پیمانوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ جب تک ہم ان پیمانوں کو نہیں سمجھتے ایک بات کو مستبعد خیال کر لیتے ہیں۔ جب وہ سمجھ میں آ جاتے ہیں، وہی ناممکن بات، ممکن نظر آنے لگ جاتی ہے۔

لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہودیوں کی پھر سے وہی حالت ہو گئی اور وہ اسی ہیج زندگی کی طرف لوٹ گئے جس کی پاداش میں ان کی پہلی بربادی ظہور میں آئی تھی۔ اہل فارس کے زیر اقتدار انہوں نے جو تھوڑی مدت آزادی حاصل کی تھی، سکندر نے ۳۳۲ ق م میں اس پر ضرب کاری لگائی اور ان کا شیرازہ پھر منتشر ہونے لگا۔ پھر ۳۳۰ ق م میں بطلمیوس — (PTOLEMY) نے مصر کے راستے حملہ کر کے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ انٹی گونس کے عہد میں یہ تمام علاقہ یونانیوں کے قبضہ میں آ گیا اور یہودیوں پر سخت مظالم شروع ہو گئے حتیٰ کہ ۷۰ ق م میں اس دوسری اور آخری تباہی کی تہمید شروع ہو گئی جو رومیوں کے ہاتھوں ظہور میں آئی تھی۔ اس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءَ وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا

تَنْبِيْرًا (۱۷)۔ پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا تو پھر تم پر ایک اور قوم مسلط ہو گئی جس نے مار مار کر تمہارا حلیہ بگاڑ دیا۔ وہ تمہارے ہیکل تک میں داخل ہو گئے۔ جس طرح پہلے حملہ آوروں نے کیا تھا انہوں نے بھی سب کچھ توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ "رد میوں کا گورنر پامپائی اٹھا اور اس نے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ اس تاخت و تاراج میں قریب بارہ ہزار یہودی تباہ ہو گئے۔ پھر اشعق۔ م کے قریب ایک اور یورش میں قریب تیس ہزار یہودی غلام بنائے گئے اور ڈھورنگر کی طرح فروخت ہوئے۔ مشیت کی طرف سے انہیں ان کی باز آفرینی کا ایک آخری موقعہ دیا گیا اور ان کی طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر رسول مبعوث ہوئے۔ لیکن انہوں نے آپ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ ایک دنیا پر روشنی ہے۔

قدر کے زمانہ میں قومیں ظلم و استبداد، دھاندلی اور نا انصافی، سلب و نہب، غصب، استحصال کے انسانیت کش جرائم کی مرتکب ہوتی ہیں، جن کے نتیجہ میں ان پر تباہی مسلط ہو جاتی ہے۔ لیکن محکومیت کے زمانہ میں، ان کی مذہبی پیشوائیت ایسی تباہ کن روش اختیار کرتی ہے جو انہیں ابھرنے ہی نہیں دیتی اور آہستہ آہستہ تباہی کے جہنم میں جا گرتی ہے۔ یہی تھی ان کے اجارہ ور رہبان کی وہ انسانیت کش روش، جس کے خلاف مسیحائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک صدائے انقلاب بن کر اٹھے۔ انجیل میں اس کا نقشہ بڑے بصیرت افروز انداز میں کھینچا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیکل کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو جاتے اور ایک بے باک، حق گو، پیامبر انقلاب کی طرح ان کے مذہبی پیشواؤں کو مخاطب کر کے

حضرت عیسیٰ کا نعرۃ انقلاب

کہتے :-

اے ریاکار فقیہ اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

اے ریاکار فقیہ اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔

اے اندھے راہ بتانے والو! تم پر افسوس ہے جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں، لیکن اگر وہ مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہو گا اے احمق اور اندھو! کونسا بڑا ہے؟ سونا یا مقدس جس نے سونے کو مقدس کیا۔

اے ریاکار فقیہ اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ پودینے اور سونف اور زیرے پر دہ بکی دیتے ہو۔ اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف، رحم اور ایمان کو بھوڑ دیا ہے۔ اے اندھے راہ بتانے

والو جو مجھ کو تو چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو۔

کبھی ان سے کہتے :-

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو ادیب سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مڑوؤں کی ہڈیوں اور ہر قسم کی نجاست سے بھری ہوتی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوتے ہو۔ اے سانپو! اے انھی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے۔ (متی باب ۲۳؛ آیات ۱-۳۶)

اور کبھی وہ اپنے متبعین کو متنبہ کرتے کہ:

دیکھو! یہ فقیہ اور فریسی جو موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ جو کچھ وہ بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کے لئے کرتے ہیں۔ وہ اپنے بڑے بڑے تعویذ بناتے ہیں اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں۔ ضیافتوں میں صدر شینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام لینا اور برتی کھلانا پسند کرتے ہیں۔ (ایضاً)

یہ تھی بنی اسرائیل کے علما اور مشائخ کی حالت اور یہ تھا وہ مشن، جسے لے کر حضرت مسیح علیہ السلام تشریف لائے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ مذہبی پیشوا، جو وہاں خدائی کر رہے تھے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس حق گوئی کو کس طرح برداشت کر لیتے انہوں نے ان کے خلاف متحدہ محاذ کھڑا کر لیا۔ وہ عوام کو تو یہ کہہ کر بھڑکاتے کہ یہ شخص تمہارے عقائد خراب کرتا۔ ہے لیکن ان کی مخالفت کی جو حقیقی وجہ تھی اس کی پردہ کشائی انجیل برنباس میں ان الفاظ میں کی گئی ہے :-

تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہوگی اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقہ کے مطابق اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے اس لئے کہ ہم خدمت سے نکال دیئے جائیں گے اور ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں (برنباس فصل ۱۴۲)

یہ جو انہوں نے کہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام "اللہ کی عبادت میں قدیم طریقہ کے مطابق اصلاح کرنا چاہتے تھے" تو

اس سے ان کی مراد کیا تھی۔ یا یوں کہیے کہ اس کے خلاف انہیں اعتراض کیا تھا؟ اس کے لئے وہاں کے نظام معاشرت و سیاست کو سامنے لانا چاہئے۔ وہاں

سیکولر ازم کے خلاف

رومیوں کی حکومت تھی لیکن وہ حکومت سیکولر تھی جس کی رو سے انہوں نے امور مملکت تو اپنے ہاتھ میں رکھے تھے لیکن مذہبی امور یہودیوں کے اجبار و رہبان کے زیر اقتدار تھے۔ یہ (یہودی) حکومت کے دائرہ اختیار میں مداخلت نہیں کر سکتے تھے اور حکومت ان کے حیطہ حکمرانی میں دخل انداز نہیں ہوتی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کے خلاف، دین کا نظام قائم کرنا چاہتے تھے جس میں سیاست اور مذہب دونوں حکومت خداوندی کے تابع آجاتے تھے اور اس طرح مذہبی پیشوائیت کا وجود باقی نہیں رہتا تھا۔ آپ کی دعوت انقلاب کی طرف سے یہی وہ خطرہ تھا جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہودی آپس میں کہتے تھے کہ :-

اس وقت خدا کا شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پردہ نہیں کرتے جیسے ہم ان کی شریعت کی کچھ پردہ نہیں کرتے اور اس سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں کر لیں پس اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے۔ قربانی اور روزہ کے ساتھ اس کا راضی کر لینا ممکن ہے مگر جب یہ شخص بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ راضی کیا جاسکے گا جب تک وہ اللہ کی عبادت ویسے ہی نہ ہوتے دیکھے جیسی موسیٰؑ نے لکھی ہے۔ (انجیل برنباس ص ۱۴۲)

آخری تباہی مختصراً، یہودیوں نے اپنی باز آفرینی کے اس موقع کو بھی ہاتھ سے گنوا دیا وہ اپنے جرائم میں آگے ہی آگے بڑھتے گئے تا آنکہ ان کی آخری بربادی کا وقت آگیا۔ چنانچہ رومیوں کے گورنر طیطوس (طائیس) نے سنہ عیسوی میں ایک ایسا دار کیا جس نے اس سوختہ بخت قوم پر اجتماعی ہلاکت کی ہر ثبت کر دی۔ ۱۹

اور یہ تھی وہ قوم جس سے (بعثت بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں) قرآن کریم نے خطاب کر کے کہا تھا کہ تمہارا لئے حیاتِ نو حاصل کرنے کا ایک اور موقع آگیا ہے۔ اگر تم اب بھی اپنے جرائم سے اجتناب برت کر اس نظام کے تابع آ جاؤ جیسے یہ بنی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم وحی خداوندی کے مطابق قائم کر رہا ہے تو تمہاری ذلت و نکبت پھر سے عظمت و رفعت میں تبدیل ہو جائے گی۔ ان کے یہ جرائم کیا تھے جن کی طرف ان کی بار بار توجہ منعطف کرائی جاتی تھی، قرآن کریم نے ان کا بڑی شرح و بسط سے تذکرہ کیا ہے۔ وہ تفصیل تو اپنے مقامات پر سامنے آئیں گی لیکن ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان کا ایک سٹائی ہوئی فہرست اس جگہ پیش کر دی جائے تاکہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجائے کہ وہ جرائم کیا ہوتے

ہیں جو قوموں کے آخری تباہی کا موجب بنتے ہیں۔ اس فہرست کو ذرا غور سے دیکھئے کیونکہ اس میں ہمارے لئے عبرت اور وعظمت کے ہزار سامان پوشیدہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ ہم متعدد بار کہہ چکے ہیں) قرآن کریم ان تاریخی شواہد کو پیش ہی اس لئے کرتا ہے کہ ہم ان کی روشنی میں اپنا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کہیں ہم میں بھی تودہ خرابیاں پیدا نہیں ہو رہیں جن کے نتیجہ میں سابقہ اقوام تباہ ہو گئی تھیں۔ اور یہی ہے وہ مقصد جس کے لئے ہم ان جرائم کی فہرست کو نمایاں طور پر سامنے لانا چاہتے ہیں۔ قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ یہودیوں کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ:-

(۱) اُن کے معاشرہ کی بنیاد سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے اقتدار پر تھی۔ (۲/۹۰)۔

جرائم کی فہرست

(۲) نظام سرمایہ داری کی بنیاد، ربنو پر مبنی ہے۔ یعنی اس اصول پر کہ معاوضہ محنت کا نہیں بلکہ سرمایہ کا ہوتا ہے۔ ان کے ہاں ربنو کا چلن عام تھا، حالانکہ ان کے رسولوں نے انہیں اس سے سختی سے روکا تھا۔ (۲/۱۶۴)۔

(۳) ربنو کے علاوہ، وہ دوسروں کا مال ہر جائز و ناجائز طریقے سے ہتھیا لیتے اور ہضم کر جاتے تھے (۲/۱۶۴ ذ ۵)۔

اس سلسلہ میں، ان کی ہوس زرپرستی کس حد تک پہنچ چکی تھی، قرآن کریم نے اسے اس مقدمہ کے ضمن میں بیان کیا ہے جو حضرت داؤدؑ کے سامنے پیش ہوا تھا۔ مدعی کی فریاد یہ تھی کہ مدعا علیہ مجھے کہتا ہے کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔ اور ہے بھی یہ میرا بھائی۔ اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس صرف ایک بھیڑ ہے۔ یہ میرا بھائی مجھ سے کہتا ہے کہ تم یہ ایک بھیڑ بھی مجھے دے دو، تم نے اسے رکھ کر کیا کرنا ہے۔ یہ تھی اس قوم کی ذہنیت یا ان کا معاشی نظام۔ (۲۸/۲۶-۲۷)۔

(۴) غریبوں اور محنت کشوں کی کارٹھے پسینے کی کمائی کے سلب نہب سے، سرمایہ داروں کے دل میں اگر کبھی کوئی کھٹک پیدا ہوتی تھی تو مذہبی پیشوا اسے یہ کہہ کر مٹا دیتے تھے کہ تم صدقہ خیرات سے جو نیکی کے کام کرتے ہو، ان کا ثواب بہت بڑا ہے۔ قرآن کریم نے ان کی اس خود فریبی کی بڑے دلنشین انداز سے نقاب کشائی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا حال یہ ہے کہ تم پہلے، اپنے ہاں کے غریب اور کمزور لوگوں کو ان کے گھر دے سے نکال دیتے ہو اور جب انہیں دوسرے لوگ

پکڑ کر لے جاتے ہیں تو تم انہیں فدیہ دے کر چھڑا لاتے ہو اور اپنے دل میں خوش ہو جاتے ہو کہ ہم نے بہت بڑا ثواب کا کام کیا ہے اور اسے فراموش کر دیتے ہو کہ جس مصیبت میں یہ غریب گرفتار ہیں اس کے ذمہ دار تم خود ہو۔ یاد رکھو! تمہارا صدقہ و خیرات کے اس قسم کے کام، اس جہرم کا کفارہ کبھی نہیں بن سکتے تمہاری اس روش کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم خسروؑ فی الحیوۃ الدنیا اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہو گے اور آخرت میں بھی سخت عذاب میں مبتلا رہو (۲۸/۲۶)۔

(۵) معاشرہ میں جو برائیاں پیدا ہو جاتی تھیں، نہ تو وہ ایک دوسرے کو ان سے روکتے تھے (۵/۱) اور نہ ہی

ان کے مذہبی پیشوا انہیں ان سے باز رہنے کی تلقین کرتے تھے (۵/۱) کیونکہ ان کے اپنے مفاد ان کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے۔

(۶) ان کے اکابرین ملت (لیڈران کرام) کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ لوگ ان کاموں پر ان کی تعریف کریں، جو وہ کر کے نہ دکھاتیں۔ لوگ ان کی تعریف میں قسیدے پڑھتے رہتے تھے اور وہ ان قصیدوں کو سن کر خوش ہوتے تھے (۳/۱۸)۔

(۷) مذہبی پیشوائیت کے اقتدار کا یہ عالم تھا کہ لوگوں نے علماء اور مشائخ کو اپنا خدا بنا رکھا تھا۔ (۹/۳۱)۔ کسی کو ان کے فیصلوں سے مجال سرتابی نہ تھی۔

(۸) عوام کی یہ حالت تھی، اور مذہبی پیشواؤں کی یہ کیفیت کہ :-

(ا) وہ غرور، نفرت اور تکبر و تمرد کے پیکر تھے۔ ان سے اگر کوئی علم و عقل کی بات کی جائے تو وہ اُسے یہ کہہ کر دھتکار دیتے کہ ہمارا علم مکمل ہے۔ ہمیں کسی سے کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں (۲/۸۸)۔

(ب) مذہب ان کا پیشہ تھا اور وہ چند ٹکوں کی خاطر، جس قسم کا چاہو، فتویٰ دیدیتے تھے۔ (۵/۱۴۹)۔ اور پھر تماشا یہ کہ وہ ان فتوؤں کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے، لیکن لوگوں سے کہتے یہ تھے کہ یہ خدا کی شریعت ہے جسے ہم تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ (۲/۹)

(ج) اسی دین مندرشی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی تھی کہ لوگ خدا کے راستہ کی طرف نہ آنے پائیں اس لئے وہ ہر اس آواز کو سختی سے دبا دینے کی کوشش کرتے تھے جو لوگوں کو حق و صداقت کی دعوت دے۔ (۳/۳۴)۔

(د) وہ مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے جن میں ہمیشہ سر بھٹول ہوتی رہتی تھی ان کی یہ فرقہ بندی اور اختلاف انگیزی کسی اصول کی بنا پر نہیں تھی بلکہ باہمی ضد اور رقابت کی وجہ سے تھی۔ (۱۵/۱)۔ ان کا سارا دقت ایک دوسرے کو کا فر قرار دینے میں صرف ہو جاتا تھا۔ (۱۳/۱۳)۔

(س) وہ جو کچھ دوسروں سے کہتے تھے اس پر خود عمل نہیں کرتے تھے۔ ان کے علم و فضل کی کیفیت بس یوں سمجھئے جیسے کسی نے گدھے پر مقدس کتابوں کا انبار لا دیا ہو۔ (۲۲/۵)

(س) وہ لوگوں کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھتے تھے کہ تم جو کچھ جی میں آئے کر دو۔ جنت تمہارے نام الاٹ ہو چکی ہے۔ تم کبھی جہنم میں نہیں جاؤ گے۔ اور اگر کسی وجہ سے تمہیں جہنم میں بھیج بھی دیا گیا تو تمہارے بزرگ فوراً جا کر تمہیں چھڑالائیں گے۔ (۲۲/۱)۔ تم تو خدا کی چیمپنی اولاد ہو۔ وہ تمہیں کیسے جہنم میں ڈال دے گا۔ (۱۸/۱)۔

(۹) قوم کو اعمال سے بیگانہ بنا دینے کا نتیجہ یہ تھا کہ قانون اور ضابطہ کی چھوٹی چھوٹی پابندیاں بھی ان پر شاق گزرتی تھیں۔ مثلاً انہیں کہا گیا کہ ہفتے میں ایک دن کاروبار کا ناغہ کیا کر دو (جسے سبت کہتے ہیں) تو وہ ایسے جیلے ہانے اختیار کرنے لگ جاتے جن سے وہ کسی نہ کسی طرح اس پابندی سے بچ جاتیں۔ قانون سے گریز کی راہیں

نکالنا ان کا عام معمول بن چکا تھا۔ (۱۶۳-۱۶۴)۔

(۱۰) ظاہر ہے کہ جس قوم کی یہ حالت ہو چکی ہو، وہ کسی بلند مقصد کی خاطر ذرا سی فتنہ بانی بھی نہیں دے سکتی۔ اور جب وہ کسی پھوٹی موٹی قربانی کے لئے بھی آمادہ نہیں ہو سکتی تو حق کی خاطر جان دینے کا تو ان کے ہاں سوال ہی... پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کیفیت ان کی یہ تھی کہ موت کے نام سے ان کی جان جاتی تھی۔ (۶/۵۲)۔ نتیجہ یہ کہ ان کی ہزاروں لاکھوں کی جمیعت باہر نکلتی تھی۔ لیکن جب دشمن سامنے سے آتا دکھائی دیتا تو وہ بھیڑ بکریوں کی طرح بھاگ اٹھتے اور ذلت کی موت مر جاتے۔ (۶/۶۳)۔

(۱۱) اسی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ ان کے ہاں، اور تو اور، فوج کی جرنیلی کا معیار بھی دولت بن چکا تھا۔ یعنی ان منصب کے لئے امیروں اور رئیسوں کے لڑکے منتخب کئے جاتے تھے جو ہر ذاتی کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ (۶/۶۴)۔ اور سپاہیوں میں ڈسپلن اس حد تک مفقود تھا کہ اگر ان سے کہا جاتا کہ کچھ وقت کے لئے پیاس کو روکو، پانی مت پیو تو وہ اتنی سی پابندی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ (۶/۶۵)۔

یہ تھے یہودیوں کے وہ جرائم، جن کی یاد اش میں قرآن کریم نے کہا تھا کہ ضُربتْ عَلَیْہِمُ الذِّلَّةُ اَیْنَ مَا تَقِفُوْا اِلَّا بِحَبْلِ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلِ مِّنَ النَّاسِ۔ وَبَآءُ وَیَغْضَبِ مِّنَ اللّٰهِ۔ وَضُربتْ عَلَیْہِمُ الْمَسْكَنَةُ۔ (۳/۱۳۳)۔ وہ جہاں بھی گئے ذلت و مسکنت سائے کی طرح ان کے پیچھے رہی اور انہیں خدا کے غضب سے کہیں پناہ نہ مل سکی۔ اور نبی اکرم کے بعد بھی ان کی یہی حالت رہی۔

اس مقام پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے
کیا یہودیوں کی حکومت کبھی قائم نہیں ہو سکتی؟ یہ، اور قرآن کریم کی اسی قسم کی دیگر آیات کے غلط

استنتاج سے ہمارے ہاں یہ عقیدہ پیدا ہو گیا، اور وہ متواتر چلا آ رہا ہے، کہ خدا کا یہ فیصلہ ہے کہ یہودیوں کو کبھی حکومت نہیں مل سکتی۔ یہ خدا کا فیصلہ نہیں۔ ہمارا اپنا وضع کردہ عقیدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے) زمانہ نزول قرآن کریم سے قریب ایک ہزار سال پہلے سے بنی اسرائیل میں جو اجتماعی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں ان کا فطری نتیجہ محکومی و محتاجی تھا۔ یہ ذلت و خواری انہیں مختلف اقوام کے ہاتھوں اٹھانی پڑی۔ نزول قرآن کریم کے وقت ان کی یہ خرابیاں اور بھی زیادہ ہو چکی تھیں۔ اس لئے قرآن کریم نے ان کی ذلت و رسوائی کی زندگی کو اپنے اس دعویٰ کی صداقت میں بطور شہادت پیش کر کے کہا کہ دیکھ لو، قوانین خداوندی سے انحراف کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔ اب رہا ان کے مستقبل کا سوال، تو (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) قوموں کی تباہی دو قسم

کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس تباہی کے بعد اس قوم کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی قوموں کے لئے باز آفرینی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن دوسری قسم کی قومیں وہ ہیں جو تباہی کے باوجود اپنا قومی تشخص قائم رکھتی ہیں۔ ان قوموں کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ ان حسدابیوں کو دور کر لیں جن کی وجہ سے ان پر ذلت و ادبار کے بادل اُٹھ آئے تھے اور ان کی جگہ وہ صلاحیتیں پیدا کر لیں جن سے (قرآن کے الفاظ میں) ”مردہ قومیں زندگی حاصل کر لیتی ہیں“ تو انہیں پھر حیاتِ نازہ مل سکتی ہے۔ خدا کا قانونِ رکافات یہ نہیں کہ اگر کسی قوم کے اسلاف میں کسی زمانہ میں خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں تو ان کی آنے والی نسلوں میں اس کا امکان ہی نہ رہے کہ وہ ان خرابیوں کو دور کر کے از سر نو اپنی صلاحیتیں بیدار کر لیں؛ صدیوں پہلے کی کسی نسل (GENERATION) کی غلطیوں کی یاداش میں اس کی آنے والی تمام نسلوں پر باز آفرینی کے دروازے بند کر دینا، می نہ سود خدائے را — بنابرین جس طرح ہمارے اسلاف کے درختِ شہ کا رُتلے ہمارے لئے شوکت و سطوت کی زندگی کا موجب نہیں بن سکتے، ہمیں شوکت و سطوت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب ہم خود وہ کام کریں جن کا نتیجہ شوکت و سطوت ہوتا ہے۔ اسی طرح یہودیوں کے اسلاف نے ذلت و خواری کا موجب بننے والے جرائم ان کے بعد کی نسلوں کے لئے ذلت و خواری کا سبب نہیں بن سکتے۔ اگر وہ اپنے اسلاف کی غلط روئش کو چھوڑ کر صحیح روش اختیار کر لیں تو انہیں اپنے کاموں کا بدلہ ضرور ملے گا۔ اس باب میں قرآن کریم کا فیصلہ بڑا واضح ہے۔ جب اس نے کہا کہ: **قُلْ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲۴۱)**۔ ”یہ تمہارے اسلاف اپنے اپنے وقت میں دنیا سے چلے گئے۔ ان کے اعمال ان کے ساتھ تھے۔ تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تم سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ تمہارے متعلق فیصلہ اس سے ہو گا کہ تم نے کیا کیا ہے؟“

اور یہودیوں کے متعلق قرآن نے ایک اور وضاحت بھی کر دی۔ اس آیت میں، جس میں کہا گیا ہے کہ **ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اِنَّ مَا تَفْقَحُوا (۲۴۱)** ”وہ جہاں بھی جائیں گے ذلت و رسوائی کی لعنت ان کا پیچھا کرے گی“ کے بعد کہا گیا کہ **اِلَّا بِحَبْلِ مِنَ اللّٰهِ وَحَبْلِ مِنَ النَّاسِ (۲۴۱)**۔ ”اس ذلت و مسکنت سے نکلنے کی دو صورتیں ہو سکیں گی، ایک تو یہ کہ وہ ضابطہ خداوندی کو ٹھالیں۔ اس سے انہیں باعزت طریق سے حیاتِ نو حاصل ہو جائے گی اور دوسری صورت یہ کہ کوئی قوم اپنی کسی مصلحت کی بنا پر ان کا سہارا بن جائے۔ اس صورت میں بھی ان کی ذلت و مبدل بہ قوت ہو جائے گی۔ لیکن اس میں غیروں کی محکومیت کی غیر مرئی رسوائی ضرور باقی رہے گی — وہ عزت اور وقار، جس میں کوئی قوم کسی دوسری قوم کی رہیں منت نہ ہو، صرف ضابطہ خداوندی کے اتباع سے حاصل ہو سکتی ہے۔“

بہر حال ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس کی خود تصریح کر دی تھی کہ اس، اس سو راندہ و اگر سودر ماندہ قوم کی نجات کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس قوم نے عداوت خداوندی کی اطاعت تو اختیار نہ کی لیکن ایک قسم کے بعض قومیں) اپنی مصلحتوں کی خاطر ان کا سہارا بن گئیں اور اس طرح فلسطین میں ان کی حکومت قائم ہو گئی۔



اس تمہیدی تعارف کے بعد ہمیں اصل موضوع کی طرف آ جانا چاہیے

حضرت موسیٰ کی داستانِ حیات

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ بات پوری طرح واضح نہیں ہو سکے گی جب تک خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داستانِ حیات کی نمایاں کڑیاں بھی سامنے نہ لائی جاتیں۔ داستانِ بنی اسرائیل اور سرگزشت حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور قرآن کریم میں یہ دونوں سرگزشتیں دوش بدوش سامنے آتی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوتِ انقلاب اور کشمکش کی تفصیل تو اپنے اپنے مقام پر بیان کی جا چکی ہے یہاں صرف ان پر طائرانہ نگاہ ڈالی جاتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر میں بنی اسرائیل کے ایک ممتاز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی رسول کی وساطت سے ان کی والدہ کی طرف پیغام بھیجا کہ وہ اس بچے کو صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دیں۔ ان کی والدہ نے اس ارشادِ خداوندی کی تعمیل میں ایسا ہی کیا۔ اس صندوق کو بادشاہ کے کارندوں نے دریا سے باہر نکالا اور اس طرح بنی اسرائیل کی محکوم قوم کا یہ بچہ شاہی محلات میں پہنچ گیا۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ چونکہ آخر الامر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے اربابِ حکومت کے ساتھ ٹکڑ لہنی تھی۔ اس لئے ضروری تھا کہ وہ محلاتی سیاست اور امورِ مملکت کے سر بستہ رازوں سے واقف ہو جائیں۔ یہ چیز محکوم قوم کے گھرانے میں پرورش پانے سے حاصل نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے اس بچہ کو خود شاہی محلات میں پہنچا دیا گیا۔ یہ دیں بڑھے، جوان ہوئے تو وہاں ان کے ہاتھوں ایک (بالادست) قبطی کا قتل ہو گیا۔ اس سے آپ مصر کو چھوڑ کر مدین کی طرف چلے آئے۔ وہاں انہوں نے ایک غریب سے گھرانے میں شادی کی (کہا جاتا ہے کہ ان کے خسر حضرت نعیم علیہ السلام تھے) معاہدہ کی رو سے برسوں ان کی بھیڑیں چرائیں۔ وہاں سے تھکے جہاں نے انہیں طور کی چوٹیوں پر بلا کر ثرب نبوت سے سرفراز فرمایا اور فرعون کے ساتھ..... نبرد آزمائی کا حکم دیا۔ وہ واپس مصر تشریف لائے، قوم بنی اسرائیل کی تربیت کی۔ فرعون سے ٹکڑ لے اور آخر الامر بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر سینا کی وادیوں کی طرف دوبارہ آگئے۔ وہاں اس قوم کی از سر نو تعلیم و تربیت کر کے انہیں آزادی اور سرفرازی کی زندگی بسر کرنے کا اہل بنا دیا۔ ان کے بھائی حضرت ہارون

علیہ السلام اس تمام مہم میں ان کے ساتھ تھے۔ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داستان تو یہیں تک بیان ہوئی ہے لیکن بنی اسرائیل کی طول طویل سرگزشت کا سلسلہ زمانہ نزول قرآن تک آیا ہے۔ اور اس کا آغاز اس آیت سے کیا گیا ہے جو ہمارے اس باب کی زیب عنوان ہے۔ تجرید یا دہشت کے لئے اسے یہاں دوبارہ درج کیا جاتا ہے۔



يٰۤاَيُّهَا اِسْرَآئِيْلُ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوا بِعَهْدِيْ اَوْفِيْ بَعْدِيْ كُفُّوْا
وَاِيَّاىْ فَاَرْهَبُوْنَ (۲)

اس آیت کا عام ترجمہ یہ ہے کہ ”اے قوم بنی اسرائیل! تم میری ان نعمتوں کو یاد کرو جن سے میں نے تمہیں سرفراز کیا تھا۔ تم میرے عہد کو پورا کرو، میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا اور تم میرے سوا کسی سے مت ڈرو۔“

یہاں بنی اسرائیل کو نعمائے خداوندی کی یاد دلائی گئی ہے۔ انعامات خداوندی کی تشریح و تفصیل مطالب الفرقان کی آیت میں زیر آیت (۱/۴) بیان کی جا چکی ہے (دیکھئے صفحات ۲۵-۲۸) بنی اسرائیل کو جن نعمائے خداوندی کی خصوصیت سے یاد دلائی گئی ہے۔ ان کی تفصیل قرآن مجید کے متعدد مقامات پر آئی ہے اور ان کا اجمالی تذکرہ چند سطور آگے جا کر آپ کے سامنے آجائے گا۔ ان نعمات کی ابتداء قرآن کریم نے یہ لہکر کرائی ہے۔ **وَ اِذْ نَجَّيْنٰكَ مِنْ اِلٰى فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَ** **سُوْءَ الْعَذَابِ** (۲/۲۴) **مَا لٰهُ تَعَالٰى** نے تمہیں اس عذاب سے نجات دلائی جس میں قوم فرعون نے تمہیں مبتلا کر رکھا تھا۔ یہ عذاب کیا تھا؟ اس کی تفصیلات بھی متعدد مقامات پر سامنے آئیں گی، لیکن اس کی اصل الاصول، یا علت العلل قرآن کریم نے ایک لفظ میں سمٹا کر رکھ دی ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی طرف گئے تو اس سے کہا: **اَرْسِلْ مَعَنَا** **بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ** (۲/۲۴)۔ ”میں اس لئے آیا ہوں کہ بنی اسرائیل کو یہاں سے نکال کر لے جاؤں۔ تم ان کے راستہ میں رکاوٹ نہ پیدا کرو۔ انہیں جانے دو۔“ اس کے جواب میں فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ! ہم نے تم پر اتنے احسانات کئے اور تم ان احسانات کا بدلہ اس طرح دے رہے ہو کہ ہماری حکومت کی جڑیں ہی کھوکھلی ہو جاتیں۔ سوچو کہ اگر بنی اسرائیل، جرہماری محکوم قوم ہے، یہاں سے چلی جاتے تو پھر ہم حکومت کس پر کریں گے؟ محکوموں کے بغیر حکومت کا تصور ممکن نہیں۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تم نے اور تو بہت سے احسانات گنائے جو (بقول تمہارے) تم نے ہمارے حال پر کئے تھے لیکن وہ احسان تمہیں یاد نہ رہا جو ان میں سب سے زیادہ گراں بہا ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ **اَنْ عَبَدْتَ** **بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ** (۲/۲۴)۔ ”تم نے بنی اسرائیل کو

غلامی کا عذاب اپنا غلام اور محکوم بنا رکھا ہے۔ یہ ہے سب سے بڑا احسان، جو تم نے مجھ پر اور میری قوم

پر کر رکھا ہے۔ اس کی یاد بھی تو دلاؤ؟

آپ نے غور فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کس طرح ایک لفظ میں اس عذاب کی تفصیل کو سمٹا کر رکھ دیا جس میں بنی اسرائیل ماخوذ تھے — یعنی غلامی اور محکومی کا عذاب! اسی کو قرآن کریم نے دوسری جگہ اَلْعَذَابُ اِلَیْہِمْ (۲۴۳) کہا ہے یعنی ذلت آمیز عذاب۔ ہم اس جگہ کے پہلے باب میں بتا چکے ہیں کہ مستبد ارباب اقتدار کو انتہائی خوشی اس سے حاصل ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو ذلیل اور خوار کریں۔ حکمران قوم کی مسرت کا راز اسی میں پنہاں ہوتا ہے کہ وہ محکوم قوم کو ذلیل کرتے ہیں۔ جہاں تک ان طبعی یا محسوس نکالیف کا تعلق ہے جو بنی اسرائیل کو پہنچائی جاتی تھیں، ان کی تفصیل تورات میں شرح و بسط سے بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ کہا ہے:-

لیکن اسرائیل کی اولاد برونند ہوئی اور بہت بڑھی اور فراواں ہوئی اور نہایت زور پیدا کیا۔ اور وہ زمین سے معمور ہو گئی۔ تب مصر میں ایک نیا بادشاہ جو یوسفؑ کو نہ جانتا تھا پیدا ہوا۔ اور اس نے اپنے لوگوں سے کہا۔ دیکھو کہ بنی اسرائیل کے لوگ ہم سے زیادہ اور قوی تر ہیں۔ آؤ ہم ان سے دانشمندانہ معاملہ کریں تاکہ بینہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہوں اور جنگ پڑے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل جاویں اور ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں اس لئے انہوں نے ان پر خراج کے لئے محصول بٹھلائے تاکہ انہیں اپنے سخت کاموں کے بوجھوں سے سنٹائیں۔ اور انہوں نے فرعون کے لئے خزانے کے شہر بیتوم اور رمیسس بنائے۔ پر انہوں نے جتنا انہیں دیا وہ زیادہ تر بڑھے اور فراواں ہوئے۔ اور وہ بنی اسرائیل کے سبب ناخوش ہوئے۔ اور مصریوں نے خدمت کر دینے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انہوں نے سخت محنت سے گارا اینٹ کا کام اور سب قسم کی خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی۔ ان کی ساری خدمتیں، جو وہ ان سے کراتے تھے، مشقت کی تھیں۔ (خروج ۲: ۱۰)

اس میں کہا گیا ہے کہ فرعون کو اس کا خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ اگر بنی اسرائیل قوت پکڑ گئے تو وہ ان کی حکومت کے لئے بہت بڑے خطرے کا موجب بن جائیں گے۔ اسی خطرہ سے بچنے کے لئے انہوں نے وہی تدبیر اختیار کی جو مستبد حکمرانوں کا عام سیاسی حربہ ہے یعنی

پارٹیوں میں بٹ جانا — عذاب (۲۸)

وہ بنی اسرائیل میں پارٹیاں پیدا کرتا رہتا تھا۔ ایک پارٹی کو معزز اور مکرم بنا کر آگے بڑھاتا اور دوسری کو کمزور کر کے پیچھے ہٹاتا اور اس طرح انہیں آپس میں لڑاتا رہتا۔ اس باہمی اختلاف اور تضادم کا نتیجہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل دن بدن کمزور ہوتے چلے گئے۔ وہ اس محکوم قوم میں سے کس قسم

کے لوگوں کو آگے بڑھاتا اور کن لوگوں کو پیچھے ہٹاتا، اسے قرآن نے یہ کہہ کر بڑے بلخ انداز میں بیان کیا ہے کہ **يُذَرِّحُ اَبْنَاءَ هُمٍ وَيَسْتَعِي نِسَاءَهُمْ اِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ** (۲۸)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ وہ ان کے ابناء کو ذبح کرتا اور ان کی نساء کو زندہ رکھتا اور اس طرح ان میں فساد برپا کرتا رہتا۔ یہ الفاظ دو ایک دیگر مقامات پر بھی آئے ہیں (مثلاً ۱۴۲) ہمارے ہاں ان الفاظ کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ فرعون نے حکم دے رکھا تھا کہ بنی اسرائیل کے ہاں جتنے بچے پیدا ہوں ان میں سے لڑکوں کو پیدا ہونے کے ساتھ ہی قتل کر دیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے۔ یہ مفہوم صحیح نہیں اسے تورات سے لیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے:

تب مصر کے بادشاہ نے عبرانی دائی جنائیوں کو، جن میں سے ایک کا نام سفرہ اور دوسری کا نام فوعہ تھا، یوں کہا کہ جب عبرانی عورتوں کے لئے تم دائی کا کام کرتی ہو اور تم انہیں پتھروں پر دیکھو، اگر بیٹا ہو تو اسے ہلاک کر دو اور اگر بیٹی ہو تو اسے چھینے دو۔

(خروج ۱۶-۱۵)

یہودیوں نے تو اس افسانہ کی کمزوری کو خود ہی بھانپ لیا اور یہ لکھ دیا کہ:

پر، دائی جنائیاں خدا سے ڈریں اور جیسا کہ مصر کے بادشاہ نے انہیں حکم کیا تھا، نہ کیا اور لڑکوں کو جیتا رہنے دیا۔ (خروج ۱۲)

لیکن ہمارے ہاں کے مفسرین اس بات پر جرحے ہیں جسے سب سے پہلے مفسر نے لکھ دیا تھا (تقلید میں ہوتا ہی یہ ہے) اور کبھی کھڑے ہو کر یہ سوچنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ اگر فرعون کے اس حکم پر ایک نسل تک بھی عمل ہوتا تو مصر سے بنی اسرائیل کا نام و نشان تک مٹ جاتا لیکن وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بھی اتنی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ نیز ان کے ساتھ ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام بھی موجود تھے جو ان سے بڑے تھے۔ اگر بڑے قتل کر دیئے جاتے تو حضرت ہارون علیہ السلام کس طرح زندہ بچ جاتے! پھر قرآن کریم نے دوسرے مقام پر کہا ہے کہ فرعون نے حکم یہ دیا تھا کہ جو لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائیں ان کے ابناء کو ذبح کیا جائے (۲۹)

اصل یہ ہے کہ عربی زبان میں ذبح اور قتل کے الفاظ جان سے مار دینے کے لئے ہی استعمال نہیں ہوتے۔ ان سے مراد ہوتا ہے کسی کو ذلیل و خوار کرنا۔ اس کی صلاحیتوں کو ابھرنے نہ دینا۔ اسے جوہر انسانیت سے محروم رکھنا۔ اور ابلے قوم کے معنی قوم کے بڑے ہی نہیں بلکہ مجازی معانی کے اعتبار سے اس سے مراد، قوم کے معزز افراد ہوتے ہیں، بنا، عمارت یا عمارت کی بنیاد کو کہا جاتا ہے) لہذا ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ فرعون کرتا یہ تھا کہ قوم بنی اسرائیل کے جن

افراد میں جو ہر مردانگی کی نمود دیکھتا انہیں ذلیل و خوار کرتا، نیچے ہٹاتا، اور آگے ان لوگوں کو بڑھاتا جو ان صلاحیتوں سے عاری ہوتے۔ حکمران طبقہ کی اس قسم کی دسیسہ کاری ہمیشہ سچل آ رہی ہے۔ وہ محکوم قوم میں سے انہی کو اپنا مقرب اور معزز بناتے ہیں جو انسانی صلاحیتوں سے عاری ہوں۔ اور جن کے متعلق ذرا سا احساس بھی ہو کہ وہ سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہیں۔ انہیں ابھرنے نہ دیا جائے۔ یہ تھی فرعون کی وہ چال، جس سے وہ بنی اسرائیل کو کمزور سے کمزور تر کرنا چاہتا تھا۔ (آیت ۲۸) میں التَّٰزِیْنَ اسْتَضْعِفُوا کہہ کر اس حقیقت کو واضح کر دیا۔ یعنی وہ قوم جسے وہ کمزور سے کمزور تر کرتے جاتا تھا۔ لہذا بنی اسرائیل پر خدا کا پہلا انعام یہ تھا کہ اس نے انہیں غلامی کے اس ذلت آمیز عذاب سے نجات دلائی۔ لیکن یہ تو صرف منفیانہ پہلو ہے۔ غلامی کے عذاب سے نجات ملنے سے قوم کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں کچھ حاصل کرنے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب نظر آتا ہے کہ نجات کے اس مفہوم کے متعلق بھی مختصر الفاظ میں بات کر لی جائے جو ہمارے ہاں عام طور پر رائج ہے اگرچہ اس پر تفصیلی بحث اس کے مقام پر آئے گی جیسا

نجات کا مفہوم

کہ بتایا جا چکا ہے، عیسائیوں کے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ پیدا ہونے کے بعد اپنے والدین کے گناہ کی آلائش اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس سے اس آلائش کو دور کر دینا نجات کہلاتا ہے، اور یہ حاصل ہوتی ہے حضرت مسیح کے کفارے پر ایمان لانے سے۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ ہمیں ہمارے اسلاف کے بعض گناہوں کی وجہ سے کچھ دنوں کے لئے جہنم میں ڈال دیا جائے گا تاکہ ان گناہوں کے جراثیم تلف ہو جائیں اور اس کے بعد ہمیں جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ اس کا نام ہے نجات۔ یعنی عذاب جہنم سے چھٹکارا پانا۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ہر بچہ اپنے پچھلے جنم کے کرموں (اعمال) کی پاداش میں مختلف درجوں (ذاتوں) میں جنم لیتا ہے۔ وہ گروڑ یا کرڈ سال تک آواگون (تنازع) کے ان چکروں میں گردش کرتا رہتا ہے اور آخر الامر اس سے چھٹکارا حاصل کر کے مُکنتی (نجات) حاصل کر لیتا ہے۔ ویدانت یا تصوف کا عقیدہ یہ ہے کہ روح خداوندی انسانی سپیکر میں پہنچ کر مادہ کی کثافتوں سے ملوث ہو جاتی ہے۔ اس کثافت کو مختلف قسم کی ریاضتوں اور مشقتوں سے دور کیا جاتا ہے تاکہ یہ روح پھر اپنی اصل کے ساتھ مل جانے کے قابل ہو جائے، مادہ کی کثافت کے اس طرح دور ہو جانے کا نام نجات ہے۔

آپ نے دیکھا کہ دنیا کے تمام مذاہب اور مذاہب میں ”نجات“ کا تصور یہ ہے کہ انسان پہلے پاک اور صاف تھا۔ پھر بعض آلائشوں اور کثافتوں سے ملوث ہو گیا۔ (خواہ یہ کثافتیں پیدا ہونے کی پیدا کردہ) انسانی زندگی کا مقصد ہے کہ ان آلائشوں کو دور کر کے پھر ویسا انسان بن جائے جو آلائشوں سے ملوث نہیں تھا۔

خواہ یہ چیز اس دنیا میں ریاضتوں اور مشقتوں سے حاصل ہو جائے اور خواہ آخرت میں کچھ وقت کے لئے جہنم کی سزا بھگتنے کے بعد — طریق کار اس کا کوئی بھی ہو، مقصد اس سارے پروگرام کا یہ ہے کہ انسان جیسا پہلے تھا پھر سے ویسا ہی بن جائے۔ مثال کے طور پر آپ یوں سمجھئے کہ صبح کے وقت آپ تندرست اور توانا تھے۔ پھر کسی وجہ سے آپ کو بخار ہو گیا۔ آپ نے اس کی تکلیف برداشت کی، علاج معالجہ کیا۔ شام کو بخار ترک گیا اور آپ پھر ویسے کے ویسے ہو گئے جیسے صبح کے تھے۔ اس تمام پروگرام میں آپ نے کچھ حاصل نہیں کیا۔ یہ ہے نجات کا وہ عام تصور، جو بد قسمتی سے ہمارے ہاں بھی مردج ہے۔ آپ سوچئے کہ اس نظریہ کی رو سے خود خدا کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے؟

خدا پاک اور صاف روحوں کو، انسانی پیکر میں، دنیا میں بھیجتا ہے کہ وہ یہاں پہنچ کر گناہوں کی آلائش میں ملوث ہو جائیں۔ پھر انبیاء کرام کی بعثت کا سلسلہ شروع کرتا ہے کہ وہ لوگوں اس آلائش کے دور کرنے کے طریقے بتائیں۔ یہ آلائشیں یہاں صاف نہیں ہوتیں تو انہیں مرنے کے بعد داخل جہنم کر دیتا ہے تاکہ اُس بھٹی میں یہ آلائشیں صاف ہو جائیں۔ اور اس طویل پروگرام کے بعد جب انسان پھر ویسے ہی بن جائیں جیسے وہ دنیا میں آنے سے پہلے تھے تو انہیں جنت میں بھیج دیتا ہے۔ اور اس پراس پروگرام کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ آپ سوچئے کہ کیا اس قسم کا پروگرام اس خدا کے شایان شان ہو سکتا ہے جو بار بار کہتا ہے کہ ہم نے اس سلسلہ کائنات کو عبث اور باطل پیدا نہیں کیا۔ اسے تعمیری نتائج مرتب کرنے کے لئے باکمی پیدا کیا ہے۔

قرآن کریم کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ انسان دنیا میں کسی قسم کے گناہ کی آلائش کے بغیر سادہ لوح کے ساتھ، کچھ مضر صلاحتیں لے کر پیدا ہوتا ہے۔ دنیاوی زندگی میں اس کے سامنے پروگرام یہ ہوتا ہے کہ وہ ان مضر صلاحتیوں کی اس طرح نشوونما کرے کہ وہ زندگی کی اگلی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ اس اگلی ارتقائی منزل کا نام جنت ہے۔ اسے اس نے ”فوز“ کہہ کر پکارا ہے اور فوز کے معنی کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے نہیں بلکہ مثبت طور پر کچھ حاصل کرنے (ACHIEVEMENT) کے ہیں۔ ان اشارات سے آپ نے سمجھ لیا ہو گا کہ فخرانی پروگرام کا مقصد انسان کی ”نجات“ نہیں، اس کی فوز و فلاح ہے (فلاح کے معنی ہوتے ہیں کھیتی کا برد مند اور ثمر بآہونا) اس اجمال کی تفصیل اس مقام پر آئے گی جہاں اخروی زندگی سے متعلق گفتگو ہوگی۔ یہاں اتنی مزید وضاحت کافی ہوگی کہ ”نجات“ کے معنی کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بھی ہیں اور مصیبت سے دور رکھنے کے بھی۔

اُخروی نجات اس دوسرے معانی میں ہے۔

اس ضمنی گفتگو کے بعد پھر آئیے اصل موضوع کی طرف۔ قرآن کریم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ خدا نے تمہیں فرعون

کی غلامی کے عذاب سے نجات دلائی۔ یہ پہلی کڑی تھی اس سلسلہ انعامات کی جس کا ذکر آگے چل کر آتا ہے۔ غلامی کی زندگی میں تمہیں اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دینے کے مواقع حاصل نہیں تھے۔ اس سے چھٹکارا پانے کے بعد تمہیں اس کے مواقع حاصل ہوں گے۔ جب تم نے ان مواقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے معاشرہ کو قوانین خداوندی کے مطابق متشکل کیا تو اس سے زندگی کے مثبت نتائج تمہارے سامنے آنے شروع ہو گئے۔ اس سلسلہ میں اس نے کہا:-

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ. وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً. وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ. وَنَمَكِّنُ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ. وَنُرِيْ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ (۲۸)

چنانچہ اس مقام پر ہم نے ارادہ کیا کہ وہ قوم جسے فرعون کے استبداد نے کچل کر رکھ دیا تھا، اسے اپنی نعمتوں سے نوازا جائے۔ اُسے نہ صرف یہ کہ دوبارہ زندگی مل جائے۔ اسے سربراہی اور سرداری عطا کی جائے۔ اُسے ایک خطہ زمین کا مالک بنا دیا جائے جس میں وہ اپنی با اختیار مملکت قائم کرے اور فرعون اور اس کے مذہبی پیشواؤں کے سردار، ہامان اور ان کے سب لاؤشکر کو وہ کچھ دکھا دیا جائے جسے دیکھنے سے وہ اس قدر خائف تھے۔ اور جس سے محفوظ رہنے کے لئے وہ اس قدر فریبکارانہ حربے استعمال کیا کرتے تھے۔

یہاں سے ہم نے دیکھ لیا کہ انعام خداوندی یہی نہیں تھا کہ اس قوم کو فرعون کا محکومیت سے نجات دلائی گئی۔ یہ تو قدیم اول تھا۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ حصول آزادی کے بعد اپنی با اختیار مملکت قائم کریں۔

انہیں تمکن فی الارض حاصل ہوا اور تمکن بھی اس سرزمین پر حاصل ہوا جس پر پہلے قوم فرعون قابض تھی۔ چنانچہ سورۃ الشعراء میں ہے فَخَرَجْنَاهُمْ مِنْ جَنَّاتٍ وَعَيْبُونٍ وَكُنُوزٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ۔ كَذَلِكَ۔ وَآوَرْنَاهَا بَنِي إِسْرَآئِيلَ (۲۶-۲۷)۔ اور ہم نے قوم فرعون کو ان کے سرسبز و شاداب باغات، صاف اور شفاف چشموں

اور ان کی زمین کے ذخائر و دفائن سے نکال باہر کیا اور ان سے تمام عزت و تکریم کے مقامات چھین لئے اور ان سب کا بنی اسرائیل کو مالک بنا دیا۔ وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَآئِيلَ مَبَآئِلَ صِدْقٍ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ (۲۸)۔

ہم نے بنی اسرائیل کو ایسا تمکن عطا کیا جو سراب نہیں تھا، حقیقت پر مبنی تھا۔ اور ہم نے انہیں نہایت خوشگوار اور پاکیزہ سامان زیست عطا کیا۔ وہ سامان زیست، جس سے پرواز میں کوتاہی آنے کے بجائے۔ حدود

نا آشنا قوتیں پیدا ہو جائیں۔

قرآن کریم نے جماعت مومنین کی خصوصیت — یا ایمان و عمل صالحہ کا لازمی نتیجہ — یہ بتایا ہے کہ یہ

اُمّت دنیا کی ہر قوم پر غالب اور ان کے مقابلہ میں سر بلند اور سرفراز ہوگی۔ وَ اَنْتُمْ اَلْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ (۱۳۸) اقبال نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے :-

مومن بالائے ہر بالا ترے غیرت اُوبرتابد ہمسرے

جماعت مومنین، دنیا کی ہر قوم کے مقابلہ میں بلند تر ہوتی ہے کسی کا اس کے آگے نکل جانا تو درکنار، اس کی غیرت اسے بھی برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی اور قوم اس کی ہمدوش ہو۔ یہی وہ انعام خداوندی تھا جس سے بنی اسرائیل کو فزایا گیا تھا، جب اس سے کہا کہ اِنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (۲/۱۴۲) ”ہم نے تمہیں تمہاری ہم عصر اقوام پر برتری عطا فرمائی“ دوسرے مقام پر کہا ہے۔ وَلَقَدْ اٰخٰتَرْنٰهُمْ عَلٰی عِلْمٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (۲/۱۴۳) ”یہ قوم دیگر ہم عصر اقوام عالم کے مقابلہ میں منتخب قوم تھی اور ان کا یہ انتخاب یونہی ”مرحمتِ خسروانہ“ کے طور پر عمل میں نہیں لایا گیا تھا۔ یہ علم و بصیرت پر مبنی تھا“

حکومت تو محض قوت کے بل بوتے پر بھی حاصل ہو سکتی ہے، اور اگر اس قوت میں اضافہ ہوتا چلا جائے تو اس سے دیگر اقوام پر غلبہ بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ تاریخ انسانیت، چنگیز اور ہلاکو قسم کے پیکر ان غلبہ و تسلط کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ لیکن جس حکومت کو قرآن کریم نعمتِ خداوندی قرار دیتا ہے اس کی بنیاد محض قوت پر نہیں ہوتی۔ اس کی بنیاد اس پر ہوتی ہے کہ قوت کو ان قوانین کے ساحلوں میں محصور رکھا جائے جو وحی کی رُوح سے عطا ہوں۔ اس مملکت کو اس نے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا نتیجہ بتایا ہے (۲/۲۴۷)۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی افضلیت کے سلسلہ میں اس حقیقت کو

کتاب و حکومت و نبوت

بڑے واضح الفاظ میں بیان کر دیا جہاں کہا کہ :-

وَلَقَدْ اٰتٰیْنَا بِنُوْحٍ الْكِتٰبَ وَالْحِکْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (۲/۱۲۹)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو ضابطہ قوانین عطا کیا۔ انہیں حکومت اور مملکت دی اور ان میں انبیاء کو مبعوث کیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انہیں نہایت خوشگوار اور پاکیزہ سامانِ زیست میسر آیا اور اپنی ہم عصر اقوام پر برتری بھی حاصل ہو گئی۔

یہ تھے وہ انعاماتِ خداوندی، جن کی یاد بنی اسرائیل کو دلائی گئی۔ سوال یہ ہے کہ اس یاد دہانی سے مقصود کیا تھا؟ اس سے انہیں یہ بتانا مقصود تھا کہ تم نے جب قوانینِ خداوندی کو پس پشت ڈالا تو قومِ منہوعون کی ذلت آمیز،

رسوا کن اور اذیت رساں محکومی کے عذاب مبتلا ہو گئے۔ اُس کے بعد جب تم نے اُن قوانین کا اتباع کیا تو تمہیں مملکت، حکومت، رزق طیب، غلبہ و برتری غرضیکہ دنیا کی تمام نعمتیں حاصل ہو گئیں۔ اس کے بعد تم نے پھر قوانینِ خداوندی سے منہ موڑ لیا تو تمہاری یہ حالت ہو گئی جس میں تم اس وقت زندگی گزار رہے ہو۔ حکومتِ سطوت تو ایک طرٹ، تمہیں اس آسمان کے نیچے، اور خدا کی وسیع سرزمین پر، کہیں ٹمک کر بیٹھنے کو جگہ نہیں مل رہی۔ تمہیں دنیا نہایت نفرت اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھتی اور صحرا نورد، خانماں خراب (WANDERING JEWS) کہہ پکارتی ہے لیکن تمہاری یہ محرومی اور نامرادی ابدی نہیں۔ اس سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے سلسلہ میں تمہارے لئے باز آفرینی کا ایک موقع آیا تھا، تم نے اسے ضائع کر دیا۔ اب پھر ایک موقع آیا ہے۔ اگر تم اس سے فائدہ اٹھاؤ تو تمہیں پھر وہی سرفرازیاں اور سر بلندیاں حاصل ہو جائیں گی۔ تمہیں یاد ہو گا (اور اس حقیقت کے بچے کچھے آثار تو تمہاری محرن کتابوں میں آج تک موجود ہیں کہ) جب تمہارے مورثِ اعلیٰ، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا مانگی تھی کہ دنیا اور آخرت کی خوشگواریاں تمہارے نام لکھ دی جائیں۔ تو ہم نے کہا تھا کہ یہ خوشگواریاں یونہی ابدی طور پر کسی قوم کے نام نہیں لکھی جایا کرتیں۔ اگر یہ قوم ہماری متعین روش پر چلتی رہی تو ان خوشگوار یوں سے بہرہ یاب رہے گی۔ لیکن اگر اس نے اس راستہ کو چھوڑ دیا تو پھر مصائب و آلام کے بادل اُنڈ کر آ جائیں گے، بایں ہمہ، ان کی یہ محرومی ابدی نہیں ہو گی۔ ان کے لئے آخرالمرابز آفرینی کا ایک موقع آئے گا اور وہ اس طرح کہ اَلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ اِلٰھِ الَّذِیْ یُحِیْ وَّمُتُّ مَكْتُوبًا عِنْدَھُمْ فِی السُّورٰتِ وَاِلٰھِ نٰحِیْلِ (۱۰۶)۔ انہیں اس رسول کا اتباع کرنا ہو گا جس کی نشاندہی تورات اور انجیل میں کرا دی گئی ہے۔ یعنی رسولِ آخرالزمان نبیِ اُمّی کا اتباع، اور یہ ان کے لئے آخری موقع ہو گا کیونکہ اس کے بعد کوئی رسول نہیں آئے گا۔ اسی کے لئے کہا گیا وَاَوْفُوا بِعَہْدِیْ اَوْفِیْ بِعَہْدِکُمْ (۱۰۷)۔ تم نے جو وعدہ مجھ سے کیا تھا، اُسے پورا کرو تو میں نے جو وعدہ تم سے کیا تھا، میں وہ پورا کروں گا۔

اگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھئے کہ یہاں جو کہا گیا ہے کہ ”تم یہ کرو تو میں وہ کروں گا۔“ اس کی تشریح مطالب الفرقان

۱۔ یہود اور نصاریٰ، دونوں اس آنے والے کا انتظار کر رہے تھے، اور اب تک انتظار کر رہے ہیں، جس کا وعدہ ان کی کتابوں میں موجود تھا (اور موجود ہے)۔ وہ آنے والا (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر چہ اب بھی گیا اور یہ اب تک اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور جتنے عبرت کہ ان کی دیکھا دیکھی، خود مسلمان بھی ایک آنے والے کا انتظار کر رہے ہیں۔ یا للعجب!

جلداول میں ”تقدیر کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے بڑی شرح و بسط سے کی گئی ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لینا ضروری ہے۔ ملاحظہ ہوں صفحات ۱۷۲ اور ۱۸۵-۱۸۰۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ تم قوانین خداوندی کا اتباع کرو تو اس کے نتائج خود بخود تمہارے سامنے آجائیں گے۔

بنی اسرائیل کے اس عہد کو ”میشاق“ کہہ کر بھی پکارا گیا ہے۔ بنیادی طور پر وہ یہ تھا کہ ————— **میشاق بنی اسرائیل**

إِلَّا اللّٰهَ (۲/۱۶۸)۔ یعنی ”بنی اسرائیل سے یہ عہد لیا گیا تھا: انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ قوانین خداوندی کے سوا کسی کی اطاعت نہ کریں“۔ چونکہ وہ قوانین اب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وساطت سے عطا کئے گئے ہیں اس لئے ان کی اطاعت اسی رسول کی اتباع کی شکل میں ہو سکتی ہے۔ یہ تو اس میثاق یا عہد کا مرکزی نقطہ تھا۔ اس کی تفصیل مختلف مقامات پر دی گئی ہیں مثلاً (۲/۱۷۷) میں اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ وغیرہ کو سامنے لایا گیا ہے۔ (۲/۱۷۷) میں رسولوں کے اتباع کی تائید کی گئی ہے۔ (۲/۱۷۸) میں سبت کی پابندی کی تاکید ہے۔ (۲/۱۷۸) میں کہا گیا ہے کہ وہ باہمی خونریزی نہ کریں اور اپنی ہی قوم کے کمزور لوگوں کو ان کے گھر بار سے نہ نکال باہر کریں۔ (۲/۱۷۹) میں کہا گیا ہے کہ وہ اس کتابِ خداوندی کو محکم طور پر تمام لیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔ (۲/۱۷۹) میں کہا گیا ہے کہ وہ خدا کے خلاف افتراء پر دازی سے کام نہ لیں۔ یعنی خود ہی مختلف احکامات وضع کر کے انہیں شریعتِ خداوندی کا نام دے کر لوگوں سے اپنی اطاعت نہ کرائیں۔

یہ تھے وہ عہد جو ان سے لئے گئے تھے لیکن انہوں نے اس عہد و میثاق کو اٹھا کر پھینک دیا (۲/۱۸۴)۔ یہی وہ نقضِ عہد تھا جس کے نتیجے میں دنیا بھر کی ذلتیں اور رسوائیاں سائے کی طرح ان کے پیچھے لگ گئیں (۲/۱۸۵)۔ اور ان کے دل پتھر ہو گئے (۲/۱۷۵)۔

محکومی اور غلامی، نکبت و زبوں حالی، ذلت اور پستی کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم احساسِ کمتری کے نفسیاتی مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس سے جرات اور بصالت، حق گوئی اور مہیا کی کے جوہر انسانیت تلف ہو جاتے یا دب کر رہ جاتے ہیں۔ ان کے قلوب، خوف و حزن کے کاشانے بن جاتے ہیں۔ توہم پرستی کی رسیاں انہیں سانپ بن کر ڈراتی ہیں۔ یَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ (۲/۶۳)۔ ”کہیں کوئی پتہ کھڑے تو ان کی جان جاتی ہے کہ آئی کوئی نئی مصیبت!“ اسی ڈر اور خوف کی وجہ سے وہ منافقت کا شیوہ اختیار کر لیتے ہیں۔ نزدلِ قرآن کے زمانہ میں یہودیوں کی یہی حالت ہو چکی تھی اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا تھا کہ تم نے جو عہد میرے ساتھ

کیا تھا اُسے پورا کرو۔ تم کسی سے مت ڈرو۔ **وَاَيَّا سَ فَاَرْهَبُوْنَ** (پہلے) اس کا عام ترجمہ ہے ”صرف مجھ سے ڈرو“ اور یہ نکتہ تھوڑی سی وضاحت چاہتا ہے۔

خوف، خشیت، رعب وغیرہ کا ترجمہ خوف یا ڈر ہی کیا جاتا ہے لیکن مادہ کے اعتبار سے ان کے معانی میں خفیف اور لطیف سا فرق ہوتا ہے اور اسی وجہ سے قرآن کریم میں یہ الفاظ مختلف مواقع پر مختلف مفہیم کے ساتھ آئے ہیں۔ انسان میں جب کوئی کمزوری پیدا ہو جائے تو اُسے اپنے محفوظ ہونے کا خطرہ لاحق رہتا ہے اور وہ ہر وقت اپنی حفاظت کی تدابیر سوچتا رہتا، اور اس وجہ سے لرزاں و ترساں رہتا ہے اس کی اس کیفیت کو **سَرْهَبٌ** کہتے ہیں، اس عدم تحفظ کے احساس کا نتیجہ منافقت ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے منافقین کے متعلق کہا ہے کہ **لَا تَنْتُمْرَ اَشَدُّ رَهَبًا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ - ذٰلِكَ يَاْتُهُمْ قَوْهًا لَاْ يَفْقَهُوْنَ** (۵۹)۔ ان کے دلوں میں خدا کے مقابلہ میں انسانوں کا خوف زیادہ شدید ہوتا ہے اور یہ اس لئے کہ یہ پیش آنند معاملات پر فہم و فراست سے غور و فکر نہیں کرتے۔ موہوم خطرات کی وجہ سے ڈرتے رہتے ہیں۔“

خدا سے ڈرنے کا مفہوم | اس مقام پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہم آیت (۲) میں دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ ہدایات خداوندی اتباع کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ہر قسم کے خوف اور حزن سے مامون ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن کریم میں دیگر مقامات پر بھی دہرایا گیا، اور اسے بہت بڑا انعام خداوندی قرار دیا گیا ہے۔ ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ خوف کے احساس سے کس قدر تباہ کن نفسیاتی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جب ”خوف“ اس قدر تباہیوں کا موجب ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں کہا ہے کہ ”مجھ سے خوف کھاؤ“ خوف بہر حال خوف ہے، خواہ وہ کسی کی طرف سے بھی کیوں نہ ہو۔ یہ سوال اس لئے ابھرتا ہے کہ ہم ”خوف“ کے ایک ہی معنی لیتے ہیں، حالانکہ خوف اور خوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایک خوف وہ ہے جو کسی مستبد حکمران کی دھاندلی اور تشدد کے احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسری قسم کا خوف وہ ہے جو کسی غلط اقدام کے تباہ کن نتیجہ کے احساس سے لاحق ہوتا ہے۔ ہم بچے کو ڈراتے ہیں کہ آگ کے پاس نہ جانا، تمہاری انگلی جل جائے گی، اسے خوف نہیں کہا جائے گا بلکہ غلط اقدامات سے احتیاط برتنے کا احساس کہا جائے گا۔ اسے اندیشہ یا خدشہ کہہ لیجئے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ چنانچہ عربی زبان میں ”خوف“ کا یہ مفہوم بھی ہے۔ اس اعتبار سے **اَلْخَافَةُ** اس چرمی جبہ کو کہتے ہیں جسے چھتے سے شہید نکالنے والا

اور طے لیتا ہے تاکہ وہ مکھیوں کے ڈنگ سے محفوظ رہے۔ نیز اس تھیلے کو بھی کہتے ہیں جس میں کسی شے کو محفوظ رکھنے کے لئے، بند کر دیا جاتے۔ اس نہج سے دیکھتے تو خدا سے ڈرنے کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس کے قوانین کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج کا احساس کر کے ان سے اجتناب کیا جائے، بچا جائے۔ قرآن کریم کے متعلقہ مقامات پر غور کرنے سے خوفِ خدا کا یہ مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ التَّوْبَةِ میں ہے: **وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ (۹۹)**۔ ”جو شخص مقامِ خداوندی سے ڈرتا ہے اور اپنے آپ کو پست جذبات سے باز رکھتا ہے،“ یہاں خوف کے معنی بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی اپنے پست جذبات کے اتباع کے نقصان رساں نتائج کا احساس کرتے ہوئے ان سے احتیاط برتنا۔ سورۃ بقرہ میں ہے: **فَإِنْ خِفْتُمْ إِلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ...** (۲۳۹)۔ ”اگر تمہیں اس کا ڈر ہو کہ تم حدودِ اللہ کو قائم نہیں رکھ سکو گے تو.....“ یہاں بھی خوف کے معنی واضح ہیں (نیز دیکھئے ۲/۲۵)۔ سورۃ الانعام میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان مبارک سے کہلایا گیا کہ: **إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۶)**۔ ”اگر میں بھی قوانینِ خداوندی کی نافرمانی کروں تو مجھے بھی یومِ عظیم کے عذاب سے ڈرنا ہوگا“ (نیز دیکھئے ۲/۲۹)۔

یہی مفہوم ”خشیتِ الہی“ کا بھی ہے۔ عربوں کے ہاں شَجَدَ خَاشِيَةً ایسے درخت کو کہتے تھے جو پانی نہ ملنے کی وجہ سے خشک ہو جاتے، لیکن اس طرح خشک کہ اس کے پھر سے سرسبز ہو جانے کی توقع ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے بھی وہی مراد ہے۔ یعنی تم اس احساس سے غافل نہ ہو کہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے تمہاری کھیتیاں جھلس جائیں گی، تمہارا نخل تمنا خشک ہو جائے گا۔

ان مقامات سے واضح ہے کہ خدا کے خوف، خشیت یا رَهْب کا مفہوم اُس خوف اور ڈر سے مختلف ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسان سے لاحق ہوتا ہے۔ یہ خوف اس انسان کی طرف سے لاحق ہوتا ہے جس سے یا تو تمہاری کچھ امیدیں وابستہ ہوں یا جس سے تمہیں کسی نقصان کا اندیشہ ہو۔ ان وجوہات سے پیدا ہونے والے خوف سے محفوظ اور مامون رہنے والوں کے متعلق کہا کہ **يَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا. وَكَانُوا لَنَا خَشِيعِينَ (۲۱)**۔ ”یہ لوگ جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت، دونوں صورتوں میں، ہمارے قوانین کو پکارتے تھے اور ان کے سامنے تسلیم خم کرتے تھے۔ ان کی اطاعت کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان کے سینے میں انسانوں کا خوف باقی نہیں رہتا تھا۔“ اس نے دوسرے مقام پر کہا کہ انسان انہی لوگوں سے خائف ہوتا ہے جنہیں وہ صاحبِ اقتدار سمجھ لیتا ہے۔ اگر اس کا ایمان ہو کہ اقتدار صرف خدا کو حاصل تو پھر وہ کسی انسان سے خائف نہیں ہوتا۔ سورۃ النحل میں ہے:

وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ. إِنَّمَا هُوَ إِلَهُ وَاحِدٌ. فَإِيَّايَ فَارْهَبُونَ (۱۶)۔ ”خدا کا حکم یہ ہے کہ تم اپنے لئے دو الہ تجویز نہ کرو۔ الہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے اللہ کی ذات۔ لہذا تم صرف اس کے قوانین کی خلاف ورزی کے نتائج سے ڈرو۔“ یہ جو یہاں الہینِ ثنّین (دو الہ) کہا گیا ہے تو اس کی تشریح دوسرے مقام پر ان الفاظ میں کر دی کہ: وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهُ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهُ (۲۳)۔ ”سما میں بھی وہی الہ ہے اور ارض میں بھی وہی الہ“ اس نکتہ کی وضاحت مطالب الفرقان (جلد اول) میں زیر آیت (۱) (صفحات ۱۰-۹ پر) کی گئی ہے۔ یہاں اتنا دہرا دینا کافی ہے کہ مذہب میں یہی ثنویت رائج ہوتی ہے۔ خدا کے متعلق سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس کا حیطہ اقتدا آسمانوں پر ہے اور دنیاوی معاملات کا تعلق انسانی حکومتوں سے ہے۔ اس میں آسمانی الہ کا تصور محض نظری حیثیت لئے رہتا ہے۔ لیکن ارضی خداؤں کا خوف ہر وقت اعصاب پر مسلط رہتا ہے۔ اسی کا نام شرک ہے اور شرک کا لازمی نتیجہ خوف۔ اقبال کے الفاظ میں:-

آنکہ رمز مصطفیٰ فہمیدہ است شرک را در خوف مضروبیدہ است
(امرار و رموز ص ۱۱۱)

بنابریں، جب اللہ تعالیٰ نے یہودیوں سے کہا کہ: وَإِيَّايَ فَارْهَبُونَ (۱۶) تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت تم نے دنیا میں مختلف الہ تجویز کر رکھے ہیں جن سے تم ہر وقت ڈرے اور سہمے رہتے ہو۔ تم اگر قوانین خداوندی کی صداقت پر پھر سے ایمان لے آؤ اور ان کے مطابق زندگی بسر کرو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے دل میں کسی انسان کا ڈر او خوف باقی نہیں رہے گا۔ احساس ہوگا تو فقط اس کا کہ قوانین خداوندی کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے کیونکہ اس کا نتیجہ واقعی ایسا ہوگا جس سے انسان کو ڈرنا چاہیے۔ اسی کی تاکید کرتے ہوئے ان سے کہا کہ:-

وَأَمِنُوا بِمَا آَنَزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ
بِهِمْ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا. وَإِيَّايَ فَاتَّقُوا۔

۲
۳۱

اس آیت کے پہلے حصہ کا ترجمہ یہ ہے کہ ”تم اس قرآن پر ایمان لاؤ جو نازل ہوا اللہ سے اور جو مصدق ہے، اُس کا جو تمہارے پاس ہے۔ ایسا نہ کرو کہ تم اس سے انکار کرنے والوں میں پیش پیش ہو“ ہم مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں بتا چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے انسانوں کیساتھ

قرآن پر ایمان لانے کی دعوت

اہل کتاب کو بھی دعوت دی تھی کہ وہ رسالت محمدیہ پر ایمان لائیں۔

(دیکھئے جلد اول ص ۸۳) سوال یہ ہے کہ جب قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ ایک ہی دین تھا جو حضرت نوح علیہ السلام سے میلہ لیتی تھی

(صلی اللہ علیہ وسلم) تک جملہ انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف سے دیا جاتا رہا تو پھر انبیاء سابقہ کی امتوں (یہود و نصاریٰ وغیرہ) سے کیوں کہا گیا کہ وہ قرآن کریم پر ایمان لائیں۔ ان کے پاس اُن کی کتابیں موجود تھیں جن پر وہ ایمان رکھتے تھے تو اس کے بعد قرآن پر ایمان لانے کا مطالبہ کیوں کیا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک اپنی اصل و اساس کے اعتبار سے دین ایک ہی تھا جو مختلف انبیائے کرام کی طرف نازل کردہ کتابوں میں دیا گیا تھا لیکن انبیاء کے نام یو اؤں میں سے کسی کے پاس بھی وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں رہی تھی جو ان کے نبی کی وساطت سے انہیں ملی تھی۔ ہمارا یہ دعویٰ یونہی بلا سند اور بلا دلیل (محض قرآن کریم کی عظمت اور افضلیت ثابت کرنے کے لئے) نہیں۔ یہ حقیقت پر مبنی ہے۔ میں نے اپنی کتاب —

مذاہب عالم کی مبینہ آسمانی کتابیں — میں مختلف مذاہب کے مدعیوں کی تصانیف اور تاریخ کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں جو ان کے رسول نے انہیں دی تھی۔ چونکہ اس مقام پر بات یہودیوں کے متعلق ہو رہی ہے اس لئے مناسب سمجھا گیا ہے کہ ان کی مبینہ آسمانی کتاب، تورہ کی مختصر سی تاریخ پیش قارئین کر دی جائے۔ لیکن اس تاریخ کو سامنے لانے سے پہلے قرآن کریم کے اس دعویٰ کو دیکھیں جس میں اس نے کہا ہے کہ یہ لوگ اپنی کتابوں میں دیدہ دانستہ تحریف کرتے تھے۔ اس تحریف کی پہلی شکل تو وہ تھی جسے اس نے

زیر نظر آیت سے متصل آیت میں ان الفاظ میں بیان کیا کہ: **وَلَا تَكْفُرُوا بِالْحَقِّ بِالْبَاطِلِ** **تَحْرِيف** **وَتَكْفُرُوا بِالْحَقِّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۲۴۶)** ”تم نہ تو تمہیں حق و باطل کو اور نہ ہی

دیدہ دانستہ کتمان حقیقت“ سورة اٰل عمران کی آیات (۲: ۲۴۶) نیز سورة المائدہ کی آیت (۵: ۱۳۶) اور سورة الانعام کی آیت (۶: ۹۲) میں بھی ان کے انہی اقدامات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ تبلیس حق و باطل کے معنی یہ ہیں کہ احکام خداوندی اور اپنی خود ساختہ شریعت کو اس طرح غلط ملط کر دینا کہ ان میں امتیاز اور پہچان مشکل ہو جائے۔ اور کتمان حقیقت کے معنی ہیں کہ اصل بات کو چھپائے رکھنا۔ یہ مذہبی پیشوائیت کی عام روش ہے، خواہ ان کا تعلق کسی مذہب سے ہو۔ وہ کرتے یہ ہیں کہ **يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ (۲۴۶)** ”خود احکام وضع کرتے ہیں اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ شریعت خداوندی ہے“ کبھی وہ بیکرتے ہیں کہ **يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِمْ (۲۴۶)** ”احکام خداوندی کو ان کے صحیح مقامات سے ہٹا کر ادھر ادھر کر دیتے ہیں اور پھر ان کی من مانی تادیلوں اور تفسیروں سے ان کا کچھ سے کچھ مفہوم متعین کر دیتے ہیں“ (زیر دیکھئے ۵: ۱۳۶)۔

اللہ تعالیٰ نے منزل من اللہ کتاب کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا (۲/۲۵)۔ اور اس کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کی لمنے والی امت میں بھی کوئی اختلاف اور فرقہ پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جب کتاب خداوندی کے ساتھ وہ کچھ کیا جائے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کتاب میں بھی اختلافات پیدا ہو جائیں گے اور اس کی لمنے والی قوم بھی فرقوں میں بٹ جائے گی۔

اختلافات

یہی کچھ کتاب موسیٰ کے ساتھ ہوا تھا۔ قرآن کریم کے الفاظ میں وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتَلَفَ فِيهِ (۲۵/۳۱) ”یہ حقیقت ہے کہ دیگر انبیائے کرام کی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی خدا کی طرف سے کتاب دی گئی تھی لیکن اس کتاب میں اختلافات پیدا کر دیتے گئے“ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قوم مختلف فرقوں میں بٹ گئی اور ہر فرقہ کے علماء اور مشائخ خدا بن کر بیٹھ گئے۔ (تَخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهَبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ) (۹/۳۱)۔ ”ان لوگوں نے اپنے علماء و مشائخ کو خدا سے دے ہی اپنا معبود بنا لیا“

یہ تھے وہ الزامات، جو قرآن کریم نے یہودیوں کے خلاف عائد کئے تھے اور انہی کی بنیاد پر ان سے کہا تھا کہ انہیں جو تعلیم سابقہ انبیائے کرام کی رسالت سے ملی تھی، وہ ان کے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں، وہ اب قرآن کریم ہی میں ملے گی۔ اس لئے اگر وہ حیات نو کے متمنی ہیں تو انہیں چاہئے کہ وہ اس کتاب پر ایمان لائیں۔ اب یہ دیکھئے کہ قرآن کریم کے اس دعویٰ کی تصدیق تاریخی شواہد سے کس طرح ہوتی ہے۔

سب سے پہلے اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ تورات صرف اس کتاب کا نام نہیں

تورات کی تاریخ

جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا گیا تھا۔ یہ مجموعہ ہے ان تمام صحف کا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد کے انبیائے بنی اسرائیل کو وقتاً فوقتاً ملتے رہے۔ یہ مجموعہ (۳۹) کتابوں پر مشتمل ہے جنہیں علماء یہود نہیں سلسلوں میں منقسم کرتے ہیں:-

(۱) سلسلہ اول۔ تورات (یا قانون)۔ اس میں پانچ کتابیں (اسفار) شامل ہیں جنہیں کتب موسیٰ کہا جاتا جاتا ہے۔ پیدائش۔ خروج۔ احبار۔ گنتی اور استثناء۔ قرآن کریم میں تورات (یعنی عہد عتیق) کو کہیں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب نہیں کیا گیا۔ ان کے صحف ہی کا ذکر آیا ہے (۵۳/۳۴ ز ۴۹/۴۸)۔

(۲) سلسلہ دوم۔ نبیم۔ اس میں چھوٹی بڑی بائیس کتابیں شامل ہیں۔ اور

(۳) سلسلہ سوم۔ کتبین۔ اس میں بارہ کتابیں شامل ہیں جن میں سے ایک زبور بھی ہے۔

یہ کتابیں (جیسی کچھ بھی ہیں) آج موجود ہیں، لیکن ان میں بعض ایسی کتابوں کا حوالہ آتا ہے جن کا وجود اس مجموعہ میں کہیں نہیں ملتا۔ اس قسم کی کم از کم گیارہ کتابیں گنائی جاسکتی ہیں۔ جہاں تک ان پانچ کتابوں کا تعلق ہے جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات اور اس کے بعد کے حالات بھی موجود ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کتابوں کا کم از کم کچھ حصہ بعد کا اضافہ ہے۔ عہد نامہ عتیق کی کتابوں کے متعلق بہ تحقیق ثابت نہیں ہو سکا کہ یہ ابتداء کس عہد میں مدون ہوئیں اور ان کے مؤلف کون تھے۔ البتہ تناظر و تحقیق ہے کہ ایک زمانہ ایسا آیا تھا جب ان کا وجود ناپید ہو چکا تھا اور اس کے بعد از سرنو ان کی تدوین عمل میں آئی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب نخت نصر نے یروشلم پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے الواح تورات اور دیگر برکات کو (یہودیوں کے قول کے مطابق) ہیکل میں محفوظ رکھا تھا۔ نخت نصر نے ان سب کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا اور یہودیوں کو گرفتار کر کے بابل لے گیا۔ قریب ایک سو سال کے بعد جب یہودیوں نے یروشلم میں دوبارہ بسنا شروع کیا تو انہیں اپنے گم گشتہ مصاحف کی ترتیب نو کی منکر ہوئی۔ تورات کے بیان کے مطابق، عذرافقیہہ نے اپنی یادداشت کے مطابق سلسلہ اول کی پانچ کتابوں کو مرتب کیا۔ اس کے بعد نجیاء نبیؑ نے سلسلہ دوم کی کتابوں کو مرتب کیا۔ لیکن، اس کے بعد، جب یونانیوں نے فلسطین کو تباہ کیا تو انہوں نے ان تمام صحیفوں کو جلوا دیا اور تورات کی تلاوت کو حاکم بند کر دیا۔ اس کے بعد یہودیوں کے اجبار و رہبان نے ان کتابوں کو از سرنو مرتب کرنا شروع کیا اور ان انتالیس کتابوں کے سلسلہ کو مکمل کیا جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ لیکن جب سلسلہ میں رومی گورنر ٹائٹس نے بیت المقدس کو تباہ کیا تو پھر یہودی اس میں آکر آباد نہ ہو سکے۔ ٹائٹس ان مقدس صحیفوں کو ہیکل سے نکال کر فتح کی یادگار کے طور پر روما کے محلات میں لے گیا۔ یہودیوں کی مرکزیت فنا ہو چکی تھی، ان کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ مختلف مقامات پر ان کے علمائے انفرادی طور پر پھر ان کتابوں کو مدون کیا۔ یہودیوں کی اپنی زبان قدیم عبرانی تھی۔ لیکن بابل سے مراجعت کے بعد ان کی زبان آرامی ہو گئی۔ عذرافقیہہ نے عہد عتیق کی کتابوں کس زبان میں لکھا تھا، یہ بالتحقیق معلوم نہیں۔ اس لئے کہ ان کی مرتب کردہ کتابوں کا بھی دنیا میں کہیں وجود نہیں۔ لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کو یا تو یہودیوں کی اصل زبان عبرانی قدیم میں لکھا ہوگا یا پھر بعد کی زبان (ارامی)

۱۔ اس کے مرتب کرنے کی داستان بڑی دلچسپ۔ اسے میری کتاب — مذاہب عالم کی مبینہ آسمانی کتابیں — میں دیکھئے۔

۲۔ یہودیوں کے ہاں ہیکل کے ایک منصبدار کو بھی نبی کہہ کر پکارتے تھے جس کا منصب پیش گوئیاں کرنا ہوتا تھا۔ یا لوگوں کو ان کی قسمت بتانا۔

میں۔ لیکن دنیا جی کتابوں سے روشناس ہوئی وہ سب کی سب یونانی زبان میں تھیں۔ اور انہیں سے پھر ان کا ترجمہ عبرانی زبان میں ہوا۔ ان عبرانی نسخوں میں سجد اختلافات ہیں۔ گیارہویں صدی عیسوی میں ان کے تقابل سے ایک متفق علیہ نسخہ مرتب کیا گیا جو اب تک مروج ہے۔ اس نسخہ میں مذکورہ صدر اختلافات کو حاشیہ پر لکھ دیا گیا۔ ان کا پہلا ایڈیشن ۱۳۸۸ء میں چھپا لیکن جب ۱۹۵۷ء میں دوسرے ایڈیشن کا انتظام کیا گیا تو پہلے ایڈیشن کے نسخے سے بارہ ہزار جگہ اختلاف کٹا پڑا۔ دوسرے ایڈیشن کا یہی نسخہ اب عام طور پر رائج ہے۔

یہ ہے اس کتاب (یا مجموعہ کتب) کی تاریخی حیثیت، جسے یہودی اپنے انبیاء کی کتابیں کہہ کر، ان پر اپنے مذہب کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ان تاریخی شواہد کے علاوہ، اگر عمدہ عیسائی کی ان کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کا ایک ایک ورق پکار پکار کر کہہ دے گا کہ یہ کسی صورت میں بھی خدایا انبیائے کرام کی طرف منسوب کی جانے کے قابل نہیں۔

وحی کی دو قسمیں | جہاں تک تلبیس جن و باطل کا تعلق ہے، یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وحی کی دراصل دو اقسام تھیں۔ ایک تورہ شب کتب یعنی وحی مکتوب

(یا وحی منلو) اور دوسری تورہ شب علفہ۔ یعنی وحی غیر مکتوب (یا وحی غیر منلو)۔ یہ وحی غیر مکتوب حضرت ہارون علیہ السلام اور ان کی اولاد کی وساطت سے سلسلہ روایات آگے بڑھتی گئی۔ دوسری صدی عیسوی کے آخر تک ان روایات کا ایک طومار اکٹھا ہو گیا تھا جسے ربی یہودہ نے ایک جگہ جمع کیا۔ اس مجموعہ کا نام مشنا ہے پھر اس مجموعہ کی تشریحات و تفصیلات کیجا کی گئیں۔ اس کا نام جمارا ہے۔ ان دونوں کے مجموعہ کو تالمود کہتے ہیں تالمود بھی یہودیوں کے ہاں تورات کی سی اہمیت رکھتا ہے بلکہ تورات سے بھی زیادہ۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ مجموعہ، تورات کی تفسیر ہے اور وحی کا ہم پایہ (مثلاً معہ)۔

یہ تو تھا سلسلہ روایات۔ اس کے علاوہ ایک اور ذخیرہ بھی تھا جو اس سے زیادہ پرپیچ اور مخفی راستوں سے جمع کیا گیا تھا۔ عذرا فقیہہ کے متعلق مشہور تھا کہ جب انہوں نے تورات کی پانچ کتابوں کو مرتب کیا تو اس کے ساتھ ستر مخفی ملفوظات بھی مدون کئے تھے جو باطنی علم پر مبنی تھے اور ان کی تعلیم پوشیدہ طور پر خواص تک محدود تھی۔ عذرا فقیہہ کا اپنا بیان ہے کہ ان دو سو چار کتابوں کے متعلق جو اس نے مرتب کی تھیں، اس بلند و بالا ہستی کا ارشاد ہوا کہ:-

ان کے پہلے حصہ کو عام طور پر مشائخ کرد و تاکہ اہل اور نا اہل سب انہیں پڑھ سکیں۔ لیکن دوسرے حصہ کی ستر کتابوں کو مخفی رکھو اور صرف انہیں کو دو جو لوگوں میں سمجھ بوجھ کے مالک ہوں۔ کیونکہ یہی

لوگ ہیں جن میں فہم و وسراست کا چشمہ عقل کا منبع اور علم کا دریا ہے۔ (عزرا حوالہ ص ۲۲۶ پر دیکھئے)
 یہ تھی یہودیوں کے ہاں (مبینہ) آسمانی راہنمائی کی حالت، جس کے پیش نظر ان سے کہا گیا تھا کہ اگر وہ حیاتِ نو
 کے متمنی ہیں تو انہیں چاہئے کہ وہ خدا کی اس آخری کتاب (قرآن عظیم) اور خدا کے اس آخری رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)
 پر ایمان لائیں۔

ضمناً، قرآن کریم کے متعلق متعدد مقامات پر کہا گیا ہے: مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ (۲)۔ اس کا ترجمہ کیا
 جاتا ہے "یہ قرآن تصدیق کرتا ہے ان کتابوں کی جو اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کے پاس ہیں"
مُصَدِّق کے معنی | آپ سوچئے کہ یہود و نصاریٰ کی جن کتابوں کی کیفیت وہ تھی جو اوپر بیان کی گئی ہے اور

جن کے متعلق خود قرآن کریم نے بار بار کہا ہے کہ وہ محض تھیں، کیا قرآن کریم ان کتابوں کے سچا ہونے کی تصدیق کریگا؟
 لفظ "مُصَدِّق" کے معنی تصدیق کرنے والا نہیں۔ اس کے معنی ہیں سچ کر دکھانے والا۔ یہود و نصاریٰ کی آسمانی کتابوں
 میں (جس شکل میں بھی وہ نازلِ قرآن کے وقت موجود تھیں) بہت سے قرآنی دعاوی کا ذکر تھا۔ مثلاً یہ کہ خدا کی حکومت
 زمین پر اسی طرح قائم ہوگی جس طرح اس کی حکومت آسمان پر قائم ہے۔ دینِ خداوندی کا غلبہ ہوگا، حق کی فتح
 ہوگی، باطل شکست کھا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ایک آنے والا آئے گا اور وہ ایسا کر کے دکھائے
 گا۔ اُن سے کہا گیا کہ جس آنے والے کا تمہیں انتظار تھا، وہ آگیا اور اپنے ساتھ وہ کتاب لایا ہے جو خدا کے ان وعدوں
 کو عملاً سچ کر دکھائے گی جن کا ذکر تمہاری کتابوں میں آیا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت (۹) کو دیکھئے جس میں کہا گیا ہے
 کہ خدا نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ جو لوگ اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیں گے انہیں خدا جنت عطا کر دے گا۔ اور
 اس کے بعد ہے: وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ (۹)۔ "یہ وہ خدا کا سچا وعدہ ہے
 جو اس نے توراۃ میں بھی کیا تھا، انجیل میں بھی، اور اب اسی کو قرآن میں دہرا رہا ہے"۔ اس قسم کے تھے خدا کے وہ

لے جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ان تمام امور کی تفصیل، حوالے، سندیں اور شواہد، میری کتاب — مذاہبِ عالم
 کی مبینہ آسمانی کتابیں — میں ملے گی۔ وہیں سے یہ حقیقت بھی سامنے آئے گی کہ پھر یہودیوں کے یہ تمام عقائد اور مسالک کس طرح
 رفتہ رفتہ خود ہمارے ہاں بھی در آئے اور وضعی روایات، تفاسیر اور صوفیائے مکاشفہ کے ذریعے (مردِ جبہ مذاہبِ اسلام کی
 بنیادیں بن گئے۔ ہمارے ہاں بھی وحی کی یہی دو قسمیں مانی جاتی ہیں۔

لے انجیل کے متعلق ہم آگے چل کر اس کے مقام پر، اسی تفصیل سے لکھیں گے جس تفصیل سے تورات کے متعلق لکھا گیا ہے۔

وعدے جنہیں خدا کے اس رسولؐ نے سچ کر دکھایا تھا۔ واضح رہے کہ قرآن کریم جہاں نظری طور پر کہتا ہے کہ اس تعلیم پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا، وہاں وہ طریق بھی بتاتا ہے جس پر عمل کر کے وہ نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اس طریق کا نام دین کا نظام یا الاسلام ہے۔ مذہب میں نظری تعلیم تو سچی کبھی کسی نہ کسی حالت میں باقی رہ جاتی ہے لیکن وہ عملی طریق نگاہوں سے یکسر اوجھل ہو جاتا ہے جس کی رو سے ان نظری مواعید نے محسوس نتائج کی شکل اختیار کرنی تھی۔ مذہب میں اس نظری تعلیم کے الفاظ کو دہرائینے یا رسمی طور پر پیش کش کے طور طریقے ادا کر لینے کا نام اطاعتِ خداوندی سمجھ لیا جاتا ہے۔ باقی ہے اس کے نتائج، تو اس کے متعلق یہ کہہ کر اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دلایا جاتا ہے کہ یہ (نتائج) اگلی دنیا میں جا کر مرتب ہوں گے۔ اس دنیا میں نہیں۔ دین کے نظام میں یہ نتائج اس دنیا میں بھی سامنے آجاتے ہیں اور آخرت میں بھی۔ قرآن کو جب مواعیدِ خداوندی کا مصدق کہا گیا ہے تو اس سے یہ مفہوم ہے کہ اس میں وہ طریق بھی بتایا گیا ہے جس کے مطابق عمل کرنے سے خدا کے یہ وعدے اس دنیا میں سچے ثابت ہو کر سامنے آجائیں گے۔

وَلَا تَكُونُوا أَقِلَّ كَافِرِيہ (۲)

آیت کے اس ٹکڑے میں ایک اور عظیم حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ جب بھی کوئی رسول آیا تو عام طور پر اس کے مخاطب دو گروہ تھے۔ ایک وہ جو کسی پہلے نبی کے پیرو ہونے کے مدعی نہیں تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو خدا، وحی اور آخرت تک کے منکر تھے۔ دوسرا گروہ وہ تھا جنہیں مذہب پرست کہا جاتا ہے۔ وہ کسی سابقہ رسول کے قبیح ہونے کے دعویدار تھے اور (بزرگم خویش) خدا، رسول، کتاب اور آخرت کے قائل اور شریعتِ خداوندی کے ماننے والے۔ چاہتے یہ تھا کہ یہ گروہ اس نئے رسولؐ کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہتا کیونکہ وہ انہی صداقتوں کی طرف دعوت دیتا تھا جنہیں یہ خود تسلیم کرتے تھے۔ وہ ان میں اصلاح ہی چاہتا تھا۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ مذہب پرست طبقہ داعیانِ الی اللہ کی مخالفت میں پیش پیش ہوتا تھا اور سب سے زیادہ متشدد۔ اس حد تک کہ ان میں سے بہت کم ایسے افراد نکلتے جو اس رسولؐ کی دعوت کو قبول کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہب کا مدار

مذہب پرست طبقہ کی طوطی دین کی مخالفت

شخصیت پرستی پر ہوتا ہے اور حضراتِ انبیائے کرامؑ کی طرف سے پیش کردہ دین، خدائے واحد کی اطاعت کی دعوت دیتا ہے۔ شخصیت پرستی کا تقاضا ہوتا ہے کہ کسی بات کو علم و بصیرت یا دلیل و برہان کی رو سے پرکھنے کے بجائے دیکھا یہ جائے کہ وہ ان کے اسلاف کے اقوال یا مسلک کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر وہ اس کے خلاف ہو تو پھر آپ

سرٹھیجئے وہ اُسے کبھی ماننے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کے اسلاف پر زرد پڑتی ہے، اور اُسے وہ کسی صورت میں بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ اس مسلک کو حق و صداقت پر مبنی سمجھتے جس میں نام تو خدا کا ہو لیکن پرستش درحقیقت ان شخصیتوں کی ہو جنکی عقیدت ان کے قلب کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکی ہو۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو مختلف مقامات پر بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ وہ سورۃ الزمر میں کہتا ہے کہ ان لوگوں کی کیفیت یہ ہے: **وَإِذَا دُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْتَمَزَتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ - وَإِذَا دُكِرَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ (۳۹)**۔ ”جب ان کے سامنے ایک خدا (خدا کے واحد) کے احکام پیش کئے جاتے ہیں تو یہ بات ان پر سخت گراں گزرتی ہے۔ اس سے ان کا سینہ بھنچ جاتا ہے۔ وہ منہ بسور لیتے ہیں لیکن جب ماسوا اللہ (دوسری شخصیتوں) کی بات کی جاتی ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔“ قرآن، اس قسم کے ”خدا پر ایمان کو ایمان تسلیم نہیں کرتا۔ ایمان تو، توحیدِ خالص کا نام ہے۔ اگر اس میں کسی شخصیت کی ذرا سی بھی آمیزش ہو جائے تو وہ کفر ہو جاتا ہے، شرک قرار پا جاتا ہے۔ چنانچہ سورۃ المؤمن میں ہے: **ذَلِكُمْ بِأَنَّهُ إِذَا دُعِيَ اللَّهُ وَحْدَهُ كَفَرْتُمْ - وَإِنْ يُشْرِكْ بِهِ تُؤْمِنُوا - فَالْحُكْمُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ (۲۲)**۔ ”جب انہیں خدائے واحد کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو وہ اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ اُس سے کفر اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن جب خدا کے ساتھ اوروں کو بھی ملا دیا جائے تو وہ پھر ایمان لے آتے ہیں۔ ان سے کہو کہ یہ خدا پر ایمان نہیں۔ ایمان یہ ہے کہ خدا

قرآن خالص کی اطاعت

کے اقتدار کو مطلق تسلیم کیا جاتے اور اس حقیقت پر یقین رکھا جائے کہ خلی حکومت صرف اسی کو حاصل ہے۔ اطاعت صرف اسی کے احکام کی کی جا سکتی ہے؛ سورۃ بنی اسرائیل میں اسے اور بھی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ پہلے کہا کہ: **وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ حِجَابًا مَّشْهُودًا (۱۷)**۔ ”جب تو ان کے سامنے قرآن پیش کرتا ہے تو یہ لوگ، جو دعویٰ ایمان کے باوجود، خدا کے قوانین مکافاتِ عمل اور حیاتِ آخرت کے منکر ہیں، ان کے اور تمہارے درمیان ایک ایسا پردہ لاحق ہو جاتا ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، آنکھوں سے دیکھا نہیں جا سکتا؛ اس غیر مرئی اور غیر محسوس پردہ سے ہوتا کیا ہے **وَجَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ - وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا - وَإِذَا دُكِرَ رَبُّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَوْ أَعْلَى أَدْبَارِهِمْ نُفُورًا (۱۷)**۔ ”ان کے دلوں پر خول چڑھ جاتے ہیں جس سے ان کے سمجھنے، سوچنے کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے۔ ان کے کانوں میں ڈاٹ لگ جاتے ہیں جس سے صداقت

کی آوازوں کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ تو ان کے سامنے خدائے واحد کا ذکر کرتا ہے۔ ان کی پرستیدہ شخصیتوں کو ساتھ نہیں ملاتا۔ اس سے ان کے دلوں میں نفرت کے طوفان اُٹھ اُٹھتے ہیں اور یہ منہ موڑ کر چل دیتے ہیں۔ جسے لوگ ”شریعتِ خداوندی“ کہہ کر پکارتے ہیں وہ خدائے واحد کے احکام پر مشتمل نہیں ہوتی۔ یہ ان کے اسلاف کی وضع کردہ شریعت ہوتی ہے جسے یہ خدا کا شریک ٹھہرا دیتے ہیں۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے: **اَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللّٰهُ** (۲۶) ”خدا کے شریک وہ ہیں جو ان کے لئے اس قسم کی شریعت وضع کر دیتے ہیں جس کا حکم خدا نے نہیں دیا ہوتا“ یہی ہے وہ شریعت جسے ان کے علماء و مشائخ (اجبار و رہبان) شریعتِ خداوندی کہہ کر پیش کرتے اور ان سے اس کی اطاعت کراتے ہیں۔ قرآن کریم نے انہی کو خدا کے شریک قرار دیا ہے جب کہا ہے **اتَّخَذُوا اٰجَارَهُمْ وِرْثًا لَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ** (۹) ”یہ اپنے اجبار و رہبان کو خدا کا شریک بنا دیتے ہیں“

ہم نے جو ادھر کہا ہے کہ دینِ خداوندی کی سب سے شدید مخالفت، مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوتی تھی، اس کی شہادت قرآن کریم کے ادراک سے بین طور پر ملتی ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خدائے واحد کی طرف دعوت دی تو آپ کے سامنے ایک تو قریش مکہ تھے۔ یہ لوگ کسی سابقہ نبی کے پیرو ہونے کے مدعی نہیں تھے۔ ان میں بت پرستی، اوہام پرستی، رسوم پرستی عام تھی لیکن اصطلاحی طور پر یہ کسی مذہب کے پیرو نہیں تھے۔ دوسرا گروہ وہ تھا جسے قرآن کریم اہل کتاب کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ وہ گروہ تھا جسے ہم اصطلاحی طور پر مذہب پرست کہہ سکتے ہیں۔ ان میں یہودی اس مخالفت میں پیش پیش تھے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن کریم کے معتد بہ حصہ میں انہی اہل کتاب کی مخالفتوں، دیسہ کاریوں، فریب انگیزیوں، پنہاں سازشوں اور کھلی ہوتی بغاوتوں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور جماعتِ نو مبین کے ساتھ ان سب کا ٹکراؤ مسلسل رہا لیکن آخر الامر ہم دیکھتے ہیں کہ لا مذہب قریش یا دیگر اسی قسم کے عرب قبائل نے تو اسلام قبول کر لیا لیکن ان اہل کتاب میں سے بہت کم مسلمان ہوئے۔ ان (یہودیوں) کو پہلے مدینہ سے نکالنا پڑا اور اس کے بعد ملک بدر کرنا پڑا۔ وہ کہتے تھے کہ ہمارے پاس تو رات ہے جو ان انبیاء کی تعلیم پر مشتمل ہے جو خدا کی طرف سے مبعوث ہوئے تھے۔ اس کے جواب میں ان سے کہا جاتا کہ تمہاری ان موجودہ کتابوں کی نسبت تو بیشک ان انبیاء کی طرف ہے لیکن ان کے مندرجات خدائے واحد کی وحیِ خالص پر مشتمل نہیں۔ ان میں بہت کچھ انسانوں کا خود ساختہ شامل ہو چکا ہے۔ اسی کو تلبیسِ حق و باطل کہا جاتا ہے۔ دیکھتے اس حقیقت کو قرآن کیسے بلیغ انداز میں بیان

کہتا ہے جب کہتا ہے: اِنَّا اَنْزَلْنَاهُ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَّحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا
لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْاَحْبَابُ بِمَا اسْتَحْفِظُوْا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ۔ وَكَانُوْا عَلَیْهِ شُهَدَآءُ فَلَا تَخْشَوْنَ
النَّاسَ وَاخْشَوْنِیْ وَلَا تَشْتَرُوْا بِآیَاتِیْ ثَمَنًا قَلِيْلًا۔ وَمَنْ لَّمْ یَحْكَمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ (۲۴۱)۔
یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے تورات نازل کی۔ اس میں ہماری ہدایت اور روشنی موجود تھی جو انسانوں کو سیدھے راستے کی طرف
لے جاتی تھی۔ انبیاء اور ان کے بعد تمہارے بزرگوں میں سے وہ لوگ جن کے ذمہ اس تعلیم کی حفاظت کا فریضہ عائد کیا گیا
تھا، اس غلطی تعلیم کے سامنے تسلیمِ خم کر دیتے اور انہی کے مطابق تمہارے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرتے اور
ان فیصلوں کی نگرانی بھی کرتے۔ لیکن بعد میں آنے والوں نے اس میں خود اپنی طرف سے بہت کچھ ملا لیا۔ اس سے نہ وہ
تورات، تورات رہی نہ شریعت، شریعت خداوندی۔ تمہارے مذہبی پیشواؤں نے اسے اپنا کاروبار بنا لیا۔ تم اس
حقیقت کو سمجھتے بھی ہو کہ جو کچھ یہ پیش کرتے ہیں وہ صداقت پر مبنی نہیں لیکن تم پر ان کا خون اس قدر مسلط ہو چکا ہے کہ تم
ان کی مخالفت میں زبان پر کچھ نہیں لانا چاہتے۔ لیکن تمہاری یہ روش بالکل غلط ہے۔ ان کے فتوؤں سے مت ڈرو۔ دروغ
قوانین خداوندی کی خلاف ورزی کے تباہ کن عواقب سے۔ اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھو کہ اس قسم کی غلط شریعت کا نام خدا پر ایمان
نہیں۔ خدا پر ایمان صرف اس کا ہے جو تمام امور کے فیصلے منزل من اللہ کتاب کے مطابق کرتا ہے۔ جو لوگ بھی ایسا نہیں
کرتے وہ کافر ہیں، خواہ وہ زبان سے اپنے آپ کو مومن ہی کیوں نہ کہیں۔ اسی قسم کے ہیں وہ ”مومن“ جن کے متعلق کہا
کہ وہ ایمان کے مدعی ہونے کے باوجود مشرک کے مشرک رہتے ہیں۔ وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَھُمْ
مُشْرِکُوْنَ (۲۴۲)۔ ایمان یہ ہے کہ ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی کے مطابق کیا جائے۔ اگر اس وحی
کے ساتھ کسی قسم کی بھی آمیزش کر دی جائے تو وہ شرک ہو جاتا ہے، ایمان نہیں رہتا۔ مذہب میں (خواہ اس کا کوئی نام
بھی کیوں نہ ہو) اسی قسم کا شرک کا رُسرا رہتا ہے۔ خدائے واحد پر ایمان نہیں رہتا۔

مذہب پرست طبقہ، مذہب کو چھوڑ کر دین کی طرف اس لئے نہیں آتا
جنت آسانی سے مل جاتی ہے | کہ مذہب میں جنت بڑی آسانی سے مل جاتی ہے اور دین میں ضبط و انضام

صبر آزما مراحل سے گزرنا اور خارجی قوتوں کے ہمت شکن تصادمات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ مذہب اپنے پیروں کو اس فریب
میں مبتلا رکھتا ہے کہ تم خدا کی چیمپی قوم ہو۔ وہ تمہیں کبھی جہنم میں نہیں جلائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب
اہل کتاب، یہود و نصاریٰ کا یہی عقیدہ تھا کہ نَحْنُ اَبْنَاءُ اللّٰهِ وَاجْبَآؤُہُ (۲۴۳)۔ ہم خدا کی اولاد اور اس کے محبوب
بندے ہیں۔ وہ ہر مذہب پرست کی طرح اس خوش فہمی میں مگن تھے کہ وہ خالقوں کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ اِلَّا مَنْ كَانَ

هُودًا اَوْ نَصَارًا (۲۶)۔ ”جنت میں صرف یہودی اور عیسائی جائیں گے دوسروں پر اس کے دروازے بند ہوں گے۔“ (ضمناً) ان کے اس دعویٰ کا جواب بھی سنتے چلیے جو خدا کی طرف سے ملا کہ: تِلْكَ اَمَانِيْتُهُمْ۔ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ (۲۷)۔ ”اے رسول! ان سے کہہ دو کہ یہ محض تمہاری خوش فہمی ہے۔ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو تو اس کی تائید میں کوئی دلیل پیش کرو۔“ اور اس کے بعد پوری تحدی سے اعلان کر دیا کہ اس قسم کی خوش فہمیاں سب باطل ہیں۔ فریب عقیدت ہیں۔ بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ اَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲۸)۔ ”حقیقت وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا جو انسان بھی خلوص قلب سے احکام خداوندی کے سامنے جھک جاتے اور حسن کارنامہ انداز سے زندگی بسر کرے تو خدا کے ہاں سے اسے اس کا صلہ ملے گا۔ اور وہ صلہ یہ ہو گا کہ ایسے لوگ خوف اور حزن سے مامون ہو جائیں گے۔“ ان سے کہا کہ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ جنت میں صرف یہودی اور نصاریٰ ہی جاسکیں گے تو ابراہیم، اسمعیل، اسیٰ، یعقوب (علیہم السلام) اور ان کے وابستگان کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ تو نہ یہودی تھے نہ نصاریٰ۔ تمہارے اصول کے مطابق تو وہ بھی جنت میں نہیں جاسکیں گے (نیز دیکھئے ۲۹)۔

قرآن کریم نے اس ضمن میں ایک اور بھی دلچسپ بات کہی ہے۔ یہودی اور عیسائی، دونوں اس باہمی فرقہ بندی کے مدعی تھے کہ وہی جنت میں جائیں گے کوئی دوسرا نہیں جاسکے گا۔ لیکن ان کی باہمی مخالفت کی کیفیت یہ تھی کہ: وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ (۳۰)۔ ”یہودی کہتے ہیں کہ عیسائی حق و صداقت پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودی حق و صداقت پر نہیں۔ اور تمہارے یہ دونوں اپنے اپنے دعاوی کی تائید میں وہ کتاب پیش کرتے ہیں جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کی کتاب ہے۔“ اور اس کے بعد قرآن کریم نے یہ کہا کہ: كَذٰلِكَ قَالَ الْبٰزِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ (۳۱)۔ ”یہ بات یہود و نصاریٰ تک ہی محدود نہیں۔ دنیا کا ہر مذہب پرست یہی کہتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک ہی مذہب کے مختلف فرقے ایک دوسرے کے خلاف یہی کچھ کہتے رہتے ہیں اور ہر فرقہ یہی دعویٰ کرتا ہے کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں وحی خداوندی پر مبنی ہے۔“

یعنی ہر مذہب پرست پہلے تو یہ کہتا ہے کہ ہمارا مذہب سچا ہے باقی سب مذاہب جھوٹے ہیں۔ اسی لئے جنت میں ہم ہی جائیں گے۔ دیگر مذاہب نہیں جاسکیں گے۔ اور اس کے بعد پھر خود اپنے مذہب کے پیروں کے متعلق کہتا ہے کہ جنت میں صرف ہمارا فرقہ جائے گا۔ دوسرے فرقوں کے متبعین اس میں — نہیں جاسکیں گے — مذہب کہیں بھی ہو۔ اس کی خصوصیات ہر جگہ یکساں ہوتی ہیں۔

کے تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ آواز بلند نہ ہونے پائے۔ اسے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ یہی تھی اہل کتاب کی وہ روش جس کے سلسلہ میں ان سے کہا گیا تھا کہ: قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصَدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَنۢ مِّنۡ أَمَنۡ تَبْغُونَهَا عِوَجًا - وَأَنۡتُمْ شُهَدَآءُ - وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۲۴۸)۔
 ”اے رسول! ان سے کہہ دو کہ جو لوگ خدا کے دین کو قبول کرنا چاہتے ہیں، تم ان کا راستہ روک کر تو کھڑے نہ ہو جاؤ۔ تم چاہتے یہ ہو کہ یہ لوگ بھی تمہاری طرح ٹیڑھے راستے اختیار کر لیں۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ سیدھا راستہ وہی ہے جس پر یہ لوگ چلنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھو! خدا کا قانون مکافاتِ عمل تمہاری ہر حرکت سے واقف ہے اور تمہیں اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔“

مذہبی پیشوائیت ایسا کیوں کرتی ہے، اس کا جواب قرآن کریم نے (آیت ۲۴۸ کے) اگلے ٹکڑے میں دیدیا ہے جہاں کہا ہے:
 وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا (۲۴۹)
 ”تم دین کو کاروبار نہ بناؤ۔ اس سے دنیا مت کماؤ۔“

آپ قرآن کریم کو شہدِ دع سے آخر تک دیکھ جائیے۔ ہر رسول کی دعوت یہ ہوتی تھی کہ: يُقْوِمُوا عِبَادَ اللَّهِ (۱۵۸)۔ ”اے لوگو! خدا کی محکومیت اختیار کرو۔“ اور اسی سانس میں وہ یہ بھی اعلان کر دیتے تھے کہ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْدًا (۱۵۹)۔ ”میں اس کے لئے تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔“ آپ سوچئے کہ یہ کتنی اہم بات ہوگی جسے ہر رسول اپنی دعوت کے ساتھ دہراتا تھا۔ بات ہے ہی بڑی اہم۔ جب دین کو ذریعہٴ معاش بنا لیا جائے تو پھر وہ دین رہتا ہی نہیں، مذہب بن جاتا ہے۔ اور یہی وہ چیز تھی جس سے یہودیوں کو اس طرح روکا گیا تھا۔ یہ دین فروشی، مذہب کے پیشوا (علماء مشائخ) اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی کہ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لِيَآكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِلَا بَأْسٍ ط. وَيَصَدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (۲۴۶)۔ ”اے جماعتِ مومنین! اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا کہ اکثر علماء و مشائخ عوام کے مال و دولت کو باطل طور پر کھا جاتے ہیں اور اپنی اسی کمائی کی خاطر وہ لوگوں کو خدا کے راستہ کی طرف نہیں آنے دیتے۔ ان کی راہ میں روک

(تفسیر حاشیہ صفحہ ۱۹۳)۔ (قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق) اتنا ہی کہتا ہوں کہ دین میں غلو نہ کیجئے۔ خدا کو خدا، اس کے رسول کو رسول اور علماء و فقہاء کو عالم اور قہیدہ ہی سمجھئے۔ انہیں اپنے مقام سے آگے نہ بڑھائیے۔ لیکن مذہب پرست طبقہ کے نزدیک ایسا کہنا کفر ہے۔ قرآن کریم نے سچ کہا تھا کہ مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہمیشہ ایک سارے عمل ہوگا خواہ وہ کوئی مذہب ہو۔

بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں، دین فروشوں کے اس کاروبار کے متعلق، مطالب الفرقان — جلد اول میں وضاحت سے لکھا جا چکا ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لیجئے۔ (ملاحظہ ہو جلد اول صفحہ ۲۵۷-۲۵۶)۔ وہیں سے یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ ”ہماری آیات کو ”ثمن قلیل“ کے عوض رت بیچو“ تو اس کا مفہوم کیا ہے۔ جیسا کہ وہاں بتایا جا چکا ہے، اس سے یہ کہنا مقصود نہیں کہ دین کے عوض تھوڑے پیسے نہ لیا کرو: زیادہ لیا کرو۔ (جب حرام ہی کھانا ہے تو پیٹ بھر کر کیوں نہ کھایا جائے!) ہم نے وہاں بتایا ہے کہ جب مستقل اقدار خداوندی اور بنیادی منفعت میں ٹکراؤ ہو تو اس مستقل قدر کے مقابلہ میں دنیا کی بڑی سے بڑی متاع بھی جنس کا سد اور متاع قلیل و حقیر قرار پا جاتی ہے۔ قرآن کہنا ہی یہ چاہتا ہے کہ متاع دنیا بیشک حاصل کرو لیکن دین کو بیچ کر نہیں۔ اور یہ چیز اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ :-

وَإِيَّايَ فَاتَّقَوْنَ (۲/۲۲)

”انسان صرف قوانین خداوندی کا اتباع کرے۔ ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے بچے“ یہی وہ احتیاط ہے جس سے انسان دین فروشوں سے بچ سکتا ہے۔

چونکہ دین فروشوں کے متباس حق و باطل اور کتمان حقیقت ہی سے ممکن ہوتی ہے۔ اس لئے اگلی آیت میں ان سے کہا کہ :-

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔

”حق اور باطل کو آپس میں گڈ مڈ نہ کرو، نہ ہی حقائق کو چھپاؤ۔“ اگرچہ حق اور باطل کا عام مفہوم واضح ہے اور اس کے ایک گوشہ کو، جو تخلیق کائنات سے متعلق ہے، آیت (۲/۲۲) کے ذیل میں گواہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن چونکہ دین کا سارا دار و مدار حق کو تسلیم کرنے اور باطل کو مسترد کر دینے پر ہے اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کی ان دو بنیادی اصطلاحات کو اور وضاحت سے بیان کر دیا جائے۔

حق کے معانی | عربی زبان میں ”حَقٌّ“ ایک وسیع المعانی لفظ ہے۔ اس کے بنیادی اور اہم مفہام حسب ذیل ہیں۔ (۱) کسی شے کا ٹھوس واقعہ یا ایسی حقیقت بن کر سامنے آ جانا جس سے کسی کو مجال انکار

نہ ہو۔ یعنی اس کا محکم طور پر ثابت ہو جانا۔ (۲) ایسا ٹھوس تعمیری واقعہ جو اپنی جگہ پر ثابت اور محکم ہو، امٹ اور غیر متبدل

ہو۔ جو اپنی جگہ پر قائم رہے اور کسی کے بدلنے سے بدل نہ سکے۔ (۳) جو اپنی جگہ پر قائم رہے لیکن جو چیز اس کے دائرہ کے اندر کار فرما ہو وہ زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرتی چلی جائے۔ اسے ایک مثال کے ذریعے سمجھئے۔ آج کل تو دروازوں میں قبضے لگے ہوئے ہیں پھر لانے زمانہ میں دروازوں کے اوپر پیچھے لگی کی طرح لکڑی ہوتی تھی جو (SOCKET) میں بالکل فٹ ہو جاتی تھی۔ (SOCKET) تو اپنی جگہ پر قائم رہتی تھی لیکن یہ لگی اس کے اندر اس طرح گھومتی رہتی تھی کہ دروازہ حسب ضرورت بند بھی کیا جاسکتا تھا اور کھولا بھی۔ ”حق“ کی یہ خصوصیت اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتی ہے جس کی مزید تشریح چند سطور آگے جا کر سامنے آئے گی۔

یہ ہے ”حق“ اور جوشے یا نظریہ اس کے خلاف ہو اسے باطل کہا جائے گا۔ لہذا باطل کے معنے ہوئے جو حقیقت میں واقع نہ ہو اور اسے محض عقیدۂ مان لیا جائے جس کا یا تو کوئی نتیجہ مرتب نہ ہو اور یا اس سے تخریبی نتائج پیدا ہوں۔ جو محو ہو جانے والا ہو۔ جو ہواؤں کے رخ کے ساتھ اپنا بھی رخ بدلتا رہے۔ یا اس طرح جامد ہو کر انسانی زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکے۔

اب دیکھئے قرآن کریم میں یہ لفظ یا اصطلاح کن معانی میں آئی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے آپ کو الحق کہا ہے۔ سورۃ المؤمن میں ہے: فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ (۲۳/۱۱۶) ”بلند و بالا، بر قسم کے غلبہ و تسلط اور اقتدار مطلق کا مالک — الحق“

جو کچھ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے (یعنی وحی خداوندی) اسے بھی الحق کہا گیا ہے۔ سورۃ الرعد میں ہے: وَالَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنَ رَبِّكَ الْحَقُّ (۲۴/۱۳) ”جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تیری طرف نازل کیا گیا ہے وہ الحق ہے۔“ (نیز دیکھئے ۲۴/۳۵)۔ سورۃ البقرہ میں ہے: نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ (۲/۱۶) ”اللہ نے اس کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے“ بعض مقامات پر اسے صریحاً کہہ کر پکارا گیا ہے، جیسے لَقَدْ جَاءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ (۲۴/۱۶) ”نیرے رب کی طرف سے تیری طرف الحق آگیا“ (نیز دیکھئے ۲۴/۱۶)۔ سورۃ الکہف میں ہے: وَقِيلَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ (۱۸/۱۸) ”ان سے کہہ دو کہ الحق تمہارے رب کی طرف سے آگیا ہے سو جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرے۔ اور جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے“

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا گیا کہ: إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ (۲/۱۱۶) ”ہم نے تجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے“ اسی کو متعدد مقامات پر ”دین الحق“ بھی کہا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ التوبہ میں ہے: هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ. وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (۹/۳۳)۔

”خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطہ ہدایت، یعنی دین الحق کے ساتھ بھیجا تاکہ یہ نظام انسانوں کے خود ساختہ تمام نظاموں پر غالب آجائے۔ خواہ یہ بات ان لوگوں پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے جو خالص قوانین خداوندی کے تابع زندگی بسر نہیں کرنا چاہتے“ (نیز دیکھئے ۲۸ ذ ۶۱)

انسانی اعمال نامہ کے متعلق بھی یہ کہا کہ: وَلَدَيْنَا كِتَابٌ يَنْتَظِقُ بِالْحَقِّ (۲۳)۔ ”ہمارے پاس ایسی کتاب ہے جو ہر بات حق کے مطابق کہتی ہے“

سورۃ النجم میں، حق کے مقابلہ میں ظن کا لفظ لاکر بتایا گیا ہے کہ کوئی ظنی عقیدہ یا نظریہ دین الحق نہیں ہو سکتا۔ آیت کے الفاظ ہیں: وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ - اِنْ يَتَّبِعُونَ اِلَّا الظَّنَّ - وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي عَنْهُ الْحَقُّ شَيْئًا (۵۳)۔ ”ان لوگوں کا عقیدہ، نظریہ یا مسلک علم پر مبنی نہیں ہوتا۔ یہ صرف ظن کا اتباع کرتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ حق کے مقابلہ میں ظن کچھ معنی نہیں رکھتا۔“ حق اور ظن کے اسی تقابل کے سلسلہ میں سورۃ الحج میں کہا: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِہٖ الْبَاطِلُ (۲۲)۔ ”یہ اس لئے کہ الحق صرف خدا کی ذات ہے اور

جسے یہ لوگ اس کے سوا پکارتے ہیں وہ باطل ہے“ (نیز دیکھئے ۳۱) انہی کے متعلق دوسری جگہ کہا: وَلَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوا بِاللّٰهِ - اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ (۲۹)۔ ”جو لوگ اللہ سے انکار کرتے ہیں اور باطل پر ایمان رکھتے ہیں وہ تباہ ہو جاتے ہیں“ دوسری جگہ کہا کہ ان کا کیا کر یا سب باطل ہو جاتا ہے۔ یعنی رائیگاں جاتا ہے (۱۱)۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قوانین خداوندی سب کے سب الحق ہیں اور جو کچھ بھی ان کے خلاف ہے وہ باطل ہے (جیسا کہ پہلے تفصیلاً لکھا جا چکا ہے) قوانین خداوندی میں، ایک تو قوانین فطرت داخل ہیں اور دوسرے وہ قوانین جن کا تعلق انسان کی انسانی زندگی سے ہے۔ ان دونوں میں تمیز کرنے کی غرض سے ثانی الذکر کو مستقل اقدار خداوندی بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ کائنات میں حق و باطل کی کش مکش جاری ہے۔ اس کے لئے کہیں

کہا کہ کَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ (۳۱)۔ ”اس طرح خدا حق و باطل میں ٹکراؤ پیدا کرتا رہتا ہے“ دوسری جگہ کہا کہ: بَلْ نَقْضُ فِتْنٰتِہٖ

بِالْحَقِّ عَلٰی الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُہٗ فَاِذَا هُوَ رَاقٍ (۲۱)۔ ”خدا باطل پر حق کی ضربیں لگاتا رہتا ہے۔ تاکہ حق، باطل کا مغز توڑ دیتا ہے اور اس طرح وہ محو ہو جاتا ہے“ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے: وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ - اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۱۸)۔ ”ان سے کہہ دو کہ الحق آگیا ہے۔ اور اس کے آنے سے باطل محو ہو گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ باطل، حق کے مقابلہ میں ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ اسے تو مٹ ہی جاتا ہے۔ دیر بھر حق کے آنے کی ہونٹ

ہے۔“تاریکی اس وقت تک تاریکی رہتی ہے جب تک روشنی نہیں آتی۔ روشنی کی پہلی کرن کے آنے سے تاریکی محو ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ تاریکی روشنی کے نہ ہونے کا نام تھا۔ جب روشنی رہے گی تاریکی آ نہیں سکے گی۔ قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَ مَا يُبَدِّلُ الْبَاطِلَ وَمَا يُعِيدُ (۳۹)۔“ ان سے کہہ دو کہ الحق آگیا ہے۔ باطل اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکے گا۔ وہ اس کے پہلے حملے ہی سے شکست کھا جائے گا۔ اور جب تک الحق موجود رہے گا، باطل پلٹ کر نہیں آ سکے گا۔“

یہ الحق، قرآن کریم کی شکل میں خدا کی طرف سے نازل کیا گیا اور چونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا تھا اس لئے اس کے متعلق کہہ دیا کہ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ۔ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَبِيبٍ (۴۰)۔“ باطل اس کی طرف نہ سامنے سے آ سکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ خدا کے حکیم و حمید کی طرف سے نازل شدہ ہے۔“

لیکن قرآن کریم میں الحق صرف الفاظ کی شکل میں موجود اور محفوظ ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسانی دنیا میں یہ ٹھوس حقیقت بن کر کس طرح سامنے آتا ہے؟ (اس وقت تو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم کے موجود اور محفوظ ہونے کے باوجود باطل کا دور دورہ ہے)۔ اس سوال کا تعلق مسئلہ خیر و شر سے ہے جس کے متعلق ہم مطالب الفرقان جلد اول (۲۵-۲۶ تا ۲۷-۲۸) میں لکھ چکے ہیں۔ نیز کشمکش ابلیس و آدم میں بھی جس کا تفصیلی ذکر سابقہ باب میں آ چکا ہے۔ یہاں اسے ہم، مختصر الفاظ میں دہرتے ہیں۔ پہلے قوانین فطرت کو لیجئے۔ یہ قوانین، تخلیق کائنات کے ساتھ ہی یہاں موجود تھے لیکن نظری حیثیت سے۔ جب تک انسان ان کا علم حاصل نہیں کر سکا، غلط (باطل) راستوں پر چلتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سخت

قوانین فطرت حق ہیں

نقصان اٹھاتا رہا۔ (مثلاً) اس نے سیلاب کے متعلق سمجھا کہ یہ ”اندر دیوتا“ کے غصہ میں آ جانے (گھبراہٹ) کا نتیجہ ہے۔ وہ سیلاب آ جانے پر ”اندر دیوتا“ کے بُت کے حضور چڑھاوے چڑھاتا رہا اور سیلاب اسے بدستور تباہ کرتے رہے۔ چیچک کے متعلق اس نے سمجھا کہ یہ ”کالی ماما“ کی ناراضگی سے پھوٹتی ہے تو وہ کالی ماما کے چرنوں میں اپنی شروہا کے پھول چڑھاتا رہا لیکن چیچک اسے اور اس کی اولاد کو موت کی بھینٹ چڑھاتی رہی۔ یہ باطل کا غلبہ تھا۔ لیکن جب اس نے صدیوں کی کاوشوں اور کامیابیوں کے بعد ان قوانین کو دریافت کر لیا جن کے مطابق سیلاب آتے اور چیچک پھوٹتی ہے۔ تو اس نے ان پر قابو پایا اور اس طرح حق، باطل پر غالب آ گیا۔

اور اب تو مرض اور شفا کے متعلق ایک اور نظریہ قائم ہوا ہے۔ وہ یہ کہ تھریسی جراثیم، ہوا۔ پانی۔ غذا۔ چھوٹ

کے ذریعے انسان کے جسم پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اس کی قوتِ مدافعت ان کا مقابلہ کرتی ہے۔ اگر وہ قوت زیادہ قوی ہے تو وہ ان جراثیم کو ہلاک کر دیتی ہے اور انسان کی صحت برقرار رہتی ہے۔ اگر قوتِ مدافعت کمزور ہے تو وہ جراثیم غلبہ آجاتے ہیں اور انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اس کی قوتِ مدافعت کو بڑھا دیا جائے تاکہ وہ ان جراثیم پر غالب آجائے۔ یہ بھی طبعی سطح پر حق و باطل کی کشمکش ہے۔ انسانی فکر نے اس نظریہ کا انکشاف بھی صدیوں کے تجربات کے بعد کیا ہے۔

یہی کیفیت اس حق اور باطل کی کشمکش کی ہے جو انسانی زندگی میں بھی کارفرما چلی آرہی ہے۔ انسانوں کے خود ساختہ تمدنی، معاشرتی، سیاسی، معاشی نظاموں نے، جو باطل پر مبنی تھے، اسے جس قدر نقصان پہنچایا ہے، تاثرِ عالم کے ادراک اس پر شاہد ہیں حتیٰ پٹنی نظام، خدا کی طرف سے ملتا رہا، لیکن باطل پرست انسانوں کی مفاد پرستیاں اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی رہیں۔ اسے قرآن کریم نے حق اور باطل کی کشمکش یا کفر اور ایمان کے مجادلہ سے تصویر کیا ہے۔ سورۃ الکہف میں ہے: وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ۔ وَيَجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ۔ وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَمَا أُنذِرُوا هُزُوًا (۱۸) ”ہم اپنے پیغامبروں کو بھیجتے رہے تاکہ وہ لوگوں کو بتائیں کہ حق کے مطابق زندگی بسر کرنے کے نتائج کس قدر خوشگوار ہوں گے اور باطل کی روش اختیار کرنے کے عواقب کس قدر تباہ کن ہوتے ہیں۔ لیکن وحی سے انکار کرنے والے مفاد پرست، باطل کے حجبے لیکر حق کے خلاف نبرد آزما ہو گئے تاکہ وہ حق کو غالب نہ آنے دیں۔ اسے کمزور کر دیں۔ ہمارے پیغامبران سے کہتے رہے کہ اس کا نتیجہ ان کے حق میں اچھا نہیں ہوگا لیکن وہ ان تنذیرات کی ہنسی اڑاتے رہے۔“ (نیز دیکھئے ۲۴)۔ اس سے ظاہر ہے کہ حق اور باطل کا یہ ٹکراؤ ان دو جماعتوں کے تصادم سے سامنے آتا تھا جن میں سے ایک حق کا علم بلند کرنے کے لئے اٹھتی تھی اور اس کے مقابلہ و دمری جماعت، باطل کے حربوں سے اس کا مقابلہ کرتی تھی۔ اس تصادم کی آخری آماجگاہ میدانِ جنگ ہوتا تھا۔ صد اول

جنگ کا مقصد

کی جماعتِ مومنین کے یہی وہ جنگ تھے جن کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ فَوَيْدُ اللَّهِ إِنَّ يَحْيَىٰ مَنَّ بَكَلَّتْهُمْ وَيَتَطَّعُ دَابِرَ الْكَافِرِينَ۔ لِيُحَقِّقَ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْجَاهِلُونَ (۱۸) خدا چاہتا تھا کہ اپنے قوانین کی رو سے حق کو ایک ٹھوس حقیقت کی شکل میں سامنے لے آئے اور اس سے انکار کرنے والوں کی جڑیں کاٹ کر رکھ دے۔ یہ تصادم اس لئے تھا کہ حق ثابت اور محکم ہو جائے اور باطل مٹ جائے، خواہ مجرموں پر یہ بات کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے۔“ اس سے ظاہر ہے کہ الحق بیشک قرآن کریم میں نظری طور پر موجود ہے۔ لیکن وہ عللاً

ایک ٹھوس حقیقت اسی صورت میں اختیار کر سکتا ہے، جب حق کی علمبردار جماعت باطل کے مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑی ہو۔ اس جماعت کے ہاتھوں، باطل شکست کھا جاتا ہے اور جب تک یہ جماعت موجود رہتی ہے، باطل پلٹ کر نہیں آسکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر یہ جماعت موجود نہ رہے تو پھر الحق پر مبنی قانون خداوندی سر جھکائے خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ ایسا سمجھنا غلط ہے۔ انسان اپنی عقل کے تجرباتی طریق سے ٹھوکریں کھاتا اور ہڈیاں تڑوتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس طرح صدیوں کی جانگسل منازل طے کرنے کے بعد حق تک پہنچ جاتا ہے۔ اس حقیقت کو ہم مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں واضح طور پر بیان کر چکے ہیں (دیکھئے صفحات ۱۱۶-۱۱۵)۔

یہ ہے وہ طریق جسے قرآن کریم نے سورۃ الرعد میں برجستہ مثالوں کی رو سے واضح کیا ہے۔ ارشاد ہے:-

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً - فَسَالَتْ اَوْدِيَةًۢ بِقَدَرِهَا - فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا - وَمِمَّا يُوقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حَلِيَّةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ - كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ - فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذٰبُ جُفَاءً - وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ - كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ (۱۳)۔

”کائنات میں حق و باطل کی کشمکش کا قانون کارفرما ہے اور اسی کشمکش سے کائنات اپنے ارتقائی منازل طے کرتی آگے بڑھتی جاتی ہے اسے مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ بادلوں سے مینہ برستا ہے تو ندی نلے اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہہ نکلتے ہیں۔ پانی کے بہاؤ سے زمین کا میل کچیل جھاگ بن کر سطح پر آ جاتا ہے تو سیلاب کی زد اسے بہا کر لیجاتی ہے اور زمین صاف ستھری رہ جاتی ہے۔

بایوں سمجھو کہ جب کسی دھات کو آگ میں تپایا جاتا ہے کہ اس سے زیورات یا دیگر ضروریات کی چیزیں بنائی جائیں تو اس کا کھوٹ جھاگ بن کر اُپر آ جاتا ہے اور خالص دھات نیچے رہ جاتی ہے۔ اس طرح کائنات میں خدا کے قانون کشمکش کے مطابق تعمیری قوتیں تخریبی قوتوں سے ٹکراتی رہتی ہیں، تو تخریبی قوتیں جھاگ کی طرح رائیگاں چلی جاتی ہیں اور جو کچھ نوع انسان کے لئے نفع بخش ہوتا ہے وہ باقی رہ جاتا ہے۔ یہ ہے خدا کا قانون محمود ثبات (۱۳۹)۔ اس طرح خدا مثالوں کے ذریعے بات واضح کر دیتا ہے۔“

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ عقل کے تجرباتی طریق کے بعد، وحی کی راہنمائی کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ ضرورت ہر آن رہتی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ ایک تو اس لئے کہ زندگی کے مسائل کسی دور میں ختم نہیں ہو جائیں گے۔ یہ آخری انسان تک سامنے

آتے رہیں گے۔ اور دوسرے اس لئے کہ حق کے نظام کو قائم رکھنے کے لئے اقدار خداوندی کی پابندی ضروری ہوگی۔ اس موضوع پر ہم جلد اول میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔ (دیکھئے صفحات ۲۶۶-۲۵۷)

یہ تھا وہ الحق، جس کے متعلق بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ نہ تو تم حق کو چھپاؤ اور نہ ہی تبلیس حق و باطل کرو۔ اس آیت (۲/۲۵۷) میں یہ کہا گیا ہے کہ ایسا نہ کرو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا کہ اس کے بعد تم کرو کیا؟ اس، کرنے، کے لئے اصولی طور پر آیت (۲/۲۵۷) میں کہا تھا کہ تم ستران مجید اور رسالت محمدیہ کی صداقت پر ایمان لاؤ۔ اس کے بعد ایک عملی پروگرام دیا گیا جس کی ابتداء یہ کہہ کر کی گئی کہ:-

۲ ۳۳

وَأَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاٰكِعِينَ۔

اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ، "تم صلوٰۃ قائم کرو۔ زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو" دیکھنے میں تو یہ اس پروگرام کی تین چھوٹی چھوٹی کڑیاں ہیں لیکن درحقیقت ان میں دین کے پورے کا پورا نظام سمٹ کر آگیا ہے۔ قرآن مجید میں اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے الفاظ متعدد مقامات پر اکٹھے آئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دو بنیادی ستون ہیں جن پر دین کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کے متعلق مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں بڑی شرح و بسط سے گفتگو کی جا چکی ہے۔ (ملاحظہ ہوں صفحات ۱۰۴-۹۷)۔ اس مقام پر یعنی آیت (۲/۲۵۷) میں، وَيَقِيْمُوْنَ الصَّلَاةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ کے الفاظ آئے تھے۔ ہم نے وہاں صلوٰۃ کے ساتھ انفاق کی بھی تشریح کر دی تھی اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ ان دونوں کا باہمی تعلق کیا ہے (ملاحظہ ہوں جلد اول کے صفحات ۱۰۴-۱۰۵) لیکن چونکہ زکوٰۃ کا لفظ یہاں پہلی دفعہ آیا ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس کا صحیح تصور واضح طور پر سامنے لے آیا جائے۔ کیونکہ "صلوٰۃ" کی طرح "زکوٰۃ" کا مروجہ مفہوم بھی قرآنی مقصود تک پہنچنے نہیں دیتا۔

ہم اس جلد کے پہلے باب میں نفس یا انسانی ذات کے سلسلہ میں یہ بتا چکے ہیں کہ مادہ زکوٰۃ کا مفہوم (ز.ک.و) کے معنی ہیں بڑھنا، پھولنا، پھلنا، نشوونما پانا۔ یہیں سے لفظ الزکوٰۃ ہے جس

کے بنیادی معنی ہیں نشوونما، بالیدگی، پھلنا پھولنا۔ اس جلد کے باب اول میں نظریہ ارتقاء کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اسے ایک بار پھر سامنے لائیے۔ اس کا ملخص یہ ہے کہ سطح ارض پر انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ انسانی ذات اس قدر نشوونما حاصل کرے کہ اس سے یہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل یا یوں کہیے کہ اگلی منزل، طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ لیکن زندگی کی

موجودہ منزل میں انسانی ذات کی نشوونما، انسانی جسم کے اندر رہتے ہوئے ہی ممکن ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ انسانی جسم کی بھی مناسب نشوونما ہوتی جائے۔ قرآن کریم نے ان تمام ذرائع، اسباب، سامان کے لئے، جس سے انسانی جسم اور اس کی ذات کی نشوونما ہوتی جائے، الزکوٰۃ کی جامع اصطلاح استعمال کی ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس نکتہ کو پھر سے سامنے آئیے کہ کیونرم کا منتہی، انسانی جسم کی پرورش اور نشوونما ہے اسی لئے ان کے ہاں روٹی کا مسئلہ آخری اور مقصود بالذات مسئلہ ہے۔ یعنی اگر انسان کی طبعی ضروریات زندگی پوری ہو جائیں تو پھر اس کے سامنے کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ قرآن کریم اسے حیوانی سطح زندگی کو ہر پکارا اور کفر سے تعبیر کرتا ہے (۲۴)۔ اس کے برعکس قرآن کریم کے نزدیک انسانی جسم کی نشوونما مقصود بالذات نہیں۔ یہ ذریعہ ہے انسانی ذات کی نشوونما کا، جو مستقل اقدار خداوندی کے اتباع سے ہو سکتی ہے۔ اس سے آپ نے دیکھا کہ کیونرم اور اسلام دو معاشی نظام نہیں، بلکہ دو نظریات زندگی ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل متضاد اور متناقض ہیں۔

اس تمہید کے بعد آئیے، قرآن کی اصطلاح زکوٰۃ کی طرف۔

انبیاء سابقہ کو زکوٰۃ کا حکم

اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا حکم سلسلہ وحی میں، قرآن کریم میں پہلی بار نہیں آیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ یہ حکم انبیاء سابقہ کو بھی دیا گیا تھا۔ سورۃ انبیاء میں مختلف انبیاء کرام کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ: **وَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِمْ فَعَلِ الْخَيْرَاتِ - وَاِقَامُوا الصَّلَاةَ - وَاِيتَاءَ الزَّكَاةَ - وَكَانُوا لَنَا عَبْدِينَ** (۲۴)۔ ”ہم نے ان کی طرف وحی کی کہ وہ خیر کے کام کریں اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا نظام قائم کریں اور اس طرح ہماری عبودیت اختیار کریں“ اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے مخاطبین سے کہا کہ: **وَاَوْصِنِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ هَادِمَتْ حَيَاتُ رَاسِخٍ**۔ ”خدا نے مجھے زندگی بھر صلوٰۃ اور زکوٰۃ پر قائم رہنے کا حکم دیا ہے“ ذرا آگے چل کر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے تذکرہ جیلہ کے ضمن میں کہا: **وَكَانَ يَامُرُ اَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ** (۱۹)۔ ”وہ اپنے ساتھیوں کو صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا حکم دیا کرتے تھے“

بنی اسرائیل کے متعلق کہا کہ ”ہم نے ان سے اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا عہد لیا تھا“ (۲۴)۔ اور ان سے کہا تھا کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کی ناہمواریاں دور کر کے انہیں جنت میں داخل کر دیا جائے گا (۲۴)۔ یہی حکم حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی وساطت سے جماعتِ مومنین کو دیا گیا۔ سورۃ المزمل میں خطاب کی ابتداء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتی ہے اور اس کے بعد کہا گیا ہے۔ **دَاَقِمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ** (۲۳)۔ یہ جمع مخاطب کے صیغے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا حکم حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور جماعتِ مومنین سب کو دیا گیا تھا۔ سورۃ المائدہ میں مومنین کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ **وَالَّذِينَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يَقِيْبُونَ**

الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ رَجَعُوا)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور جملہ احکامِ خداوندی کے سامنے سرنگوں ہوتے ہیں۔ اسی طرح سورۃ التوبہ میں ہے کہ وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ۔ اِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۹)۔ مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہیں۔ وہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر خدا اپنی رحمتوں کا سایہ کرے گا۔ وہ خدا جو ہر قسم کے غلبہ اور حکمت کا مالک ہے۔ اسی طرح سورۃ الاعراف میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا سے دنیا اور آخرت کی حسنات کی دعا مانگی تو ان سے کہا گیا کہ: فَسَاكُنْهَا لِبَنِّينَ يَتَّقُونَ۔ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ۔ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ (۲۶)۔ میں ان حسنات کو ان لوگوں کے لئے لکھ دوں گا جو تقویٰ شعار ہوں گے۔ ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ سرانجام دیں گے اور ہمارے قوانین پر سختہ ایمان رکھیں گے۔“

مشرکین مکہ اسلامی نظام کی سخت مخالفت کرتے تھے اور اس مخالفت کی انتہا یہ تھی کہ وہ میدانِ جنگ تک میں اتر آئے تھے۔ ان حالات میں ان کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت دی گئی، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہا گیا کہ: فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ۔ اِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۹)۔ اگر یہ اپنی اس روش سے باز آجائیں اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں تو پھر ان کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔ یہ اس لئے کہ قانونِ خداوندی میں حفاظت اور رحمت کی گنجائش رکھی گئی ہے: ذرآئکے چل کر کہا گیا کہ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ فِي الدِّينِ (۹)۔ اگر یہ اپنی موجودہ روش کو چھوڑ دیں اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی بن جائیں گے۔“

ان دونوں آیتوں میں مشرکین کے حصارِ دین میں داخل ہو جانے کے لئے اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کی شرط

عائد کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) یہ دین کے بنیادی ستون ہیں۔ چنانچہ دوسرے مقام پر ان دونوں ستونوں کی اس بنیادی حیثیت

دین کے بنیادی ستون

کو متعین طور پر واضح کر دیا۔ جہاں کہا وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ۔ حُنَفَاءَ۔ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ۔ وَذَٰلِكَ دِينُ الْقِيَمَةِ (۹۸)۔ اور خدا نے انہیں یہ حکم دیا ہے

کہ وہ دل کے پورے خلوص کے ساتھ خدائے واحد کی محکومیت اختیار کریں۔ اسی کو اپنا نصب العین قرار دے کر سیدھے اس کی طرف چلتے جاتیں۔ ادھر ادھر مت دیکھیں۔ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں۔ یہ ہے دینِ قیم جس پر چلنے کا انہیں حکم دیا گیا ہے۔ ”سورۃ حمّٰ میں کہا ہے کہ مشرکین کے لئے تباہی ہے: الَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوٰۃَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ کٰفِرُوْنَ (۲۵۶)۔“ یہ وہ لوگ ہیں جو ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ سرانجام نہیں دیتے اور آخرت کے منکر ہیں۔“ یہاں ایتائے زکوٰۃ اور ایمان بالآخرت کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے۔ اس سے بھی دین کے اس بنیادی ستون کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

سابقہ باب میں بتایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ جو لوگ ہدایتِ خداوندی کا اتباع کریں گے ان پر کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں رہے گا۔ اُسی سورۃ (بقرہ) میں ذرا آگے چل کر کہا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَآتَوْا الزَّکٰوٰۃَ لَهُمْ اَجْرٌ مِّنْ عِنْدِ رَبِّهِمْ۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲۵۷)۔“جو لوگ ایمان لاتے اور اُن سے اعمالِ صالحہ سرزد ہوتے ہیں اور وہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرتے ہیں تو اللہ کے ہاں سے انہیں ان کا اجر ملتا ہے۔ اور وہ اجر یہ ہوتا ہے کہ ان پر کسی قسم کا خوف و حزن طاری نہیں ہوتا۔“ دوسری جگہ انہیں کے متعلق کہا کہ: رِجَالٌ لَا تُلْهِیْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوْا الزَّکٰوٰۃَ۔ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَاَلَا بُصٰرُ (۲۵۸)۔“یہ وہ لوگ ہیں کہ خرید و فروخت اور دیگر کاروبار انہیں قوانینِ خداوندی سے غافل نہیں کرتے۔ وہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ انقلاب آجائے گا جس میں انسانوں کے قلوب بھی الٹ کر رہ جائیں گے اور نگاہیں بھی۔“

ان مقامات پر ہم نے ایتائے زکوٰۃ کے قرآنی الفاظ کا ترجمہ نہیں کیا۔ عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ”وہ زکوٰۃ دیتے ہیں“ یا ”زکوٰۃ دو“ اور چونکہ ہمارے ہاں زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم یہ ہے کہ جس مال پر ایک سال گزر جائے اس میں سے (بجلاً) اڑھائی فیصد کے حساب سے خیرات کے طور پر دیدیا جائے، اس لئے قرآن کی اس اصطلاح سے توجہ اس مفہوم کی طرف منعطف ہو جاتی ہے۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے ایتائے زکوٰۃ کا یہ مفہوم نہیں۔ یہ تو خیرات ہے جو انفرادی طور پر دیدی جاتی

۱۔ سورۃ الروم میں کہا گیا ہے کہ ”رَبُّوْا فِی الْحَقِیْقَتِ بَرْہٰتًا لِّیٰکُنْ زَکٰوٰۃٌ بَرْہٰتٌ ہِیَ“ (۲۵۹)۔ اس کی تشریح اس مقام پر کی جائے گی جہاں ربوٰ کے متعلق گفتگو ہوگی۔

ہے بعض لوگ اس میں اتنی تبدیلی کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کا یہ روپیہ انفرادی طور پر خرچ کرنے کے بجائے بیت المال میں جمع ہونا چاہیے۔ اور حکومت اسے ان مصارف میں خرچ کرے جنہیں قرآن نے متعین کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ یہ کہتے ہیں کہ ”بیت المال“ حکومت کے خزانہ سے الگ ہوتا ہے اس لئے اس روپے کو حکومت کی آمدنی (GOVERNMENT REVENUES) سے الگ رکھنا چاہئے، کیونکہ حکومت کی آمدنی دنیاوی ہے اور یہ روپیہ دینی۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس اصطلاح میں ثنویت کا وہ تصور کس طرح ابھر کر سامنے آ جاتا ہے جس کی رو سے دین اور دنیا کو دو الگ الگ دائرے قرار دیدیا گیا ہے اور جس پر سیکولر ازم کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس تصور کی رو سے بنیادی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ زکوٰۃ دینا، نماز پڑھنے کی طرح انفرادی فعل ہے جسے ہر حالت میں اور ہر مقام پر عمل میں لایا جاسکتا ہے۔ لیکن ایتائے زکوٰۃ کا یہ تصور قرآن تصور کے مطابق نہیں۔ قرآن کریم نے ایتائے زکوٰۃ کو مشروط کر دیا ہے ایک خاص شرط کے ساتھ اور یہ وہ شرط ہے جس سے اس فریضہ کا بنیادی مفہوم واضح طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ سورۃ الحج میں جماعتِ مومنین کو پہلی بار جنگ کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس کا پہلا مقصد تو یہ بتایا گیا کہ اس سے لوگوں کو مذہبی آزادی حاصل ہو جائے گی۔ اور اس کے بعد پیران اسلام کے متعلق کہا کہ :-

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ - وَآتَوُا الزَّكٰوةَ
وَامَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ - وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ - وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْر (۲۲)۔

یہ حکومت کا فریضہ ہے

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں ملکہ حاصل ہو جائے گا۔ جب ان کی اپنی آزاد حکومت قائم ہو جائے گی، تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے۔ جسے قرآن جائز تسلیم کرتا ہے، اس کا حکم دیں گے۔ جسے وہ ناجائز قرار دیتا ہے اس سے روکیں گے۔ اور ان کے تمام معاملات کی آخری اتھارٹی قانونِ خداوندی ہوگا۔ اس آیت سے یہ بات سوچ کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم نے (اقامتِ صلوٰۃ کی طرح) ایتائے زکوٰۃ کے لئے جماعتِ مومنین کی اپنی حکومت کو بنیادی شرط قرار دیا ہے اور ایتائے زکوٰۃ (زکوٰۃ دینا) مملکت کا فریضہ بتایا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ یہ تصور بھی قرآن کے مطابق نہیں کہ لوگ اپنے طور اڑھائی فیصد خیرات کے طور خرچ کر دیں اور یہ بھی صحیح نہیں کہ حکومت ”زکوٰۃ“ وصول کرے۔ یہاں تو حکومت کا فریضہ ایتائے زکوٰۃ — یعنی زکوٰۃ دینا قرار دیا گیا ہے، زکوٰۃ لینا یا وصول کرنا نہیں۔ سورۃ المؤمنین میں، مومنین کی خصوصیتِ کبریٰ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَحِلُوْنَ (۲۳)۔ ”یہ لوگ زکوٰۃ کے لئے مصروف کار رہتے ہیں“ اس سے بھی معلوم ہوا کہ ایتائے زکوٰۃ ایک پروگرام ہے جس پر جماعتِ مومنین اپنی مملکت میں نظامِ حکومت کے تابع عمل پیرا رہتی ہے۔ یہ پروگرام، یا مملکت اسلامیہ کا فریضہ، زکوٰۃ کے اُس مفہوم کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے جسے شروع میں بیان کیا گیا ہے۔ ہم نے وہاں بتایا ہے کہ الزکوٰۃ کے معنی ہیں وہ سامان، اسباب اور ذرائع جن سے

زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم

زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم | افرادِ انسانیہ کی جسمانی نشوونما بھی ہوتی جاتے اور ان کی ذات کی نشوونما بھی۔ قرآنِ کریم کی رو سے اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہوگا کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے تمام افرادِ معاشرہ کی طبعی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور ان کی ذات کی نشوونما بھی۔ یہ اس حکومت کا فریضہ ہی نہیں بلکہ اس کے قیام کا مقصد اور وجہ جواز ہے۔ افرادِ معاشرہ کی طبعی ضروریات کے متعلق ہم جلد اول میں معاشی نظام کے تابع گفتگو کرتے ہیں۔ (دیکھئے صفحات ۱۹۴، ۱۰۵) باقی رہی انسانی ذات کی نشوونما، سو اس کے متعلق اسی جلد کے پہلے باب میں بات ہو چکی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کس طرح دینِ قیم بنتے ہیں۔ دین کا مقصد ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں تمام افرادِ احکام و قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے رہیں اور جس میں ہر فرد کو وہ سامان اور ذرائع میسر آجائیں جن سے اس کی طبعی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور اس کی ذات کی نشوونما بھی ہوتی جلتے۔ افرادِ معاشرہ کی طبعی ضروریات پوری کرنے کے لئے ضروری ہوگا کہ ذرائعِ رزق، مملکتِ اسلامیہ کی تحویل میں رہیں۔ اور ذات کی نشوونما کے لئے ضروری ہوگا کہ یہ مملکت افرادِ معاشرہ کی تعلیم و تربیت اس طرح کرے کہ ذات کی نشوونما کا تقاضہ ان کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے۔ اگرچہ انسانی نشوونما کے یہ دونوں گوشے زکوٰۃ کی جامع اصطلاح میں آجالتے ہیں لیکن بعض مقامات پر اس نے ان کا الگ الگ بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً سورۃ البقرۃ میں ہے کہ پد کشاد اور نیکی کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا رخ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ کشاد کی راہ اس کی ہے جو اللہ، آخرت، ملائکہ، انبیاء اور کُتب پر ایمان لائے اور اَتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِ الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ۔ وَابْنُ السَّبِيلِ وَالسَّاعِیِّنَ وَفِي الرِّقَابِ۔ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَآتَى الزَّكٰوةَ (۲/۱۷۷)۔ مال کی کشش کے باوجود اُسے ذوی القربی، یتامی، مساکین، ابن السبیل، سائیں اور محکوموں اور غلاموں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے۔ اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرے۔ یہاں ظاہر ہے کہ ”ایتائے زکوٰۃ کے معنی طبعی ضروریات کا پورا کرنا ہی نہیں۔ کیونکہ یہ مقصد تو روپیہ صرف کرنے سے حاصل ہو جائے گا جس کے لئے ”اَتَى الْمَالَ“ کے الفاظ پہلے آچکے ہیں۔ یہاں ایتائے زکوٰۃ سے مراد اس کا دوسرا گوشہ ہے۔ یعنی مناسب تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا اور ایسی مساعداً فضا پیدا کرنا، جس میں ان افرادِ معاشرہ کی ذات کی نشوونما بھی ہوتی جاتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جب کہا گیا ہے کہ : وَ يُزَكِّیْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۲/۱۷۹ ذ ۱۷۸ ذ ۱۷۷ ذ ۱۷۶ ذ ۱۷۵ ذ)۔ وہ کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور اس طرح ان کے تزکیہ نفس۔ ان کی ذات کی نشوونما۔ کا سامان ہم پہنچاتا ہے۔ انہیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ اپنی ذات کی مناسب نشوونما کر سکیں۔ تو اس سے بھی یہی مقصد ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلامی مملکت کے سربراہ کی حیثیت

سے حضورؐ کا فریضہ یہ بھی تھا کہ آپؐ افرادِ معاشرہ کے رزق کا انتظام کریں۔ لیکن اس کے ساتھ، بلکہ اس سے کہیں اہم، یہ فریضہ تھا کہ حضورؐ ان افراد کی ذات کی نشوونما کا انتظام کریں۔ اور یہ مقصد تعلیم کتاب و حکمت کی رو سے حاصل ہو سکتا تھا۔

ضمناً ہم نے اوپر کہا ہے کہ فریضہ رسالت یہ بھی تھا کہ لوگوں کو اس قابل بنادیا جائے کہ وہ اپنی ذات کی نشوونما کر سکیں تو یہ چیزِ فرائض کی رہنمائی کے مطابق ہے۔ قرآنِ کریم نے ایک طرف تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ کہا ہے کہ **وَيُزَكِّيهِمْ** اور دوسری جگہ خود افراد کے متعلق کہا کہ: **قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا (۹۱)**۔ ”اسی کی زندگی کی کھیتی پروان چڑھی جس نے اپنی ذات کی نشوونما کر لی“ (نیز ۳۴/۳۵) ان آیات سے ظاہر ہے کہ اپنی ذات کی نشوونما ہر فرد کو خود ہی کرنی ہوگی۔ اسلامی نظام — باتباع رسالت محمدیہ — ایسا انتظام کرے گا جس سے افرادِ معاشرہ اس قابل ہو جائیں کہ اپنی ذات کی نشوونما کر سکیں۔ اسی کو ہم نے مساعد فضا مہیا کرنا یا مناسب تعلیم و تربیت کے اسباب ہم پہنچانا کہا ہے۔ افراد کی ذات کی نشوونما کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اسے تو فرد کو خود آپ ہی کرنا ہوگا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ آپؐ لوگوں کی صحیح راستہ کی طرف راہنمائی کر سکتے ہیں انہیں صحیح راستہ پر چلا نہیں سکتے۔ **إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ - وَلَئِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ - وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ (۲۵۶)**۔ اور تو اور، وہ بھی جس سے تو خاص طور پر محبت کرے، تو اُسے بھی صحیح راستہ پر چلا نہیں سکتا بلکہ راستہ دکھا ہی سکتا ہے راستہ پر چلنا تو قانونِ خداوندی کے مطابق ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہی جانتا ہے کہ کون صحیح راستہ پر چلتا ہے۔“

اس ضمنی نکتہ کے بعد ہم پھر اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ خلافت علی منہاج رسالت (اسلامی مملکت) کا فریضہ یہ صدقہ اور خیرات کا انفرادی فعل نہیں — ضمناً، جنہیں زکوٰۃ کے قرآنی مصارف کہا جاتا ہے وہ زکوٰۃ کے مصارف نہیں، صدقات کے مصارف ہیں (دیکھیے ۹)۔ صدقات اور زکوٰۃ میں کیا فرق ہے اس کی وضاحت اپنے مقام پر کی جائے گی۔

ہم نے کہا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ مملکتِ اسلامیہ کا فریضہ ہے۔ مملکتِ اسلامیہ یا قرآنی حکومت پر کسی خاص فرد یا افراد کے کسی گروہ کی اجارہ داری نہیں ہوتی۔ یہ پوری کی پوری امتِ مسلمہ کی مملکت ہوتی ہے اور جسے ہم مملکت کا فریضہ کہتے ہیں وہ درحقیقت پوری امت کا فریضہ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ایتائے زکوٰۃ بھی پوری کی پوری مملکتِ اسلامیہ کا فریضہ قرار پائے گا۔ عملی طور پر یوں سمجھئے کہ اس مملکت میں تمام کا سب افراد ان کاموں کو، جو ان کے سپرد کئے جائیں گے، اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق پوری پوری تندہی سے سرانجام دیں گے۔ اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لئے کر

زکوٰۃ کا عملی نظام

فاضلہ، اس نظام کی سنٹرل انتھارٹی (مرکزیت) کی تحویل میں دیدیں گے تاکہ وہ اس سے ان لوگوں کی ضروریات زندگی پورا کرنے کا انتظام بھی کرے جو اپنی ضروریات خود پورا کرنے کے قابل نہ ہوں۔ اس کے علاوہ، وہ مملکت افراد معاشرہ کی مناسب تعلیم و تربیت کا انتظام بھی کرے جس سے وہ اس قابل ہو جائیں کہ اپنی ذات کی نشوونما کر سکیں۔ اس اعتبار سے آپ آج کی اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ زکوٰۃ، اسلامی مملکت کی جملہ آمدنی (REVENUE) کو کہا جائے گا اور اسے اس لئے زکوٰۃ کہا جائے گا کہ اس آمدنی کا مقصد افراد معاشرہ کی نشوونما ہوگا۔ حکومت کے محاصل کو مقصد کے نام سے تعبیر کرنے میں جو گہری حکمت ہے اس کی تحسین ارباب نظر ہی کر سکتے ہیں۔

اس مقام پر قارئین کے دل میں یقیناً یہ سوال ابھرے گا کہ پھر یہ ”زکوٰۃ“ موجودہ شکل میں کس طرح تبدیل ہوگئی؟ ”کس طرح تبدیل ہوگئی“ کا جواب دینا مشکل ہے۔ اتنا تو واضح ہے کہ قرآن کریم میں نہ زکوٰۃ کے نصاب کا کوئی ذکر ہے نہ اس کا شرح کا۔ نہ اس کے مصارف کا تعین کیا گیا ہے۔ یہ تمام چیزیں خارج از قرآن ہیں۔ نصاب وغیرہ تو اس لئے بھی خارج از قرآن ہے کہ قرآن کریم نے مال و دولت جمع کرنے کی سخت مخالفت کی ہے۔ اتنی مخالفت کہ اس نے ایک مقام پر کہا ہے کہ ”جہنم آداریں دے دے کر بلائے گا اس شخص کو جمع قَاوَعٰی (۱۸۱)“ جو مال جمع کر کے اسے برتن میں بند کر لیتا ہے اور پھر اس پر ڈھکناوے کر اسے اپنے لئے مختص کر لیتا ہے“ ایسے شخص کو جہنم آداریں دے دیکر بلائے گا۔ سورة الہمزة میں ہے کہ سخت بنا ہی ہے اس کے لئے اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّ

دولت جمع کرنے کے خلاف

عَدَدًا (۱۸۲) ”جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر ننانوے کے پھر میں پھنس جاتا ہے“ قرآن کہتا ہے کہ ایسے شخص کو اس آگ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ ”جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیا کرتے ہیں“ سورة التوبہ میں اس اجمال کو مزید تفصیل سے بیان کر دیا جہاں کہا کہ: وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُسْفِقُوْنَہَا فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْہُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْہَا فِی نَارِ جَهَنَّمَ۔ فَتَکْوٰی بِہَا جَبَاہُمْ وَّجَنَابُہُمْ وَّظُہُوْرُہُمْ۔ هٰذَا مَا کُنْتُمْ لَا تَفْسِکُمْ فَاذْكُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ (۱۸۳) ”جو لوگ چاندی اور سونا، یعنی مال اور دولت جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں صرف کرنے لئے کھلا نہیں رکھتے، تو اے رسول! تم اعلان کر دو کہ وہ ایک الم انگیز عذاب میں ماخوذ ہوں گے اُس دین اُن کے چاندی اور سونے کے ان ٹکڑوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا۔ اور پھر اس سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشت کو داغا جائے گا اور اُن سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنے لئے مختص کر رکھا تھا۔ لو

آج اپنے خزانہ سے پیدا ہونے والے عذاب کا مزہ چکھو“ ہم نے یہ آیات محض مثال کے طور پر درج کر دی ہیں ورنہ قرآن کریم اصولی طور پر زرا ندرزی کی سخت مخالفت کرتا اور اس طرح نظام سرمایہ داری کو اس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتا ہے۔ وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ: **يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ - قُلِ الْعَفْوَ (۲۴۰)**۔ اے رسول! یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنے مال و دولت میں سے کتنا حصہ دوسروں کے لئے دیدیں۔ ان سے کہہ دو! کہ تمہاری اپنی ضروریات سے جس قدر بھی زائد ہے وہ سب کا سب“ قرآن کی اس تعلیم کی روشنی میں ظاہر ہے کہ یہ تصویر ہی نہیں پیدا ہوتا کہ مسلمان دولت جمع کرتا رہے اور اس جمع شدہ مال پر ایک سال گزر جانے کے بعد اس میں سے اڑھائی فیصد نکال کر ”اللہ واسطے“ دیدے۔ یہ تو خالص نظام سرمایہ داری ہے۔ نظر آتا ہے کہ جب صدرِ اول کے بعد مسلمانوں میں ملوکیت آئی تو اس کے ساتھ ہی مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری کے عناصر بھی ابھر آئے۔ قرآنی آیات کی رو سے تو اس نظام (سرمایہ داری) کے شائبہ تک کی بھی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔ اس کے لئے لامحالہ روایات وضع کرنی پڑیں اور وہ روایات ہماری کتب احادیث میں داخل کر دی گئیں (مثلاً) ہم نے اوپر سورۃ التوبہ کی آیات (۳۵-۹۴) درج کی ہیں جن میں دولت کے اکتناز کو عذابِ جہنم کا موجب بتایا گیا ہے۔ ان کی تفسیر کے سلسلہ میں ذیل کی روایت (مشکوٰۃ - کتاب الزکوٰۃ میں درج ہے)۔

(حضرت) ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم

کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری فکر کو دور کر دوں گا اور اس مشکل کو حل کر دوں گا پس، عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا نبی اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں گزری ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے۔۔۔۔۔ (حضرت) ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا بیان سنکر (حضرت) عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔

یہ روایت زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ اسے ایک خاص مقصد کے لئے وضع کیا گیا۔ ورنہ آپ سوچئے کہ خدا کی طرف سے حکم نازل ہوتا ہے اور وہ (معاذ اللہ) صحابہ کبارؓ پر (معاذ اللہ) گراں گزرتا ہے؟ حضرت عمرؓ ان کی غمازگی کرتے ہوئے اس مشکل کے حل کی تلاش کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاتے ہیں اور حضورؐ فرمادیتے ہیں کہ تم لوگ خواہ مخواہ پریشان ہو گئے۔ جتنا جی چاہے مال جمع کر دو۔ پس اس میں سے، سال کے بعد اڑھائی روپیہ سینکڑہ کے حساب سے خدائی لاہ میں دیدیا کرو۔ باقی سارا مال حلال و طیب ہو جائے گا اور (حضرت) عمرؓ اس حل کو سن کر نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہیں۔

(معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)۔ یہ وہ مومنین ہیں جن کے متعلق قرآن شہادت دیتا ہے کہ انہوں نے اپنا مال اور جان، خدا کے ہاتھ بیچ دیا تھا (۹/۱۱۱)۔ یہ وہ مومنین ہیں کہ خدا کا حکم تو ایک طرف، اس کے رسولؐ کے فیصلے کے متعلق خدا کا یہ ارشاد گرامی ان کے سامنے تھا کہ: **فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ**۔ **ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا** (۴/۶۵)۔ "تیرا رب اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک ان کی یہ حالت نہ ہو کہ اپنے ہر اختلافی معاملہ میں تجھے اپنا حکم بنائیں اور اس کے بعد ہی نہیں کہ تمہارے فیصلہ کو طوعاً و کرہاً تسلیم کر لیں بلکہ اس کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرائی نہ گزرے۔ وہ دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں" کیا آپ ایک ثانیہ کے لئے بھی یہ تصور کر سکتے ہیں کہ جن لوگوں کے مومن ہونے کے لئے یہ بشرط تھی، خدا کا حکم ان کے دل میں کسی قسم کی گرائی پیدا کر دے گا اور پھر وہ اس مصیبت کا حل تلاش کرنے کے لئے اپنا نمائندہ رسول اللہؐ کے پاس بھیجیں گے؟ اور نمائندہ بھی حضرت عمرؓ جیسا، جس کے کرتے پر زائے خلافت میں بھی چار چار پیوند لگے ہوتے تھے؟

اس قسم کی ہیں وہ روایات، جن کی رو سے قرآن کریم کے معاشی نظام (الزکوٰۃ) کو مردجہ زکوٰۃ میں بدل دیا گیا اور جس نے نظام سرمایہ داری کے لئے سارے راستے کھول دیئے۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے کہ خود ان حضرات کی بیان کردہ سیرت کی رو سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ زکوٰۃ دی ہی نہیں

رسول اللہ اور جمع مال

اس لئے کہ تمام کتب سیرت اس کی شہادت دیتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور اپنے اہل خانہ کے ضروریات سے زائد ایک پیسہ بھی کبھی گھر میں نہیں رکھا تھا۔ ایک روایت میں یہاں تک کہا گیا ہے:-

مرض الموت کے وقت، حضورؐ کے ہاں چند دینار کہیں سے آئے تھے، حضورؐ نے فرمایا کہ انہیں صدقہ کر دو۔ (یعنی بیت المال بھیج دو) تاکہ ان سے حاجتمندوں کی ضروریات پوری ہوں، لیکن اس کے بعد حضورؐ پر غشی طاری ہو گئی اور سب لوگ آپؐ کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے۔ آپؐ کو ہوش آیا تو فرمایا وہ دینار لادو۔ دینار کو حضورؐ نے اپنے ہاتھ پر رکھا اور کہا: خدا کا محمدؐ کے متعلق کیا گمان ہو گا جب وہ اس سے ملے اور کے پاس یہ دینار ہوں۔ اس پر حضورؐ نے انہیں خود بیت المال میں بھیج دیا۔ (اصح السیر حکیم دناپوری) بخاری میں یہ حدیث بھی موجود ہے کہ حضورؐ نے فرما دیا تھا:-

میرے ورثہ میں ایک دینار بھی بطور ترکہ تقسیم نہیں ہوگا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کے اخراجات کے بعد جو کچھ بھی بچے گا، وہ صدقہ ہوگا۔

ظاہر ہے کہ جس ذاتِ اقدس کی یہ کیفیت ہو اور جس گھرانہ کی مالی حالت ایسی ہو، وہ اس زکوٰۃ کو کیسے ادا کریں گے جس کی ادائیگی شرط یہ ہے کہ جمع شدہ مال پر ایک سال بیت چکا ہو۔ کیا اس گھر میں جمع شدہ مال سال بھر کے لئے رکھا رہتا ہوگا؟

اور جب اس گھر کی کیفیت یہ تھی تو اس کے بعد یہ سوچئے کہ اس آیت کا مطلب کیا ہوگا جس میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کو یہ حکم دیا تھا کہ **لَهُ وَأَقِمْنَ الصَّلَاةَ وَآتَيْنَ الزَّكَاةَ (۳۳/۳۳)**۔ ”تم اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرو“ ظاہر ہے کہ یہ ایتائے زکوٰۃ، ہماری مروجہ زکوٰۃ نہیں تھی۔ یہ وہی زکوٰۃ تھی جس کے متعلق ہم حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فریضہ (يُزَكِّيهِمْ) کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ یعنی حضور کے اہل خانہ سے کہا یہ کیا تھا کہ تم ایسا انتظام کرو جس سے تمہارے دائرہ اثر میں آنے والے افراد کی ذات کی نشوونما کا انصرام ہو سکے۔ یعنی ضروری تعلیم و تربیت کی رودے۔

❖

ہم نے اوپر کہا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ امت مسلمہ کا اجتماعی منصب تھا۔ اس کی تائید زیرِ نظر آیت (۳۳/۳۳) کا اگلا ٹکڑا کر رہا ہے:-

وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاجِعِينَ (۳۳/۳۳)

اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ ”تم رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو“ دیکھنے میں تو یہ تین لفظ ہیں لیکن درحقیقت یہ مذہب اور دین کا نقطہ انبیاز ہیں۔ اس کی وضاحت سے پیشتر آپ پہلے اس لفظ (رکوع) کے معنی اور مفہوم کو دیکھ لیجئے۔ اس کے مادہ (رکع) کے معنی بھٹکنے کے ہیں، جس طرح سجدہ کے معنی بھی بھٹکنے کے ہیں۔ عام طور پر ان میں مندرجہ یہ کیا جاتا ہے کہ رکوع تھوڑے سے بھٹکنے کو کہتے ہیں اور سجدہ

پورے اور کامل جھکاؤ کو۔ یہ وہی فرق ہے جو نماز میں رکوع اور سجدہ کی محسوس ہیئت میں نظر آتا ہے۔ ان دونوں کے اس فرق کی تشریح بھی ذرا آگے چل کر بیان کی جائے گی۔ جیسا کہ اسی جلد کے دوسرے باب ”سجدہ“ کے ضمن میں بتایا جا چکا ہے۔ سجدہ سے مفہوم قوانینِ خداوندی کی اطاعت ہے۔ یہی مفہوم رکوع کا بھی ہے۔ سورۃ الحج میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح کیا گیا ہے: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۲۲/۲۲)** اے جماعتِ مومنین! تم رکوع کرو اور سجدہ کرو۔ یعنی اپنے رب کی محکومیت اور اطاعت اختیار کرو۔ اور خیر کے کام کرو تاکہ تمہاری کھیتیاں پر دان چڑھیں۔ اس سے اگلی آیت میں اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ اور صلۃ خطاب نسائی، سے ہے جس میں حضور کی ازواجِ مطہرات اور دیگر محترم خواتین بھی آجاتی ہیں اسی لئے میں نے اس کا ترجمہ اہل بیت کیا ہے۔

اعتصام باللہ وغیرہ، دین کے بنیادی ارکان کا ذکر آیا ہے۔ سورۃ الفتح میں، مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ کی مختلف خصوصیات اور صفاتِ کبریٰ کے ضمن میں کہ: تَرَاهُمْ رُكْعًا سَجْدًا (۲۸)۔ ”تو انہیں راکعین اور ساجدین دیکھے گا“۔ ظاہر ہے اس کے معنی بھی اطاعت گزار کے ہیں۔ سورۃ المائدہ میں مومنین کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اقامتِ صلوة اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کرتے ہیں وَهُمْ رَاكِعُونَ (۵)۔ ”وہ خدا کے اطاعت گزار ہوتے ہیں“۔ سورۃ التوبہ میں مومنین کے اوصاف کے سلسلہ میں السَّاجِدُونَ السَّجْدَ (۹) کہا گیا ہے۔ خانہ کعبہ کے سلسلہ میں بھی لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ (۲۵) کے الفاظ آئے ہیں۔ ایک مقام پر اہل جہنم کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کا جرم یہ تھا کہ یہ خدا کی صداقتوں کی تکذیب کرتے تھے وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ (۲۵)۔ ”جب ان سے کہا جاتا تھا کہ رکوع کرو تو یہ رکوع نہیں کرتے تھے“۔ اس کے معنی واضح ہیں کہ ان سے کہا جاتا تھا کہ احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرو تو یہ ان کی اطاعت نہیں کرتے تھے۔

ان آیات سے واضح ہے کہ رکوع کرنے کے معنی قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنے کے ہیں۔ اس کی محکومیت اختیار کرنے کے۔ ہم نے اوپر کہا ہے کہ سجدہ کا مفہوم بھی یہی ہے۔ لیکن لغوی طور پر رکوع تھوڑے سے جھکنے کو کہتے ہیں اور سجدہ پورے کے پورے جھک جانے کو۔ ہر چند یہ دونوں الفاظ اطاعت کے معانی میں مرادف ہیں لیکن قرآن کریم نے جب یہ دو الگ الگ الفاظ استعمال کئے ہیں تو ان کا فرق کچھ یوں سمجھ میں آتا ہے۔ دین کی دعوت کا آغاز اس قوم سے ہوتا ہے جو ان صداقتوں سے یا تو بالکل بیگانہ ہوتی ہے یا ان پر عمل پیرا نہیں ہوتی۔ ان کی روشِ زندگی ان کے یکسر خلاف ہوتی ہے۔ اور چونکہ یہ روش صدیوں سے اُن کی گھٹی میں پڑی ہوئی چلی آرہی ہوتی ہے، انہیں اس حالت سے نکال کر دین کی غایت تک پہنچانا ایک طویل سفر ہوتا ہے۔ نفسیاتی حکمت کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں یہ تبدیلی بتدریج لائی جائے (مثلاً) ہم قرآن کریم کے معاشی نظام میں

رکوع اور سجدہ میں فرق

دیکھ چکے ہیں کہ اس کا مستنبط قُلِ الْعَفْوَ (۲۴) ہے۔ یعنی اپنی ضرورت سے زائد سب کچھ مملکت کے حوالے کر دینا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس غایت تک تو بتدریج پہنچا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں صدقہ اور خیرات اور ضرورت مندوں کے لئے انفرادی امداد وغیرہ کے احکام بھی ملتے ہیں۔ حتیٰ کہ وراثت کے احکام بھی۔ صاف نظر آتا ہے کہ ان احکام کا تعلق اس عبوری دور سے ہے جس میں سے گذار کر اس جماعت کو آخری نصب العین تک پہنچایا جائے گا۔ سہ جب وہ

سہ جیسے ترکِ فخر کے متعلق تاریخ بتاتی ہے کہ اس حکم کو آخری منزل تک پہنچنے کے لئے قریب پندرہ سال کا عرصہ لگ گیا۔

آخری منزل آجائے گی۔ یعنی تمام افراد کی ضروریات زندگی کے ہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت پر عائد ہو جائے گی اور افراد مملکت کے پاس زائد از ضرورت کچھ نہیں رہے گا۔ اُس وقت اس عبوری دور سے متعلق احکام عمل پیرا رہنے اور ہونے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ دین کے اس طریق کار کی روشنی میں، ہم کچھ ایسا سمجھتے ہیں کہ رکوع کا تعلق عبوری دور سے ہے اور سجدہ، انتہائی شکل کا نام ہے۔ اطاعت تو دونوں میں ہی ہوگی لیکن ان کے مدارج میں فرق ہوگا۔ یہ بھی واضح رہے کہ انتہائی شکل میں جب عبوری دور سے متعلق احکام پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت نہیں رہے گی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ احکام منسوخ ہو جائیں گے، وہ بدستور اپنی جگہ قائم رہیں گے جب حالات پھر ویسے ہو جائیں تو وہ نافذ العمل ہو جائیں گے۔ جس طرح پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کا حکم نافذ العمل ہو جاتا ہے اور پانی مل جانے پر یہ حکم ساقط العمل ہو جاتا ہے۔ منسوخ نہیں ہو جاتا۔ اب آئیے اس بنیادی نکتہ کی طرف، جس کے متعلق ہم نے کہا ہے کہ وہ مذہب اور دین میں حد فاصل ہے یعنی یہ کہ **وَأَذْكُرُوا لَكُمْ مَعَ الرَّسُولِ** کی شرط کیوں لگائی گئی ہے۔

مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ، انفرادی تعلق کا نام ہے، **دین اجتماعی نظام کا نام ہے** جسے ہر شخص، اپنے اپنے طور پر، اپنے اپنے طریق سے ہر جگہ، ہر علم خویش، قائم کر سکتا ہے، اور مقصد اس سے اپنا اطمینان حاصل کرنا، یا اس سے آگے بڑھ کر اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، دین ایک اجتماعی نظام کا نام ہے۔ اس میں قوانین خداوندی کی اطاعت بھی اجتماعی حیثیت سے ہوتی ہے اور اس کے نتائج بھی اجتماعی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اجتماعی معاشرہ یا جماعت بھی افراد ہی کا مجموعہ ہوتی ہے اس لئے ایک صالح نظام، یا طیب جماعت اسی صورت میں متشکل ہو سکتی ہے جب افراد بھی صالح ہوں۔ یہ نکتہ بڑا بنیادی ہے جس کی رو سے دائرہ ہوں قائم ہوتا ہے کہ افراد صالح ہوں تو جماعت یا نظام صالح ہوتا ہے اور اجتماعی نظام صالح ہوتا ہے تو افراد بھی صالح ہوتے ہیں۔ افراد اور جماعت کا یہ تعلق ایک مثال کے ذریعے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ گھڑی، مختلف پرزوں کے ربط باہمی کا نام ہے۔ اگر پرزے ٹھیک ٹھیک ہوں تو گھڑی بھی درست ہوگی اور اگر اس کے پرزے درست نہ ہوں تو گھڑی کے درست ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا لیکن اگر یہ نہایت عمدہ، پختہ، درست، صحیح و سالم پرزے مینر پر بکھرے پڑے ہوں تو نہ ان کا کوئی فائدہ ہوگا نہ ان سے کوئی نتیجہ مرتب ہو سکے گا۔ انہیں ایک خاص ربط و ضبط کے ساتھ، مشینری کی شکل میں اپنی اپنی جگہ پر فٹ ہونا پڑے گا تب جا کر ان کی افادیت ظہور میں آ سکے گی۔ اسے کہتے ہیں اجتماعی نظام۔

قرآن کریم نے دین کے قیام کے لئے امت کا وجود لازمی قرار دیا ہے۔ اسی لئے اس نے مؤمنین کو امت کہہ کر پکارا ہے۔ جب حضرت ابراہیم اور حضرت اسمعیل علیہما السلام نے دنیا میں

تشکیل امت

خدا کے گھر کی عمارت استوار کی تو اس کی تعمیر کے بعد انہوں نے خدا کے حضور اپنی یہ آرزو پیش کی کہ: رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (۲/۱۳۸)۔ "اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں بھی ایسا بنا کہ ہم تیرے اطاعت گزار رہیں اور ہماری ذریت میں سے بھی ایک ایسی امت پیدا کر جو تیرے احکام کے سامنے سرسجود ہو"۔ یعنی تعمیر کعبہ کے بعد پہلی دعا ایک اُمت پیدا کرنے کے لئے کی گئی۔ یہی وہ امت تھی جو اسلام کو بحیثیت دین کے متشکل کرنے کے لئے وجود میں لائی گئی۔ چنانچہ اسی کعبہ کی مرکزیت کے سلسلہ میں کہا گیا کہ: وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (۲/۱۴۳)۔ "اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنایا۔ تمہارا نظام یہ ہو گا کہ تم تمام اقوام عالم کے اعمال کی نگرانی کرو گے اور یہ رسول تمہارے اعمال و کردار کا نگران ہو گا۔ اس امت کے متعلق دوسری جگہ کہا کہ: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۲/۱۴۹)۔ "تم وہ بہتر اُمت ہو جسے نوع انسان کی فلاح اور بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمہارا فریضہ ہے"۔ سورۃ الاعراف میں ہے: وَوَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةً يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ (۷/۱۸۱)۔ "اور ہم نے اپنی مخلوق میں سے ایک امت پیدا کی جو الحق کے ساتھ لوگوں کی راہنمائی کرتی اور اسی کی رُو سے دنیا میں نظامِ عدل قائم کرتی ہے"۔

یہ اُمت متشکل کیسے ہو گی، اس کے متعلق سورۃ آل عمران میں وضاحت سے بتا دیا کہ: **اعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ** وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (۳/۱۰۳)۔ "تم تمام کے تمام، اجتماعی حیثیت سے، وحیِ خداوندی (قرآن مجید) کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور باہمی تفرقہ مت پیدا کرو۔ فرقے اور پارٹیاں نہ بن جاؤ"۔ یہاں دیکھئے۔ امت کی وحدت کا طریق کار یہ بتایا گیا ہے کہ سب کے سب، کتابِ اللہ کے ساتھ متمسک رہیں۔ یہی ان کا نقطہِ ماسک اور نصب العینِ حیات ہو۔ پھر جمیعاً کے لفظ نے واضح کر دیا کہ یہ "اعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ" اجتماعی حیثیت سے ہو گا۔ فرداً تو ایک طرف، گروہ درگروہ ہو کر بھی، یہ اعتصام نہیں ہو سکے گا۔ اس کے بعد کہا: وَأَذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ۔ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً۔ فَأَلَفَّ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ۔ فَاصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا۔ وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ۔ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا۔ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (۳/۱۰۴)۔ "تم تباہی اور بربادی کے جہنم کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔ تم اس میں گرنے ہی والے تھے کہ اس نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ ہم اس طرح تمہیں اپنی باتیں، اپنے احکام، اپنی آیات سمجھاتے رہتے ہیں تاکہ تم صحیح راستہ پر چلتے ہو۔"

سچ یہاں سے یہ حقیقت بھی سامنے آ جاتی ہے کہ عدل اسی فیصلہ کو کہا جائے گا جو وحیِ خداوندی (قرآن کریم) کے مطابق ہو۔

یہ تھا وہ طریق، جس سے ان افراد کو ایک امت کی شکل میں متشکل کیا گیا، اس کی بنیادی نکتہ تھا، اجتماعی طور پر اعتصام بحمل اللہ (۲/۱۳۶) اور نتیجہ تھا دونوں کے باہمی ملنے سے ایک دوسرے کا بھائی بن جانا۔ اس امت کی تشکیل میں وجہ جامعیت دین کا اشتراک تھا۔ نسل، رنگ، وطن، زبان میں سے کسی کا اشتراک بھی وجہ جامعیت نہیں تھا۔ قرآن کریم نے مختلف اقوام عالم اور مختلف ادوار زمانہ میں پیدا ہونے والے انبیائے کرام کا نام بنام ذکر کرنے کے بعد کہا: **إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ** (۲/۲۱۳)۔ ”یہ تمام حضرات ایک امت کے افراد تھے۔ اور ان کے ایک امت بننے کی بنیاد یہ تھی کہ وہ ایک ہی رب کے بندے تھے اور اسی کے اطاعت گزار تھے۔“ یہی وہ امت تھی جسے سلسلہ انبیائے کرام کی آخری کڑی، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے اشتراک کی بنیادوں پر متشکل فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے ان سے تاکید کہا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ** (۳/۱۹۹)۔ ”اے جماعتِ مومنین! اے امتِ مسلمہ! تم میں سے ہر فرد دین کی بنیادوں پر ثابت قدم رہے۔ دوسرے افراد کے ثابت قدم رہنے کا ذریعہ بنے۔ اور اس طرح ربطِ باہمی سے باہوں میں باہیں ڈال کر ایک جماعت کی حیثیت سے سفرِ حیات طے کرے۔ یوں تم سب قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاؤ تا کہ تمہاری کھیتیاں پروان چڑھیں“ اس کے بعد تاکید کی کہ: **كُونُوا مَعَ الشَّاقِينِ** (۹/۹۱)۔ صادق بننا اور رہنا چاہتے ہو تو گروہِ صادقین کے ساتھ ملکر رہو“ اور یہی مفہوم ہے: **وَأَمْرٌ كَعَمَلٍ مَعَ السَّاجِدِينَ** (۲۲/۲۲) کا۔ قرآن کریم نے توحشت میں داخل ہونے کی شرط بھی یہ بتائی ہے کہ: **فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي** (۲۹/۲۹)۔ ”میرے بندوں کے ساتھ مل جا اور یوں جنت میں داخل ہو جا“ یاد رہے کہ یہاں نفسِ مطمئنہ کو مخاطب کیا گیا (۲۹/۲۹)۔ مذہب اور تصوف میں تصور یہ ہے کہ نفس کا مطمئن ہو جانا مقصودِ حیات ہے، اور نفسِ چرنگہ ہر فرد کا الگ الگ ہوتا ہے اس لئے اطمینانِ قلب یا اطمینانِ نفس انفرادی چیز ہے جو مختلف قسم کے مجاہدوں اور ریاضتوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اور جس فرد کو یہ حاصل ہو جائے وہ جنت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے نفسِ مطمئنہ کے جنت میں داخل ہونے کے لئے بھی یہ شرط بتائی کہ **فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي** (۲۹/۲۹)۔ ”تو میرے بندوں کے گروہ میں شامل ہو جا اور یوں جنت میں داخل ہو جا۔ اس کے بغیر تو جنت میں داخل نہیں ہو سکتا“ آپ نے غور فرمایا کہ وہ جو ہم نے گھڑی اور اس کے پرزدوں کی مثال سے بات واضح کی تھی، قرآن کریم نے اسے کس طرح ایک حقیقت کے طور پر بیان کیا ہے۔ یعنی افراد کے نفس (ذات) کا متوازن اور مطمئن ہونا ضروری ہے لیکن یہ نفس الگ الگ مقصدِ حیات حاصل نہیں کر سکتے ان کا جماعت کی مشینری کے اندر فیٹ ہونا نہایت ضروری ہے اس طرح یہ جنتی زندگی حاصل کر سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جنتِ جہنم، دونوں کے متعلق یہ کہا کہ ان میں جماعتیں داخل ہوں

کی (۳۹/۲۱)۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے پیغام میں اسلام اور جماعتی زندگی کو لازم ملزوم قرار دیا ہے، اور یہ درحقیقت تفسیر ہے اُس قرآنی نکتہ کی، جسے حضرت عمرؓ نے ان تین الفاظ میں سمو کر رکھ دیا تھا کہ لَا إِسْلَامَ إِلَّا بِالْجَمَاعَةِ۔ جماعت کے بغیر اسلام کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ساتھ ہی اقبالؒ نے فرد اور جماعت کے باہمی تعلق پر بھی بڑی شرح و بسط سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ رموز بخودی میں کہتے ہیں :-

فرد را ربط جماعت رحمت است :- جو ہر اور اکمال از ملت است

فرد می گیرد، ز ملت احتتام :- ملت از افراد می یابد نظام

دین کے اسی اجتماعی نظام کو خلافت راشدہ یا مکتب اسلامیہ کہا جاتا ہے۔ یہ مملکت مشتمل ہوگی ایک امت پر، جس میں نہ کوئی مذہبی فرقہ ہوگا نہ سیاسی پارٹی۔ اس امت کا ضابطہ خدا کی کتاب ہوگا اور انہیں

مرکزِ ملت | اس کتاب کے مطابق چلانے والی اس مملکت کی سنٹرل اتھارٹی، جسے مرکزِ ملت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اسی کی تشریح میں اقبالؒ کہتا ہے :-

قوم را ربط و نظام از مرکز سے :- روزگارش را دوام از مرکز سے

محسوسات کے خوگر انسان کے لئے ایک محسوس مرکز کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلام میں یہ محسوس مرکز، کعبہ ہے جسے خدا نے ”بیت“ (اپنا گھر) کہہ کر پکارا ہے اور اسے تمام امت کے لئے قبلہ قرار دیا ہے۔ قبلہ کے معنی ہوتے ہیں، وہ نصب العین جو ہر وقت نظروں کے سامنے رہے (مثال کے طور پر جیسے) اگر آج ماسکو کہا جائے تو اس سے مقصد ایک شہر نہیں ہوتا بلکہ کیونکہ نظام کے مرکز کی محسوس شکل ہوتا ہے۔ یہی حیثیت دین کے نظام میں کعبہ کی ہے جس کے متعلق کہا کہ وَجَّيْتُ مَا كُنْتُمْ قَوْمًا وَجَّهَكُمْ شَطْرَهُ (۲/۱۴۴) ”تم دنیا میں کہیں بھی ہو، تمہاری نگاہیں اسی مرکز کی طرف ہونی چاہئیں“

آمین (کتاب اللہ) کی وحدت اور مملکت کی وحدت اور اُن کے ساتھ اس محسوس مرکز کی وحدت سے امت کی وحدت برقرار رہتی ہے۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو کیسے حسین انداز میں بیان کیا ہے کہ :-

چہست ملت، لے کہ گوئی لا الہ باہزاراں چشم بودن یک نگاہ

مردہ؟ از یک نگاہی زندہ شو بگذر از بے مرکزی، پائندہ شو

کعبہ کے متعلق وہ کہتا ہے کہ وہ محض مٹی اور پتھر کی عمارت کا نام نہیں۔ وہ ملتِ اسلامیہ کی ایک نگہی کی محسوس علامت ہے۔

ارمغانِ حجاز میں ہے :-

حرم جز قبلہ قلب و نظر نیست طواف اوطاف بام و در نیست

میان ما و بیت اللہ زمیں است کہ جبریل امیں را ہم خبر نیست

یہ ہے دین کی رد سے، جماعت، اس کے مرکز اور اس کے نصب العین کی حقیقت — ایک امت، ایک ضابطہ حیات، ایک نظام زندگی، ایک مملکت اور ایک مرکز محسوس۔ لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو ان ارکان و عناصر کی شکلیں تو باقی رہ جاتی ہیں، روح اور مقصد ختم ہو جاتا ہے۔ روزانہ زندگی میں اس اجتماعیت کے مظاہر صلوة کے اجتماعات تھے لیکن اب اس کا مفہوم ”باجماعت نماز“ بن کر رہ گیا ہے اگرچہ مروجہ نماز کے لئے جماعت کی شرط بھی لازمی نہیں (نماز انفرادی طور پر بھی ادا کی جاسکتی ہے) لیکن باجماعت نماز کا ثواب زیادہ بتایا جاتا ہے۔ پھر نماز کی نیت کرتے وقت، ”منہ طرف قبلہ شریف کے“ بھی کہا جاتا ہے۔ مساجد کا رخ بھی قبلہ کی سمت رکھا جاتا ہے اور اس کے تعین کے لئے بڑی احتیاط برتی جاتی ہے کہ وہ بالکل صحیح ہو۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن محض رسوم، جن کی روح گم ہو چکی ہے۔ نماز میں سارے نمازی ”باجماعت“ کھڑے ہوتے ہیں لیکن ایک نمازی کا

ہماری موجودہ حالت

دل، دوسرے نمازی کے ساتھ نہیں ہوتا۔ اسی قسم کی تھی وہ جماعت، جس پر طعن کرتے ہوئے، منافقوں کے متعلق کہا تھا تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّى (۵۹)۔ ”تم گمان کر دگے کہ یہ ایک جماعت ہے حالانکہ ان کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتے ہیں“ آپ کو یاد ہو گا کہ قرآن کریم نے جماعت کی بنیادی شرط فَاَلْفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ (۳۳) بتائی تھی۔ یعنی جس میں افراد کے دل ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں۔ ایک اجتماع یہ تھا اور ایک اجتماع ہماری نماز کا ہے جس میں ایک دوسرے کے ساتھ کندھے سے کندھا تو ملا ہوتا ہے لیکن قلوب الگ الگ ہوتے ہیں۔ پھر اس جماعت کا ایک امام بھی ہوتا ہے جس کی آواز پر سب نمازی اٹھتے اور بیٹھتے ہیں۔ لیکن یہ ”اطاعت امام“ نماز کی حرکات و سکنات تک محدود ہوتی ہے۔ دین میں امام یا امیر کی اطاعت، زندگی کے ہر گوشے میں ہوتی ہے کیونکہ وہ امت سے قرآن کی اطاعت کرتا ہے۔ یہی صورت ”منہ طرف قبلہ شریف کی“ ہے۔ اس میں قبلہ کی طرف رخ کرنے کی شکل تو باقی ہے، اس کا مقصد ختم ہو چکا ہے۔ مقصد، نصب العین کی وحدت تھا۔ قیامت ہے کہ مختلف فرقوں کے مسلمان الگ الگ مسجدوں میں، الگ الگ فرقہ وارانہ نماز پڑھتے ہیں اور ہر ایک اپنی نماز کو باجماعت بھی قرار دیتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ ہمارا رخ قبلہ کی طرف ہے۔ حج کا اجتماع اس سے بھی زیادہ حسرت آمیز منظر پیش کرتا ہے۔ اس میں ساری امت کے افراد، اس مرکز محسوس (کعبہ) کے سامنے کھڑے ہوتے اور اس کا طواف کرتے ہیں، لیکن ان کے مذہبی اور سیاسی مراکز بھی الگ الگ ہوتے ہیں، اور ان کے دل بھی ایک دوسرے سے الگ۔

یاد رکھئے! اسلام، بحیثیت دین، اس دن ختم ہو گیا تھا، جب امت میں وحدت نہیں رہی تھی۔ یعنی جب امت مختلف مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں یا حکومتوں میں بٹ گئی تھی۔ قرآن کریم نے اس امت سے تاکید کی تھی کہ: وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (۳۰-۳۲)۔ ”یاد رکھو! تم مومن ہونے کے بعد پھر مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں مذہبی فرقے یا سیاسی پارٹیاں بنا لیں اور اس کے بعد ہر گروہ اس فریب میں مبتلا ہو کر بیٹھ گیا کہ ہم حق پر ہیں باقی سب باطل پرست ہیں“۔ چونکہ ہم ایسے ہاں امت کا ہر فرد کسی نہ کسی فرقہ سے وابستہ ہوتا ہے اس لئے قرآن کریم کی اس قسم کی آیات ان پر بڑی گراں گزرتی ہیں۔ ان کے فرقوں کے بندھن، یعنی مذہبی پیشوا، انہیں یہ کہہ کر مطمئن کرا دیتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسلام پر کوئی فرقہ بھی قائم نہ ہو؟ ہم اسلام پر قائم ہیں اس لئے ہم پر ان آیتوں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لیکن شرعاً قرآن کریم نے تو کسی فرقہ کی بھی استثنائیں نہیں کی۔ اور یہ بات بڑی واضح ہے۔ دین، امت واحدہ کی شکل میں ہی قائم اور باقی رہ سکتا ہے۔ جب امت فرقوں میں بٹ گئی تو دین باقی نہ رہا، مذہب رہ گیا۔ لہذا کوئی فرقہ یہ کہہ ہی نہیں سکتا کہ ہم دین پر قائم ہیں۔ دین پر قائم امت ہوتی ہے۔ افراد یا فرقے مذہب پرست ہو سکتے ہیں، دین پر قائم نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے اللہ نے رسول اللہ سے کہا کہ: اِنَّ السَّيِّئِينَ فَرَقُوا دِيْنَهُمْ وَكَانُوا شِيعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۲۶)۔ ”جو لوگ دین میں فرقے پیدا کر لیں اے رسول! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا“۔ رسول کا تعلق یا واسطہ امت سے ہوتا ہے، فرقوں سے نہیں۔

یہودی مذہب پرست تھے۔ ان کی امت کی وحدت ختم ہو چکی تھی حتیٰ کہ قومی مرکزیت تک بھی تباہ ہو چکی تھی۔ ان کا محسوس مرکز — یروشلم — بھی ان کی تولیت میں نہیں رہا تھا۔ دوسرے الفاظ میں، ان کا دین، مذہب میں تبدیل ہو چکا تھا۔ لہذا جب ان سے کہا گیا کہ: اَقِمْوْا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ (۲۴۷) تو وہ جواب میں کہہ سکتے تھے کہ ہم تو اپنے طرق پر خدا کی پرستش کرتے ہیں (یہ اقامتِ صلوٰۃ ہے) صدقہ، خیرات بھی دیتے ہیں (یہ ایسے زکوٰۃ ہے)۔ تو آپ ہم سے اود کیا چاہتے ہیں؟ ان سے کہا گیا کہ نہ یہ صلوٰۃ، نہ یہ زکوٰۃ۔ یہ تو رسمی پرستش، یا انفرادی ”نیکی کے کام“ ہیں دین نہیں دین کی پہلی شرط یہ ہے کہ جو لوگ اجتماعی حیثیت سے دین کا نظام قائم کر رہے ہیں (سَٰرِکِیْنِ)۔ تم ان کے ساتھ شامل ہو کر اطاعتِ خداوندی کرو۔

یہ تھی اسلام کی طرف آنے کی وہ دعوت، جو اہل کتاب کو دی گئی تھی۔

کے رسمی ارکان و فرائض کی ادائیگی سے یہ نہ سمجھ لو کہ یہی بتو حاصل ہو گیا۔ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (۲/۱۷۷) ”بہر یہ نہیں ہے کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف“ اس کے بعد کہا کہ ”بہر یہ ہے کہ تم خدا کی صداقتوں پر ایمان لانے کے بعد اپنا مال و دولت تعمیرِ انسانیت کے لئے عام کر دو“ ذرا آگے چل کر کہا کہ: وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مِمَّنْ اتَّقَى (۲/۱۷۹) ”بہر یہ نہیں کہ تم اپنی رسم کے مطابق مکان کے سامنے کے دروازے سے آتے ہو یا پچھلے دروازے سے۔ بہر یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کس قدر کرتے ہو“ اسی کی تاکید جماعتِ مومنین سے کی جب کہا کہ: وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى (۲/۱۸۰) ”تم بہر اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کیا کرو“ یہی وہ بہر کے کام ہیں جن کے لئے باہمی مشاورت کی بھی ضرورت بتائی گئی ہے (۲/۱۸۱) ”ضمناً، ان دونوں آیتوں میں ہر دو کے مقابلہ میں لفظ اثم آیا ہے اثم کے معنی ہوتے ہیں اضمحلال، افسردگی، تکان، ضعف اور اس کی وجہ سے صحتِ زندگی میں دوسروں سے پیچھے رہ جانا۔ اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ بتو کس طرح جوہرِ انسانیت کی نمود اور زندگی میں کشادہ پیدا ہوتی ہے۔

بہر حال، یہودیوں سے کہا گیا (اور ظاہر ہے کہ یہاں ان کے مذہبی پیشواؤں سے بالخصوص خطاب ہے) کہ تم دوسروں کو تو بہر اور تقویٰ کی تاکید کرتے رہتے ہو، لیکن کبھی نہیں دیکھتے کہ خود تم میں بھی یہ صفات پیدا ہو رہی ہیں یا نہیں۔ یہاں الفاظ ہیں: وَتَنَسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ (۲/۱۸۱) ”تفسون کے مادہ

علماء و مشائخ کی حالت

(ن۔ س۔ ی) کے بنیادی معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو ناقابلِ التفات سمجھ کر اس کی حفاظت ترک کر دینا۔ اس سے بے اعتنائی برتنا۔ انسانی زندگی میں سب سے زیادہ گراں بہا مقام انسان کی ذات (نفس) کا ہے۔ اس لئے اس کی حفاظت کی انتہائی کوشش کرنی چاہئے۔ حفاظتِ نفس کے معنی ہوں گے اقدارِ خداوندی کی پابندی سے اپنی ذات کی نشوونما کرنا۔ قرآنِ کریم ان مذہبی پیشواؤں کو الزام یہ دیتا ہے کہ تم دوسروں کو تو ان اقدار کی پابندی کی اس قدر تاکید کرتے رہتے ہو لیکن یہ کبھی نہیں سوچتے کہ تم خود ان کی کس قدر پابندی کرتے ہو۔ قرآنِ کریم نے ان کے علماء کے متعلق کہا ہے: كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا يَكْفُرُونَ (۲/۱۸۲) ”ان لوگوں کی مثال، جنہیں توہرات جیسی کتاب دی گئی تھی، لیکن وہ اس کے احکام کی پابندی نہیں کرتے ایسی ہے جیسے کسی گدھے پر مقدس کتابیں لاد دی گئی ہوں“ وہ کتابوں کی نمائش کرتا پھرے گا لیکن رہے گا گدھے کا گدھا۔ یہی کیفیت ہوتی ہے ان عالموں اور واعظوں کی، جو ساری عمر دوسروں کو وعظ و نصیحت کرتے رہتے ہیں اور اپنی سیرت و کردار میں کوئی تبدیلی نہیں کرتے۔ وہ اس وعظ و نصیحت کو اپنے روزگار کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے: إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (۹۳)۔ ”علماء مشائخ کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ وہ لوگوں کا مال ناجائز طریقے سے کھا جاتے ہیں اور بجائے اس کے، کہ لوگوں کو خدا کی طرف جانے والے راستہ پر چلائیں، اسٹے ان کی راہ میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔“

قرآن کریم نے ان لوگوں کے متعلق ایک اور اہم بات بھی کہی ہے اور وہ یہ کہ یہ عام لوگوں کو وعظ و نصیحت تو کرتے ہیں لیکن عملاً انہیں برائیوں سے روکتے نہیں۔ لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمْ إِلَّا نَحْمَ وَآكُلُهُمُ السَّحْتُ لَمَبْسٌ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (۹۴)۔ ”ان کے علماء اور مشائخ لوگوں کو معیوب حرکات سے روکتے نہیں۔ یعنی جو لوگ دوسروں کا مال حرام طریقے سے کھا جاتے ہیں (یعنی دولت مند، سرمایہ دار طبقہ) یہ انہیں اس سے روکتے۔ یہ اس لئے کہ اس سے خود ان کے اپنے روزگار پر زبرد پڑتی ہے۔“ قرآن کہتا ہے کہ ”یہ ان کی خدا پرستی نہیں، بلکہ مذہب کو انہوں نے ایک انڈسٹری (صنعت) بنا رکھا ہے۔“ (نیز ۹۵)۔

پھر وہ کہتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ يُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا (۹۶)۔ ”یہ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں کہ لوگ ان کی، اُن کے ان کاموں کی وجہ سے تعریف کریں، جنہیں یہ کرتے نہیں۔“ آپ اپنے ہاں کے بزرگوں کے جانشینوں کو دیکھئے خواہ ان کا تعلق علمی مراکز سے ہو اور خواہ تصوف کی خانقاہوں سے۔ یہی تھیں کہ ان میں کوئی محاسن نہیں ہوں گے، ان کے کیرکٹر میں دنیا بھر کے عیوب نظر آئیں گے لیکن وہ ”اعلیٰ حضرت“ کی اولاد یا ان کے مزار مقدس کے مجاور ہونے کی حیثیت سے انتہائی عزت و تکریم کے مستحق سمجھے جائیں گے۔ معتقدین آئیں گے، ان کے حضور نذرانے بھی پیش کریں گے اور ان کے پاؤں بھی چومیں گے۔ اور یہ اس سے بہت خوش ہوں گے۔ یہ تھی حالت یہودیوں کے احبار رہبان کی۔ واضح رہے کہ ان میں اچھے لوگ بھی تھے اور قرآن کریم کی کشادہ نگہی اور وسعتِ قلب ملاحظہ فرمائیے کہ وہ ان کے ان اچھے لوگوں کی تعریف کرتا ہے۔ وَ مِنْهُمْ الصَّالِحُونَ وَ مِنْهُمْ دُونَ ذَلِكَ (۹۷)۔ ”ان میں اچھے لوگ بھی ہیں اور بُرے لوگ بھی۔“ یہ اچھے لوگ الحق کے ذریعہ لوگوں کو ہدایت بھی کتے ہیں اور اسی کے مطابق انصاف بھی کرتے ہیں۔ (۹۸ ذ ۳۲)۔ یہی اچھے لوگ تھے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا (۱۱۳-۱۱۲ ذ ۳۲) لیکن یہ اچھے لوگ خال خال تھے۔ ان کی اکثریت کا یہی عالم تھا کہ وہ ”دیگرانِ نصیحت خود را نصیحت“ کے مسلک پر کار بند تھے اور لوگوں کی نظروں میں پارسا بننے کے لئے الکتاب کی تلاوت بھی کرتے رہتے تھے (تلاوت کا وسیع مفہوم آگے چل کر اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا)۔

قرآن کریم اس منفی پہلو کے بعد پھر مثبت گوشہ کی طرف آیا اور ان سے کہا کہ تم پر جو ذلت و مسکنت اور ادا برداری

کا عذاب ملا ہے اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تمہارے جو ہر انسانیت بیدار ہوں اور تمہاری صلاحیتیں نشوونما پائیں۔ اس کے لئے کہا کہ :-

وَأَسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقَوْنَ رَبَّهُمْ وَإِنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

۲۴۶-۲۵۵

ان آیات کا عام ترجمہ یہ ہے کہ مہتمم صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ خدا سے معاونت طلب کرو۔ لیکن یہ منزل بڑی کٹھن ہے۔ اس لئے یہ عام لوگوں بڑی گراں گزرتی ہے اسے وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو قوانین خداوندی کے سامنے جھکتے ہیں اور انہیں اس کا خیال رہتا ہے کہ انہیں عدالت خداوندی میں اپنے اعمال کا حساب پیش کرنا ہے۔

یہاں پہلا لفظ استعانت ہے، اور استعانت کے متعلق جلد اول میں آیت (۲۴۶) کے تحت بڑی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ (ملاحظہ ہو جلد اول ص ۲۴۶) وہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ صبر و صلوٰۃ کی رو سے استعانت کس قدر صبر آزما اور ہمت طلب مرحلہ ہے۔ وہ مرحلہ، جس میں ہر قسم کے نقصانات برداشت کرنے اور مصائب جھیلنے پڑتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض اوقات جان تک کی قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔ اسی لئے یہاں کہا کہ یہ منزل بڑی کٹھن ہوگی۔

صلوٰۃ کے متعلق بھی جلد اول میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے کہ اس سے مراد اس نظام کی تشکیل ہے جس میں افراد و معاہدات احکام خداوندی کی اطاعت کرتے چلے جائیں۔ دوسرا لفظ صبر ہے۔ صبر کے معنی ہوتے ہیں ثبات و استقلال کے ساتھ مخالفتوں کا مقابلہ کرنا۔ اس طرح جم کر کھڑے ہو جانا کہ پائے ہمت میں ذرا سی لغزش نہ آنے پائے۔ اپنی ذات کو ایسا متوازن بنالینا کہ حوادث زمانہ کے ہچکولے اُسے ذرا بھی ڈانوا ڈول نہ کر سکیں۔

صدیوں کی غلامی، محکومی، خانماں خرابی، لامرکزیت سے بنی اسرائیل میں ثبات و استقامت کی صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں۔ قرآن کریم نے کئی ایک مقامات پر یہ بتایا ہے کہ ان کی کمزوری

استقامت

اور دونوں ہمتی کس حد تک پہنچ چکی تھی۔ سورة البقرہ میں، قصہ آذربائش (حضرت طالوت اور جالوت کے ضمن میں کہا گیا ہے کہ اُن کا کمانڈر انہیں میدان جنگ کی طرف لے چلا تو اُن سے کہا کہ آگے جو ندی آتی ہے اس پر پانی پینے نہ بیٹھ جانا۔ اپنی پیاس کو روکنا۔ لیکن وہ اتنا بھی ضبط نہ کر سکے (۲۴۶-۲۵۲)۔ اس سے ذرا پہلے ہے کہ وہ دشمن کے مقابلہ کے لئے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکلے لیکن موت کے ڈر سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے (۲۴۷)۔ ان کی یہی بزدلی اور دونوں ہمتی تھی جس کی وجہ سے ان کی کیفیت یہ ہو چکی تھی کہ موت کے تصور سے ان کی جان جاتی تھی (۲۴۷)۔ بنا بریں یہ ضروری تھا کہ ان سے کہا جاتا کہ اگر تم دوبارہ زندگی چاہتے ہو تو اس کے لئے شرط اول یہ ہے کہ تم احکام خداوندی کی اطاعت کرو لیکن اس میں بڑے

استقلال و استقامت کی ضرورت ہوگی۔ قرآن کریم نے دین کے راستہ کو (الْعَقَبَةُ) سے تعبیر کیا ہے (۹۱)۔ اس کے معنی ہوتے ہیں پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا۔ آپ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے اس ایک لفظ میں ان جملہ تفصیل کو کس اعجاز سے سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ یہ ہے دین کی وہ گھاٹی جس کے متعلق کہا کہ جب وہ عام لوگوں کے سامنے آتی ہے تو وہ گھبرا جاتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ اس پر کیسے چڑھا جائے گا لیکن جنہیں اس کا یقین ہوتا ہے کہ زندگی کی رفعت و بلندیاں اس پر چڑھے بغیر حاصل نہیں ہو سکتیں، وہ اسے دشوار گزار راستہ نہیں سمجھتے۔ وہ اس پر چڑھتے ہیں اور قدم قدم ہی سہی، چوٹی پر پہنچ کر دم لیتے ہیں۔

ظن کے معنی | آیت (۲۴) میں لفظ يَظُنُّونَ آیا ہے۔ عام طور پر ظن کا لفظ حق اور یقین کے مقابلہ میں آتا ہے۔ لیکن علمائے لغت کا کہنا ہے کہ اگر اس کے بعد اَنِّ یا اَنَّ کا حرف آئے تو

اس کا مفہوم یقین کے قریب ہو جاتا ہے۔ لہذا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں ہر وقت یہ خیال رہتا ہے کہ ہم نے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے اپنے تمام اقوال و اعمال کا حساب دینا ہے۔ یعنی ان کے نتائج ہمارے سامنے آکر رہیں گے۔ رب کی ملاقات اور ”الیہ راجعون“ کا تفصیلی مفہوم جلد اول (صفحہ ۲۵) پر بیان کیا جا چکا ہے۔ اسے دھرانے کی ضرورت نہیں اس کا مفہوم ہوتا ہے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق اعمال کے نتائج کا سامنے آنا۔ یہودیوں کو یہ بات واضح طور پر اس لئے سمجھائی اور بتائی گئی کہ وہ قانونِ مکافات کے قائل ہی نہیں رہے تھے۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) وہ تو یہ کہتے تھے کہ ہم خدا کی جہیتی اولاد ہیں (۵/۱۸) اور جنت ہمارے لئے (RESERVE) ہو چکی ہے (۲۳/۱۱)۔ لہذا ان سے یہ کہا گیا کہ اگر حیاتِ نو چاہتے ہو تو تمہیں ان تمام باطل عقائد و نظریات کو ذہن سے نکالنا ہوگا اور اس حقیقت پر ایمان لانا ہوگا کہ حقیقی زندگی اور اس کی خوشگواریاں، قوانینِ خداوندی کی اطاعت اور مستقل اقدار کی پابندی ہی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ باطل کی فریب انگیز جھوٹی آرزوؤں اور تمناؤں سے نہیں۔ یہودیوں سے یہ بات براہِ راست کہی اور مسلمانوں سے بالواسطہ کہا کہ تم بھی کان کھول کر سن لو کہ: لَيْسَ بِأَمَانِيَّتِكُمْ وَلَا أَمَانِي أَهْلِ الْكِتَابِ۔ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ۔ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا

قانونِ مکافات | (۱۳۳)۔ ”فیصلہ نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہوگا اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں کے

مطابق۔ فیصلہ ہوگا ہمارے اس قانون کے مطابق کہ جو شخص بھی غلط کام کرے گا، کسے باشد، اس کا نتیجہ اس کے سامنے آئے گا۔ وہ اپنے دل میں ہزار یہ سمجھے کہ میرے بزرگ میری سفارش کر دیں گے اور فذاب سے بچا لیں گے، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ کوئی ایسی ہستی اور قوت نہیں جو قانونِ خداوندی کے خلاف کسی کی کوئی مدد کر سکے“ دوسری طرف کہا: بَلَىٰ

مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ. وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۲۲۳)۔ جو شخص بھی احکام خداوندی کے سامنے تسلیم خم کر دے گا اور خلوص قلب سے ان کی اطاعت کریگا تو اللہ کے ہاں سے اُسے اس کا اجر ملے گا۔ اور وہ اجر یہ ہوگا کہ ایسے لوگ خوف اور حزن سے مامون رکھے جائیں گے۔ یہاں یہود کو جو دارنگ دی گئی ہے، اس کی مزید تفصیل آئندہ باب میں ہمارے سامنے آئے گی۔

خلاصہ باب سوم

جو اصول اور پر بیان کیا گیا ہے یعنی یہ کہ جو قوم قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے گی، وہ سرسبز و شاداب رہے گی اور جو ان کے خلاف چلے گی وہ تباہ و برباد ہو جائے گی (اس کی زندہ مثال قوم بنی اسرائیل ہے جو اس وقت (۱۷۰۰ سال پہلے) ان قوانین کی اس شدت سے مخالفت کر رہی ہے تم ان سے کہہ دو کہ تم اپنی تاریخ کے اس عہد کو سامنے لاؤ جب تم قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ تم نے دیکھ لیا تھا کہ اس دور میں تمہیں کس قدر آسائشیں اور راحتیں، سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب تھیں۔

پھر تم نے اس روش کو چھوڑ دیا، تو اس کا نتیجہ بھی تمہارے سامنے ہے — یعنی دنیا بھر کی ذلت و رسوائی (۲/۲۲۳)۔

اب پھر ایسا موقع آیا ہے کہ تم چاہو تو اپنی گم گشتہ جنت کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہو۔ تم میرے قوانین کی اتباع سے (اپنے عہد کو پورا کرو اور پھر دیکھو کہ میں کس طرح ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہوں جن کا میں نے تم سے، اس کے بدلے میں وعدہ کیا تھا (۲/۲۲۳)۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تم تمام غیر ضروری قوتوں کا خوف اپنے دل سے نکال ڈالو، اور صرف میرے قوانین کے سامنے جھکو، اور ان کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے ڈرو، اور محتاط رہو۔ اس ابدی حقیقت کو یاد رکھو کہ خدا کے قوانین اپنی نیتیم خیزی میں اٹل ہوتے ہیں۔ جب اور جہاں بھی کوئی

قوم ان پر عمل پیرا ہوگی، ان کے خوشگوار نتائج سے مستمتع ہو جائے گی جو خلافت درزی کرے گی، تباہ و برباد ہو جائے گی اسی کو قوموں کی تقدیر اور تاریخ کہتے ہیں۔ لہذا اگر تم اپنی تقدیر بدلنا چاہتے ہو تو اپنی روش کو بدل لو۔

اس کا عملی طریقہ یہ ہے کہ تم اس ضابطہ قوانین (قرآن) پر ایمان لاؤ جسے ہم نے (اس رسول پر) نازل کیا ہے۔ یہ (علاوہ اور باتوں کے) ان تمام دعادی کو بھی سچ کر دکھائے گا جو تمہارے ہاں نظری طور پر موجود ہیں۔ چونکہ اس کی تعلیم بنیائی طور پر دہی ہے جو کبھی تمہیں بھی دی گئی تھی (اور جواب اپنی اصلی شکل میں تمہارے پاس نہیں)، اس لئے تمہیں چاہئے تھا کہ تم یکک کر اس کی طرف آتے۔ لیکن، اس کے برعکس، تم نے اوروں سے بھی پہلے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ ایسا نہ کرو ہم جانتے ہیں کہ تمہیں مذہبی پیشوائیت کی بنا پر کچھ دنیاوی مفاد حاصل ہیں۔ (۱۱۴-۱۱۵) اور تمہارے خود ساختہ عقائد و رسومات تمہاری قومی گروہ بندی کا موجب بن رہے ہیں جن کا چھوڑنا تم پر گراں گزرتا ہے (۱۱۶) لیکن اس ضابطہ کے اتباع سے جو کلی مفاد حاصل ہوں گے، وہ ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوں گے۔ لہذا تم اسی کے مطابق زندگی بسر کرو۔

تمہاری موجودہ روش یہ ہے کہ کہیں تم، حقیقت پر یکسر پردہ پوشی کر کے اُسے لوگوں کے سامنے آنے ہی نہیں دیتے (۱۱۷)، اور کہیں (وحی کے ساتھ اپنی خود ساختہ شریعت کو ملا کر) حق اور باطل کو اس طرح خلط ملط کر دیتے ہو کہ باطل، حق بن کر دکھائی دیتا ہے۔ اور تم یہ سب کچھ اپنے مفاد کی خاطر دیدہ و دانستہ کرتے ہو۔ تم اپنی اس روش کو چھوڑ دو، اور قرآن کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنانے کے بعد (نظام صلوٰۃ قائم کرو، اور نوع انسان کی نشوونما کا سامان فراہم کرو، اور اس طرح تم بھی ان کے ساتھی بن جاؤ جو قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں (۱۱۸-۱۱۹)۔ ایسا صوف اس نظام معاشرہ میں ہو سکے گا جو قرآن پر ایمان رکھنے والی جماعتوں میں) کے ہاتھوں متشکل ہوگا (۱۲۰)۔ اس کتمان حقیقت اور تبلیہ حق و باطل کی روش کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ تمہاری اپنی زندگی میں عجیب تضاد اور منافقت پیدا ہو چکی ہے۔ تم دوسروں کو تو تائید کرتے ہو کہ وہ بھلائی اور کشادگی راہ اختیار کریں (۱۲۱) لیکن جب اپنی باری آتی ہے تو تمہیں یہ سب وعظ نصیحت بھول جاتی ہے اور اس کے ساتھ تم اس کے بھی مدعی ہو کہ تم کتاب اللہ کا اتباع کرتے ہو۔ ذرا عقل و فکر سے کام لے کر سوچو کہ کیا خدا کی کتاب اس قسم کی روش اختیار کرنے کی تعلیم دے گی؟

یاد رکھو! تمہاری صلاحیتوں کی نشوونما، اور تمہاری زندگی میں صحیح توازن، اُسی صورت میں پیدا ہو سکے گا کہ تم نہایت استقامت اور استقلال سے نظام صلوٰۃ پر کاربند رہو (۱۲۲)۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ راستہ تمہیں بڑا دشوار گزار اور یہ منزل بڑی کٹھن نظر آئے گی (اس لئے کہ تم خدا کے عطا کردہ دین کے بجائے مذہبی پیشوائیت کے خود ساختہ

”مذہب“ پر آنکھیں بند کر کے چلنے اور دوسروں کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو چکے ہو (۳۶-۳۷) ذ (۳۷-۳۸)۔ لیکن اگر تمہیں اس کا خیال رہے کہ تم نے خدا (کے قانونِ مکافات) کا سامنا کرنا ہے۔ تم اس قانون کی زد سے باہر نہیں جا سکتے۔ تمہارا ہر قدم اسی کیلئے اٹھ رہا ہے، تو پھر تمہارے دل میں یقیناً وہ جھکاؤ پیدا ہو جائے گا جس سے انسان، اپنے ذاتی میلانات کو چھوڑ کر، قوانین خداوندی کے سامنے سر جھکا دیا کرتا ہے۔



نوٹ: صفحہ ۱۸۱۔ سلاؤل پر عبرا، کتاب دوم کا حوالہ دیا گیا ہے۔ بائبل کے مروجہ نسخوں میں عبرا کی صرف ایک کتاب ہے

لیکن لاطینی نسخوں میں عبرا (ESDRAS) کی دو کتابیں ہیں یہ اقتباس وہیں سے لیا گیا ہے۔ (دیکھئے DR. BROWN

کی کتاب (RESEARCHES IN ORIENTAL HISTORY P.P 79-82)

چوتھا باب

آیات (۲/۲۷۷) تا (۲/۲۸۵)

داستانِ نبی اسرائیل — سینا کی وادیاں

- ۱۔ قانونِ مکافاتِ عمل
- ۲۔ جزا اور سزا
- ۳۔ شفاعت کا صحیح مفہوم
- ۴۔ ابتلا و آزمائش کا قرآنی مفہوم
- ۵۔ سمندر کیسے پار کیا تھا ؟
- ۶۔ فرعون کی محفوظ لاش۔
- ۷۔ فرعون کا ایمان — ضعفِ خودی کا مظاہرہ ...
- ۸۔ عزیر کون تھا ؟
- ۹۔ سامری کون تھا ؟
- ۱۰۔ گوسالہ پرستی۔
- ۱۱۔ شکر کا قرآنی مفہوم۔
- ۱۲۔ حضرت ہارونؑ اور حضرت موسیٰؑ دونوں کو کتاب دی گئی تھی۔
- ۱۳۔ خدا کی صفت — الباری۔ کا مفہوم۔
- ۱۴۔ باہمی خوں ریزی کی مذمت۔

چوتھا باب (آیت ۴۷ تا ۵۴)

داستان بنی اسرائیل — سینا کی واپس

يٰۤاَيُّهَا اِسْرَآئِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاِنِّیْ
فَضَّلْتُكُمْ عَلٰی الْعٰلَمِیْنَ۔

۲
۲۷۷

اس آیت میں بھی آیت ۲۷۷ کی طرح بنی اسرائیل کو انعاماتِ خداوندی کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔ ان نعمتِ خداوندی کی تفصیل سابقہ باب میں سامنے آچکی ہے۔ اسی قسم کی یاد دہانی آیت ۲۷۷ میں بھی کرائی گئی ہے۔ انعاماتِ خداوندی کی ان یاد دہانیوں سے یہ مقصد نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنے احسانات جتاتے ہیں۔ خدا تو اس قسم کے انسانی جذبات سے بلند و بالا ہے۔ اس سے مراد ان کی دنیوی حالتوں کے تقابل سے انہیں آمادہ بہ اصلاح کرنا ہے۔ اسے ایک مثال کی رو سے سمجھیے۔ ایک تندرست و توانا، خوب رو و جوان اپنی بد احتیاطیوں کی وجہ سے صحت ضائع کر دیتا ہے اور قسم قسم کے امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک نا صحت مشفق اس سے کہتا ہے کہ تم اپنی اس حالت کو یاد کرو جب تمہاری صحت قابل رشک تھی۔ تمہارے چہرے کی تروتازگی بڑی پرکشش ہوتی تھی۔ تم ہشاش بشاش زندگی بسر کرتے تھے۔ دن بھر کام کاج کرتے اور کبھی تھکان محسوس نہیں کرتے تھے اور آج تمہاری یہ حالت ہو چکی ہے! اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اگر تم اپنی ان بڑی عادات کو چھوڑ دو تو پھر سے وہی صحت اور تازگی واپس آ سکتی ہے۔ بنی اسرائیل کو جو نعمتِ خداوندی کی بار بار یاد دہانی کرائی گئی ہے تو اس سے یہی مقصود تھا۔ انہیں بتایا یہ جارہا تھا کہ تم نے قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کی تو تمہیں ایسی سرفرازیاں اور خوشگواریاں حاصل ہو گئیں جن کی نظیر تاریخ میں کم ملے گی۔ اس کے بعد جب تم نے ان قوانین سے سرکشی اختیار کی تو تمہاری یہ حالت ہو گئی۔ اگر اب بھی تم اپنی روش بدل لو تو تمہیں وہی سرفرازیاں حاصل ہو سکتی ہیں۔

چنانچہ انعاماتِ خداوندی کی یاد دہانی کے فوری بعد انہیں یہ بتایا گیا کہ تم نے کونسی غلط روش اختیار کی تھی جس کا نتیجہ

ذلت و رسوائی کی تمہاری موجودہ زندگی ہے۔ اگلی آیت میں ہے:-

وَاتَّقُوا یَوْمًا لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ
وَلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ یُنصَرُونَ۔

۲
۲۷۸

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کو پیش نظر رکھو اور اس امر کی احتیاط برتو کہ تمہارا کوئی قدم اس کے قوانین کے خلاف نہ اٹھے۔ یاد رکھو! قانونِ مکافات کی رد سے ہر شخص کو اپنے اعمال کا خمیازہ، خود بھگتنا پڑتا ہے۔ کوئی شخص کسی دوسرے کے جرم کا ذرا سا بوجھ بھی نہیں بٹا سکتا۔ نہ ہی کسی کی سفارش، کسی کے کام آ سکتی ہے۔ نہ ہی مجرم کچھ معاذتہ دے کر، سزا سے بچ سکتا ہے۔ نہ ہی کوئی شخص کسی کی کچھ مدد کر سکتا ہے۔ یہ ہے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل۔

یہودیوں کی ذلت و خواری کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے قانونِ مکافاتِ عمل کو کیسر نظر انداز کر دیا تھا اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہو چکے تھے کہ جنت ہمارے نام لکھی جا چکی ہے (۲۱۱)۔ ہم خدا کی چینی اولاد اور اس کی محبوب قوم ہیں (۵۸) اگر ہمیں، اپنے بعض اسلاف کے گناہوں کی پاداش میں جہنم میں جانا بھی پڑے گا تو وہ محض چند دنوں کیلئے ہوگا۔ پھر ہمارے سفارشی ہمیں وہاں سے نکال کر جنت میں لے جائیں گے (۲۱۲) اس سلسلہ میں انہوں نے عجیب و غریب عقائد وضع کر رکھے تھے۔ ان کی مقدس کتاب تالمود میں ہے:-

یہودیوں کے عجیب و غریب عقائد | آخرت میں (حضرت) ابراہیم علیہ السلام جہنم کے دروازے پر بیٹھے ہوں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں داخل نہ ہونے

دیں گے۔ اب رہے ایسے اسرائیلی، جنہوں نے سخت گناہ کے کام کئے تھے، سو ان کے لئے وہ ایک کام کریں گے۔ وہ ان بچوں کے ختنہ کی کھال اتار کر، جو ختنہ سے پہلے وفات پا چکے تھے، اس قسم کے اسرائیلیوں کے مقامِ ختنہ پر چکا دیں گے اور اس طرح انہیں نامختون بنا کر جہنم میں (چند دنوں کے لئے) بھیج دیں گے۔

(تالمود ص ۴۰۴)

ان اسرائیلیوں کا جہنم میں داخلہ محض ایک رسم پوری کرنے کے لئے ہوگا:-

جہنم کی آگ کا اسرائیلی گناہگاروں پر کچھ اثر نہیں ہوگا۔ (ایضاً ص ۶۵)

اور اس کی وجہ، جیوش انسائیکلو پیڈیا میں یہ لکھی ہے:-

اسرائیلی گناہگاروں کو جہنم کی آگ چھو نہیں سکتی۔ اس لئے کہ وہ جہنم کے دروازہ پر گناہوں کا اقرار کر لیں

گئے اور اس طرح خدا کی طرف لوٹ آئیں گے۔ (جلد پنجم ص ۵۸۳)

آخر دی نجات ہی نہیں، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اس دنیا کی عزت و فلاح بھی اپنے اعمال کی وجہ سے نہیں ملتی بلکہ:-

بعض کو عزت ان کے آباء اجداد کے اعمالِ حسنہ کی بدولت ملتی ہے اور بعض کو ان کی آنے والی نسلوں

کے اعمال کے صدقہ میں۔ (جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ششم ص ۶)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے کہ ”یہودیوں کی امیدوں کا مرکز ان کے آباؤ اجداد کے اعمال ہوتے تھے۔ بالخصوص یہ عقیدہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہمارے جدِ امجد ہیں“ اسی طرح (ENCYCLOPAEDIA OF RELIGIONS AND ETHICS) میں مذکور ہے کہ :-

یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق ان کے تمام بزرگوں کے اعمال ایک جگہ اکٹھے کر دیئے جائیں گے اور انہیں پھر تمام بنی اسرائیل پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس طرح ان میں سے ہر ایک کے حصہ میں نجات و سعادت آجائے گی۔ (جلد گیارہ ص ۱۲۲)

یہودیوں کے ان عقائد کی روشنی میں دیکھا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ قرآن کریم نے مندرجہ بالا آیت (نیز آیت ۱۲۳) میں جو کہا ہے کہ یہ بھی نہیں ہوسکے گا اور وہ بھی نہیں، تو اس سے ان کے انہی بطل عقائد کی تردید مقصود تھی۔ جیسا کہ ہم مسلسل لکھتے چلے آ رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ دین کی اساس و بنیاد خدا کا قانون مکافاتِ عمل ہے اور سارا قرآن گویا اسی قانون کی تشریح و تفصیل لئے ہوئے ہے۔ اس قانون کا ٹکص

قانون مکافاتِ عمل

یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل (حتیٰ کہ دل میں گزرنے والا خیال اور ارادہ بھی) اپنا نتیجہ مرتب کرتا رہتا ہے۔ اگر وہ عمل، اقدار و قوانینِ خداوندی کے مطابق ہے تو اس کا نتیجہ خوشگوار ہوتا ہے اور اگر وہ ان کے خلاف ہو تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادیاں۔ سورۃ البقرہ میں ہے: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸)۔ ”جو شخص کوئی اچھا کام کرے گا اس کا اچھا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوگا۔ جو غلط کام کرے گا اس کا تباہ کن نتیجہ بھی خود اسی کو بھگتنا پڑے گا“ سورۃ الانعام میں ہے: وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۶/۱۶۵)۔ ”جو شخص غلط قدم کرتا ہے اس کا نقصان اسی کو ہوتا ہے۔ خدا کا قانون مکافاتِ عمل یہ ہے کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا، کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا“ اس باب میں اور تو اور، کائنات کی عظیم ترین ہستی، حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اقدس سے یہ اعلان کر دیا گیا کہ: قُلْ إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۶/۱۵۰ ذ ۱۵۱ ذ ۳۹)۔ ”اے رسول! ان سے کہہ دو کہ اگر میں بھی اپنے رب کے قوانین کی خلاف ورزی کروں تو یومِ مکافات کے عذاب سے مجھے بھی چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ میں بھی اس سے ڈرتا ہوں“ قانون کی اس غیر مرئی حقیقت کو محسوس مثالوں کے ذریعے سے یہ کہہ کر سمجھایا گیا کہ: وَتَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا (۲۱/۲۱)۔ ”یومِ مکافات کو

ہم عمل کے ترازو کھڑے کر دیں گے اور اس طرح کسی پر ظلم و زیادتی نہیں ہوگی۔ اس ترازو کی کیفیت یہ ہوگی **فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ۔ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ** (۹۹)۔ غلط اور صحیح اعمال کا ایک ایک ذرہ سامنے آ جائے گا۔ اس دن کوئی کسی کو، کسی قسم کا نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکے گا (۳۴)۔ اس دن نہ بیٹا باپ کے کام آ سکے گا نہ باپ بیٹے کو بچا سکے گا (۳۵)۔ اس دن دوست، اپنے دوست سے بھاگ بھاگے گا۔ ماں اور باپ اولاد کو چھوڑ دیں گے۔ بیوی اور بچے آنکھیں چرائیں گے۔ اس لئے کہ اس دن سب کو اپنی اپنی پڑی ہوگی (۳۶-۳۷)۔ اس دن نہ کوئی سودے بازی ہو سکے گی نہ کسی کی دوستداری کوئی کام دے سکے گی۔ نہ کسی کی سفارش چلے گی (۳۸-۳۹)۔ اس دن ہر فرد، تنہا، صرف اپنی ذات کو لئے ہوئے۔ عدالتِ خداوندی میں حاضر ہوگا (۴۰-۴۱)۔

یہ ہیں خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے چند اشارات۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، سارا قرآن، اساسی اور بنیادی طور پر یہ ہیست مجموعی اسی قانون کی تفصیل اور اسی نکتہ کی تفسیر ہے کہ لے

گندم از گندم بر وید، جو ز جو ۔۔۔ از مکافاتِ عمل غافل مشو

اس تمہیدی گفتگو کے بعد آیہ زیر نظر (۲/۸۸) کے مختلف اجزاء کی طرف آئیے۔

پہلا ٹکڑا ہے: **يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا** (۲/۸۸) اس میں تجزی کا لفظ تشریح طلب ہے اس کا مادہ ہے (ج۔ز۔ی) جس کے بنیادی معنی کسی چیز کا بدلہ ہیں۔ علمائے لغت نے کہا ہے کہ اس کے معنی ایک چیز کا دوسری چیز کا قائم مقام ہونا ہے۔ یہ مفہوم ایک اہم حقیقت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ جس چیز کو عام طور پر ”عمل کا بدلہ“ کہا جاتا ہے۔ وہ درحقیقت اس عمل کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ یعنی نتیجہ، عمل کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ آپ آگ میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ یہ آپ کا عمل ہے۔ آپ کا ہاتھ جل جاتا ہے اور اس میں سخت تکلیف ہوتی ہے یہ اس عمل کا نتیجہ ہے۔ عمل تو فوراً ختم ہو گیا لیکن اس کے نتیجے نے اس کی جگہ لے لی۔ اسے عمل کی جزا کہا جائے گا۔ ہمارے ہاں عام طور پر اچھے نتیجے یا بدلے کے لئے جزا اور برے نتیجے کے لئے سزا کا لفظ بولا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں، دونوں کے لئے جزا ہی کا لفظ

آیا ہے۔ ہاتھ جلنے کی جو مثال ہم نے اوپر دی ہے اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے نہ **جزا و سزا**

کسی کو گالی دی۔ اس نے آپ کو تھپڑ مارا۔ یہ خارج سے ملی ہوئی سزا ہے۔ اس میں گالی اور تھپڑ میں کوئی ربط باہمی نہیں۔ اس کے برعکس، آپ نے آگ میں ہاتھ ڈالا تو اس کے نتیجے میں آپ شدید درد میں مبتلا ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ درد آگ میں ہاتھ ڈالنے کا فطری نتیجہ ہے۔ یہ سزا کہیں خارج سے نہیں ملی۔ خارج سے ملنے والی سزائیں یہ ہو سکتا ہے کہ جس شخص کو آپ نے

گالی دی تھی وہ آپ کو معاف کر دے۔ کوئی دوسرا شخص آپ کی طرف واری کر کے، آپ کو اس سزا سے بچائے یا آپ اسے کچھ دے دلا کر معاملہ رفع دفع کرا لیں۔ لیکن آگ میں ہاتھ ڈالنے کی جو سزا آپ کو ملی ہے اسے نہ کوئی معاف کر سکتا ہے۔ نہ کسی کی سزا اس کی کوئی تخفیف کر سکتی ہے۔ نہ کسی کو کچھ دے دلا کر آپ در دے بچ سکتے ہیں۔ اس سزا کو تو آپ کے خود ہی بھگتنا ہوگا۔ (اس سے بچا کیسے جائے گا اس کے متعلق ”توبہ“ کے عنوان میں بتایا جائے گا)۔ بالفاظ دیگر، قانون مکافات عمل کی رو سے عمل خود آپ اپنی جزا ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا **هَلْ يَجْزُونَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ** (۲/۲۴) (۲/۲۵)۔ اعمال خود اپنی جزا آپ ہوتے ہیں۔ ہر عمل کا نتیجہ، اس عمل کی جگہ آجاتا ہے۔ اس کا قائم مقام بن جاتا ہے۔ سورۃ الدھر میں ان جنت کے متعلق کہا: **وَجَزَاءُ نَهْمٍ مَّا صَبَّوْا جَنَّةً وَحَرِيدًا** (۲/۲۶)۔ ”ان کی استقامت کی جزا جنت کی شکل میں سامنے آجائے گی۔“ (نیز ۲/۲۳)۔ دوسری طرف غلط اعمال کی سزا کے سلسلے میں کہا: **ذَلِكَ جَزَاءُ نَهْمٍ مَّا كَفَرُوا وَهَلْ يُجْزَى إِلَّا الْكَافِرُونَ** (۲/۲۷)۔ ”ہم نے ان کے کفر کا بدلہ یوں دیا، اور ایسا بدلہ ہم کفر کی روش اختیار کرنے والوں ہی کو دیا کرتے ہیں“ ان آیات میں سزا اور جزا دونوں کے لئے جزا کا لفظ آیا ہے۔ دوسری جگہ جامع طور پر کہا: **الْيَوْمَ تُجْزَى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ** (۲/۲۸)۔ ”اس دن ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔“ (نیز ۲/۲۹)۔ سورۃ یسین میں ہے: **فَالْيَوْمَ لَا تَظْلُمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تَجْزُونَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ** (۲/۳۰)۔ ”اس دن، کسی شخص پر، کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوگی اور تمہیں تمہارے اعمال ہی کا بدلہ ملیگا۔“

آیت (۲/۲۸) میں **لَا تُجْزَى نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ** آیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قانون مکافات کی رو سے کوئی شخص، کسی مجرم کا بدل نہیں بن سکے گا۔ یعنی اس کے جرم کی سزا اپنے اوپر نہیں لے سکے گا۔ وہ اس کے کسی کام نہیں آ سکے گا۔ دوسرے مقام پر ہے: **يَوْمَ لَا يُغْنِي مَرُؤًى عَنْ مَرُؤًى شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ** (۲/۳۱)۔ ”جس دن کوئی دوست، کسی دوست کے کام نہیں آ سکے گا اور مجرموں کی کوئی شخص مدد نہیں کر سکے گا“ قانون مکافات کے سلسلے میں جو آیات پہلے لکھی جا چکی ہیں انہیں ایک بار پھر سامنے لائیے۔ زیر نظر آیت کے اس ٹکڑے کا مفہوم اور بھی واضح ہو جائے گا۔ آپ نے دیکھا کہ ان چار لفظوں میں کس طرح یہودیوں کے باطل عقائد کی جڑ اکھڑ کر رکھ دی گئی ہے۔

آیت زیر نظر کا اگلا ٹکڑا ہے **وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ** (۲/۳۸)۔ اس دن کسی کی شفاعت کا مفہوم | سفارش قبول نہیں کی جائے گی۔ اس میں شفاعت کا لفظ غور طلب ہے، اس لئے کہ اس میں یہودیوں کے شفاعت سے متعلق باطل عقیدے کا بطلان ہی نہیں بلکہ اس کا خود ہمارے ہاں بھی غلط

مفہوم لیا جاتا ہے اس کی تردید بھی مقصود ہے۔

”سفارش“ کی روش کس قدر قابلِ مذمت فعل اور تباہ کن نتائج کا موجب ہے، اس کا اندازہ آپ اپنے معاشرہ کی موجودہ حالت سے لگا سکتے ہیں۔ آپ ہر روز یہ شکایت کرتے ہیں کہ صاحب! اب تو کوئی کام بھی قاعدے اور قانون کے مطابق نہیں ہوتا۔ ہر فیصلہ سفارش کی رو سے ہوتا ہے۔ جس کے پاس کوئی بڑی سفارش ہے اس کا ہر کام آسانی ہو جاتا ہے۔ جس کے پاس سفارش نہیں، وہ لاکھ حق پر ہو، اس کی کوئی نہیں سنتا۔ آپ جب کسی افسر یا حاکم کے متعلق کہتے ہیں کہ اُس کے ہاں تو صرف سفارش چلتی ہے تو آپ کے ذہن میں اس کا نہایت نفرت آگیاں تصور قائم ہو جاتا ہے۔ اور جو شخص سفارش کے ذریعے حکام سے لوگوں کے غلط کام کرواتا اور مجرموں کو سزا سے بچا لیتا ہے اُسے بھی بدترین خلاف سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایسی حقیقتیں ہیں جن سے کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ اس کے بعد آپ سوچئے کہ اگر نقشہ کچھ اس قسم کا ہو کہ قیامت میں عدالتِ خداوندی میں ملزم پیش ہو۔ قانون کی رُود سے اس کے خلاف جرم ثابت ہو جائے۔ عدل کی رو سے اُسے جہنم کی سزا دی جاتے۔ بلکہ اسے جہنم میں بھیج بھی دیا جاتے۔ اس کے بعد کوئی بزرگ ہستی خدا سے اس کی سفارش کرے اور خدا اس کی سفارش مان کر اس مجرم کو جہنم سے نکال کر جنت میں بھیج دے تو آپ سوچئے کہ اس سفارش کرنے والے بزرگ اور سفارش ماننے والے خدا کے متعلق کس قسم کا تصور قائم ہوگا؟ لیکن مذہب کی دنیا میں اس بوجھ کا تماشہ دیکھئے کہ مذہب پرست طبقہ دنیاوی کاروبار میں سفارش کے اس عمل دخل کو تو اس قدمِ مذموم اور معیوب قرار دے گا لیکن قیامت میں سفارش کے اسی کاروبار کو بڑا مستحسن خیال کرے گا۔ چنانچہ شفاعت کا عقیدہ دنیا کے قریب قریب ہر مذہب میں پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے شفاعت کے اس باطل عقیدے کی بہ اصرار و تکرار تردید کی ہے۔ کہیں وہ کہتا ہے: **يَقُولُونَ هَؤُلَاءِ شُفَعَاءُ لَنَا عِنْدَ اللَّهِ** (۱۸) ”یہ لوگ اپنے معبودوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ خدا کے ہاں ان کی سفارش کریں گے؟“ لیکن حقیقت یہ ہے کہ: **مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ** (۱۸) ”جنہوں نے ظلم اور زیادتی کی ہوگی ان کا کوئی دوست نہیں ہوگا، نہ ہی کوئی شفاعت کرنے والا جس کی اطاعت انہیں کوئی فائدہ دے سکے۔“ دوسری جگہ ہے: **وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ مِنْ شُرَكَائِهِمْ شُفَعَاءُ** (۲۰) ”جن لوگوں کو یہ اپنے شرکاء سمجھا کرتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ ان کی شفاعت کریں گے ان میں سے کوئی بھی ان کا شفیع نہیں ہوگا“ (نیز ۲۵)۔ اور **فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ** (۲۷) ”شفاعت کرنے والوں میں سے کسی کی شفاعت ان کے کام نہ آسکے گی“ وہ اس کیفیت کو دیکھ کر پکاریں گے کہ: **فَهَلْ لَنَا مِنْ شُفَعَاءَ فَيَشْفَعُوا لَنَا** (۲۸) ”کیا آج کوئی شفاعت کرنے والے ہیں جو ہماری شفاعت کر سکیں؟“ اور اس کے بعد یابوس ہو کر خود

ہی ایک آو سرد کے ساتھ کہیں گے: فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِينَ (۲/۱۲۱)۔ ”آج ہمارا کوئی بھی شفاعت کرنے والا نہیں“

اہل مذہب کے عقیدہ شفاعت کی اس طرح تردید کرنے کے بعد، جماعتِ مومنین سے کہا کہ:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا مَسَارِقَكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعَ فِيهِ وَلَا خُلَّةَ وَلَا شَفَاعَةَ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۲/۲۵۴)۔

اے جماعتِ مومنین! جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اسے منفعتِ عام کے لئے کھلا رکھو، قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جب نہ توجنت مال و دولت کے عوض خریدی جاسکے گی نہ کسی دوست کی دوستی کسی کام آسکے گی۔ نہ ہی کسی کی سفارش چل سکے گی۔ جو لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں، وہ اپنے آپ پر بہت بڑا ظلم کرتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود ہمارے ہاں بھی شفاعت کا عقیدہ موجود ہے اور اس کی تائید میں قرآنِ کریم کی اس قسم کی آیات پیش کر دی جاتی ہیں جن میں (مثلاً)

آیہ ہے: مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (۲/۲۵۵)۔ ”وہ کون ہے جو خدا کے پاس کسی کی شفاعت کرے بجز اس کے، جسے خدا اجازت دے“ (اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ خدا کی اجازت سے شفاعت کی جاسکے گی اور ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کی شفاعت خدا کی اجازت سے کریں گے۔ لیکن ان آیات سے اس قسم کا نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں۔ سب سے پہلے تو اس لئے کہ اس قسم کی شفاعت کا عقیدہ قانونِ مکافات کے یکسر خلاف ہے جس کی بنیادوں پر دین کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اور دوسرے اس لئے کہ اس سے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآنِ کریم متضاد عقائد کی تعلیم پیش کرتا ہے، حالانکہ قرآنِ کریم نے اپنے منزل من اللہ ہونے کی ایک بنیادی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں تضادات اور اختلافات نہیں (۲/۲۶۰)۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کی آیات کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اس کیلئے ہمیں پہلے لفظِ شفاعت کے معانی پر غور کرنا ہوگا۔

لفظِ شفاعت کے مادہ (ش۔ ف۔ ع) کے بنیادی معنی ہیں کسی چیز کو، کسی دوسری چیز کیساتھ ملا دینا۔ دو چیزوں کا ایک دوسرے کے ساتھ متصل کر دینا۔ کسی شخص کا کسی دوسرے شخص کے ساتھ کھڑے ہو جانا۔

اس ”ساتھ کھڑے ہو جانے“ کی رُو سے اہل مذہب نے یہ عقیدہ قائم کر لیا کہ ان کے بزرگ مجرموں کے ساتھ کھڑے ہو کر خدا سے ان کی سفارش کریں گے۔ اس طرح شفاعت کے معنی سفارش ہو گئے۔ لیکن قرآنِ کریم، اس ”ساتھ کھڑے ہونے“ کے معنی کچھ اور بتاتا ہے۔

قرآنی اصطلاحات کے معانی

آگے بڑھنے سے پہلے ایک بنیادی نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآن کریم میں بہت سے الفاظ اور اصطلاحات ایسی ہیں جنہیں باطل پرست بھی استعمال کرتے ہیں اور مومنین بھی۔ قرآن کریم میں جب وہ لفظ باطل پرستوں کی طرف سے آئے گا تو اس کا وہ مفہوم ہوگا جس مفہوم میں اسے باطل پرست استعمال کرتے ہیں۔ اور جب وہ لفظ خود خدا یا جماعت مومنین کی طرف سے بولا جائے گا تو اس سے وہ مفہوم لیا جائے گا، جس مفہوم میں اسے قرآن کریم نے استعمال کیا ہے۔ مثلاً اللہ کا لفظ جب کفار یا مشرکین کی طرف سے آئے گا تو اس سے مراد اُن کے بت یا دیگر معبودان باطل ہوں گے۔ لیکن جب یہ لفظ خدا کی طرف ہوگا تو اس سے مراد وہ خدائے حقیقی ہوگا جو ہر قسم کے اقتدار کا مالک ہے۔ عبادت کا لفظ جب کفار، مشکون یا اہل کتاب وغیرہ کی طرف سے بولا جائے گا تو اس کے معنی ”پرستش“ کے ہوں گے اور جب یہ خدا یا جماعت مومنین کی طرف سے استعمال ہوگا تو اس کے معنی احکام خداوندی کی اطاعت اور اس کی محکومیت ہوگا (وقس علی ذالک) الفاظ کے ان مفاہیم کے بنیادی فرق کو سامنے رکھنے کے بعد اب لفظ شفاعت کی طرف آئیے۔ ہم نے اوپر کہا ہے کہ باطل پرست اہل مذاہب، اس سے مراد سفارش کرنا، لیتے ہیں جس کی تردید قرآن کریم نے کی ہے۔ اس کے برعکس قرآن کریم جماعت مومنین کے سلسلے میں اسے دوسرے معنوں میں استعمال کرتا ہے۔

قرآن کریم انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی پیش کرتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں بر و تقویٰ کے کاموں میں افرادِ معاشرہ باہمی تعاون کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس تعاون کا حکم خود قرآن میں دیا گیا ہے۔ (۴)۔ دنیاوی زندگی میں اس قسم کے تعاون کو شفاعت کہا جائے گا۔ یعنی کسی کا مدد کے لئے دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو جانا، اس فرق کے ساتھ کہ تعاون میں لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور شفاعت میں ایک شخص کسی دوسرے کی مدد کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ بھی اس کی مدد کرے گا یا نہیں۔ جیسے کسی مظلوم کی جائز مدد کے لئے اس کے ساتھ کھڑے ہو جانا۔

باہمی تعاون کے سلسلے میں قرآن کریم نے کہا ہے: وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۴)۔ ”بر اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی معاونت کرو۔ اثم اور عدوان کے کاموں میں معاونت مت کرو۔“ پہلی قسم کی معاونت کو قرآن کریم نے مستحسن قرار دیا ہے اور دوسری قسم کے تعاون کو ممتنع۔ اسی کو دوسرے الفاظ میں یوں سمجھایا گیا ہے مَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِّنْهَا (۲۴)۔ ”جو شخص کسی اچھے کام میں، دوسرے کے ساتھ

مدد کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اسے اس میں حصہ مل جاتا ہے اور جو شخص کسی بُرے کام میں، کسی کا ساتھ دیتا ہے تو اس کو بھی اس میں سے حصہ مل جاتا ہے۔“ یہاں سے اس دنیا میں ایک دوسرے کی شفاعت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

اب آیہ آخرت کی طرف۔ قانونِ مکافات کی رو سے انسان کے ہر عمل کا نتیجہ ساتھ کے ساتھ مرتب ہوتا رہتا ہے یعنی اس کی ذات اس سے متاثر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی کو اعمالِ نامہ کہتے ہیں (تفصیل پہلے گزر چکی ہے) لیکن قرآن کریم نے جزا اور سزا کی مجرد حقیقت کو محسوس انداز میں سمجھانے کے لئے ایسا نقشہ کھینچا ہے جیسے ملزموں کی عدالت میں پیشی ہوتی ہے اور مقدمہ کی سماعت کے بعد حکم سنایا جاتا ہے۔ مقدمہ میں حاکم کے علاوہ، مستغیث ہوتا ہے، ملزم ہوتا ہے، گواہ ہوتے ہیں، پولیس کے سپاہی ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے اسی قسم کے استعاروں میں حقیقت کو بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہا ہے کہ: **وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ** (۵۱)۔ جب ملزم ہماری عدالت میں لایا جائے گا تو اس کے ساتھ ایک پیچھے سے ہانکنے والا ہوگا اور اس کے علاوہ گواہ بھی ہوگا۔ یہ گواہ خود بخود اس شخص کے ساتھ کھڑے نہیں ہو جائیں گے۔ (جیسا کہ عدالتوں میں قاعدہ ہے) ان میں سے جسے بلایا جائے گا، وہی آئے گا اور وہی اس کی گواہی دے سکے گا جسے گواہی دینے کی اجازت دی جائے گی۔ اس کے لئے کہ: **مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ** (۷۵)۔ وہ کون ہے جو خدا کی اجازت کے بغیر اس کے حضور کسی کے ساتھ کھڑا ہو سکے؟ سورة الزخرف میں وضاحت سے بتایا کہ اس شفاعت (یا کسی کے ساتھ کھڑے ہو جانے) کے معنی گواہی دینے کے ہیں۔ فرمایا: **وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ** (۲۳)۔ یہ باطل پرست جن ہستیوں کو خدا کے سوا پکارتے ہیں، انہیں ان کے ساتھ کھڑے ہونے کا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ ایسا وہی کر سکے گا (جسے خدا کا حکم یا اجازت دے) جو واقعات کا علم رکھتا ہو۔ اور سچی گواہی دے۔ یہاں سے آپ نے دیکھ لیا کہ خدا کے ہاں شفاعت کے معنی شہادت یا گواہی دینے کے ہیں۔ یہ گواہ بہ ہمتِ مجموعی خدا کے رسول بھی ہوں گے۔ سورة المائدة میں ہے: **يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أُجِبْتُمْ** (۱۰۵)۔ جس دن اللہ رسولوں کو جمع کرے گا اور ان سے پوچھا جائے گا کہ ان لوگوں کی طرف سے تمہاری دعوت کا جواب کس قسم کا ملا تھا؟ ان رسولوں کا جواب، ان کی طرف سے گواہی (شہادت) ہوگا۔ رسولوں کے علاوہ ”ملائکہ“ کی شہادت بھی ہوگی۔ **يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَقَالَ صَوَابًا** (۱۶۵)۔ جس دن الروح اور ملائکہ صف باندھے کھڑے ہوں گے اور کوئی بات نہ کر سکے۔ ملائکہ کی تشریح اس کتاب کے بابِ اول میں کی گئی ہے۔ الروح کی تشریح اپنے مقام پر آئے گی۔

سکے گا۔ بجز اُس کے، جسے خدائے رحمن اجازت دے اور وہ صحیح اور درست بات کہے۔ دوسری جگہ کہا: مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ (۱۸)۔ ”کوئی شخص خدا کے اذن کے بغیر گواہی کے لئے کسی کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ سورۃ مریم میں ہے: لَا يَمْدِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ اَتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (۱۹)۔ ”اُن کے سوا، جنہوں نے خدائے عہد باندھ رکھا ہو (یعنی جو خدا کے مطیع و فرمانبردار رہے ہوں ان کے سوا) کوئی کسی کی تائید اور حمایت میں گواہی کا حق نہیں رکھے گا۔ سورۃ طہ میں ہے: يَوْمَئِذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اٰذَنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا (۲۰)۔ ”اس دن کسی کی شہادت کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکے گی بجز اُس کے، جسے خدا کا اذن حاصل ہو اور وہ ایسی بات کہے جو خدا کی بات سے ہم آہنگ (قوانین خداوندی کے مطابق) ہو۔“ (نیز ۳۴/۲۱، ۲۱/۲۸، ۵۳/۴۶)۔

ان مقامات سے شفاعت کا مفہوم سامنے آ جاتا ہے۔ یعنی یہ مفہوم کہ اس کے معنی سفارش کے نہیں بلکہ صحیح اور سچی شہادت دیکر کسی کی تائید اور حمایت کرنے کے ہیں۔ چونکہ یہ تائید و حمایت اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب وہ خدا کے قوانین کے مطابق ہو، اس لئے خدا نے خود اپنے آپ کو شَفِيعٌ کہا ہے۔ مثلاً سورۃ الانعام میں ہے: لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُونِهٖ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ (۶/۱۶، ۶/۲۲)۔ ”خدا کے سوا ان کا کوئی درست اور شفیع نہیں ہوگا۔“ اور سورۃ الزمر میں یہ کہہ کر ساری بات واضح کر دی کہ: قُلْ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا (۳۹/۲۳)۔ ”ان سے کہو کہ شفاعت تمام تر، ساری کی ساری، صرف خدا کے لئے ہے۔“ اگر ان آیات میں شفاعت کے معنی سفارش اور شفیع کے معنی سفارش کرنے والا کئے جائیں تو اس سے کوئی بات ہی نہیں بنتی۔ یعنی خدا تو حاکم یا فیصلہ کر نیوالا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی حاکم خود ہی سفارش کرنے والا نہیں ہو سکتا۔ لہذا شفاعت سے مراد خدا کی وہ تائید و حمایت ہے جو قوانین خداوندی کی اطاعت سے حاصل ہوتی ہے۔ اسے خدا کی نصرت بھی کہا جاتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ہمارے ہاں جو رسول اللہ یا دیگر مقررین بارگاہ خداوندی کی شفاعت بمعنی سفارش کا عقیدہ ہے، وہ صحیح نہیں۔ ویسے بھی قرآن کریم نے، رسول اللہ کو کہیں شافع یا شفیع نہیں کہا۔ شہید یا شاہد۔ گواہی دینے والا یا نگران کہا ہے (دیکھئے ۲/۱۸، ۲۱/۲۸، ۳۳/۴۸، ۴۳/۴۸)۔ علاوہ بریں جو رسول خود اپنے متعلق یہ کہے کہ اگر میں بھی خدا کی معصیت کروں تو اس کی سزا سے محفوظ نہیں رہ سکتا (۱/۶) کیا وہ معصیت کا روں کی، سفارش کر کے انہیں ان کے جرائم کی سزا سے بچانے کی کوشش کرے گا؟ قرآن کریم نے تو مجرمین کے پشت پناہ بننے کی سخت ممانعت کی ہے اور واضح الفاظ میں کہا ہے کہ خدا کے نیک بندوں کا قطعاً یہ شیوہ نہیں

ہوتا (۲۸ تا ۲۹)۔ ویسے بھی سزا کا جو قرآنی مفہوم پہلے بیان کیا جا چکا ہے اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو سفارشِ رشوت وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ”اگر میں اگلی ڈالنے سے جو در رہتا ہے، کسی کی سفارش، یا رشوت اس کو نہ دور کر سکتی ہے نہ اس میں تخفیف۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو گناہوں (جرام) کی ”بخشش“ کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس نکتہ کی وضاحت ”مغفرت“ کے عنوان میں اپنے مقام پر کی جائے گی۔ یہاں اتنے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے سفارش کا تصور قرآنی کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔

ان تصریحات سے بات واضح ہو گئی ہوگی کہ قرآن کریم نے جب بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ یاد رکھو! خدا کے ہاں کسی کی سفارش قبول نہیں کی جائے گی تو وہاں شفاعت کے معنی سفارش کے ہیں جس کا عقیدہ یہودی رکھتے تھے۔ اور جس کی تردید قرآن کریم نے کی ہے، خواہ وہ عقیدہ کسی کے ہاں بھی ہو۔

آیت زیرِ نظر کا اگلا ٹکڑا ہے: وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ (۲/۲۸) اس میں عدل کے معانی غور طلب ہیں۔

لفظِ عدل کا مفہوم اس سے واضح ہو جائے گا کہ اونٹ کے دونوں طرف جو بوجھ لادا جاتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ ہر دو اطراف کا وزن ایک دو سرے کے بالکل برابر ہو۔ ان میں سے ہر ایک کو

عدل کا مفہوم

”عدل“ کہا جاتا ہے۔ لہذا اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں ایک چیز کا، کسی دوسری چیز کے برابر ہونا۔ بنا بریں، کسی چیز کے برابر اس کا معاوضہ عدل کہلاتا ہے۔ مثلاً سورۃ المائدہ میں ہے کہ اگر کوئی حالتِ احرام میں کسی جانور کا شکار کرے تو اس کے بدلے میں اسے اس کے برابر کوئی جانور دینا ہوگا: أَوْ كَفَّارَةً طَعَامَ مَسْكِينٍ (۵/۹۵)۔ یا اس کی قیمت کے برابر مساکین کو کھانا کھلانا: أَوْ عَدْلٌ مِّذْلِكَ صِيَامًا (۵/۹۵)۔ یا اس کے بدلے میں روزے رکھنا۔ اس سے عدل کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے یعنی جرم کے معاوضے میں کوئی ایسی شے پیش یا قبول کرنا، جس سے جرم اس کے مواخذہ سے بچ جائے۔ اس میں رشوت بھی آجائے گی اور کفارہ بھی۔ کفارہ کا مفہوم بھی وضاحت طلب ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی بچہ پیدائش کے ساتھ اپنے اولیٰ ماں باپ کے گناہ کی الائنش لے کر آتا ہے۔ وہ کتنے ہی اچھے کام کیوں نہ کرے اس آلائش سے اس کی نجات نہیں ہو سکتی۔ (ان کے عقیدہ کی رد سے) جب اللہ تعالیٰ نے اس صورتِ حالات پر نظر ڈالی تو اس سے اُسے (معاذ اللہ) بڑی پریشانی ہوئی کہ اس سے تمام انسان جہنم رسید ہو جائیں گے! اس کا علاج یہ سوچا گیا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو دنیا میں بھیج دے۔ مخالفین اسے صلیب دیدیں، اور اس طرح اس کا خون ناحق انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بن

بن جائے۔ چنانچہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص حضرت مسیح علیہ السلام کے کفارہ پر ایمان لے آئے اس کی نجات ہو جائے گی کیونکہ ان کا خون ناحق اس شخص کے گناہوں کا بدلہ بن جائے گا۔

قرآن کریم نے جب کہا کہ: **وَإِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا** (۲/۱۷۷) کوئی شخص اپنے گناہوں کا کسی قسم کا بھی بدلہ کیوں نہ دینا چاہے، وہ قبول نہیں کیا جائے گا، تو اس میں رشوت وغیرہ کے علاوہ عیسائیوں کے عقیدہ کی بھی تردید ہو گئی۔ (واضح رہے کہ قسم وغیرہ توڑنے کے جس کفارہ کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے اس کے متعلق گفتگو اپنے مقام پر کی جائے گی۔ اس وقت سمجھنے کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ وہ ایسی خفیف سی لغزشیں (تم ۵۲/۲) ہیں جن کی، قانون کی رد سے، سزا جرمانہ ہوتی ہے۔ اس کفارہ کے معنی جرمانہ کی ادائیگی ہو گی۔ لیکن یہ جرمانہ یہیں ادا کیا جاسکے گا۔ آخرت میں اس کی ادائیگی کا بھی سوال پیدا نہیں ہو گا)

یہ ہے وہ عدل، جس کے متعلق یہودیوں سے کہا گیا کہ خدا کے قانون مکافات عمل میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ اس قانون کی رد سے ہر عمل اپنا نتیجہ مرتب کر کے رہے گا اور کسی قسم کا کفارہ وغیرہ دیکر اس نتیجہ سے بچا نہیں جاسکے گا۔ جو الفاظ زیرِ نظر آیت (۲/۱۷۷) میں آئے ہیں، انہیں (۲/۱۷۷) میں بھی دہرایا گیا۔

نُصْرَتُكَ مَفْهُوم آیت زیرِ نظر کا اگلا ٹکڑا ہے: **وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ** (۲/۱۷۷)۔ نصرت کے عام معنی، مدد کرنا ہیں لیکن نصرت اور اعانت میں بالعموم یہ فرق کیا جاتا ہے کہ نصرت دفعِ مصرت کے لئے خاص ہوتی ہے۔ یعنی کسی مجرم کی مدد کر کے اسے جرم کی پاداش سے بچالینا یا کسی مصیبت سے محفوظ رکھنا۔ مثلاً

سورۃ الانبیاء میں ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے خدا کو پکارا کہ وہ انہیں آئینوالی مصیبت سے بچائے تو **وَنَصَرْنَاهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَبُوا بِآيَاتِنَا** (۲۱/۷۷) ”ہم نے اسے اس قوم کی دلازدستیوں سے بچالیا جو ہمارے قوانین کی تکذیب کرتی تھی“ سورۃ الزمر میں ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرو: **مَنْ قَبِلَ أَنْ يَأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ** (۳۹/۷۷) ”قبل اس کے کہ تم اس عذاب میں مبتلا ہو جاؤ جس سے تمہیں کوئی چھڑا نہیں سکے گا“ دوسری جگہ اہل جہنم کے متعلق کہا کہ وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے: **وَلَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا** (۳۳/۷۷) ”اور وہ کوئی ایسا مددگار نہیں پائیں گے جو انہیں اس عذاب سے نجات دلا دے“ سورۃ المؤمن میں ہے کہ دربارِ فرعون کے مردِ مؤمن نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ: **فَمَنْ يَنْصُرُنَا مِنَ بَنِي اللَّهِ أَنْ جَاءَنَا** (۲۴/۷۷) ”ذرا سوچو کہ جب خدا کا عذاب آگیا تو اس سے ہمیں کون بچا سکے گا“ سورۃ ہود میں ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ تم

لے عدل یعنی انصاف کے متعلق اس کے مقام پر گفتگو کی جائے گی۔

مجھے بتاؤ: فَمَنْ يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ عَصَيْتُهُ (۲/۲۹) ”اگر میں قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کی پاداش سے مجھے کون بچا سکے گا؟“

ان آیات سے واضح ہے کہ نصرت کے معنی ہیں کسی کی مدد کر کے اُسے جرم کی پاداش سے بچا لینا خواہ اس مدد کی نوعیت اور کیفیت کچھ بھی ہو۔ یہ تصور خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے خلاف ہے۔ وہ ایسا عقیدہ رکھنے والوں سے کہتا ہے کہ جن معبودانِ باطل، یا اپنے بزرگوں کے متعلق تمہارا عقیدہ ہے کہ وہ تمہیں جرائم کی سزا سے بچالیں گے: وَلَا يَسْتَطِيعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَلَا أَنْفُسُهُمْ يَنْصُرُونَ (۲/۱۹۲) ”تمہیں سزا سے بچالینا تو ایک طرف، وہ خود اپنے آپ کو بھی پاداشِ جرم سے بچا لینے کی استطاعت نہیں رکھتے“ (نیز ۲/۱۹۳)۔ (جہاں تک خدا کی نصرت کا تعلق ہے اس کی وضاحت اس کے مقام پر کی جائے گی۔ یہاں ہم نے نصرت کے اسی مفہوم پر اکتفا کیا ہے جس کا تعلق آیت زیرِ نظر سے ہے)۔

جو کچھ اس آیت میں کہا گیا ہے اس پر ایک دفعہ پھر نظر ڈالئے۔۔۔ اور دیکھئے کہ ان مختصر سے الفاظ میں، قانونِ مکافات کی کس طرح وضاحت، اور اس کے خلاف اہل مذاہب کے ہر باطل عقیدے کی کس طرح حتمی طور پر تردید کی گئی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ جس قوم کا قرآن کریم کی اس ایک آیت پر بھی ایمان ہو اس میں عدل کا کیا تصور ہوگا، اور وہ احکام و اقدارِ خداوندی کی کس طرح پابند ہوگی اور اس طرح وہ قوم اس زمین پر کس قسم کا جنتی معاشرہ قائم کرے گی!

واضح رہے کہ قرآن کریم کی اس قسم کی آیات کا مطلب یہی نہیں کہ ایسا کچھ قیامت (آخر دی زندگی) میں نہیں ہو سکے گا۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کچھ اس دنیا کی زندگی میں نہیں ہونا چاہئے۔ خدا کا قانونِ مکافات ہر دو جہان (دنیا اور آخرت دونوں) میں یکساں نافذ العمل ہے۔



قرآن کریم، بنی اسرائیل کو ان انعامات کی یاد دہانی کر رہا ہے جن سے انہیں نوازا گیا تھا۔ اس ضمن میں اُس نے اگلی آیت میں کہا ہے:-

وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنَ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ
يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ
مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ۔

۲
۳۹

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ”تم خدا کی اس نعمت کو بھی یاد کرو کہ اس نے تمہیں قومِ فرعون کے استبداد سے نجات دلائی جو تمہیں طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا رکھتی تھی۔ ان میں ایک عذاب یہ بھی تھا کہ وہ تمہارے بچے کو ذبح کر دیتے

تھے اور نساہ کو زندہ رکھتے تھے“ ذبحِ ابناء کی تفصیل آیت (۲/۲۴۱) کے تحت سابقہ باب میں گزر چکی ہے۔ اس میں نجات کا مفہوم بھی سامنے آچکا ہے اس لئے ان تفصیل کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس آیت کے آخر میں جو آیا ہے کہ وَ فِي ذٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ (۲/۲۴۱) تو اس میں لفظِ بَلَاء وضاحت طلب ہے۔

ہمارے ہاں بَلَاء کے معنی بہت بڑی خونناک چیز یا مصیبت کے ہوتے ہیں۔ یہیں سے لفظ ابتلا ہے جس کے معنی آزمائش کئے جاتے ہیں۔ جب کسی سے کہا جائے کہ خدا کے نیک بندے کیوں مصیبتوں میں گرفتار ہوتے ہیں تو اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ خدا انہیں آزمائش میں ڈالتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں بھی جہاں جہاں اس لفظ کو خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس کا ترجمہ آزمائش ہی کیا جاتا ہے۔ یعنی خدا انہیں آزماتا ہے۔ ان کی آزمائش کرتا ہے۔ اور اس سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ خدا کا ان نیک بندوں کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ وہ اس کے مقرب بندے ہیں۔ لیکن ایسا کہنے وقت کوئی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ اس سے خدا کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے؟ آپ اپنے کسی

محرم راز سے کہتے ہیں کہ فلاں شخص ہماری دوستی کا دعویٰ تو ہر وقت کرتا رہتا ہے لیکن معلوم نہیں وہ مخلص ہے بھی یا نہیں؟ اس کے جواب میں وہ کہتا ہے کہ اُسے آزما کر دیکھ لینا چاہئے۔ یعنی اس سے کوئی بہت بڑا آزمائش کرنی چاہئے اور پھر دیکھنا چاہئے کہ وہ اسے پرہیز کرتا ہے یا نہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو اس شخص کی دوستی اور اخلاص کے متعلق یقینی طور

پر معلوم نہیں، اور اسے معلوم کرنے کے لئے آپ اُسے آزماتے ہیں۔ آپ سوچتے

آزمائش کا غلط تصور | کہ جب ہم یہ کہیں کہ خدا اپنے بندوں کو آزماتا ہے کہ اپنے دعویٰ عبدیت میں سچے اور مخلص ہیں یا نہیں، تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ خدا کو اس کا علم نہیں۔ اس آزمائش سے وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ لوگ درحقیقت کیسے ہیں! خدا علام الغیوب ہے۔ وہ دلوں میں گزرنے والے خیالات تک سے بھی واقف ہے لہذا اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ فلاں شخص کیسا ہے، خدا کے متعلق بڑا غلط تصور پیدا کرتا ہے۔ لہذا قرآن کریم میں یہ لفظ جہاں خدا کی طرف منسوب ہو اس کا ترجمہ آزمائش نہیں کرنا چاہئے۔ اس کے بعد دیکھئے کہ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

بَلَاءٌ — اِبْتِلَاءٌ (ماوہ ب۔ ل۔ و۔ یا۔ ب۔ ل۔ ی) بَلَاءِ یا اِبْتِلَاءِ کا قرآنی مفہوم | اس مادہ کے دو معانی ہوتے ہیں (۱) کسی کے متعلق جو باتیں معلوم

نہ ہوں انہیں معلوم کرنا اور (۲) کسی چیز کی اصلی حالت کا ظاہر ہونا یا ظاہر کرنا خواہ وہ اچھی ہو یا بُری۔ پہلے مفہوم کی رُو سے اسے آزمائش کہا جائے گا، اور جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، اس مفہوم کو خدا کی طرف کبھی منسوب نہیں

کرنا چاہتے۔ دوسرے مفہوم (اصلیت یا حقیقت کے ظاہر ہو جانے) کے نظائر قرآن کریم میں بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً سورة الطارق میں ہے: "يَوْمَ تَبُكُّ السَّيْرَاطُ" (۹۶)۔ "جس دن تمام چھپی ہوئی باتیں ظاہر ہو جائیں گی۔ ہر راز بے نقاب ہو جائے گا۔" سورة آل عمران میں منافقین کے سلسلے میں کہا گیا کہ جنگ کا حکم اس لئے بھی دیا جاتا ہے: "وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ" (۳/۱۵۳)۔ "تاکہ جو کچھ تمہارے دلوں میں پوشیدہ ہے وہ ظاہر ہو کر سامنے آ جائے۔" سورة المومنون میں قوم نوح کی داستان بیان کرنے کے بعد کہا: "وَأَن كُنَّا لَمَبْتَلِينَ" (۲۳/۲۳)۔ "ہم اقوام سابقہ کی سرگزشتوں کو اس طرح ظاہر کرتے رہتے ہیں۔"

دنیا میں حق و باطل کی کشمکش جاری ہے۔ کشمکش میں زندگی کے مختلف پہلو بدل بدل کر سامنے آتے رہتے ہیں۔ کہیں مشقتوں کے ہمت آزما پہلو اور کہیں خوشگوار یوں کے سکون افزا گوشے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ ان تغیرات احوال میں انسان کس قسم کے کردار کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ نامساعد حالات کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرتا ہے یا راہ فرار اختیار کر لیتا ہے۔ نامساعد حالات میں وہ خدا فراموش ہو جاتا ہے یا اس کے قوانین کی اور بھی شدت سے اطاعت کرتا ہے۔ ان تغیرات میں انسانی رد عمل کو امتلا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ مواقع جن میں انسانی کردار کی نمود ہو جائے۔ سورة الفجر میں ہے: "فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَقَّسَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ" (۹۹/۱۵)۔ "جب انسان کے حالات مساعد ہوتے ہیں تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ خوشگواریاں کن اسباب کا نتیجہ ہیں۔ وہ انہیں سرسری طور پر لیتا ہے اور تکلفاً کہہ دیتا ہے کہ بس یہ تو خدا کا فضل ہے۔ وہ جسے چاہے اس سے نوازدے۔" "وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ" (۹۹/۱۶)۔ "اور جب اس کی زندگی دوسرا پہلو بدلتی ہے اور اس پر رزق کی تنگی ہو جاتی ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ یہ اس کی کس غلطی کا نتیجہ ہے۔ وہ جھنجھنے چلانے لگ جاتا ہے کہ خدا نے مجھے خواہ مخواہ نا حق، بلا سبب ذلیل و خوار کر دیا۔" اس کے بعد قرآن یہ بتاتا ہے کہ ایسے شخص کا یہ رد عمل غلط ہوتا ہے۔ یہاں ہر بات کے لئے قاعدہ اور قانون مقرر ہے، اور یہ تغیرات احوال انہی قوانین کے مطابق رونما ہوتے ہیں۔

ان نظائر سے واضح ہے کہ ابتلا کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنا محاسبہ کرے کہ اس کی صلاحیتوں کی کس حد تک نشوونما ہو چکی ہے۔ زندگی کے اس قسم کے (مساعد اور نامساعد) مواقع اس لئے پیش نہیں آتے کہ خدا انسان کو آزماتا ہے۔ یہ اس لئے پیش آتے ہیں کہ انسان خود اپنے آپ کو آزمائے۔ اپنی ذات کا ٹیسٹ

محاسبہ و خولیش

(TEST) کرے کہ وہ کس حد تک مستحکم ہو چکی ہے۔ ان معانی کی وضاحت کے لئے سورة المدھر

میں انسانی تخلیق کے سلسلے میں کہا: "إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا" (۲/۶)۔ "ہم نے انسان کی پیدائش کی ابتدا ایک بلے جلے نطفہ سے کی اور ایسا انتظام کیا کہ رحمِ مادر میں اس کے مضمرجوہروں کی نمود ہوتی جائے تاکہ وہ ایک سننے اور دیکھنے والا انسانی بچہ بن جائے۔" یہ ہے۔۔۔ "إِبْتِلَاءً" کا صحیح نقشہ، یعنی مضمرجوہروں کا محسوس شکل میں سامنے آ جانا۔ ان کی نمود ہو جانا۔ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) اس کے لئے انسان کو کبھی نامساعد حالات میں سے گزرنا پڑتا ہے اور کبھی زندگی کی خوشگوار یوں سے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ وَبَلَوْنَهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ۔ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۲/۱۷۸)۔ "انہیں زندگی کے مختلف حالات میں سے گزرنا پڑا۔ یہ حالات کبھی خوشگوار تھے کبھی نامساعد۔ مقصد اُن سے یہ تھا کہ وہ ہر حالت میں ہمارے قوانین کی طرف رجوع کریں؛ دوسری جگہ زندگی کے خوشگوار پہلوؤں میں صحیح کردار کی نمود کو بِلَاءٌ حَسَنًا (۲/۱۷۸) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بِلَاءٌ کے اس مفہوم کی رو سے آیت زیرِ نظر میں جو کہا گیا ہے: وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ (۲/۲۱۹) تو اس میں بَلَاء کے صحیح معانی واضح ہو جاتے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ فرعون کا عذاب خدا کی طرف سے ایک آزمائش تھی۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، خدا کی طرف سے آزمائش کا تصور بنیادی طور پر غلط ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر اس کا یہ مفہوم لیا جائے کہ یہ عذاب خدا کی طرف سے آزمائش تھی تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا ایک طرف تو اس عذاب کی شکل میں انہیں آزما رہا تھا اور دوسری طرف اس نے اپنے ایک جلیل القدر پیغمبر کو بھیجا کہ وہ انہیں اس عذاب سے نجات دلائے۔ یہ تو متضاد باتیں ہوں گی۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے تمہیں فرعون کے عذاب سے جو نجات دلائی تو یہ چیز تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لئے ایک عظیم نعمت تھی زندگی کا بڑا خوشگوار پہلو تھا کیونکہ اس سے تمہیں اپنی باز آفرینی کے مواقع حاصل ہو گئے (نیز دیکھئے ۱۱۱/۴)۔ اصل یہ ہے کہ محکوم قوم کو آزادی مل جانا بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ اس سے اس قوم کو اپنی صلاحیتوں کو نشوونما دینے کے مواقع حاصل ہو جاتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم ان مواقع سے فائدہ کس طرح اٹھاتی ہے اور اس آزادی کے محاصل کو استعمال کس طرح کرتی ہے۔ یہی تھی بنی اسرائیل پر خدا کی پہلی نعمت۔

قومِ فرعون کے شکنجہٴ استبداد سے نجات دلانے کے پروگرام کی پہلی کڑی یہ تھی کہ اس قوم کو مصر کی سرزمین سے نکال کر سینا کی آزاد فضا میں بسا دیا جائے۔ یہ ہے وہ واقعہ، جس کا ذکر اگلی آیت میں آتا ہے

جس میں کہا گیا ہے کہ:

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ
فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ۔

۲
۵۰

بات یوں ہوئی کہ "وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ" اور ہم نے موسیٰ کی
طرف وحی بھیجی کہ ہمارے بندوں کو راتوں رات مصر سے نکال کر لے جاؤ۔ لیکن یاد رکھو کہ یہ مرحلہ آسانی سے طے نہیں ہوگا
گا۔ فرعون تمہارا تعاقب کرے گا۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں لے کر نکلے، اور جیسا کہ انہیں پہلے سے (WARN)
کر دیا گیا تھا، "فَاتَّبَعُواهُمْ مُشْرِقِينَ" (۲۴)۔ "صبح ہوتے ہی فرعون نے ان کا تعاقب کیا۔" اب اس منظر
کو سامنے لائیے کہ قوم بنی اسرائیل جب آگے بڑھی تو اس نے دیکھا کہ سامنے سمندر اور پیچھے فرعون کا لشکر۔ ظاہر ہے
کہ یہ قوم جس کی ہمتوں کو صدیوں کی غلامی نے کچل کر رکھ دیا تھا، گھبرا اٹھی اور کہنے لگی کہ "إِنَّا لَمُدُّرُكُونَ" (۲۵)
ہم پکڑے گئے، ہم مارے گئے۔" اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے، اُس سکون اور اطمینان کے ساتھ، جو ان حضرات
(علیہم السلام) کا خاصہ ہوتا ہے، ان سے کہا کہ "كَلَّا۔۔۔ گھبراؤ نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہوگا: إِنَّ مَعِيَ رَبِّي
سَيَهْدِي" (۲۶)۔ "ہم تنہا نہیں، میرا رب میرے ساتھ ہے۔ وہ یقیناً ہماری راہنمائی ایسے راستے کی طرف کرے
گا جس سے ہم صحیح و سلامت اپنے مستقر تک پہنچ جائیں۔"

آگے بڑھنے سے پہلے "إِنَّ مَعِيَ رَبِّي" (۲۶) کے روح پرور اور اطمینان افزا ایمان کے اظہار پر غور فرمائیے۔
تاریخ کے اوراق کو، اس واقعہ کے بعد چند صدیاں آگے کی طرف اُلٹیے اور آجیے اس غار کے دہانے پر، جس میں دو
شخصیتیں دشمنوں سے اپنی حفاظت کے لئے چھپی بیٹھی ہیں۔ خدا نے ان دونوں کو ایک دوسرے کا دوست کہہ کر
پکارا ہے۔ خطرہ کے احساس سے ایک دوست (حضرت ابوبکر صدیقؓ) کے چہرے پر، پریشانی کے کچھ آثار دیکھ کر
— جو یقیناً اپنی حفاظت کے خیال سے نہیں بلکہ اس ساتھی کی حفاظت کے خیال سے لاحق ہوئی تھی۔ جو...

جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ اس دوسرے دوست (حضرت

غار کا ساتھی صدیق اکبرؓ)

فرمایا کہ: "لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا" (۲۷)۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" یہاں
غور کیجئے! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: "إِنَّ مَعِيَ رَبِّي" (۲۶)۔ "میرا رب میرے ساتھ ہے۔"
انہوں نے اس میں اپنی قوم کو شامل نہیں کیا تھا کیونکہ اس قوم کا ہنوز خدا پر ایمان ایسا پختہ نہیں تھا۔ حضور نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمعنا کہا۔ یعنی اس میں اپنے دوست کو بھی شامل کر لیا کیونکہ اللہ پر اس کے ایمان کی پختگی میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔

اس ضمنی نکتہ کے بعد آگے بڑھتے اور دیکھتے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو کہا تھا کہ میرا رب اس راستے کی نشاندہی کرے گا جہاں سے ہم بخیر و عافیت اپنے مستقر تک جا پہنچیں گے، تو خدا کی وہ رہنمائی کیا تھی اور اس کی روشنی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کس طرح اپنی قوم کو لیکر بحفاظت آگے بڑھ گئے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم میں چند الفاظ ایسے آتے ہیں، جن کا مفہوم پہلے سمجھ لینا ضروری ہے

(۱) بحر۔ ہمارے ہاں، بحر سمندر کو کہتے ہیں لیکن عربوں کے ہاں بحر، ہر اس مقام کو کہتے تھے جہاں بہت سا پانی جمع ہو، خواہ وہ نخلستانوں کے تالاب سے ہوں، خواہ دریا اور خواہ سمندر۔ وہ سب کے لئے یہی لفظ بولتے تھے۔ اسی ضمن میں دوسرا لفظ 'یم' بھی آیا ہے۔ (۲۸)۔

(۲) فوق۔ اس کے معنی عام طور پر پھٹ جانا کہے جاتے ہیں لیکن دراصل اس کے معنی ہوتے ہیں الگ ہو جانا، جدا ہو جانا، فاصلے پر ہو جانا۔

(۳) ضوب۔ یہ لفظ بڑا وسیع المعانی ہے۔ عام طور پر اس کے معنی مارنا کہے جاتے ہیں لیکن یہ لفظ آیتوں میں کئی بار سفر کرنے کے معانی میں بھی آتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے: "وَإِذَا هَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ (۲۹)۔" جب تم اللہ کی راہ میں جہاد کیلئے نکلو" سورة مائدہ میں ہے: "إِنْ أَنْتُمْ هَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ (۳۰)۔" جب تم حالت سفر میں ہو۔"

(۴) عصا۔ (ماوہ ع۔ ص۔ و) اس مادہ کے اصلی معنی اجتماع اور اختلاف کے ہیں۔ یعنی اکٹھا ہونا اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جانا۔ لاکھی کو اس لئے عصا کہتے ہیں کہ اسے پکڑنے لے انگلیوں کو اکٹھا کرنا پڑتا ہے۔ العصا جماعت کو کہتے ہیں۔ شق العصا کے معنی ہیں جماعت میں افتراق پیدا کر دینا۔ نیز عصا کے معنی قوت اور ہر اس شے کے ہوتے ہیں جس پر سہارا کیا جائے۔

(۵) آل۔ (ماوہ ا۔ و۔ ل) یہ لفظ اولاد کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مثلاً آل یعقوب (۱۹)۔ اور رفقا اور متبعین کے معانی میں بھی۔ جیسے آل فرعون (۲۰)۔

ان مبادیات کے بعد آگے بڑھتے۔ ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لیکر سمندر کے کنارے

سمندر کیسے پار کیا گیا تھا

پہنچے تو آپ نے خدا کے حکم سے سمندر پر اپنی لاٹھی ماری۔ سمندر کا پانی پھٹ کر الگ الگ شیشے کی دیواروں کی طرح، منبج ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ ان دونوں دیواروں کے درمیانی راستے سے سمندر پار کر کے صحرائے سینا میں جا پہنچے۔ تورات میں ایسا ہی آیا ہے، اور ہمارے ہاں یہ تصور وہیں سے لیا گیا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی متعلقہ آیات پر غور کرنے سے حقیقت کچھ اور نظر آتی ہے۔ اسے پھر دہرا دیا جائے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ **إِنَّ هِيَ رِبِّي سَيْهَرٌ** (۲۴)۔ ”میرا رب میرے ساتھ ہے۔ وہ یقیناً میری راہنمائی اس راستہ کی طرف کر دے گا جہاں سے ہم بعاقبت سمندر کو عبور کر لیں گے“ خدا کی وحی نے اس راستہ کی نشاندہی کی تھی جہاں سے یہ سمندر کو باسانی پار کر سکتے تھے۔ تورات ہمیں بتاتی ہے — اور جغرافیہ سے بھی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ واقعہ بحیرہ قلزم (RED SEA) کا ہے۔ آپ ذرا نقشے پر نگاہ ڈالئے۔ بحیرہ قلزم، بحر ہند سے الگ ہو کر، عرب اور مصر کو دو قطعوں میں تقسیم کرتا ہوا بحرِ ردم کی طرف بڑھتا گیا ہے۔ حتیٰ کہ آخر میں یہ دو چھوٹی چھوٹی شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔ ہم بحرِ ردم کی طرف رخ کئے ہوں تو باتیں طرف کی شاخ ذرا بڑی ہے۔ اب اُسے نہر سوئز کے ذریعے بحرِ ردم سے ملا دیا گیا ہے۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں نہر سوئز موجود نہیں تھی۔ ان دونوں شاخوں کے درمیان مثلث قطعہ میں سینا کی دادیاں ہیں جہاں بنی اسرائیل کو پہنچنا تھا۔ بحیرہ قلزم کا یہ حصہ آج تو کافی گہرا ہے لیکن دنیا میں مرورِ زمانہ سے جو جغرافیائی تغیر تبدیل پیدا ہوتے رہتے ہیں وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ خشکیاں پانی میں اور پانی خشکیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بطلمیوس کے جغرافیہ کے مطابق بحیرہ قلزم، زمانہ قدیم میں متعدد جزیرہ سے پٹا ہوا تھا اور قیاس ہے کہ اس کا آخری حصہ اس زمانے میں اتنا گہرا نہیں ہو گا جتنا آج کل ہے۔ اس لئے مد و جزیرا ہواؤں کے رخ سے اس حصہ کا پانی نیچے کی طرف ہٹ کر اسے پایاب بنا دیتا ہو گا۔ اس سلسلے میں دو مزید باتیں قابلِ غور ہیں۔ تورات میں سمندر پھٹ جانے کا بھی ذکر ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ:-

مردانہ لوات بھرتی یورپی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک بنا دیا اور پانی دوڑھٹے

ہو گیا۔ اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ سے خشک زمین پر چل نکلے۔ (خروج باب ۱۴ - آیات ۲۲ - ۲۱)

— دوسری بات یہ کہ ۱۹۶۲ء میں یہودیوں کی طرف سے قورات کا جو ترجمہ شائع ہوا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ دورِ حاضر کی تحقیق کی رو سے معلوم ہوا ہے کہ بنی اسرائیل نے سمندر کو عبور نہیں کیا تھا بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو اس مقام سے پارے گئے تھے جو دلدل بن چکا تھا اور جہاں سرکنڈا اُگ رہا تھا۔ اسی نسبت

سے اسے (SEA OF REEDS) کہتے تھے۔ یہ مقام موجودہ ہر سوئز سے قریب واقع تھا۔ یہ اعلان امریکہ کی (JEWISH PUBLICATION SOCIETY) کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر (LISSE ZUSSMAN) کی طرف سے کیا گیا تھا۔ ان تصریحات کے بعد قرآن مجید کی طرف آئیے۔ سورة الشعراء میں کہا گیا ہے: فَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنِ اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ (۲۴۷)۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے کہ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے ”ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی اور کہا کہ تو اپنی لاٹھی سمندر پر مار“ لیکن، جیسا کہ ہم ان الفاظ کے معانی سے واضح کر چکے ہیں، ضَرْب کے معنی راستہ چلنے کے ہیں اور عَصَا کے معنی جماعت یا قوم کے۔ لہٰذا ان الفاظ کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تو اپنی قوم کو لے کر اس سمت سے سمندر کی طرف جا، جس کی بذریعہ وحی نشاندہی کی گئی ہے۔ سورة طہ میں ہے: وَلَقَدْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَسْرِ بِعَبَادِي فَأَضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا (۲۴۸)۔ اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ ہمارے بندوں کو راتوں رات مصر سے نکال لو اور اس سمت سے سمندر کی طرف جاؤ جہاں سے پانی خشک ہو چکا ہے۔ وہاں کا پانی خشک کس طرح ہوا تھا، اس کے متعلق دوسری جگہ کہا۔ وَأَتْرُكُ الْبَحْرَ رَهَوًّا (۲۴۹) ”رَهَوًّا کے بنیادی معنی دو ہیں۔ (۱) سکون، جس میں جوش و خروش نہ ہو۔ اور (۲) وہ جگہ جو کبھی بلند ہو جاتی ہو اور کبھی پست۔ سمندر کے پرسکون ہونے کے معنی تو یہ ہیں کہ وہاں اس کا جوش و خروش نہیں ہوگا۔ باقی رہا پانی کے نیچے کی زمین کا کبھی ابھڑانا اور کبھی پست ہو جانا، تو اسے سمجھنے کے لئے آپ سمندر کے کنارے (BEACH) کو سامنے لائیے اور اس کے ساتھ مد و جزر کو۔ مد کے وقت سمندر کا پانی خشکی پر چڑھ آتا ہے۔ اسے اہل لغت نے زمین کے پست ہو جانے سے تعبیر کیا ہے۔ اور جب اس میں جزر آتا ہے تو پانی نیچے ہٹ جاتا ہے اور وہی زمین ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اس لفظ (رَهَوًّا) کے ان معانی کو سامنے رکھنے اور پھر دیکھنے کہ قرآن کریم نے دو الفاظ (رَهَوًّا اور يَبَسًا) سے کس طرح ساری بات واضح کر دی ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی راہنمائی اس مقام کی طرف کی گئی تھی جہاں پانی کی گہرائی بہت کم تھی۔ اتنی کم کہ، سمندر کے جزر کے وقت وہ حصہ خشک ہو جاتا تھا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں پہنچے تو سمندر میں جزر تھا اس لئے وہ اپنی قوم کو لے کر بحیرہ مندرم کی اس شاخ کو عبور کر کے سامنے خشکی پر پہنچ گئے۔ اس کے بعد اہل فرعون وہاں آئے تو سمندر کو خشک دیکھ کر اس میں اتر گئے۔ لیکن اتنے میں سمندر میں مد شروع ہو گیا اور وہ غرق ہو گئے۔

ان مفاہیم کی روشنی میں اب پوری متعلقہ آیت دیکھئے۔ سورة البقرہ کی زیر نظر آیت میں ہے: وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ (۲۴۸) ”اور ہم نے

سمندر کے پانی کو فاصلے پر کر دیا اور تمہیں بغایت پار لگا دیا۔ اس کے بعد فرعون اور اس کے ساتھی غرق ہو گئے اور تم اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔“ آیات (۲۳۶-۲۳۷) میں وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَآئِيلَ الْبَحْرَ آيَا ہے۔ یعنی ہم نے اس طرح بنی اسرائیل کو سمندر عبور کرا دیا۔ یہ منظر، کہ سمندر میں اترنے سے پہلے اہل فرعون کا گروہ ایک طرف کھڑا تھا اور بنی اسرائیل کا گروہ دوسری طرف کی خشکی پر۔ اسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: فَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْبَحْرَ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ (۲۳۶)۔ اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کو اس راستہ سے سمندر کی طرف لے چلو جسکی ہم نے نشاندہی کی ہے وہ سمندر کے دوسری طرف خشکی پر کھڑے ہو گئے۔ اِدھر قوم فرعون کے لوگ آگئے۔ دونوں کے درمیان سمندر کا وہ حصہ حائل تھا جہاں سے بنی اسرائیل گزرے تھے۔ اس طرح یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے یوں کھڑے تھے جیسے ریت کے قودے ہوں۔ سورة طہ میں ہے: وَلَقَدْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي فَاضْرِبْ لَهُم مَّحْزَبًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَا تَخَفُ دَرَكَاوِلَ تَخْتَلِي (۲۳۷)۔ اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ میرے بندوں کو راتوں رات مصر سے نکال لے جا اور انہیں سمندر کے اس حصے سے پار لے جا جہاں پانی خشک ہو چکا ہے۔ اس طرح تمہیں نہ تو تعاقب کرنے والوں سے کوئی خدشہ ہوگا اور نہ ہی غرق ہو جانے کا ڈر۔ اور سلسلے کی آخری آیت ہے: وَاتْرَكِ الْبَحْرَ دَرَهًا (۲۳۸) انہم جندٌ مَّغْرَقُونَ (۲۳۹)۔ اور ہم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ تم تو سمندر کو چر سکون حالت میں چھوڑ دو۔ اس کے بعد فرعون کا لشکر اس میں غرق ہو جائے گا۔ یہ ہے بنی اسرائیل کے سمندر پار کرنے اور فرعون کے غرق ہو جانے کا واقعہ۔

اس واقعہ کا تذکرہ تو یہاں ختم ہو گیا لیکن اس میں دو امور درود بھی قابل ذکر ہیں۔ سورة یونس میں ہے: وَجَوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَآئِيلَ الْبَحْرَ فَاتَّبَعَهُمُ فِرْعَوْنُ وَجُنُودُهُ بَغْيًا وَعَدُوًّا. حَتَّىٰ إِذَا ادْرَاكَهُ الْغَرَقُ قَالَ آمَنْتُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا الَّذِي آمَنْتُ بِهِ بَنُو إِسْرَآئِيلَ وَآنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ (۲۴۰)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر پار کرا دیا۔ فرعون اور اس کے لشکر نے ان کا پیچھا کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو جا دبوچیں اور انہیں پھر اپنے شکنجہ استبداد میں جکڑ لیں لیکن اتنے میں پانی چڑھ آیا۔ جب فرعون نے دیکھا کہ وہ غرق ہونے لگا ہے تو پکار اٹھا کہ میں اس خدا پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں اور اعلان کرتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار

نہیں اور اس طرح میں بھی اس کے فرمانبردار بندوں میں شامل ہو جاتا ہوں۔

فرعون کا ایمان | فرعون کے اس اعلان پر، عام انسانوں کے ذہن میں یہ خیال ابھرتا ہوگا کہ اس پر بارگاہِ خداوندی سے تحسین و تبریک کے ڈونگرے برسائے گئے ہوں گے اور

ملائکہ نے جوشِ مسرت سے نعرے بلند کئے ہوں گے لیکن قرآن کچھ اور کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فرعون کے اس اعلان پر بارگاہِ خداوندی سے جواب ملا کہ :

اَلْاِنۡ- وَ قَدْ عَصٰیْتَ قَبۡلَ وَ کُنْتَ مِنَ الْمُفۡسِرِیۡنَ۔ (۱۶)

ہاں! تو اب ایمان لایا۔ حالانکہ اس سے پہلے قونے ساری عمر سرکشی اختیار کئے رکھی اور مسلسل فساد برپا کرتا رہا۔ اب تیرا یہ ایمان ہماری میزان میں پرکاش جتنا وزن بھی نہیں رکھتا۔

آپ اس جواب پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ ذہنِ انسانی میں ابھرنے والے خیال اور قانونِ مکافاتِ عمل کے مانک خدا کے جواب میں کس قدر اصولی فرق ہے۔ ایمان، قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ صداقت کے اقرار اور اعلان کا نام ہوتا ہے جس کا محرک جذبہ دفعِ مضرت ہوتا ہے نہ جلبِ منفعت۔ وہ ہر قسم کے خطرات سے بے نیاز ہو کر کیا جاتا ہے۔ اس ایمان کا اعلان، استحکامِ خودی کی دلیل ہوتا ہے۔ لیکن جو ایمان، موت کے ڈر یا کسی اور خوف کی وجہ سے لایا جائے وہ نہ صرف یہ کہ، ایمان کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا بلکہ اس ایمان لانے والے کی نزدلی (ضعفِ خودی) کی دلیل ہوتا ہے۔ ایسا شخص درحقیقت، خطرہ یا موت سے بچنے کے لئے ایمان کو اپنی سپرینا چاہتا ہے۔ اس قسم کے ایمان کے اعلان کو اس شخص کے منہ پر یہ لکھ مارا جاتا ہے کہ :-

در کفر ہم پختہ نہ زائر را رسوا مکن

اس ایمان سے تو وہ کفر ہزار درجہ بہتر ہے، جس پر انسان مصائب و خطرات کے باوجود قائم رہے۔ اس سے اس

لے اس واقعہ کے سلسلہ میں ہماری کتب روایات کا بیان بھی ملاحظہ کرتے جانیے۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے :-

حضرت فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کی خبر دیتے وقت جبریل علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا کہ لاش کہ آپ اس وقت ہوتے اور دیکھتے کہ میں اس کے (فسر عوکی) منہ میں کیچر ٹھونس رہا تھا اس خیال سے کہ کہیں اس کی بات پوئی پوئی پر حسرتِ خدا اس کی دستگیری نہ کرے۔

شخص کی بھنگی کردار کا پتہ چلتا ہے۔ اس کا کفر اس کی فکری غلطی یا تقلید کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو غالب نے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ :-

وفاداری، بشرط استواری، اصل ایمان ہے :- مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑ دیں گے

فرعون کے اس ایمان کے مقابلے میں، اسی کے دربار کے ساحرین کے ایمان کو سامنے لائیے، ضعف اور استحکام خودی کا تقابل ابھر کر سامنے آجائے گا۔ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کے لئے مملکت کے بڑے بڑے منتریوں اور پجاریوں کو بلایا تھا۔ اس کے لئے اس نے ایک بہت بڑے دنگل کا سا اہتمام کیا تھا۔ اس مقابلہ کی ہار جیت سے فرعون کا مستقبل وابستہ تھا۔ یہ اس کی آتما کا بھی سوال تھا۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ مقابلہ کس قدر اہمیت کا حامل تھا۔ مقابلہ ہوا تو ان منتریوں نے حضرت موسیٰ کی طرف سے پیش کردہ حقائق کو علی وجہ البصیرت دیکھ لیا اور اس کے بعد وہ یقیناً پکار اٹھے کہ: اَمَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ رَبِّ مُوسٰی وَهَارُونَ

ساحرین دربار فرعون کا ایمان

آئے آئے: آپ سوچتے کہ اس سے فرعون کے دل و دماغ کی حالت کیا ہوگی! شکست اور ایسی رسوا کن شکست! ذلت اور ایسی کھلی ہوئی ذلت!! وہ ایک پھرے ہوئے شیر کی طرح گر جا، کف بردہاں سیلاب کی طرح اُٹا اور کہا اَمَنْتُمْ بِهِ قَبْلَ اَنْ اُذِنَ لَكُمْ۔ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكْرُؤُمُوْهُ فِی الْمَدِیْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَا اَهْلَهَا۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۱۲۳)۔ ہیں! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ تم مجھ سے اجازت لئے بغیر خدا سے موسیٰ پر ایمان لے آئے۔ مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ یہ کوئی خفیہ سازش ہے جو تم نے مل کردار السلطنت میں کی ہے تاکہ تم اس ملک کے باشندوں کو یہاں سے نکال باہر کرو اور اس سرزمین پر اپنی حکومت قائم کرو۔ میں تمہیں ابھی اس کا مزہ چکھاؤں گا اور تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ فرعون کے خلاف سرکشی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے: لَا قَطْعَانَ اَیْدِیْکُمْ وَاُجْلَکُمْ مِنْ خِلَافِ ثَمَرٍ لَا هَلِیْتُمْکُمْ اَجْمَعِیْنَ (۱۲۴)۔ میں پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں اٹے سیدھے کٹواؤں گا اور پھر تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا۔

جو رو استبداد کی ان قہر مانی بجلیوں کو آپ نے دیکھ لیا۔ اب ساحرین کے کوہ متثال عزم و ایمان کی تجلیات کا منظر بھی ملاحظہ فرمائیے۔ انہوں نے نہایت سکون و ثبات سے فرعون کی اس گرج کو سنا۔ ایک سیم زیر لبی سے اس کی طرف نگہ حقارت سے دیکھا اور کہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ جس صداقت کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں کیا ہم تمہارے دُر سے یا موت سے بچنے کے لئے اس کی تکذیب کر دیں؟ لَنْ نُؤْثِرَکَ عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنْ

الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِي فَطَرَنَا (۲۰) جس خدا نے ہمیں پیدا کیا اور جو کچھ دلائل و بصیرت کی بنا پر ہمارے سامنے آگیا، ہم اس پر تجھے کبھی ترجیح نہیں دے سکتے۔ تیری دھمکیاں اور تحوّل و ترہیب کی شعلہ باریاں ہم پر کچھ اثر نہیں کر سکتیں۔ ”فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ (۲۱)“ جو فیصلہ تو کرنا چاہتا ہے کر ڈال، جو تیرے جی میں آئے کر گزرا، تیرے آپس ہاتھ زیادہ سے زیادہ اسی طبعی زندگی تک ہمارے گلو گیر ہو سکتے ہیں۔ اس سے آگے تو کر ہی کیا سکتا ہے؟ تیرے اقتدار کی حدود اسی دنیا تک ہیں اور خدا کی مملکت اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ ”إِنَّمَا تَقْضِي هَذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا..... (۲۲)“ تیرا فیصلہ اسی زندگی تک محدود ہے اور زندگی تو اس سے کہیں آگے جاتی ہے۔ وہاں تیرا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔“

یہ تھا وہ ایمان، جو... زمین و آسمان کو دجہ میں لے آتا ہے اور اس پر خدا اور اس کے ملائکہ تبرکاتِ تہنیت کے پھول برساتے ہیں۔ (۳۳)۔ ایک طرف اس حق گوئی و دیباکی کو دیکھئے اور دوسری طرف فرعون کی پستی کردار کو، جس نے موت سے بچنے کے لئے ایمان کی آڑ لینا چاہی۔

علامہ بریں ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے، مذہب پرست طبقہ کی طرف سے کہا جاسکتا ہے کہ توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ اُسے ہر حال قبول کر لینا چاہئے خواہ اس کا اعلان کسی وقت بھی کیوں نہ ہو۔ ایسا کہنے والوں کو معلوم ہی نہیں کہ توبہ کسے کہتے ہیں اور اس کی قبولیت کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ توبہ کے دو اجزاء، لاینفک یا باہمہر گریہ و استغاثہ ہیں۔ آپ سے کوئی غلطی ہو گئی۔ اس سے کچھ نقصان واقع ہوا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس احساس کو توبہ کہتے ہیں۔ لیکن اتنے سے تو اس نقصان کا ازالہ نہیں ہو جاتا جو اُل غلطی کی وجہ سے لاحق ہوا تھا۔ اس کے لئے تو آپ کو ایسے کام کرنے ہوں گے جن سے

توبہ کا مفہوم

اس نقصان کی تلافی ہو جائے۔ یہ اس پر وگرام کا دوسرا حصہ ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ہر جگہ تَاب کے ساتھ اَصْلَح کا اضافہ کیا ہے۔ اب اگر ایسا ہو کہ آپ کو اپنی خطا کا احساس اس وقت ہو جب آپ کے لئے کچھ کرنے کا وقت ہی نہ رہے تو یہ احساس کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں کر سکے گا۔ بالفاظِ دیگر، یہ کہا جائے گا کہ آپ کی توبہ کی قبولیت کا وقت گزر چکا۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے سورۃ النساء میں اِنْ اَلْفَاظِ میں بیان کیا ہے وَلَیْسَتْ

۱۔ اس مقام پر ہم نے سادہ عربی کے اس واقعہ کو اختصاراً بیان کیا ہے۔ اس کا تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

۲۔ اس کی تفصیل مطالب الفرقان جلد اول صفحات ۲۶-۲۷ پر گزر چکی ہے۔

التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ
 (۲۵۲) ”ان لوگوں کی توبہ، توبہ ہی نہیں جو ساری عمر برائیاں کرتے رہے لیکن جب ان کے سامنے موت آگھری
 ہوئی تو کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں“ قرآن کریم نے اسی لئے اسے توبہ تسلیم نہیں کیا کہ اس کے بعد عمل کے لئے
 وقت ہی باقی نہیں رہا تھا جس سے تلافی مافات ہو سکتی۔ یہی اٹل فرعون کے قصہ میں بھی کہا گیا۔ اس کے
 ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھئے کہ یہ جواب خدا کی طرف سے ملا تھا جو دلوں کے ارادوں
 تک سے واقف ہے۔

اس قصہ میں دوسری قابل ذکر بات وہ ہے جس کا تذکرہ، قرآن کریم میں ان الفاظ میں آیا ہے:-

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلَقَكَ آيَةً وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ
 عَنْ آيَاتِنَا لَغَفِلُونَ (۲۵۳)

(فرعون کی غرقابی کے وقت ہم آپ سے کہا کہ) آج ہم ایسا کریں گے کہ تیری لاش کو سمندر کی موجوں سے
 بچالیں گے تاکہ، یہ ان لوگوں کے لئے، جو تیرے بعد آنے والے ہیں، حقیقت کی نشانی بن جاتے۔
 اور اکثر انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں کی طرف سے ایک قلم غافل ہوتے ہیں۔

اس آیت کا صحیح مفہوم، ایک عرصہ تک مرکوز بحث و نظر بنا رہا۔ اس لئے کہ یہ بات
 سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ فرعون کی لاش کو آنے والوں کے لئے کس طرح محفوظ رکھا

فرعون کی لاش

گیا تھا۔ چونکہ حقیقت سمجھ میں نہیں آتی تھی اس لئے اس سلسلہ میں عجیب غریب افسانے وجود میں آ گئے جو ہمارے
 کتب تفاسیر میں موجود ہیں لیکن جن کا ذکر کرنا ہم ضروری نہیں سمجھتے۔ تا آنکہ اٹھارویں صدی عیسوی میں، مصر کے
 تہہ خانوں سے ان کے قدیم بادشاہوں کی مومی شدہ لاشیں برآمد ہونا شروع ہوئیں جن میں سے ایک کے
 متعلق علمائے مصریات کی تحقیق ہے کہ وہ فرعون موسیٰ (ریمیسس نانی) کی لاش ہے۔ انساٹیکو پیڈیا برٹانیکا میں اس
 کی تصریح موجود ہے۔ اس تحقیق کی روشنی میں قرآن مجید کی اس آیت کا صحیح مفہوم سامنے آ گیا۔ قرآن کریم کے حقائق و
 غوامض کا وہ حصہ، جس کا تعلق مختلف علوم سے ہے، علم و تحقیق کی روشنی میں ہی صحیح طور پر سامنے آ سکتا ہے۔
 زمانہ من حیث الکل علمی تحقیقات کی روش سے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ جوں جوں ان تحقیقات میں اضافہ ہوتا جائے گا اور

وہ قیاس سے آگے بڑھ کر یقین کے درجہ تک پہنچتی جائیں گی، قرآن کریم کے معارف، رموزِ فطرت کی طرح بے نقاب ہوتے جائیں گے، قرآن کریم کے معارف، رموزِ فطرت کی طرح بے نقاب ہوتے جائیں گے اور اس طرح وہ آیات، جو پہلے متشابہات میں داخل تھیں۔ (یعنی انہیں تشبیہاً بیان کیا گیا تھا) — رفتہ رفتہ محکمات کے ذیل میں آتی جائیں گی (۱۳۱)۔ حَتَّىٰ يَتَّبِعَنَ لَهُمْ آتَهُ الْحَقُّ (۱۳۲)۔ یہاں تک کہ یہ حقیقت مسلمہ طور سامنے آجائے گی کہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ مبنی بر صداقت ہے۔“

—:—

اس طرح، بنی اسرائیل کو، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں اہل مصر کے عذاب سے نجات ملی اور فرعونؑ اپنے جنود و عساکر کے غرق دریا ہو گیا۔ بنی اسرائیل اس کے بعد سینا کی وادیوں میں سکونت پذیر ہو گئے۔ یہاں سے ان کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے اور اسی زندگی کا ایک واقعہ اس اگلی آیت میں مذکور ہے، جو یوں ہے:

وَإِذْ وَاَعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل، مصر میں قریب چار سو سال تک رہے۔ اگرچہ وہ رہے تو محکومیت کی حالت میں، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے جداگانہ قومی تشخص کو برقرار رکھا۔ یوں کہتے کہ حاکم قوم نے انہیں اپنے سے الگ رکھا اور اس طرح ان کا جداگانہ وجود برقرار رہا۔ ان کا جداگانہ وجود تو برقرار رہا لیکن، جیسا کہ خوتے غلامی کا تقاضہ ہوتا ہے، انہوں نے حاکم قوم کے اندازِ زیست ہی کو نہیں بلکہ ان کے عقائد و نظریات تک کو غیر شعوری طور پر اپنایا اور وہ ان کے قلب کی گہرائیوں تک میں اس طرح پیوست ہو گئے کہ خدا کے دوا دوا العزم پیغمبروں — حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام کی تعلیم و تربیت کے باوجود ان کے نفوس نہ مٹ سکے۔ مصری بت پرست تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی انہوں نے بھی بت پرستی اپنا شعار بنا لیا تھا۔ قرآن کریم میں ہے کہ: وَجَوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَآئِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلَىٰ قَوْمٍ يَعْكِفُونَ عَلَىٰ آلِهَتِهِمْ تَأْمِنَةً ۖ قَالُوا يَسُوْسَىٰ اجْعَلْ لَنَا إِلَهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ (۱۳۳)۔ اور جب بنی اسرائیل سمندر پار اتر گئے تو وہاں ان کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے بتوں کی مجاور بنی بیٹھی تھی۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ہمارے لئے بھی ایک ایسا ہی معبود بناد دیجئے جیسا ان لوگوں کا معبود ہے۔“ اس فرمائش پر حضرت موسیٰ کے دل پر جو گزری ہوگی اس کا اندازہ لگایا

جاسکتا ہے لیکن ایسے لوگوں سے اس کے سوا اور کیا کہا جاتا کہ: **قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ (۱۳۸)**۔ واقعہ یہ ہے کہ تم بڑی ہی جاہل قوم ہو، کم سختو! تمہیں ابھی تک یہ اندازہ بھی نہیں ہو سکا کہ جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے اور مال کیا: **اِنَّ هَؤُلَاءِ مُتَبَرِّمًا هُمْ فِيْهِ وَابْطِلُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۳۹)**۔ یہ لوگ جس طریق پر چل رہے ہیں وہ تباہ ہو کر رہے گا اور انہوں نے جو عمل اختیار کر رکھا ہے وہ یکسر باطل ہے: **اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی** تمہیں اقوام عالم پر فضیلت عطا فرمانا چاہتا ہے اور تم ہو کہ، انسان تو ایک طرف پتھر کی مورتیوں کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی آرزو دل میں لئے بیٹھے ہو۔ ذرا سوچو تو سہی: **اَغَيْرَ اللّٰهِ ابْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (۱۴۰)**۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے لئے خدا کے سوا، کوئی اور الٰہ تجویز کر دوں حالانکہ اس نے تمہیں اقوام عالم پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ نف ہے تم پر اور تمہاری ذہنیت پر۔ لیکن غلامی سے مسخ شدہ ذہنیت سے اس کے سوا اور توقع بھی کیا کی جاسکتی تھی؟

بہ خود کے می رسدایں راہ پیلے تن آسانے ہزاراں سال منزل در مقام آذری کردہ

بہر حال، حضرت موسیٰ علیہ السلام، انہیں لے کر آگے بڑھ گئے۔ طوب کے دامن میں ڈیرے ڈال دیئے اور وہاں ان کی تعلیم و تربیت شروع کر دی۔ ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کچھ وقت کے لئے ان سے الگ ہونا پڑا۔ آیت (۲) میں اسے چالیس راتوں کی مدت کہا گیا ہے اور آیت (۱۴۱) میں، اس مدت کو، تیس جمع دس راتیں، کہہ کر پکارا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جاتے ہوئے اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام سے کہا کہ میرے بعد، تم میری جانشینی کرنا اور معاملات کو بالکل ٹھیک ٹھاک رکھنا۔ ان میں کچھ مفسدین بھی ہیں ان کا خاص خیال رکھنا (۱۴۲) لیکن ان کی غیر حاضری میں، بنی اسرائیل نے ایک بت کی پرستش شروع کر دی جس کی شباہت گائے کے پچھڑے (رجل) — گو سالہ کی سی تھی۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ لیکن اس کا ذکر کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان چند الفاظ کا تفصیلی مفہوم بیان کر دیا جائے جنہیں اس واقعہ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ سب سے پہلے اس لفظ **عَجَل** (پچھڑے) کو لیجئے۔

سورۃ التوبہ میں ہے **وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ (۹)**۔ یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔

ہمارے ہاں عام طور پر عزیر سے مراد، عذرا فقیہہ لئے جاتے ہیں جن کا ذکر تورات کی تدوین کے سلسلے میں تیسرے باب میں آچکا ہے۔ لیکن یہود کا کہنا ہے کہ ہم نہ تو

عذرا فقیہہ کو عزیر کہتے ہیں اور نہ ہی ہم انہیں (یا کسی عزیر) کو ابن اللہ مانتے ہیں۔ ہماری بعض روایات میں ہے کہ

نزولِ قرآن کے زمانے میں، مدینہ میں کچھ یہودی تھے جو یہ عقیدہ رکھتے تھے۔ امام ابن حزم نے لکھا ہے کہ یہودیوں کا صدوقی فرقہ جو میں میں رہتا تھا اس کا یہ عقیدہ تھا۔ لیکن یہودیوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ روایات ان کے لئے سند قرار ہی نہیں پاسکتیں۔

لیکن حال ہی میں بعض محققین کا خیال اس طرف گیا ہے کہ قرآن کریم نے جس عزیر کے متعلق کہا ہے کہ یہودی اسے ابن اللہ مانتے تھے اس سے مراد عذرا فقیہہ نہیں بلکہ مصر کا ”عزیر دیوتا“ ہے جس کی وہاں پرستش ہوتی تھی اور انہی کی دیکھا دیکھی یہودیوں نے بھی اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔ ہیروڈوٹس نے، آج سے قریب اڑھائی ہزار سال قبل، اس دیوتا کا نام (OSIRIS) یعنی عزیرس لکھا ہے۔ یونان میں اسماء کے بعد ”س“ زائد ہوتی ہے۔ اس صورت میں، اس دیوتا کا اصل نام عزیر ہے جو قرآنی عزیر کے بالکل مشابہ ہے۔ مصر کے آثارِ قدیمہ میں اس کا نام ”ایزار“ آیا ہے۔ اس کے نام پر جو سائنڈیل پوجا جاتا تھا اس کا نام ”ایزار ہاپی“ — یعنی عجل عزیر تھا۔ اس پچھڑے کو عزیر کی روح کا مظہر اور ”فتاح“ یعنی خالقِ خدا کا اوتار اور پٹنار (ابن اللہ) مانا جاتا تھا۔ مصر سے یہ اعتقادات نکل کر شام اور فلسطین کے علاقوں میں پھیل چکے تھے اور یہی وہ عجل (پچھڑا) تھا جس کی پرستش یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں شروع کر دی تھی (اس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہود کو اس گوسالہ پرستی سے روک دیا لیکن آپ کے بعد اس کی پرستش دوبارہ شروع ہو گئی۔ چنانچہ یہودیوں کی سلطنت کی تقسیم کے بعد، شمالی سلطنت کے بادشاہ یروبعام اول (۹۳۳ ق.م) نے عجل پرستی کو شاہی مذہب قرار دے دیا اور سونے کے دو پچھڑے بنا کر ان کی پرستش عام کر دی۔ یہی وہ عزیر دیوتا ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے۔ موجودہ زمانے میں بائبل کے عبرانی نسخوں کے تراجم کی جو تصحیح ہوئی ہے اس کے پیش نظر اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ بائبل میں بھی بنی اسرائیل کی عزیر پرستی کا ذکر موجود ہے لیکن (غلطی سے) لفظ عزیر کو ”اسیر“ سمجھ کر اس کا ترجمہ ”قیدی“ کر دیا گیا۔ اب لیگارڈ نے اپنے یونانی ترجمہ میں اس کی تصحیح کی ہے۔

مصر کے آثارِ قدیمہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ دنیا میں غالباً سب سے پہلے عزیر ہی کو ابن اللہ مانا گیا ہے۔ چنانچہ کم دیش چار ہزار سال قبل مسیح، عزیر کے متعلق یہ اعتقاد ملتا ہے کہ یہ دیوتا خداوندِ اعلیٰ ”آمن رع“ کی نسل سے، اور خداوندِ ارض کا بیٹا تھا۔ مصر سے اب ایک صحیفہ بھی برآمد ہوا ہے جس میں عزیر کے حالات درج ہیں۔

ان تصریحات سے ذہن کا رخ اسی طرف جاتا ہے کہ عزیر سے مراد مصر کا دیوتا ہے نہ کہ عذرائی۔ بہر حال، یہ تاریخی قیاسات ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بعد میں مزید انکشافات، حقیقت کو حتم و یقین کے ساتھ بے نقاب کر دیں۔ لہٰذا قرآن کریم میں ہے کہ سامری نے اس بت کو ڈھالا تھا اور اسی کی ترغیب و تلقین پر بنی اسرائیل نے اس کی پرستش شروع کر دی تھی۔

سامری السَّامِرَةُ — السَّمَرَةُ۔ یہودیوں کی ایک قوم، جو اسرائیل قبائل میں سے ہے۔ یہ لوگ بعض مسائل میں یہودیوں سے اختلاف رکھتے ہیں۔ مثلاً ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ نیز یہ چھوت پھات کے بھی قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نابلس کا شہر ہی رحب میں یہ رہتے ہیں (بیت المقدس ہے۔ ان کے دو فرقے ہیں۔ کوشان اور دوشان۔ انہی لوگوں کی طرف وہ سامری منسوب ہے جس نے بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی کی تعلیم دی تھی۔ صاحب محیط نے کہا ہے۔ کہ السَّامِرَةُ فلسطین میں ایک مقام بھی ہے اور ایک قبیلہ بھی، جو نابلس میں رہتا ہے۔ ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ودمرے لوگوں سے چھو جانے سے یہ ناپاک ہو جاتے ہیں۔ آیت (۲۶) میں اس سامری کے متعلق جس نے بنی اسرائیل کو بہکا یا تھا، ایسا ہی کچھ آیا ہے۔

لیکن عصر حاضر کی اثری تحقیقات کی روشنی میں قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ یہ شخص سمیری قوم کا فرد تھا (بنی اسرائیل میں سے نہیں تھا) حضرت مسیح علیہ السلام سے قریب ساڑھے تین ہزار سال قبل عراق میں دو قومیں آباد تھیں۔ ایک قوم، جو جنوب سے آئی تھی عرب تھی اور دوسری جو غالباً شمال سے آئی تھی سمیری کہلاتی تھی۔ اس کا وطن اگرچہ عراق تھا لیکن یہ دور دور تک پھیل گئی تھی۔ مصر کے ساتھ ان کے تعلقات تاریخ کی روشنی میں واضح ہو چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص (جسے قرآن کریم نے سامری کہہ کر پکارا ہے ۲۵) مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معتقد ہو گیا تھا اور بنی اسرائیل کے ساتھ ہی وہاں سے نکل آیا تھا۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم اس کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اتری تھی۔ (۲۶)۔

لیکن بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ مادہ (س۔ م۔ ر) سے ہے یا یوں کہیے کہ عربوں نے سامری سے اس مادہ کے مختلف معانی وضع کئے۔ (السَّمَرُ کے معنی ہیں رات میں قصے کہانیاں کہنا۔ السَّامِرُ، شب میں قصہ گوئی کی محفل، نیز قصہ گو۔ السَّمِيرُ، قصہ گو، داستان زن — کہانیاں کہنے والے۔ جس طرح قوموں کو گمراہ او

برباد کرتے ہیں اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ خود ہماری تاریخ اس کی زندہ شہادت ہے۔ جب ہم قرآن کریم کے حقائق کو چھوڑ کر قصوں اور کہانیوں میں الجھ گئے تو دین سے دور بیٹھ گئے۔ رفتہ رفتہ اب ہماری حالت یہ ہو گئی ہے کہ ہمارے ہاں دین، نام ہی چند قصوں اور کہانیوں کا رہ گیا ہے اور قرآنی حقائق ہمارے لئے بالکل اجنبی اور نامانوس نظریات قرار پا چکے ہیں۔ ہمارا داعظ داستان گو

داستان گو۔ واعظ

ہوتا ہے۔ دین کے اس طرح داستانوں میں تبدیل ہو جانے کے سلسلے میں اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

ذرا سی بات تھی اندیشہ عجم نے جسے بڑھا دیا ہے فقط زیب داستان کیلئے

بہر حال، السامری، سمیری قوم کا فرد ہو یا خود بنی اسرائیل میں کا کوئی داستان گو، بات وہیں آ جاتی ہے۔ اس نے دین خدا دندی کو افسانہ بنا دیا۔

سامری کے قصے میں ایک لفظ اثر بھی آتا ہے۔ اس لفظ کے بنیادی معنی نقش یا نشان کے ہیں اور اسی نہج سے یہ لفظ نقش قدم یا کسی کی تعلیم یا مسلک کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت (نملہ) میں اس کے یہ معنی واضح ہیں۔ ”زبیب داستان“ کے لئے اسے کیا معنی پہناتے گئے، اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

اب آئیے قرآن کریم میں بیان کردہ قصہ گوسالہ پرستی اور سامری کی طرہ۔ اسے سورة طہ اور سورة الاعراف میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ سورة طہ میں کہا گیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم سے الگ ہو کر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ: وَمَا آعَجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوسٰی (طہ: ۹۱) ”اے موسیٰ“

گوسالہ پرستی کا واقعہ

”تہیں کون سی ایسی جلدی پڑی تھی کہ قوم کو اس حالت میں چھوڑ کر چلا آیا؟“ حضرت موسیٰؑ نے عرض کیا کہ اس میں حرج کی کوئی بات نہیں۔ هُمْ اَوْلَآءِ عَلٰی اَثَرٰی (طہ: ۹۲) ”وہ میرے پیچھے، میرے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ میری تعلیم پر عمل پیرا ہیں میرے مسلک کا اتباع کر رہے ہیں“ اس لئے میری وقتی عدم موجودگی سے کیا نقصان واقع ہو سکتا ہے؟“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قَالَ فَاِنَا قَدْ خَلَقْنَا قَوْمًا مِّنْ بَعْدِكَ وَاَضَلَّاهُمُ السَّامِرٰی (طہ: ۹۳) ”تو نے تو اپنی قوم کے متعلق یہ اندازہ کیا لیکن ہوا یہ ہے کہ تیری عدم موجودگی میں وہ ایک عجیب فتنے کا شکار ہو گئی ہے۔ سامری نے اُسے گمراہ کر دیا ہے“ یہ سن کر فَدَجَّعَ مُوسٰی اِلٰی قَوْمِهِ غَضْبَانَ اَسْفًا۔ قَالَ يَقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا۔ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ۔ اَمْ اَرَدْتُمْ اَنْ يَّجِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَبِّكُمْ فَاخْتَلَفْتُمْ مَوٰعِدٰی (طہ: ۹۴) ”موسیٰؑ غصہ اور تاسف سے ملے جلے جذبات کے ساتھ قوم کی طرہ لوٹا اور اُن سے کہا کہ یہ تم نے کیا

گل کھلایا؟ کیا تمہارے رب نے تم سے زندگی کی خوشگوار یوں کے وعدے نہیں کئے تھے؟ یا کیا ان وعدوں کے پورا ہونے میں کوئی لمبا عرصہ لگ گیا تھا جو تم خدا سے ناامید ہو گئے اور اس کی جگہ اور معبود تراش لیا۔ یا کیا تم ادھار کھاتے بیٹھے ہو کہ تم پر خدا کا غضب نازل ہو کر رہے، اس لئے تم نے یوں عہد شکنی کی ہے؟ انہوں نے جواب دیا: قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلِكِنَا وَلَكِنَّا حَبِطْنَا أَوْ زَارًا مِّنْ زِينَةِ الْقَوْمِ فَقَدْ فَتَنَاهَا رَبُّنَا، ہم نے جان بوجھ کر، بطیب خاطر، اپنی مرضی سے عہد شکنی نہیں کی بلکہ معاملہ دوسرا پیش آگیا۔ مصری قوم کی دیکھا دیکھی ہم نے زینت و زیبائش کے لئے جو زیورات پہن رکھے تھے وہ اس صحرائی زندگی میں، ہم پر مفت کا بوجھ بن رہے تھے۔ چنانچہ ہم نے اس بارگوش اور وبال ووش کو اتار پھینکا۔ یہ خیال سامری نے ہمارے دل میں ڈالا تھا؟ فَكَذَّبْتَكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ فَاخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُ خَوَارٌ فَقَالُوا هَذَا إِلَهُكُمْ وَإِلَهُ مُوسَىٰ فَنَسِيَ (۲۸-۲۷)۔ ”سامری نے ان زیورات کو لیا اور انہیں گلا کر ایک پھڑا سا بنا دیا۔ وہ تھا تو محض ایک بے جان دھڑ، لیکن سامری نے اسے ایسا بنایا (یعنی اس میں کوئی کل رکھ دی جس سے) اس میں سے پھڑے کی سی آواز نکلتی تھی۔ یہ دیکھ کر لوگ پکار اٹھے کہ یہ ہمارا بھی معبود ہے اور موسیٰ کا بھی۔ لیکن یہ کچھ کرتے وقت سامری اس بات کو بھول گیا کہ موسیٰ اگر کیا کہے گا؟ وہ سامری بھولا تھا یا نہیں، لیکن اگر یہ قوم ذرا بھی عقل و شعور سے کام لیتی تو ان پر اس پھڑے کی حقیقت بے نقاب ہو جاتی۔ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ إِلَيْهِمْ قَوْلًا وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ صَدْرًا وَلَا نَفْعًا (۲۹)۔ ”کیا انہیں نظر نہیں آتا تھا کہ پھڑے میں سے ایک آواز تو نکلتی ہے لیکن وہ ان کی کسی بات کا جواب نہیں دے سکتا اور نہ ہی ان کے لئے کسی نفع یا نقصان کی قدرت رکھتا ہے؟ علاوہ ازیں۔ وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هَارُونُ مِنْ قَبْلُ يُقَوْمُوا إِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهِ وَإِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمَنُ فَاتَّبِعُونِي وَأَطِيعُوا أَمْرِي (۳۰)۔ ”ہارون نے انہیں پہلے ہی سے کہہ دیا تھا کہ لوگو! یہ شخص تمہیں سخت گمراہی میں مبتلا کر رہا ہے۔ تمہارا رب یہ پھڑا نہیں، خدائے رحمن ہے لہذا تم اس گمراہ کرنے والے کی بات مت سنو۔ میری پیروی کرو اور جو کچھ میں تم سے کہوں اس کی اطاعت کرو“ لیکن۔ قَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ آلِ يُسُفَٰثَ الَّذِي كَفَرْنَا بِهِ قُلُوبُهَا لَا تَعْقِلُ ۚ أَكَفَرْنَا بِهِ مَرَّ وَثَلَاثًا قُلُوبُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۳۱-۳۰)۔ ”انہوں نے صاف جواب دیدیا کہ ہم اس کی پرستش سے باز نہیں آئیں گے۔ جب موسیٰ آئے گا تو اس وقت دیکھا جائے گا کہ وہ کیا کہتا ہے؟ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے روئے سخن اپنے بھائی کی طرف پھیرا اور ان سے کہا۔ قَالَ يَهْرُونُ مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا ۖ أََلَا تَتَّبِعُنِ ۚ أَفَعْصَيْتَ أَمْرِي (۳۲)۔ ”اے میرے بھائی! جب تو نے دیکھا تھا کہ قوم یوں گمراہ ہو رہی ہے تو تو نے انہیں سختی سے روکا کیوں نہیں؟ تو نے وہی کچھ کیوں نہ کیا، جو ایسے وقت میں کیا کرتا ہوں۔ وہ کونسی بات تھی جو تجھے ایسا

کرنے میں مانع ہوئی۔ یا تو نے بھی دیدہ دانستہ مجھ سے سرکشی برتی؟ اس کے جواب میں حضرت ہارون علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا وہ ہمارے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ آپ نے کہا: قَالَ يَبْنَؤُهَا لَا تَأْخُذْ بِلِحَيَّتِي وَلَا بِدَاسِيٍّ اِنِّي خَشِيتُ اَنْ تَقُولَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِي اِسْرَآئِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِي (۲/۲۵۷)۔ اے میرے ماں جانے! تو مجھ پر اس طرح خفا نہ ہو اور مجھے ہدفِ ملامت نہ بنا (۲/۲۵۷)۔ میں نے انہیں سختی سے اس لئے نہیں روکا کہ مجھے ڈر تھا کہ تو آکر یہ نہ کہے کہ تو نے قوم میں تفرقہ ڈال دیا اور میری بات کا کچھ پاس نہ کیا۔ میں نے قوم کی اس عارضی جہالت کو گوارا کر لیا لیکن اسے تفرقہ سے بچایا۔ اس جواب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام مطمئن ہو گئے۔ واضح رہے کہ یہ جواب دینے والا بھی خدا کا ایک رسول تھا اور اس سے مطمئن ہو جانے والا بھی رسول۔

ذرا اس جواب پر غور فرمائیے۔ قوم میں تشتت و افتراق اتنا بڑا جرم ہے کہ اسے اس سے بچانے کے لئے عارضی شرک تک گوارا کر لیا گیا۔ واضح رہے کہ قرآن کریم کی رو سے بت پرستی بھی شرک ہے اور تفرقہ بھی شرک۔ (۲/۲۵۷)۔ بنی اسرائیل کی بت پرستی جہالت کا نتیجہ تھی جس کا ازالہ با آسانی ہو سکتا تھا۔ لیکن قوم میں تفرقہ مستقل فساد کا موجب بن جاتا ہے اور اس کی وجہ سے جو نقصان ہوتا ہے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے حضرت ہارون علیہ السلام نے اس بڑے نقصان کے مقابلے میں، کم نقصان والے شرک کو گوارا کر لیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس سے مطمئن ہو گئے۔ لیکن ہمارے ہاں، حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں مسلمانوں میں مستقل فرقے موجود ہیں۔ اور مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ان فرقوں کے گمراہوں کو مضبوط سے مضبوط ترکیا جاتا ہے اور کبھی نہیں سوچا جاتا کہ قرآن کریم بے نص صریح، فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہے۔ زمانے کے تقاضوں سے یہ امید بندھ چلی تھی کہ شاید یہ امت فرقہ بندی کے اس شرک سے تاب ہو کر پھر سے امت واحدہ بن جائے۔ لیکن بلیس نے ان کے کان میں یہ سحر پھونک دیا کہ تمہارے فرقے، وہ فرقے نہیں، جنہیں قرآن شرک قرار دیتا ہے۔ یہ ”مکاتب فکر“ ہیں۔ اس نے الفاظ کے ذرا سے پھیر سے اس شرک کی گریز اور مضبوط کر دی۔ لیکن الفاظ کے بدل جانے سے حقیقت تو نہیں بدل جاتی۔ سنکھیا تو سنکھیا ہی رہتا ہے خواہ اس کا نام سم الفار کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ ان سے پوچھے کہ اگر یہ فرقے نہیں، مکاتب فکر ہیں تو رسول اللہ نے جو فرمایا تھا کہ میری امت میں تہتر فرقے پیدا ہوں گے (اور اس حدیث کو آپ صحیح مانتے ہیں) تو وہ فرقے کہاں ہیں؟

بہر حال، اب پھر قصۃ سامری کی طرف لوٹئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا۔ فَمَا خَطْبُكَ يَا سَامِرِيُّ (۲/۲۵۸)

”تم پر کیا بنی تھی جو تم نے یہ کچھ کر دیا۔“ اس نے جواب دیا: بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ - فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ - فَنَبَذْتُهَا - وَكَذَلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي (۲۶۰)۔ میں، جب اِدھر تمہاری قوم کی طرف آیا ہوں تو میں نے وہ کچھ بھانپ لیا تھا جو ان کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ میں نے آپ کے مسلک و مشرب کو پوری طرح اختیار نہیں کیا تھا۔ اس میں سے بس تھوڑا سا حصہ لیا تھا اور محض اپنے مقاصد کی خاطر تمہارے پیروؤں میں شامل ہو گیا تھا۔ تمہاری عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے دل نے یہ نقشہ میرے سامنے پیش کر دیا جو مجھے بڑا جاذب نظر آیا۔ چنانچہ میں نے تمہاری تعلیم کا وہ تھوڑا سا حصہ بھی، جسے میں نے اختیار کیا تھا۔ بیکار سمجھ کر اٹھا کر پھینک دیا اور تمہاری قوم کو پھر بت پرستی کی طرف لے آیا۔ بت پرستی کا جذبہ ان کے دل کی گہرائیوں میں مچل رہا تھا۔ میں نے اسے بھانپ لیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ جب میں نے انہیں ذرا سی ترغیب دلائی تو وہ اپنے اس جذبہ کی تسکین کے لئے اس کی طرف پلک کر آ گئے۔“ آپ نے غور فرمایا کہ عقائد، خواہ وہ کتنے ہی باطل اور مبنی بر جہالت کیوں نہ ہوں، کس طرح انسان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست اور اس کے خون کے ذروں میں حلول کئے ہوتے ہیں اور انہیں بدلنے کے لئے کس قدر صبر و آزمائش و ہمت اور استقامت کی ضرورت ہوتی ہے۔

سامری نے جو جواب دیا اُسے آپ نے قرآن کریم کے الفاظ میں ہنسیا۔ بات کس قدر صاف اور واضح تھی۔ لیکن آپ دیکھئے کہ سامریت ازب و استاں کے لئے ہمارے ہاں کے داعیوں نے اس میں کس کس قسم کے افسانوی اضافے کئے ہیں۔ تفسیر ابن کثیر (جس کا ذکر پہلے بھی کئی مرتبہ آچکا ہے) میں کہا گیا ہے کہ جب فرعون اپنے لشکر وں سمیت، سمندر کے کنارے آیا تو اس کا گھوڑا پانی میں اترنا نہیں چاہتا تھا۔

افسانہ نگاری

اُسی وقت حضرت جبریل علیہ السلام گھوڑے پر سوار آ گئے۔ ان کے جانور کے پیچھے فرعون کا گھوڑا لگ گیا۔ آپ نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ فرعون کا گھوڑا اُسے کچلتا ہوا دریا میں اتر گیا۔ حضرت میکائیل علیہ السلام اس گروہ کے پیچھے تھے تاکہ ان کے جانوروں کو بھنکائیں۔ ۱۷

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے پوچھا کہ یہ تو نے کیا کیا اور اس بے جان جسد سے یہ آواز کیسے آنے لگ گئی تو اس نے کہا کہ:

جب فرعون کی ہلاکت کے لئے حضرت جبریل علیہ السلام آئے تو میں نے ان کے گھوڑے کے ٹاپ تلے کی تھوڑی سی

مٹی اٹھالی تھی پس یہ اس کا کرشمہ تھا) ۱۸

ہے نائیک سر قصہ گوئی!

یہ ہے گوسالہ پرستی کا واقعہ۔ سورۃ طہ کے علاوہ، یہ سورۃ الاعراف آیات (۱۵۱-۱۳۸) میں بھی آیا ہے۔ ضمناً یہ دیکھتے کہ، اسی واقعہ کو، جسے قرآن کریم نے اس طرح بیان کیا ہے، بائبل کس طرح بیان کرتی ہے۔ اس میں لکھا ہے:

اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ پہاڑی سے اترنے میں دیری کرتا ہے تو وہ ہارون کے پاس جمع ہوئے اور اُسے کہا کہ اٹھ! ہمارے لئے معبود بنا کہ ہمارے آگے چلے۔ کیونکہ یہ مرد موسیٰ جو ہمیں مصر کے ملک سے نکال لایا، ہم اسے نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا۔ ہارون نے انہیں کہا کہ زیور سونے کے جو تمہاری جو ردوں اور تمہارے پیٹوں اور تمہاری پیٹوں کے کانوں میں ہیں توڑ توڑ کے مجھ پاس لاؤ۔ چنانچہ سب لوگ سونے

تورات کا بیان | زیور جو ان کے کانوں میں تھے، توڑ توڑ کے ہارون کے پاس لائے اور اس نے ان کے

ہاتھوں سے لیا اور ایک پچھڑا ڈھال کر اس کی صورت حکاکے ہتھیار سے درست کی اور ان سے کہا کہ اے اسرائیل! یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں مصر کے ملک سے نکال لایا۔ اور جب ہارون نے دیکھا تو اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی۔ اور ہارون نے یہ کہہ کر منادی کی کہ کل خداوند کے لئے عید ہے۔ اور وہ صبح کو اٹھے اور سوختی قربانیاں چڑھا تیں اور سلامتی کی قربانیاں گزرائیں۔ اور لوگ کھانے پینے کو بیٹھے اور کھیلنے کو اٹھے۔

(خروج ۳۲)

آپ نے دیکھا کہ غیر محرم کتاب خداوندی (قرآن کریم) اور محرم کتابوں میں کیا فرق ہوتا ہے؟ یہاں کہا یہ گیا ہے کہ یہ بہت حضرت ہارون علیہ السلام نے بنایا تھا اور انہوں نے بنی اسرائیل سے اس کی پرستش کرائی تھی۔ خدا کا ایک اولوالعزم پیغمبر اور بہت سازی اور بہت پرستی! یہ محرم کتابوں ہی کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔

قرآن کریم نے بنی اسرائیل کے اس شرک کے سلسلے میں کہا ہے کہ **وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ** (۲) ذرا آگے چل کر کہا: **إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ** (۶)۔ یعنی ”اس سے تم نے اپنے آپ پر ظلم کر لیا“ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ظلم کے معنی ہیں، جس مقام پر کسی چیز کو ہونا چاہئے اس کا اس مقام پر نہ ہونا یا نہ رہنا۔ اسی اعتبار سے قرآن کریم نے شرک کو ظلمِ عظیم کہا ہے (۳۱)۔

شرک کیوں ظلمِ عظیم ہے | شرک کے سلسلے میں اس جلد کے دوسرے باب (زیر آیت ۲) میں بتایا جا چکا ہے کہ شرک کس لئے ظلمِ عظیم ہے کہ اس سے انسان اپنے مقام سے نیچے گر جاتا

ہے۔ شرک میں انسان یا تو خارجی قوتوں کو اپنا معبود تسلیم کر لیتا ہے یا اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کو۔ کائنات کی قوتیں یا چیزیں (ملائکہ) خود انسان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے لئے بنائی گئی ہیں اور تسخیرِ فطرت انسانی ممکنات سے ہی نہیں بلکہ اس کا فریضہ بھی ہے۔ اس لئے جن اشیاء کو انسان مسخر کر سکتا ہے انہیں اپنا مسجود بنا لینا، مقامِ آدمیت سے نیچے گر جانا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم نے کہا ہے کہ تمام بنی آدم انسان ہونے کی جہت سے یکساں و جب التکلم ہیں (۱۶)۔ اس لئے کسی انسان کو الوہیت کا درجہ دیدینا بھی شرکِ انسانیت کھودینے کی دلیل ہے۔ انسان اپنے صحیح مقام پر اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ وہ صرف خالق کائنات کے قوانین کے سامنے جھکے۔ اسی کو توحید کہا جاتا ہے۔ کائناتی قوتوں، یا دوسرے انسانوں کو الہ تصور کر لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ہر وقت ان سے ڈرتا اور کانپتا رہتا ہے۔ اس سے اسے زندگی میں استحکام نصیب تک نہیں ہوتا۔ چنانچہ سورۃ الحج میں کہا گیا ہے کہ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهٖ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيحٍ (۲۲)۔ یاد رکھو! جو شخص خدا کے سوا کسی اور کی اطاعت کرتا اور اس کے سامنے جھکتا ہے اس کی مثال یوں سمجھو گویا وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آگرا اور ایسا بے کس دبے بس بن کر رہ گیا جیسے چڑیا کا بچہ اپنے گھونسلے سے نیچے زمین پر گر جائے تو اسے جیل کوئے جھپٹ کر لے جائیں۔ اور ایسا کمزور ذلتا توں ہو گیا کہ ہوا کا ہر تیز جھونکا اسے پر کاہ کی طرح اڑے اڑے پھرے اور کسی دوردراز گوشے میں پھینک دے۔ یہ ہوتا ہے شرک کا نتیجہ۔ اسی لئے بنی اسرائیل کے متعلق کہا کہ وہ جب اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بت کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے تو ذَلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۱۵۲)۔ انہوں نے اپنے آپ کو اسی دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار کر لیا۔

سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس لغزش کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہو گئے؟ نہیں ایسا نہیں ہوا۔ انہیں اس نقصان کی تلافی کا موقعہ دیا گیا۔ جیسا کہ اگلی آیت میں ہے:

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ ﴿۵۲﴾

عفو کے معنی مٹا دینا یا محو کر دینا ہوتے ہیں۔ یہ لفظ کسی نقصان کی تلافی کے لئے بھی آتا ہے۔ یعنی ایسا موقعہ ہم پہنچا دینا یا سامان فراہم کر دینا جس سے وہ شخص اپنے نقصان کی تلافی کر سکے۔ قانونی طور پر یہ لفظ سرزنش اور وارننگ کے بعد، سزا دینے بغیر چھوڑ دینے کے لئے بھی آ جاتا ہے اور معمولی سی سزا دینے کے بعد چھوڑ دینے کیلئے بھی

اسی نہج سے ہمارے ہاں اس کے معنے درگزر کر دینا بھی کئے جاتے ہیں۔ حقیقی مفہوم اس کا تلافی مافات کے لئے موقعہ فراہم کر دینا ہو گا اور اسی مفہوم کے لئے یہ لفظ آیہ زیر نظر میں آیا ہے (اس کے دیگر مفاہیم کا ذکر اپنے اپنے مقام پر آئے گا جہاں یہ بھی بتایا جائے گا کہ اس کے معنے آگے بڑھ جانے یا زائد از ضرورت کے بھی ہوتے ہیں)۔

یہاں کہا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کو اس معصیت کے بعد ایک موقعہ دیدیا گیا اور یہ اس لئے کہ **لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ** (۲۶) اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے ”تاکہ تم شکر کر سکو“ لیکن اس سے بات سمجھ میں نہیں آتی لہذا یہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ شکر کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

اس مادہ (ش۔ک۔ر) کے اصلی معنی بھر جانا، ظاہر کرنا یا نمودار ہو جانا ہیں۔ چنانچہ **الشَّكْرَةُ** اس ادنیٰ کو کہتے ہیں جس کے تھن دودھ سے بھرے ہوں۔ **شَكْرَتِ الشَّجَرَةِ** کے معنی ہوتے ہیں درخت کے تنے پر ٹہنیاں نکل آئیں اور اس طرح وہ زندگی جو اس کے اندر پوشیدہ تھی، اس کی نمود ہو گئی۔

شُكْرًا کے ان معانی کے کو پیش نظر رکھنے سے ”سعی مشکور“ کا مطلب سمجھ میں آجائے گا۔ یعنی ایسی کوشش اور محنت، جس کے بھرپور نتائج سامنے آجائیں۔ چونکہ انسان کی کوششیں اسی صورت میں بھرپور نتائج پیدا کر سکتی ہیں جب وہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق کی جائیں

اس لئے خدا کو شاکر کہا گیا ہے۔ (۲۷)۔ یعنی انسانی کوششوں میں بھرپور نتائج پیدا کرنے والا۔ نیز **شَاكِرًا** کا لفظ اس شخص کے لئے بھی بولا جائے گا جس کی کوششیں اس طرح... بھرپور نتائج کی حامل ہو جائیں۔

شُكْرًا کے دوسرے معنی ظاہر کرنے یا ظاہر ہونے کے بھی ہیں۔ جیسا کہ متعدد مقامات پر بتایا جا چکا ہے۔ انسان اندر امکانی صلاحیتیں رکھی گئی ہیں۔ ان صلاحیتوں کا پورا پورا نشوونما پانا اور اس طرح ابھر کر سامنے آ جانا، ان کا شکر ہے بنا بریں، اعمالِ صالحہ خدا کی نعمتوں کے شکر کا موجب بنتے ہیں۔ خدا کی نعمتوں کو انسانی یہود کے لئے بے نقاب رکھنا، یعنی انہیں چھپا کر نہ رکھنا، ان نعمتوں کا شکر ہے۔ اس کے مقابل میں کفر کا لفظ آیا ہے۔ (۲۸)۔ جس کے معنی ڈھانپ کر رکھنا اور دبا دینا ہیں۔ اسی جہت سے کہا گیا: **وَأَشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ** (۲۹)۔ ”تم خدا کی عطا کردہ نعمتوں کو ہمیشہ بے نقاب رکھو تاکہ دوسرے انسان بھی ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ انہیں چھپا کر اور دبا کر نہ رکھو“

انسانی صلاحیتوں کے نشوونما پانے، اور ان کے صحیح استعمال سے نعمائے خداوندی حاصل ہو جانے سے انسان کے دل میں جذبِ نشاط کی ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ یہ سرورِ آفریں کیفیت، قوانینِ خداوندی

کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے اس لئے جو شخص ان حقائق کو پیش نظر رکھتا ہے اس کے دل میں اس سے اطاعتِ خداوندی کا جذبہ اور بھی شدت سے ابھرتا ہے۔ اسے اللہ کا شکر کرنا یا شکر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ اگرچہ تم نے گوسالہ پرستی کے شرک سے اپنے آپ کو مقامِ آدمیت سے گر لیا تھا اور اس طرح دنیا میں ذلت و خواری کے مستوجب بن گئے تھے لیکن چونکہ ابھی تمہاری تعلیم و تربیت خام تھی اس لئے تمہیں اس جرم کی پاداش میں ہلاک نہیں کر دیا گیا۔ تم سے رعایت برتی گئی اور تمہیں ایک اور موقعہ دیا گیا تاکہ تم اپنے مال و دولت، وقت اور توانائی، قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرو۔ اس تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں گی۔ گوسالہ پرستی میں تم نے اپنی دولت صرف کی، محنت اور مشقت کی، وقت بھی ضائع کیا لیکن اس کا نتیجہ نہ صرف جھوٹے اعمال ہوئے، بلکہ تمہیں سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ اگر یہی دولت، وقت اور توانائی قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرتے تو تمہاری کوششیں بھرپور نتائج پیدا کرتیں۔ تمہیں ایک موقعہ دیا جاتا ہے تاکہ تم اس کے مطابق عمل کرو۔

اس مقصد کے لئے تمہیں ضابطہ قوانینِ خداوندی دیا جاتا ہے۔ اس کا ذکر اگلی آیت میں یوں کیا گیا ہے:-

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۵۳﴾

”تمہیں وہ ضابطہ قوانین، وحی کی رو سے، موسیٰ علیہ السلام کی معرفت دیا گیا تاکہ تم صحیح راستہ پر چلو۔“ یہاں کتاب کا ذکر آیا ہے۔ ہم تورات کی تاریخ کے ضمن میں، پہلے بتا چکے ہیں کہ تورات، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کا نام نہیں بلکہ وہ اس مجموعہ کتب کا نام ہے جو مختلف انبیائے بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں اور جسے بائبل کا عہد نامہ عتیق کہا جاتا ہے۔ اس مجموعہ میں کتابِ موسیٰ بھی شامل ہے۔ اس کتاب کی بنیادی صفت یا خصوصیت ”فرقان“ بتائی گئی ہے۔ اور یہ خصوصیت اسی کتاب کی نہیں، ہر وحیِ خداوندی کی ہے۔ یہ لفظ بڑا جامع بھی ہے اور واضح بھی۔ الْفَرْقُ

کے بنیادی معنی ہیں سر کی مانگ، جس سے دونوں طرف کے بال ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔ لہذا الْفُرْقَان وہ ضابطہ ہدایت ہے جس سے حق اور باطل، جائز اور ناجائز، غلط اور صحیح اس طرح نکھر کر الگ الگ ہو جائیں کہ ان میں التباس یا ابہام کی بال بھر بھی گنجائش نہ رہے۔ نیز الْفَرْقُ ایک پیمانے کو بھی کہتے تھے جو مدینہ منورہ میں مستعمل تھا۔ پیمانے سے ہر شے کا نغین ہو جاتا ہے

قرآن کریم کو بھی اسی جہت سے فرقان کہا گیا ہے۔ (۲/۵۳)

کتاب موسیٰ کے ضمن میں، ایک اور اہم نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ مرزا غلام احمد (قادیانی) نے دعویٰ نبوت کیا۔ اُن سے پوچھا گیا کہ آپ نبی ہیں تو خدا نے آپ کو کتاب کو کسی دی ہے؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ میں نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے، رسول ہونے کا نہیں۔ نبی اور رسول میں فرق یہ ہے کہ رسول صاحب کتاب ہوتا ہے اور نبی بلا کتاب۔ ان کا یہ جواب نہ صرف یہ کہ نبوت کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے بلکہ خود قرآن کریم کی تعلیم سے لاعلمی کا ثبوت بھی۔

ہزنی اور رسول کو کتاب | قرآن کریم میں ایک جگہ کہا گیا ہے: لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ (۲۵)۔ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل

کے ساتھ بھیجا اور ان سب کے ساتھ کتاب نازل کی، اور دوسری جگہ کہا کہ فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ۔ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ (۲۶)۔ اللہ نے انبیاء کو مبشر اور منذر بنا کر بھیجا اور ان سب کے ساتھ کتاب نازل کی، ان ہر دو آیات (نیز اسی قسم کے متعدد دیگر مقامات) سے واضح ہے کہ کتاب دیے جانے کے اعتبار سے نبی اور رسول میں کوئی فرق نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی اور رسول ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں نبوت سے مراد ہے خدا سے وحی یا کتاب کا ملنا اور رسالت کے معنی ہیں اس وحی یا کتاب کو دوسروں تک پہنچانا۔ اس لئے نہ کوئی رسول بلا نبوت ہو سکتا ہے اور نہ کوئی نبی بلا رسالت ہے۔ مرزا صاحب نے اپنے دعویٰ کی دلیل میں کہا کہ دیکھئے حضرت ہارون علیہ السلام نبی تھے لیکن انہیں کتاب نہیں ملی تھی۔ کتاب صرف موسیٰ علیہ السلام کو ملی تھی۔ ان کی یہ دلیل بھی ان کی قرآن کریم سے ناواقفیت کی غماز ہے۔ قرآن کریم نے جہاں کہا ہے کہ: وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ (۲۶) دیگر مقامات (وہاں یہ بھی کہا ہے: وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً وَقَدْ كَرَّ لِلْمُتَّقِينَ (۲۸)۔ ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرقان (یعنی حق کو باطل سے الگ کرنے والی کتاب) دی جس میں وحی الہی کی روشنی تھی اور متقیوں کے لئے ضابطہ ہدایت، اس سے بھی واضح تر الفاظ سورۃ الشفقت میں آئے ہیں جہاں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کا نام لیکر کہا ہے: وَآتَيْنَاهُمَا الْكِتَابَ الْمُسْتَبِينَ (۳۱)۔ ہم نے ان دونوں کو واضح کتاب عطا فرمائی، ان مقامات سے واضح ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ کو خدا کی طرف سے وحی ملی تھی اسی طرح ہارون علیہ السلام کو بھی وحی عطا ہوئی تھی۔ اور وحی ہی کو خدا کی کتاب کہا جاتا ہے۔ لہذا یہ کہنا کہ میری طرف وحی تو ہوئی ہے لیکن کتاب نہیں ملی۔ وحی اور کتاب کی حقیقت سے بے خبری کا پتہ ثبوت ہے۔

۴

بنا بریں بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ تمہیں ہدایت کا وقفہ اس لئے دیا جاتا ہے کہ تم اس ضابطہ کی اطاعت کرو جو حضرت
لے تفصیل ان امور کی بیری کتاب — ختم نبوت اور تحریک احمدیت — میں ملے گی۔

موسیٰ علیہ السلام کی وساطت سے تہیں دیا گیا ہے۔ اس پر وگرام کی صراحت اگلی آیت میں کی گئی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ:-
وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يُقَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ - فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ - فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ - ذَلِكَُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ - فَتَابَ عَلَيْكُمْ - إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

اس آیت میں لکھا گیا ہے کہ ”تم نے گو سالہ پرستی سے جو اپنا نقصان کیا، یعنی تم مقام آدمیت سے گر گئے، تو اس کی تلافی کی یہ صورت ہے کہ تم پھر سے صحیح روش اختیار کر لو“ توبہ کے متعلق اس کتاب کی پہلی جلد میں، آیت (۱۶) کے تحت (صفحہ ۲۶ پر) بتایا جا چکا ہے اور چند صفحات پہلے اس کا اعادہ بھی کیا جا چکا ہے (کہ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جس مقام سے انسان کا قدم غلط راستے کی طرف اٹھ گیا تھا اسی مقام پر واپس آ جانا۔ اس کے بعد صحیح راستے کو اختیار کرنے کے لئے لفظ اصْلَحَ آتا ہے۔ اس طرح توبہ کے پر وگرام کی تکمیل ہوتی ہے۔ ہم نے یہ بھی بتایا تھا کہ جب انسان اپنی غلطی کا احساس کر کے صحیح راستے کی طرف چلنے کے لئے واپس لوٹتا ہے تو قوانین خداوندی، نہایت آب و تاب کے ساتھ اس کے سامنے آ جاتے ہیں اور وہ اس کی راہنمائی صحیح راستے کی طرف کر دیتے ہیں۔ اس نہج سے خدا کو توباب کہا جاتا ہے۔ اور خدا کی یہ صفت اس کا بڑا ہی حسین اور پیارا تصور سامنے لانے لاتی ہے یعنی اگر تم اپنی خطا کے احساس سے اپنی آنکھ میں اشک ندامت لئے، خدا کی طرف ایک قدم اٹھاؤ تو خدا دو قدم آگے بڑھ کر تمہیں اپنے آغوش رحمت میں لے لیگا۔ خدا کی اس صفت کو التَّوَّابُ الرَّحِيمُ سے تعبیر کیا جاتا ہے، بڑی تیزی سے لوٹ کر سامان رحمت عطا کرنے والا۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ: فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ (۱۶) ہم نے کسی مقام پر بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی متعدد صفات (الاسما الحسنیٰ) قرآن کریم میں آئی ہیں لیکن مختلف آیات میں، ان صفات میں سے کسی ایک یا دو صفات کا ذکر خاص طور پر آتا ہے اور اس خاص صفت کے اس مقام پر لانے میں بڑی معنوی خصوصیت پنہاں ہوتی ہے۔ اس آیت میں خدا کی صفت الْبَارِئِ کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس کی کیا خصوصیت ہے؟

سورۃ المحشر میں خدا کی تین صفات ایک دوسرے سے ملحق بیان ہوئی ہیں۔ **هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (۵۹)**۔ یعنی الخالق۔ الباری اور المصور۔ خدا کے عمل تخلیق کے متعلق

پہلی جلد میں بتایا جا چکا ہے کہ اس کے سنی ہیں خدا کے پیدا کردہ مختلف عناصر کائنات میں سے بعض کو ایک دوسرے کے ساتھ ایک خاص توازن یا تناسب (PROPORTION) کے ساتھ اس طرح ملانا کہ اس سے ایک نئی چیز وجود میں آجائے۔

اس عمل تخلیق کے پروگرام کو سامنے لائیے۔ کائنات میں مختلف عناصر (MATERIAL) ڈھیروں پڑے ہیں۔ عمل تخلیق کی رو سے ہوتا یہ ہے کہ ان میں سے غیر ضروری عناصر کو الگ کر کے، ضروری عناصر کو، خاص تناسب کے ساتھ یکجا کیا جاتا ہے۔ غیر ضروری عناصر کو (یعنی وہ عناصر جس خاص شے کی تخلیق کے لئے ضروری نہ ہوں) اس طرح الگ کر دینے کی صفت (یعنی الگ کر دینے والے) کو الباری کہا جاتا ہے۔ جب ان عناصر سے حشود و اند کو الگ کر دیا جائے تو پھر وہ نئی شے، خاص صورت (FORM) اختیار کر لیتی ہے۔ خدا کی اس صفت کو المصور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سمجھنے کے لئے آپ ایک کمہار کو سامنے لائیے۔ وہ اپنے چاک پر گندہی ہوتی مٹی کا تودہ رکھ کر چاک کو گردش دیتا ہے۔ اس تودے میں سے زائد مٹی کو الگ کرتا چلا جاتا ہے اور اس طرح وہی تودہ ایک خاص برتن کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اشیائے کائنات کے ارتقائی عمل کی یہی صورت ہے۔

الباری کے ان معانی کو سامنے رکھ کر آیہ زیر نظر کی طرف آئیے۔ بنی اسرائیل شرک کے مرتکب ہوئے۔ یعنی انہوں نے حق کے ساتھ باطل کو ملوث کر دیا۔ دونوں مخلوط ہو گئے۔ توبہ کے لئے سب سے پہلے اس بات کی ضرورت تھی کہ باطل کو حق سے الگ کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے کہا گیا کہ تم اس خدا کی طرف رجوع کرو جو الباری ہے۔ اس رجوع کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہارے قلبی اور ذہنی تصورات (معتقدات) سے باطل الگ ہو جائے گا اور تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ خالص خدا سے واحد کے قوانین کی اطاعت کر سکو۔

لیکن اس آیت میں ابھی ایک ٹکڑہ باقی ہے۔ اور وہ ٹکڑہ ایسا ہے جس کے مرد و عورت (مفہوم سے بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ تم باری تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ اور

فَاَقْتُلُواْ اَنْفُسَكُمْ (۵۴)

اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ”تم ایک دوسرے کو قتل

کرو“ چنانچہ تفسیر ابن کثیر میں ہے :-

موسیٰ علیہ السلام نے انہیں حکم خداوندی سنایا اور جن جن لوگوں نے بچھڑا پو جاتھا انہیں بٹھا دیا اور دوسرے لوگ کھڑے ہو گئے اور قتل کرنا شروع کیا۔ قدرتی طور پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جب وہ ہٹا اور انہیں روک دیا گیا تو شمار کرنے پر معلوم ہوا کہ ستر ہزار آدمی قتل ہو چکے ہیں اور اس طرح ساری قوم کی توبہ قبول ہوئی۔ (پارہ اول ص ۹۵)

ہم سمجھتے ہیں کہ اس تفسیر کی تغلیط کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ اس قوم میں شرک تک کو اس لئے گوارا کر لیا گیا تھا کہ ان میں تفرقہ نہ پیدا ہو جائے۔ تفرقہ باہمی فساد کا موجب ہوتا ہے اور فساد کا آخری نتیجہ قتال۔ ان

میں تفرق پیدا ہونے کے امکان کو تو رد کیا اور اس تفرق کا جو آخری نتیجہ ہو سکتا تھا اس کا حکم دیا گیا! کیا یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ یہ بھی واضح رہے کہ قرآن کریم نے کسی ایک مومن کے ہاتھوں دوسرے مومن کے قتل بالعمد کو خدا کے غضب اور لعنت اور ابدی جہنم کا مستوجب بتایا ہے (۲/۲۱۷)۔ اس کے بعد آپ سوچ سکتے ہیں کہ خدا، بنی اسرائیل کی اس جماعت مومنین کو یہ حکم دے گا کہ تم ایک دوسرے کو قتل کرو اور پھر اسے اپنی رحمت بھی قرار دیگا، کیونکہ آیت کے آخر میں اس نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے رحم سے کہا ہے؟ اس کے برعکس قرآن کریم میں ہے: **كَتَبْنَا عَلَىٰ بَنِي إِسْرَءِيلَ أَنَّهُ مَن قَتَلَ** **نَفْسًا يَغْيِرْ نَفْسًا أَوْ فَسَادًا فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا** (۲/۲۱۷)۔ ہم نے بنی اسرائیل کی طرف یہ حکم بھیجا تھا کہ یاد رکھو! جس کسی نے کسی دوسرے شخص کو قتل کر دیا۔ بجز اس کے کہ ایسا کرنا جرم قتل یا بغاوت کی سزا کے طور پر ہو۔ یوں سمجھو گویا اس نے پوری کاپوری نوع انسان کو قتل کر دیا اور جس نے کسی ایک متنفس کی جان بچالی دیوں سمجھو، گویا اس نے پوری نوع انسان کی جان بچالی۔“

جس خدا نے انہیں یہ حکم دیا تھا کیا وہ انہیں اس کا حکم دیتا کہ باہمی قتال سے ہزاروں جانیں تلف کر دو!! علاوہ ازیں چند ہی آیات بعد ان سے کہا گیا ہے کہ تم سے عہد لیا گیا تھا کہ تم باہمی خون ریزی نہیں کرو گے، لیکن تم نے ایک دوسرے کو قتل کیا۔ یہ بڑا سنگین جرم تھا (۲/۲۱۷)۔ اب ظاہر ہے کہ جس باہمی خون ریزی اور قتال کو خدا نے ان کے خلاف فرد جرم میں سر نہ مرت رکھا ہے، خود خدا نے تو اس کا حکم نہیں دیا ہوگا۔ لہذا اس آیت کی یہ تفسیر صحیح نہیں۔

بات صاف ہے۔ ہم ”ذبحِ ابناء“ کے سلسلے میں بتا چکے ہیں کہ قرآن کریم میں ”ذبح“ اور ”قتل“ کے معنی گلا کاٹ دینا یا مار دینا ہی نہیں۔ اس کے معنی کسی کو پست کرنا بھی ہیں۔ بنی اسرائیل نے حکم خداوندی سے سرکشی اختیار کر کے گوساہ پرستی کے شرک کا ارتکاب کیا تھا۔ ان سے کہا یہ گیا کہ تم اگر اپنے نقصان کی تلافی چاہتے ہو تو اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ ترو و سرکشی کو چھوڑ کر تم اپنے قلوب کو عطا خداوندی کے لئے جھکاؤ۔ بہت زیادہ جھکاؤ۔ اس قدر جھکاؤ کہ ان میں معصیت اور سرکشی کا شائبہ تک باقی نہ رہے۔ ایسا کرنے کے بعد یہ ممکن ہوگا کہ تم صحیح راستہ اختیار کر لو۔ اس سے تمہارے نقصان کی تلافی بھی ہو جائے گی۔ اور تمہاری صلاحیتوں کی نشو و نما بھی۔

حُصْلَہ

خدا نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تمہیں تو یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ قوانینِ خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔ تم اس کے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو، جب تمہیں ان کی بدولت، زندگی

کی قسم کی آسائشیں نصیب ہو گئی تھیں اور تم اپنی ہم عصر قوم میں، ایسی متاز حیثیت کے مالک ہو گئے تھے کہ کوئی اور قوم تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی (۱۳۲)۔

اس نظام کو چھوڑنے کے بعد، تمہاری حالت یہ ہو گئی کہ آئین و قوانین کا احترام اور عدل و انصاف کی پاسداری تمہارا ہاں سے بالکل اٹھ گئی۔ لیکن اب یہ دھاندلی زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکتی۔ اب (قرآنی نظام کے قیام سے) وہ دور جلد آنے والا ہے جس میں کوئی شخص کسی بصر کا ذرا سا بوجھ بھی نہیں بٹا سکے گا۔ ہر ایک کو اپنے کئے کی سزا خود بھگتنی پڑے گی (۱۳۳)۔ نہ ہی کسی کی سفارش کسی کے کام آسکے گی نہ ہی کسی سے، اس کے جسم کے معاذضہ میں کچھ (رشوت) لے کر اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ اور نہ ہی کوئی شخص کسی مجرم کی مدد کو پہنچ سکے گا۔

یہ اس دنیا میں بھی ہو گا جب (قرآن کا) نظام عدل قائم ہو گا، اور آخرت میں بھی، جب تمام فیصلے خدا کے قانون مکافات کی روش سے ہوں گے۔

تمہیں یاد ہے کہ جب تم قوم منبر عون کی محکومی میں تھے تو وہ تم پر، ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر طرح طرح کے عذاب وارد کیا کرتے تھے۔ ان میں بدترین عذاب یہ تھا کہ وہ تمہارے اندر پارٹیاں پیدا کرتا رہتا تھا (۱۳۴) اور اس طرح کرتا یہ تھا کہ تمہاری قوم کے معز افراد کو، جن میں اسے جو ہر مردانگی کی جھلک دکھائی دیتی تھی اور جن سے اسے خطرہ کا امکان نظر آتا تھا، ذلیل و خوار کر کے غیر موثر بنا رہتا تھا (باکخصوص انہیں جو موسیٰ پر ایمان لاتے تھے۔ ۱۳۵)، اور جو طبقہ ان جوہر دں سے عاری ہوتا، اسے اپنا معزز و مقرب بنا کر آگے بڑھاتا رہتا تھا۔ اس طرح مجموعی حیثیت سے تمہاری قوم کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جاتی تھی (۱۳۶)۔ [سیاستِ ملوکیت کا انداز ہی یہی ہوتا ہے۔ ۱۳۷]۔

تم نے قوانین خداوندی کا اتباع کیا تو اس نے تمہیں سب سے پہلے فرعون کے اس عذاب سے نجات دلائی۔ یہ چیز تمہارے تشو و نما دینے والے کی طرف سے تمہارے لئے ایک عظیم نعمت تھی، کیونکہ اس سے تمہیں اپنی باز آفرینی کے مواقع حاصل ہو گئے (۱۳۸)۔

اور پھر (قوم فرعون کے ساتھ کشمکش کے بعد) وہ وقت آ گیا کہ تم مصر کو چھوڑ کر چل نکلے اور فرعون کا لشکر تمہارا تعاقب میں آیا، تا آنکہ تم اس مقام پر پہنچ گئے جہاں سامنے سمندر (بادریا) کا حصہ تھا اور پیچھے فرعون اور اس کی فوج، تم اس طرح گھر چکے تھے کہ ہماری راہنمائی سے تمہیں سمندر (بادریا) میں خشک راستہ مل گیا۔ اور اس طرح، ہم نے تمہیں فرعون کے لشکر کی دُور سے بچا لیا، اور وہ، اور اس کا لشکر، سب غرق ہو گئے۔ اور یہ کچھ تمہاری آنکھوں سے سامنے ہوا (۱۳۹) ذ ۱۴۰ ذ ۱۴۱ ذ ۱۴۲ ذ

اور سینا کی وادی میں پہنچ کر، (جہاں تمہاری تربیت ہو رہی تھی)، موسیٰ ہمارے حکم کے مطابق چالیس راتوں کے لئے تم سے الگ ہوا (۲/۲۴۴)، تو تم نے اتنے ہی عرصہ میں، (خدا کو چھوڑ کر مصریوں کے دیوتا) پچھڑے کی پرستش شروع کر دی، اور اس طرح، قوانین خداوندی سے سرکشی اختیار کر لی۔

لیکن ہم نے، اس پر بھی تمہیں راندہ درگاہ نہیں کر دیا، بلکہ (جیسا کہ آگے چل کر مذکور ہے۔ ۲/۲۴۶)، تمہاری اس غلط روئے کے مضار اثرات کو مٹا دیا، اور تمہیں پھر موقع دیا کہ تم اپنی صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما کرو۔

اس مقصد کے لئے، ہم نے موسیٰ کو ایک ایسا ضابطہ قوانین دیا، جو حق و باطل کو نکھار کر الگ کر دینے والا، اور مستقل اقدار کا پیمانہ تھا۔ یہ اس لئے دیا کہ تم، اس کی روشنی میں، اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکو۔

جب موسیٰ چالیس راتوں کے بعد، اپنی قوم کی طرف واپس آیا، اور اس نے دیکھا کہ قوم کو سالہ پرستی میں مصروف ہے، تو اس نے ان سے کہا کہ تم نے اس پچھڑے کو اپنا معبود کر، اپنا ہی نقصان کیا ہے، کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ تم اس سے انسانی سطح سے بہت نیچے کر گئے ہو (۲/۲۴۶)۔ اب پھر اس مقام کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تم اپنی غلطی کا اعتراف کرو، اور نہایت عجز و انکسار سے، قوانین خداوندی کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دو۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے تم قوانین خداوندی کے ان خوشگوار اور زندگی بخش نتائج سے پھر مستفید ہو سکتے ہو، جو اس وقت تم سے منہ موڑ چکے ہیں۔ ان قوانین میں یہ خصوصیت ہے کہ جب بھی کوئی ان کی طرف رجوع کرتا ہے، تو یہ، ربوبیت کے تمام سامان اپنے ساتھ لئے، اپنا رخ اس کی طرف پھیر دیتے ہیں۔

پانچواں باب

داستان بنی اسرائیل — خوتے غلامی کے مظاہرے

(آیات ۸۸ تا ۲۴۱)

- ۱ طرح طرح کے طفلانہ تقاضے۔
- ۲ ہم خدا کو بے نقاب دیکھیں گے۔
- ۳ نعمائے خداوندی — من و سلویٰ۔ رزق طیب کا مفہوم۔
- ۴ ارض مقدس میں تمکن کا وعدہ — اور قوم کی دوں ہمتی۔
- ۵ وراثت ارضی کا ابدی قانون — صلاحیت۔
- ۶ قتلِ انبیاء و رسل — خدا اور رسولوں کے غالب رہنے کا مفہوم۔
- ۷ عالمگیر دین صرف اسلام ہے۔
- ۸ سبت کا واقعہ۔
- ۹ بنی اسرائیل کے بند رہن جانے کا مفہوم۔
- ۱۰ فوجِ بقر کا واقعہ — قوم کی کٹ حجتیاں
- ۱۱ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کا مفہوم۔
- ۱۲ تائزیت یافتہ اقوام کا اسلام لے آنا۔
- ۱۳ ہمارا مروجہ اسلام، کس طرح غیر اسلامی عقائد و مسالک کا مجموعہ بن گیا۔
- ۱۴ حضرت موسیٰؑ کے کپڑے لیکر بھاگ جانے والی وضعی روایت۔

پانچواں باب

داستان بنی اسرائیل - نحوۃ غلامی کے مظاہرے

سابقہ باب میں ضمنا، بتایا گیا تھا کہ صدیوں کی غلامی کی وجہ سے بنی اسرائیل میں جوہر انسانیت مفقود ہو چکے تھے۔ ان کے سینے میں زندہ آرزوؤں کی مقدس قندیل تھی، نہ ان کی نگاہوں میں تابندہ مقاصد کی عالمتاب درخشندگی۔ دنیا میں، غلامی، ہزار لعنتوں کی ایک لعنت اور لاکھ نحوستوں کی ایک نحوست ہوتی ہے۔ غلامی میں وہ تمام عیوب و ذمائم، جنہیں جسد انسانیت کے لئے جہنم کہنا چاہتے، اس انداز سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے تباہ کن جراثیم، کب اور کن راہوں سے خون کے اندر حلول کر گئے تھے۔ نحوۃ غلامی میں پختہ انسان، زندگی کے حقائق کے مقابلے سے جی چراتا ہے اور نفس کے خوگر پرندے کی طرح عافیت کو شئی کی زندگی کو عین حیات سمجھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ، اس سے ذاتی سیرت کی رعنائیاں اور اجتماعی کیریکٹر کی دلربائیاں ایک ایک کر کے چھین جاتی ہیں۔ غلامی اقبال کے الفاظ میں:

از غلامی دل بمیرد در بدن بہ از غلامی روح گردد بارتن

یہ تو ہوتی ہے غلامی میں انفرادی کیفیت۔ جہاں تک اجتماعی زندگی کا تعلق ہے، اس کی صورت یہ ہوتی ہے:

از غلامی بزم ملت فرد فرد بہ این و آن از این و آن اندر

یہ لوگ بظاہر ایک قوم نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت وہ اجتماعی نہیں، انفرادی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس میں ہر فرد کاملاً اپنا ہوتا ہے اور جب یہ مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو ان میں باہمی سر پھٹول شروع ہو جاتی ہے۔ ان کی اس انفرادی زندگی کو اقبال نے ایک مثال سے نہایت بلیغ انداز میں واضح کیا ہے، کہتے ہیں کہ:

آں یکے اندر سجود این در قیام کار و بارش چون صلوة بے امام

آپ کسی مسجد میں، باجماعت نماز کو دیکھتے، اگرچہ اس جماعت میں بھی اب افراد ہیں... روح یگانگت نہیں ہوتی، باقی

اس رسمی جماعت میں بھی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں افراد، سیدھی صفوں

نحوۃ غلامی

میں، کندھے سے کندھا ملاتے، کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک شخص (امام) کی آواز پر سب کے

سب اٹھتے ہیں، جھکے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد جب ہی غازی، ستین پڑھنے لگتے ہیں تو نماز بھی وہی ہوتی ہے اور نمازی بھی

وہی فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ اب ان میں امام نہیں ہوتا۔ اس امام کے نہ ہونے سے ان نمازیوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ کوئی کھڑا ہے، کوئی رکوع میں جھکا ہوا، کوئی سجدے میں پڑا۔ آپ کہیں دور کھڑے ہو کر اس صحن مسجد پر نگاہ ڈالتے جس میں یہ نمازی نماز ادا کر رہے ہوں۔ تشنّت و افتراق کا بڑا عبرت انگیز منظر سامنے آجائے گا۔ یہی کیفیت ہوتی ہے قوموں کی غلامی کے زمانے میں۔ ان کی مرکزیت فنا ہو جاتی ہے اور وہ قوم ہزار قسم کے اختلافات کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ کیفیت ان کی یہ ہوتی ہے کہ ان میں نہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت باقی رہتی ہے نہ زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے نئے راستوں کی تلاش کا جذبہ۔

کیش اوتقلید کا ریش آذری است ندرت اندر مذہب کا فری است

جب ان میں فہم و بصیرت کی صلاحیت نہیں رہتی تو وہ بیسٹ حقائق (ABSTRACT REALITIES) کی صداقتوں کو پا ہی نہیں سکتے۔ اس لئے وہ اپنی پرستش کے لئے، محسوس خداؤں کو تراش لیتے ہیں — خواہ یہ خدا مٹی اور پتھر کی مورتیں ہوں اور خواہ زندہ اور مردہ انسان۔ مسلک تقلید بذاتِ خویش بت پرستی ہوتا ہے۔ دورِ حاضر کا ایک بلند پایہ فلاسفر (WHITE = HEAD) کہتا ہے کہ:-

مرد جہ تصورات و نظریات پر بلا تحقیق مطمئن ہو کر بیٹھ جانا بت پرستی ہے۔

یہی وہ بت پرست ہیں، جن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:-

تازگی باہم و شک افزائندش کہنہ دفرسودہ خوش می آیدش

وہ اس طرح لکیر کے فقیر ہو جاتے ہیں کہ ہر نئی تحقیق میں انہیں کفر و احماد کے جبرائیم دکھائی دیتے ہیں۔ صدیوں کے اس جبر و تعطل سے ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ پتھر کی مورتوں کی طرح ذہنی طور پر خود بھی پتھر بن جاتے ہیں اور ایک مقام پر ساکت و صامت پابگل کھڑے رہتے ہیں۔

کاروان شوق بے ذوق و درجیل بے یقین و بے سبیل و بے دلیل

ان میں، سفر حیات میں، ایک قدم آگے بڑھانے کا بھی دلولہ نہیں رہتا۔ اس لئے نہ ان کے سامنے کوئی منزل ہوتی ہے، نہ منزل تک پہنچانے کے راستے۔ نہ کوئی راہنما نہ چراغِ راہ۔ مختصراً یہ کہ:

دین و دانش را غلام ارزاں دہد تا بدن را زندہ دارد جاں دہد

انسانی زندگی میں عقل و دانش، وحی کی عطا کردہ اقدار و اصول، اور ان کی روشنی و نشوونما پانے والی انسانی ذات متاعِ بہا ہیں۔ لیکن غلام اور محکوم محض طبعی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اس متاعِ گرانیہ کو جنس کا سدِ سمجھتا ہے۔ اور چیراؤ

کی طرح جیتا اور انہی کی طرح مرجاتا ہے۔

ایسی ہوتی تھی وہ قوم، جسے انسانی سطح پر لانے کے لئے حضرات انبیائے کرام کو مبعوث کیا جاتا تھا۔ آپ غور کیجئے کہ یہ مرحلہ کس قدر ہمت طلب اور اس فریضے کی ادائیگی کس قدر صبر آزما ہوتی تھی۔ یہی تقادہ مقام، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا سے کہا تھا: رَبِّ اَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتٰی (۲۶)۔
حضرت ابراہیمؑ کا سوال ”اے میرے نشوونما دینے والے! مجھے یہ بتا کہ اس قسم کی مردہ قوم میں زندگی کی

روح کس طرح پھونکی جائے؟“ اس سوال پر اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ اے ابراہیم! کیا تجھے اس پر یقین نہیں کہ ایسے مردوں کو بھی زندہ کیا جاسکتا ہے؟ عرض کیا کہ جب آپ نے میرے ذمے یہ فریضہ عائد کر دیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسا ہونا ممکن ہے لہذا اس میں تو مجھے کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ میں وہ طریقہ پوچھنا چاہتا ہوں جسے اختیار کرنے سے یہ مقصد حاصل ہو سکے۔ میں چاہتا یہ ہوں کہ مجھے کامل اطمینان ہو کہ میں جس راستے پر چل رہا ہوں وہ مجھے بالیقین منزل تک پہنچا دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس طریق کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا۔ کہا کہ جنگل کے وحشی پرندوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ انسانی سائے تک سے بھی ڈر کر اڑ جاتے ہیں لیکن پرندوں کو سدھانے والے جب انہیں سدھا کر اپنے سے مانوس کر لیتے ہیں تو ان کی اس طرح قلب ماہیت ہو جاتی ہے کہ فضا کی پہنائیوں میں کھلا چھوڑ دیا جائے۔ وہ دور و در پہاڑیوں کی چوٹیوں پر بھی کیوں نہ جا بیٹھیں۔ سدھانے والا، جب ایک آواز دیتا ہے تو وہ لپک کر اس کی طرف آ جاتے ہیں۔ ابراہیمؑ حقائق سے نا مانوس، وحشی انسانوں کو اس طرح سدھا کر اپنے قریب لایا جاتا ہے۔ یہ ہے طریق مردہ قوموں میں زندگی کی روح پھونکنے کا۔ آپ نے غور کیا کہ یہ طریق کس قدر ہمت شکن، صبر آزما اور استقامت طلب ہوتا ہے؟

اس قسم کی تھی وہ قوم، جس کی تعلیم و تربیت، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سپرد کی گئی تھی۔ وہ مصر سے تو انہیں نکال لائے کہ یہ تبدیلی صرف سرزمین کی تبدیلی تھی۔ اب وہ مرحلہ آیا جس میں ان کے قلب دماغ کی تبدیلی مقصود تھی۔ اس مرحلہ میں ان کی خوشے غلامی کے مظاہر قدم قدم پر سامنے آتے تھے۔ اس سلسلے میں دو تین واقعات اس سے پہلے ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب وہ مصر سے نکلے تو سامنے سمندر تھا اور پیچھے فرعون کا لشکر۔ اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی راہنمائی کر رہے تھے اور انہیں یقین دلارہے تھے کہ تم گھبراؤ نہیں، میں وحی خداوندی کی روشنی میں تمہیں ایسے مقام کی طرف لے چلوں گا جہاں سے تم بعافیت سمندر پار کر جاؤ گے۔ لیکن اس سے ان کی بیخ و بیکار میں کمی نہ ہوئی بائبل میں ہے :-

اور جب فرعون نزدیک ہوا اور بنی اسرائیل نے آنکھیں اوپر کیں اور مصریوں کو اپنے پیچھے آتے دیکھا

تو وہ شدت سے ڈرے۔ تب بنی اسرائیل نے خداوند سے فریاد کی اور موسیٰ سے کہا، کہ کیا مصر میں قبروں کی جگہ نہ تھی کہ تو ہم کو بیابان میں مرنے کے لئے لایا۔ تو نے ہم سے یہ کیا معاملہ کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا۔ کیا یہ وہی بات نہیں جو ہم نے مصر میں تجھ سے کہی تھی کہ ہم سے ہاتھ اٹھا۔ تاکہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا، بیابان میں مرنے سے بہتر تھا بلکہ

(خروج۔ باب ۱۲-۱۲ آیات ۱۰-۱۱)

اگے بڑھے تو ایک بت پرست قوم کو دیکھ کر، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دامن پکڑ کر بیٹھ گئے کہ ہمیں بھی ایسا ہی بت بنا دیجئے۔ انہوں نے وہاں اپنا دامن چھڑایا تو ان کی غیر حاضری میں، انہوں نے گو سالہ پرستی شروع کر دی۔ یہ سب

ان کی خوتے غلامی کے مظاہر تھے۔ یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو گیا۔

حضرت موسیٰ کو ستانے والی قوم | ترمیمت، گاہ سینا میں قدم قدم پر ان کی طرف سے اسی قسم کے تقاضے ہوتے تھے۔ وہ بات بات پر روٹھ کر بیٹھ جاتے اور سرکشی اختیار کر لیتے۔ اسی قسم کے وہ تقاضے تھے جن سے تنگ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ کہنا پڑا: **يَقَوْمِ لِمَ تَوَدُّوْنِيْ وَقَدْ تَعْلَمُوْنَ اَنْيَ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اِيْكُمْ (۲۸)**۔

”اے لوگو! تم مجھے اس طرح کیوں تنگ کرتے ہو حالانکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کوئی اپنی بات تم سے نہیں منوانا چاہتا، میں تو خدا کے پیغامات تم تک پہنچاتا اور انہی کی اطاعت کا تم سے مطالبہ کرتا ہوں، پھر اس میں مجھ سے بگڑنے کی کیا بات ہے؟“

قوم بنی اسرائیل کی یہ ذہنیت، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک ہی محدود نہیں تھی۔ یہ ان کے بعد

بھی مسلسل چلی آئی۔ چنانچہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے دین خداوندی پیش کیا تو وہ آپ سے بھی اسی

قسم کے سوالات پوچھتے اور تقاضے کرتے تھے۔ سورۃ البقرہ میں ہے: **اَمْ تَرْيَدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا**

سہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قرآن کریم میں اقوام سابقہ کی داستانیں محض تاریخی حیثیت سے بیان نہیں ہوئیں۔ ان سے مقصد یہ ہوتا

ہے کہ ہم ان سے عبرت اور سوغفت حاصل کریں۔ آپ دیکھیں گے کہ بنی اسرائیل کی داستان، ہم اہل پاکستان پر کس طرح منطبق ہوتی ہے

بہیں بھی انگریز اور ہندو کی غلامی سے نجات دلا کر اس خطہ ارض میں بسایا گیا تاکہ ہم آزادی کی فضا میں سانس لے کر اپنے تصور رستہ کے

مطابق، اپنی آزاد مملکت، (اسلامی نظام) قائم کر سکیں۔ لیکن ہمارے نا شکر گزاری کا عالم یہ ہے کہ ہمیں ذرا سچی بھی کہیں مشکل پیش آتی ہے

تو چلا آگئے ہیں کہ قائد اعظم ہمیں یہاں کیوں لے آیا۔ اگر پاکستان نہ بنایا جاتا تو ہم ہندوستان میں، یہاں سے اچھے رہتے۔“ کیا ہماری ذہنیت

بجینہ، بنی اسرائیل کی سی نہیں ہے؟

سُئِلَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلِ - وَمَنْ يَتَّبِدْ اِلَ الْكُفْرِ بِاِلَ اِيْمَانٍ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ (۲۸) ”کیا تم چاہتے ہو کہ اس رسول سے بھی اسی قسم کی فرمائشیں کر دو، جس قسم کی فرمائشیں تم اس سے پہلے موسیٰ سے کیا کرتے تھے۔ اس قسم کی فرمائشوں کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ تم ایمان کے بدلے کفر کی راہ اختیار کرنا چاہتے ہو اور ظاہر ہے کہ ایسی دوش اختیار کرنے والا بڑے غلط راستے پر چلتا ہے“

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جو تقاضے کئے تھے ان میں سے ایک تقاضہ وہ بھی تھا، جو زیر نظر آیت میں ہمارے سامنے آتا ہے، یعنی:

وَإِذْ قُلْتُمْ يَمُوسَىٰ لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّعِقَةُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ۔

۲
۵۵

”جب تم نے موسیٰ سے کہا کہ ہم تمہاری کسی بات کے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں گے جب تک ہم خدا کو بے نقاب اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ ہم ایسے خدا پر ایمان ہی نہیں لا سکتے جسے ہم اپنے سامنے بے نقاب نہ دیکھ لیں“ اس تقاضے کے بعد کیا ہوا اسے ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

آپ نے دیکھا کہ ایک تک مصر کی بت پرست قوم میں رہنے سے ان کی ذہنیت کیا ہو گئی تھی۔ یہ ان انبیاء کی اولاد میں سے تھے، اور

خدا کو بے نقاب دیکھیں گے!

بہر حال اپنے آپ کو انہی کے پیرو کہتے تھے، جو ان دیکھے خدا پر ایمان لانے کی دعوت دیتے تھے۔ لیکن اب یہ ایسے خدا کو ماننے کے لئے تیار ہی نہیں تھے۔ خدا کی ذات ایک ایسی دراز البرار حقیقت ہے جو انسانی ”قیاس و خیال و گمان و دہم“ سے برتر اور ہمارے تصورات کی حدود سے بلند و بالا ہے۔ اس کا طبعی آنکھوں سے دیکھنا تو ایک طرف، انسان تو مادہ تک کی ابتدائی شکل — توانائی محض (PURE ENERGY) کو بھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ اُسے اس کے مظاہر ہی سے پہچان سکتا ہے۔ ریڈیو سے نشر شدہ لہریں ہر وقت ہمارے ارد گرد فضا میں محرکت ہوتی ہیں لیکن ہم انہیں اپنی آنکھوں سے کبھی نہیں دیکھ سکتے — آنکھوں سے دیکھنا تو ایک طرف رہا، ہم انہیں اپنے حواس خمسہ میں سے کسی حس کے ذریعے محسوس نہیں کر سکتے۔ ان کے وجود کا علم ہمیں اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے آپ کو ہمارے ریڈیو سیٹ کی وساطت سے محسوس کر آئیں۔ ذاتِ خداوندی کے متعلق قرآن کریم میں ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ - وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (۲۱) ”کوئی آنکھ ذاتِ خداوندی

کا ادراک نہیں کر سکتی، حالانکہ خدا ہر مقام پر موجود ہوتا ہے اور وہ ہر آنکھ کا احاطہ کرتا ہے لیکن اس کا یہ احاطہ کرنا بھی کسی محسوس ذریعے سے نہیں ہوتا۔ وہ نہایت غیر مرئی اور غیر محسوس طور پر محسوس اعمال انسانی تو ایک طرف، اس کے دل میں گزرنے والے خیالات تک سے بھی باخبر ہوتا ہے۔ ایسے خدا کے متعلق یہ تقاضہ کہ جب تک ہم اسے اپنی آنکھوں سے بے نقاب نہ دیکھ لیں، اُس پر ایمان نہیں لائیں گے، کتنی بڑی جہالت ہے! ان کی یہی جہالت تھی جس کے متعلق سورة النساء میں ہے: **يَسْأَلُكَ أَهْلُ الْكِتَابِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِنَ السَّمَاءِ - فَقَدْ سَأَلُوا مُوسَى أَكْبَرَ مِنْ ذَلِكَ - فَقَالُوا - آرِنَا اللَّهَ جَهْرَةً (۲۴۵)۔** ”اے رسول! تجھ سے یہ اہل کتاب (یہودی) کہتے ہیں کہ ہم تمہارے دعویٰ نبوت کو تب سچا مانیں گے جب تک ایک بنی بنائی کتاب، آسمان سے اتری ہوئی دکھاؤ۔“ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ان کا یہ تقاضہ، اس تقاضے کے مقابلے میں جو انہوں نے اپنے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا، بہر حال ہلکے قسم کا ہے۔ انہوں نے موسیٰ سے کہا تھا کہ تم خود خدا کو ہمارے سامنے بے نقاب لا کر دکھاؤ۔“ ان کی اس فرمائش کے بعد کیا واقعہ پیش آیا، اس کی تفصیل تو قرآن کریم نے نہیں دی۔ بس اتنا ہی کہا ہے کہ: **فَاَخَذَ نَكْمًا مِّنَ الصَّعِقَةِ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُونَ (۲۴۶)۔** ”تہین بجلی کی کوک نے پکڑ لیا۔ سورة الاعراف میں بھی (غالباً) اسی واقعہ کا تذکرہ چوہاں کہا گیا **اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ (۲۴۷)۔** ”انہیں زلزلہ نے پکڑ لیا۔“ ہمارے سمجھنے کی بات اتنی ہی ہے کہ مطالبہ تو خدا کو بے نقاب دیکھنے کا تھا اور ان کی دوں ہمتی اور ہزدلی کا عالم یہ تھا کہ بجلی کی کوک اور زلزلے کے ارتعاش سے ان کے ہوش اڑ گئے، حالانکہ یہ دونوں چیزیں، محسوسات

ہزدلی کا یہ عالم | میں سے تھیں محسوسات کو معبود بنالینے والوں کی ہمت اور حوصلے کا یہی عالم ہو جاتا ہے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مشدآن کریم نے شرک کرنے والوں کے خوف اور ڈر کو کس طرح واضح الفاظ میں بے نقاب کیا۔ اسی جلد کے شروع میں قصہ آدم کے ضمن میں بتایا جا چکا ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کی صلاح آدمی کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے۔ اس اعتبار سے ملائکہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ لیکن محسوسات کو معبود بنالینے والوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ فطرت کی انہی قوتوں سے ڈرتے اور کانپتے رہتے ہیں اور یہی خوف انہیں، اُن کے سامنے سجدہ ریز ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جو قوم فطرت کی قوتوں سے اس طرح لرزہ بر اندام ہو جائے وہ خدا کی عظمت اور اقتدار کا اندازہ کس طرح لگا سکتی ہے؟ **وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدَرِهِ (۲۴۸)۔** ”انہوں نے خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا۔“ ان اور انہی جیسوں کے متعلق کہا گیا تھا۔

یہودیوں کی یہی ذہنیت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جماعت مؤمنین سے کہا گیا تھا کہ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا**

اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذٰى مُّوْسٰى (۳۳) اے جماعتِ مومنین! دیکھنا تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا، جنہوں نے موسیٰ کو طرح طرح کی بیہودہ فرمائشوں اور تقاضوں سے تنگ کر مارا تھا، ان میں سے ایک تقاضہ یہ بھی تھا کہ وہ خدا کو محسوس شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس جماعتِ مومنین نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تو اس قسم کی کوئی فرمائش نہ کی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ خدا کو اس کی ان صفات کی رو سے ہی جو قرآن کریم میں مذکور ہیں، پہچانا جاسکتا ہے، ذاتِ خداوندی کو بے نقاب دیکھنا تو ایک طرٹ، اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ان

مسلمانوں کو تنبیہ

کا اس حقیقت پر محکم یقین تھا اور کامل اطمینان۔ لیکن اس کے بعد، جب ہمارے ہاں تصوف در آیا تو ہم بھی اسی سطح پر اتر آئے۔ قرآن کریم نے ذاتِ خداوندی پر ایمان کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن تصوف نے اس کی جگہ عرفان کا نظریہ وضع کیا۔ یعنی ذاتِ خداوندی کی معرفت۔ اس کی ذات کا پہچانا۔ چونکہ (صائب کے الفاظ میں)۔ تصوف برائے شعر گفتن خوب است۔ اس لئے تصوف کے ان عقائد و نظریات نے زبانِ شعر میں گل کھلائے۔ قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہا ہے کہ انہوں نے خدا سے درخواست کی تھی کہ وہ انہیں اپنا جلوہ بے حجاب دکھائے تو اس کے جواب میں کہا گیا تھا لَنْ تَرٰنِيْ (۱۲۱) ”تو مجھے نہیں دیکھ سکتا“ اس کے بعد ہے کہ موسیٰ علیہ السلام، جلوہ خداوندی کی تاب نہ لا کر گر پڑے (ان اشارات کی تفصیل ہم آگے چل کر اپنے مقام پر بیان کریں گے جہاں یہ بھی بتائیں گے کہ بنی اسرائیل کے تقاضہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس درخواست میں بنیادی فرق کیا تھا۔ اس جگہ ہم اسی نکتہ تک محدود رہنا چاہتے ہیں جس کے لئے یہ بات ضمناً کہی گئی ہے)۔ ہم ادھر بیان کر چکے ہیں کہ خدا نے اپنے متعلق کہا ہے کہ کوئی انسانی آنکھ اس کا ادراک نہیں کر سکتی۔ ظاہر ہے کہ اس میں انبیاء اور غیر انبیاء سب شامل ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں کی تصوف زدہ شاعری انتہائی غلو سے آگے بڑھتی

ہماری حالت

ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کہتی ہے کہ:-

موسىٰ زہوش رفت بیک جلوہ صفا، تو عین ذات می نگری، در تبسمی!

حضرت موسیٰ علیہ السلام صفاتِ خداوندی کے ایک جلوہ کی تاب نہ لا کر بیہوش ہو گئے لیکن حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ذاتِ خداوندی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔ نعت کی دنیا میں اس، اور اس قسم کے دیگر اشعار کو بڑے فخر سے پیش کیا اور بڑے ذوق و شوق سے سنا جاتا ہے لیکن کوئی نہیں سوچتا کہ یہ وہی جلوہ جس سے قرآن کریم نے سختی سے منع کیا تھا جب کہا تھا کہ بَلَّاهِلَ الْكِتٰبِ لَا تَقْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقْوَلُوْا عَلٰی اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ (۱۲۱)۔ اے اہل کتاب! تم دین میں مبالغہ مت کرو اور خدا کے متعلق وہی بات کہو جو احق ہے۔ اور احق یہی ہے کہ

ذاتِ خداوندی کو آنکھوں سے دیکھنا تو ایک طرف، اس کی کند و ماہیت و کیفیت بھی انسانی ذہن میں نہیں آسکتی۔
لیکن یہ مثال تو ذرا پہلے زمانے کی تھی۔ اب معاملہ اور آگے بڑھ گیا ہے اور محرابِ دمنبر تک سے اس قسم کی آوازیں
بلند کی جاتی ہیں کہ:-

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

ان کے نزدیک احد اور احمد ہیں، بس ایک میم کا پردہ حائل ہے جسے عاشق کی نگاہ نہایت آسانی سے، درمیان سے
انگ کر کے، ان دونوں کی وحدت کا نظارہ کر لیتی ہے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) اور یہ کہ:-
اگرچہ ظاہر میں وہ عرب ہے مگر حقیقت میں عین رب (ع+رب) ہے (معاذ اللہ)۔

یہ حضرات بزمِ خورشید، ہراتِ خدا کی محفل میں شریک ہوتے اور عاشق و معشوق کی طرح مجنونانہ نیاز رہتے ہیں۔
آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم نے ہم سے کہا تھا کہ تم بنی اسرائیل کی طرح نہ ہو جانا، ہم کس دھڑکتے سے اس فرمانِ خداوندی
سے سرتابی برت رہے ہیں اور طرفہ تماشا یہ کہ اسے عین دین ہی نہیں، مغرورین قرار دیا جاتا ہے۔

۰۰۰

بہر حال، اب آگے بڑھتے بنی اسرائیل کی اس ذہنیت کے بعد، انہیں مرفوع القلم سمجھا جانا چاہئے تھا۔ لیکن جیسا
کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، اللہ تعالیٰ نے تربیتِ گاہِ سینا کو ان کے لئے مہلت کا وقفہ قرار دیا۔ اس لئے کہا کہ ان کے اس قسم کے
تقاضوں کے بعد، بجائے اس کے کہ انہیں ابدی طور پر راندہ درگاہ قرار دے دیا جاتا:

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔

۲/۵۶

ہماری کتبِ تفسیر میں یہ کہا گیا ہے کہ اس بجلی کی کوٹک یا زلزلہ سے وہ سب مر گئے، لیکن اللہ نے انہیں پھر زندہ
کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو خدا اس عظیم کائنات کو عدم سے وجود میں لا سکتا ہے، جو بے جان مادہ میں سے زندگی
لی نمود کر سکتا ہے، جو ایک جرثومہ کو انسان بنا سکتا ہے۔ اس کی قدرت سے یہ ناممکن نہیں کہ وہ کسی کو طبعی طور پر مار

۱۔ نگاہِ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردہ میم کو اٹھا کر وہ بزمِ بشر میں آکے بیٹھیں ہزاروں گچھیا چھپا کر۔ اسے علامہ اقبال کے دیرا دل کا شعر بتایا جا رہا ہے
جسے انہوں نے اپنے مجموعہ کلام میں شامل نہیں کیا۔ لیکن اب اُسے فخر یہ ان کی طرف منسوب کر کے دنیا بھر میں نشر کیا جا رہا ہے۔ اگر انہوں نے
یہ شعر کیا تھا لیکن بعد میں اسے اپنے کلام سے خارج کر دیا تھا۔ تو پھر اسے ان کی طرف منسوب کئے جانا بڑی زیادتی ہے۔

کہ پھر زندہ کر دے۔ مرنے کے بعد کی زندگی پر تو ہمارا ایمان ہے۔ لیکن اس خدا نے یہ کہیں نہیں کہا وہ اس دنیا میں کسی کو طبعی موت مار کر، پھر یہیں زندہ کر دے گا۔ اس لئے اس آیت میں، موت اور بعثت کے الفاظ کچھ اور مفہوم رکھتے ہیں۔ موت اور حیات کے متعلق مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں آیت (۲/۲۸) کے تحت (صفحہ ۳۷۶ پر) گفتگو ہو چکی ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہاں موت اور بعثت کے قرآنی مفہوم کو ذرا اور واضح طور پر پیش کر دیا جائے تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ یہاں ان الفاظ سے مراد کیا ہے؟

بنیادی طور پر موت کا لفظ، حیات کے مقابلہ میں آتا ہے لیکن جس طرح حیات سے مراد محض سانس لینا نہیں، یہ لفظ مجازاً متعدد دیگر مفہیم کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح موت سے مراد بھی صرف سانس کا بند ہو جانا

یا طبعی طور پر مرجنا نہیں، یہ مجازاً متعدد معانی کے لئے بولا جاتا ہے۔ مثلاً جس چیز کی حرکت بند ہو جائے اور اس طرح اس پر جمود طاری ہو جائے۔ عربوں کے

موت کا مجازی مفہوم

ہاں اس کیلئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ کہتے تھے **هَاتَتْ السَّيِّحُ** یعنی ہوا رگ گئی، ساکن ہو گئی۔ یا جس چیز میں قوت اور حرارت نہ رہے اس کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا تھا **هَاتَتْ النَّارُ** کے معنی تھے آگ بجھ

گئی۔ یا جس چیز میں جوش اور دلولہ نہ رہے اس کے لئے بھی یہ لفظ آتا تھا **هَاتَتْ الْخَمْرُ** کے معنی تھے شراب میں تیزی اور تندہی باقی نہ رہی۔ بنا بریں قرآن کریم میں بھی یہ لفظ ضعف و ناتوانی، ذلت و مسکنت، اضمحلال اور

شکست خوردگی، قوت نہ ہونے کے باقی نہ رہنے یا عقل و شعور کے معطل یا مفقود ہو جانے کے لئے متعدد مقامات پر آیا ہے۔

مثلاً سورة البقرہ میں، بنی اسرائیل ہی کے واقعہ کے ضمن میں لکھا ہے **الْمُتَدْرِىَ الْاِثْنَيْنِ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اَلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ**۔ **فَقَالَ لَهُمْ اللّٰهُ هُوُوُوْا۔ ثُمَّ اَحْيَا هُمْ** (۲/۲۵) ”تم نے

ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جو دشمن کے مقابلہ کے لئے ہزاروں کی تعداد میں گھر سے نکلے لیکن جب وہ دشمن کے سامنے آئے تو ان پر موت کا خوف اس طرح طاری ہو گیا کہ وہ میدان جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے تو اللہ نے

ان سے کہا کہ جاؤ، مرجاؤ۔ لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں حیات تازہ عطا کر دی“ ظاہر ہے کہ یہاں ان کی شکست خوردہ ذہنیت کو موت سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوبارہ ہمت اور حوصلہ عطا ہو ہو جانے کو

حیات کہہ کر پکارا گیا۔

قرآن کریم میں، زمین مردہ (بنجر زمین) میں حیات تازہ (پیداوار کی صلاحیت) پیدا ہو جانے کے لئے یہ لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے مثلاً (۲/۲۵)۔ سورة النمل میں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ **اِنَّكَ لَا تَسْمِعُ**

الْمَوْتِ - وَلَا تَسْمِعُ الصَّمَدُ عَاءَ إِذَا وَلَوْ هُوَ بَرِيءٌ (۲/۵۶) ”اے رسول! تو نہ مردوں کو سنا سکتا ہے اور نہ ہی ان بہروں کو، جنہیں بلایا جائے تو وہ پیٹھ پھیر کر چلیں“ اس سے اگلی آیت میں ہے کہ ”تو اندھوں کو راستہ نہیں دکھا سکتا۔ تو انہی کو سنا سکتا ہے جو ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور ان کے سامنے برسرِ قیام کر دیں“ سورۃ یسین میں قرآن کریم کے متعلق کہا ہے کہ لَيُنْذِرَ مَنِ كَانَ حَيًّا (۳۶/۲) ”یہ انہی کے لئے تنذیر کا موجب بن سکتا ہے جو زندہ ہیں“ قرآنی رہنمائی کی روشنی کے متعلق سورہ الانعام میں ہے: أَوْ مَنِ كَانَ حَيًّا فَحَيَّيْنَهُ. وَجَعَلْنَاهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ - كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا (۲۴/۴۰) ”ذرا سوچو، کہ وہ شخص جو مردہ ہو، پھر اُسے زندگی عطا کر دی جائے اور اُسے ایک شمع ہدایت دیدی جائے جس کی روشنی میں وہ دنیا میں چلے پھرے۔ کیا یہ شخص اس کے برابر ہوگا جو ایسے اندھیرے میں ٹامک ٹوتیاں مارتا پھرے، جس سے نکلنے کی کوئی راہ نہ ہو“

میدانِ جنگ تو ہوتا ہی طبعی موت کی آماجگاہ ہے۔ لیکن قرآن کریم میں جہاد (جنگ) کے لئے بلانے کو زندگی کی طرف دعوت، کہہ کر پکارا گیا ہے۔ فَمَا يَأْتِيهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (۲/۲۱۷) ”اے جماعتِ مومنین! تم اللہ اور رسول کی اُس دعوت پر لبیک کہو جو تمہیں زندگی عطا کرنے کے لئے دی جاتی ہے“

ان، اور انہی جیسے دیگر متعدد مقامات سے واضح ہے کہ موت کے معنی ہر جگہ طبعی موت | **بعث کا مفہوم** | نہیں۔ اس کے بعد آیہ زیرِ نظر (۲/۲۵۸) میں دوسرا لفظ بعث ہے۔ اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں جو چیز آزادانہ نقل و حرکت کی راہ میں حائل ہو اُسے راہ سے ہٹا دینا۔ مختلف رکاوٹوں کو دور کر کے کسی کی حرکت کو جاری کر دینا۔ اس اعتبار سے اس کے معنی کسی کو اٹھا کھڑا کر دینے کے بھی ہوتے ہیں۔ بعثتِ انبیاء کا یہی مفہوم ہے۔ اور بَعَثَ بَعْدَ الْمَوْتِ کے معنی ہیں، موت کے بعد زندگی عطا کر دینا۔ قرآن کریم میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا کہ عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا (۲۱/۱۰) ”تمہارے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کر کے، تمہیں بہت جلد مقامِ محمود تک پہنچا دیا جائے گا“

ان مفہیم کی رُو سے آیہ زیرِ نظر کا مفہوم یہ ہوگا کہ بنی اسرائیل نے اپنی عقل و بصیرت کی صلاحیت بھی کھودی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کو بھی پس پشت ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے وہ اس قسم کے تقاضے کو دیا کرتے تھے کہ ہم خدا کو بے نقاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ان کی فکری اور اعتقادی موت تھی جس سے ان پر جمود طاری ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں پھر ایک موقع عطا کیا۔ ان کی اس ذہنی اور اخلاقی موت کے بعد، ان کے موانع کو دور کر کے انہیں

پھر سے حیات تازہ عطا کر دی تاکہ ان کی کوششیں ضائع نہ ہوں بلکہ بھرپور نتائج پیدا کر دیں۔ چنانچہ سورۃ الاعراف میں اس واقعہ کے ضمن میں کہا: اِنْ هِيَ اِلاَّ فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاءُ وَتَهْدِي مَنْ تَشَاءُ (۱۷۱)۔ یہ ایک بھٹی تھی جس میں سے وہ گزرتے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اس میں بھسم ہو کر راکھ ہو جاتے یعنی انہیں کبھی سیدھا راستہ دکھائی نہ دیتا لیکن خدا نے اپنے قانونِ مشیت کی رُو سے ان کی پھر سے سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کر دی۔ یہ بھی موت کے بعد ان کی دوبارہ زندگی۔

جہاں تک راستے کے موانعات کے دور کر دینے (بعث) کا تعلق ہے، ان کی طبیعی زندگی کی مشکلات اور پریشانیوں بھی دور کر دیں اور انسانی زندگی کی بھی، طبیعی زندگی کی سہولتوں کے متعلق فرمایا:-

وَضَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ - وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّاءَ وَالسَّلْوى - كُلُوا
مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ - وَمَا ظَلَمُونَا وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ
يَظْلِمُونَ (۲/۵۷)

”اے بنی اسرائیل! تم خدا کی ان نعمتوں کو بھی یاد کر دو کہ اس نے ان صحراؤں میں، تمہارے سر پر بادلوں کے سائے کر دیئے۔ کھانے کے لئے من و سلوی جیسی غذا عطا کر دی جس کے لئے تمہیں کچھ محنت اور مشقت کرنی نہیں پڑتی تھی.....“

یہاں بادلوں کے ساتھ ضَلَّلْنَا کا لفظ آیا ہے۔ اس کے بنیادی معنی سایہ کے ہوتے ہیں چونکہ عربوں کا ملک نہایت گرم ہے اور وہاں درختوں کی بہت کمی، اس لئے ان کے ہاں سایہ، راحت و آسائش کے عظیم ترین اسباب میں سے سمجھا جاتا ہے۔ اس بنا پر وہ راحت و آسائش کی برکت کو ”ظِل“ سے تعبیر کرتے تھے۔ حتیٰ کہ جنت کو بھی ظِلُّ کہہ کر پکارتے تھے۔ اسی ہیج سے قرآن کریم نے جنت کے سلسلے میں ظِلُّ کا لفظ متعدد مقامات پر استعمال کیا ہے (ملاحظہ ہوں ۳۶/۳۶، ۳۶/۴۱ وغیرہ)۔ لہذا آیہ زیرِ نظر میں ضَلَّلْنَا کے لفظ میں آسائش و راحت کا مفہوم بھی شامل ہے۔

لفظ غمام جمع ہے عَمَامَہ کی۔ اس کے بنیادی معنی کسی چیز کو ڈھانپ لینے کے ہیں۔ اور چونکہ بادل، سورج کو ڈھانپ لیتا ہے اس لئے عرب اس لفظ کو بادلوں کے معانی میں بھی استعمال کرتے تھے۔

آیت میں، من و سلوی کے ساتھ، أَنْزَلْنَا آیا ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ سینکڑوں مقامات پر آیا ہے۔ اس کے بنیادی معنی بندی سے نیچے کی طرف آنے کے ہیں لیکن اس کا مجازی استعمال متعدد انداز میں ہوتا ہے۔ جو چیز خدا کی طرف

نزول کے معنی | سے عطیہ کے طور پر ملے اس کے لئے یہ لفظ عام طور پر آتا ہے۔ اسی لئے بارش اور زمینی پیداوار کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ الحديد میں ہے **وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ** (۲۶) اور ہم نے لوہا نازل کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی معدنیات کے بلا مزد و معاوضہ عطا ہونے کے ہیں۔ (یہاں ہم اس لفظ کے انہی معانی تک محدود رہتے ہیں۔ نزولِ مسترآنِ کریم کے سلسلے میں تفصیلی گفتگو اپنے مقام پر کی جائے گی)۔

آیہ زیر نظر میں کہا کہ خدائے تمہیں من اور سلویٰ بلا مزد و معاوضہ عطا کر دیا۔ **مَنْ**، شیرخشت یا ترنجبین کی قسم کی ایک میٹھی اور بڑی لذیذ گوند ہوتی ہے جو صحرا کی جھاڑیوں پر جم جاتی ہے۔ لیکن من کے معنی احسان کے بھی ہیں۔ اس لئے اس لفظ میں کنایت یہ مفہوم بھی شامل ہو گا کہ یہ غذا تمہیں خدا کی طرف احساناً عطا ہوئی تھی۔ اسی طرح سلویٰ بٹیر کی قسم کا ایک پرندہ ہوتا ہے لیکن (مادہ کے اعتبار سے) اس سے مراد ہر وہ شے ہے جو کسی کے لئے وجہ تسلی ہو۔ بنا بریں من و سلویٰ کے الفاظ میں طبعی غذا کے ساتھ معنوی کنایات بھی شامل ہیں۔ ر سایہ فگن بادلوں اور من و سلویٰ کا ذکر ۱۶ ذی الحجہ میں بھی آیا ہے)۔

رہنے کے لئے کھلی فضا، سایہ کے لئے بادل، کھانے کے لئے من و سلویٰ اور عقب کی طرف سے حفاظت کے لئے طور جیسا پہاڑ، جس کا ذکر ۲۴ ذی الحجہ ۱۷ میں بھی آیا ہے۔

یہ ان کی طبعی زندگی کے لئے سامانِ نشو و نما تھا۔ سیکور نظام میں بات یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن قرآن کریم طبعی سامانِ حیات سے متمتع ہونے کے لئے ایک شرط بھی عائد کرتا ہے اور وہ یہ کہ **كُلُوا مِنْ حَلٰلٍ مَّا رَزَقْنٰكُمْ** (۲)۔ اس نے رزق کے ساتھ **طیب** کی شرط التزاماً لگائی ہے اور یہی شرط قرآن کے معاشی نظام کو کیونز م کے نظام سے

رزق طیب کا مفہوم | تمیز اور ممتاز کرتی ہے۔ اس سلسلے میں **طیب** کا مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے۔ لغت کی رو سے اس کے بنیادی معنی ہر وہ چیز ہے جو طبعی طور بھی انسان کے لئے پسندیدہ خوشگوار، خوش ذائقہ اور عمدہ صحت ہو اور وہ انسانی ذات کے لئے بھی نشو و نما اور بالیدگی کا موجب ہو۔ قرآن کریم نے کھانے کی بعض چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اور باقی چیزوں کے متعلق کہا ہے کہ وہ حلال ہیں۔ لیکن حلال کے ساتھ اس نے **طیب** کا اضافہ بھی کیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ کھانے پینے کی حلال اشیاء میں سے تمہیں جو پسند ہوں جو تمہارے لئے خوشگوار ہوں، جو عمدہ صحت ہوں، انہیں کھاؤ پیو۔ یعنی یہ نہیں کہ ہر حلال چیز کے کھانے کا حکم دیدیا گیا۔

قرآن کریم نے انسان کے حسن ذوق کی رعایت بھی رکھی ہے۔ اسی لئے حلال چیزوں میں سے انتخاب انسان کی پسندیدگی پر چھوڑا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک انسانی ذات کا تعلق ہے اس کے لئے طیب وہی رزق ہو گا جو قوانین خداوندی کے مطابق (جائز اور حلال طریق سے) حاصل کیا گیا ہو۔ اس اعتبار سے قرآن کریم میں ہے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اٰتٰنًی - وَهُوَ مُؤْمِنٌ - فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَیۡوَةً طَیِّبَةً - فَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۶)۔ جو مومن بھی ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ شال کرے گا، خواہ وہ عورت ہو، خواہ مرد، ہم اسے نہایت طیب زندگی عطا کریں گے اور ان کے حسن عمل کا نہایت حسین نتیجہ مرتب کر دیں گے۔ یعنی ان کی حیاتِ طیبہ ان کے ایمان اور حسن عمل کا فطری نتیجہ ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس میں دنیاوی زندگی کی خوشگوار یوں کے علاوہ، انسانی ذات کی نشو و نما بھی شامل ہے اور یہی وہ چیز ہے جو طبعی طور پر خوشگوار رزق کو رزقِ طیب بناتی ہے۔ حلال اور طیب رزق کے ضمن میں تفصیلی گفتگو پہلی جلد میں بھی ہو چکی ہے (ملاحظہ ہوں آیات ۲/۱۱۱-۱۱۲ ذ ۲/۶۹) اور اس جلد میں بھی زیرِ آیت ۲/۱۶۔ لہذا اس نکتہ کی مزید وضاحت کی یہاں ضرورت نہیں بحر ایک نکتہ کے۔ اور وہ یہ کہ رزق کے طیب ہونے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اسے کوئی شخص اپنے لئے مخصوص کر کے نہ دبا بیٹھے۔ وہ تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا ہو۔ اس میں سب حاجت مند برابر کے شریک ہوں۔ چنانچہ یہ شرط بنی اسرائیل پر بھی عائد کی گئی تھی۔ بابل میں ہے کہ جب بنی اسرائیل کو خدا کی طرف سے من دسلوی ملا تو حضرت موسیٰ نے ان سے کہا کہ:-

یاد رکھو۔ یہ وہ روٹی ہے جو خداوند نے تمہیں کھانے کو دی ہے۔ خدا کا حکم یہ ہے کہ اس میں سے ہر ایک بقدر اپنے کھانے کے لے، اور جس کے خیمے میں جتنے لوگ ہوں، ایک اور فی کس کے حساب سے جمع کرے۔ اس سے زیادہ کوئی شخص جمع نہ کرے جس نے ایسا کیا اس کے رزق میں کیڑے پڑ جائیں گے۔

(خروج - ۱۶-۱۷)

اس انداز کو قرآن کریم رزق کے طیب ہونے کی ایک شرط بتاتا ہے۔

قرآن کریم نے یہ کچھ کہنے کے بعد ایک اور عین نکتہ کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانے کے لوگوں اور ان کے بعد آنے والوں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ تم جو یہودیوں کی اس قدر ذلت و ذکیت کی زندگی دیکھ رہے ہو تو یہ نہ سمجھو کہ ہم نے ان پر خواہ مخواہ ظلم کر رکھا ہے۔ ہم نے تو انہیں اس قدر نعمتوں سے نوازا تھا لیکن انہوں نے ان نعمتوں کی قدر شناسی کی اور اس طرح اپنے آپ پر خود ظلم کیا جس کا نتیجہ ان کی ذلت و خواری کی شکل میں نمودار ہوا۔ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا۔ ہم کسی پر ظلم کیا ہی نہیں کرتے۔

بنی اسرائیل کو قوم فرعون کی غلامی سے نجات دلانی گئی۔ اس کے بعد انہیں صحرائے سینا میں بسایا گیا۔ اگرچہ ان کی زندگی کی اس منزل میں بھی انہیں بہت سی نعمتوں سے نوازا گیا لیکن یہ ان کی زندگی کا منتہی اور مستقل مستقر نہیں تھا۔ یہ تو محض راستے میں سستانے کا مقام تھا۔ ان کا آخری مقام کچھ اور تھا جس کا ذکر سورۃ القصص میں ان الفاظ میں آیا ہے کہ: **وَنُزِیدُ اَنْ تَمَنَّٰ عَلَی السَّیِّئِیْنَ اَسْتَغْفِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اُمَّةً وَتَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِیْنَ۔ وَتُمْكِنُ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ (۲۸/۲۹)**۔ ہمارا پروردگار یہ تھا کہ یہ قوم، جسے فرعون کے ظلم و استبداد نے اس قدر کمزور اور ناتواں بنا کر رکھ دیا تھا ان پر اپنا احسان کریں۔ انہیں مملکت فرعون ہی کے ایک علاقہ کا وارث بنائیں وہاں انہیں تمکن عطا کریں اور اس طرح دیگر اقوام کی امامت ان کے حصے میں آجائے۔ (نیز ۲/۱۳۷، ۲۶/۵۷-۵۹، ۳۲/۲۴)۔

اس کی طرف اگلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے جہاں کہا ہے:-

وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَادْخُلُوا

۲
۵۸

الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةً نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتَكُمْ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ۔ (۲۸/۲۹)

اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے: ”اور جب ہم نے کہا داخل ہو جاؤ اس شہر میں اور کھاتے پھرو اس میں، جہاں چاہو فراغت سے اور داخل ہو دو دانے میں سجدہ کرتے ہوئے اور حِطَّةً کہتے ہوئے۔ بخش دیں گے ہم تمہارے گناہ اور نیکی کرنے والوں کو زیادہ بھی دیں گے۔“

اس آیت میں قریہ سے مراد کوئی خاص بستی نہیں بلکہ فلسطین کی سرزمین ہے جس کا انہیں **خلافت ارضی** وارث بنانا مقصود تھا۔ اُس سرزمین کے متعلق چار الفاظ میں یہ بتایا کہ وہاں تمہیں

جنت ارضی کی زندگی نصیب ہو جائے گی۔ **فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا** کے الفاظ جنتِ آدم کے سلسلے میں آیت (۲۸/۲۹) میں آچکے ہیں۔ وہاں سے معلوم ہو جائے گا کہ اس سے مقصود کیا تھا۔ بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ یہ سرزمین تمہارے نام لکھ دی گئی ہے۔ اب تم آگے بڑھو اور اس کا قبضہ لے لو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں خاص تنبیہ بھی کر دی اور یہ وہ تنبیہ ہے جو کسی ملک میں عام فاتحین اور مومنین کے لشکر کے داخل ہونے میں ہیں امتیاز پیدا کر دیتی ہے۔ عام فاتحین کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ مفتوحہ علاقے میں داخل ہوتے ہیں تو قوت کا اثر انہیں بد مست کر دیتا ہے جسکی وجہ سے وہ مفتوح و مغلوب آبادی کو ایسے ظلم و ستم کا نشانہ بناتے ہیں جس سے انسانیت کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ سابقہ اقوام کے سلسلے میں تاریخ کے خونی اوراق، فاتح قوم کی اس وحشت و بربریت

کی داستانوں سے ملوث ہیں اور عصرِ حاضر کی اقوام، مفتوحہ علاقوں کے ساتھ کیا کچھ کرتی ہیں وہ ہمارے آنکھوں دیکھے منظر ہیں۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو ملکہ سبا کے ان عبرت آموز الفاظ میں تمام دنیا کے لئے باعثِ موعظت بنایا ہے کہ:

قَالَتْ إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً - وَكَذَلِكَ يَفْعَلُونَ (۲/۲۴۹) ملکہ سبا نے اپنے وزیروں اور مشیروں سے پوچھا کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی چٹھی کا کیا جواب دینا چاہئے اور اس کے ساتھ ہی ان سے کہا کہ اپنا مشورہ دیتے وقت اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا کہ جب بادشاہ، کسی ملک میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوتے ہیں تو وہاں کیا کچھ کرتے ہیں۔ وہ وہاں

مسلم فاتحین کی خصوصیت

کی ہر شے کو ہنس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں۔ وہ وہاں کے معزز اور سربراہ اورہ ابنائے قوم کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں۔ اور اسے بھی فراموش نہ کرنا کہ کسی خاص بادشاہ کی روش نہیں، یہ ملوکیت کا خاصہ ہے۔ بادشاہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں ایسا ہی کرتے ہیں۔ اور یہی تقوت کے نشہ میں مدہوش ملوکیت کی وہ ذہنیت، جسے بدلنے کے لئے بنی اسرائیل کو تنبیہ کی گئی کہ اس سرزمین میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہونا تو اس انداز سے کہ تمہاری گردنیں قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکی ہوئی ہوں (سُجَّدًا)۔ دیکھنا! تمہارے سر میں سرکشی کے جذبات نہ ابھرائیں ان بستیوں میں متکبر اور جبار بن کر داخل نہ ہونا۔ اپنے سر کو جھکاتے ہوئے داخل ہونا۔ اس کے ساتھ دوسرا لفظ حِطَّةٌ ہے۔ اور یہ تنبیہ بھی بڑی عبرت آموز ہے۔ ظاہر ہے کہ جنگ و جدال میں سپاہیوں سے کوئی نہ کوئی لغزش سرزد ہو جاتی ہے۔ کہا کہ فاتحانہ طور پر داخل ہوتے وقت اپنی ان لغزشوں پر نظر رکھنا جو تم سے سرزد ہو چکی ہوں۔ جب تمہاری نگاہیں اپنی لغزشوں پر مرکوز ہوں گی تو تمہارے دل میں تمرد اور سرکشی کے جذبات نہیں ابھریں گے۔ فرد تنی اور انکسار کے جذبات بیدار ہوں گے۔ اور دوسری بات یہ یاد رکھنا کہ اس سرزمین کو اب تمہارا مستقر بننا ہے اس لئے اس کا بھی خیال رکھنا کہ اگر تم نے وہاں کسی چیز کو تباہ اور برباد کر دیا تو وہ تباہی اور بربادی خود تمہاری ہوگی کیونکہ وہ چیزیں تو اس کے بعد خود تمہاری اپنی زندگی کا سامانِ زیست بننے والی ہیں۔ انہیں دشمن کی چیزیں نہ سمجھنا، اپنی سمجھنا۔

لغت کی رو سے حِطَّةٌ کے یہ دونوں معانی ہیں۔ اپنی لغزشوں کی معافی مانگنا اور اس منزل پر سامانِ سفر کو اتار دینا۔ یہی تھی وہ تلقین، جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی لسانِ مبارک سے خود جماعتِ مومنین سے کی گئی جب کہا کہ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ - وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا - فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ - إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا (۲/۱۹۸) جب خدا کی نصرت تمہارے شامل حال ہو جائے تمہارے سامنے فتوحات کے دروازے کھل جائیں اور تمہارے نظام کے ان خوشگوار نتائج کو دیکھ کر

لوگ فوج در فوج خدا کے دین میں داخل ہونے شروع ہو جائیں تو اس وقت یہ نہ سمجھ لینا کہ اب مقصد حاصل ہو گیا۔ اصل پروگرام تو اس وقت شروع ہو گا۔ اس لئے تم خدا کے نظام ربوبیت کی تکمیل کے لئے پہلے سے بھی زیادہ شدت کیساتھ سرگرم عمل رہنا اور خدا سے سامان حفاظت طلب کرنا۔ وہ تمہاری کوتاہیوں اور لغزشوں کے نقصان رساں نتائج سے محفوظ رکھے گا۔ یہی تھی وہ تنبیہ جو بنی اسرائیل کو کی گئی اور اس کا نتیجہ بھی انہی الفاظ میں بیان کیا گیا کہ **ذَغْفِرُ ذُنُوبَكُمْ** **خَطِيئَتَكُمْ** (۲/۵۸)۔ یہاں مغفرت کا لفظ پہلی بار آیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے صحیح مفہوم کا سامنے آنا نہایت ضروری ہے۔

قرآن کریم کی رو سے قانون مکافاتِ عمل اور جزا اور سزا کا قرآنی مفہوم آیات (۲/۱۷۸) (۲/۱۷۹) میں سابقہ صفحات پر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس سے عمومی طور پر مغفرت کا مفہوم بھی واضح ہو جائے گا اور حقیقت

مغفرت کے معنی

بھی قانونِ مکافات کے خلاف ہے۔ سفارش (شفاعت) کا عملی مقصد بھی تو یہی ہوتا ہے کہ مجرم کو بخش دیا جائے۔ اُسے اس کے جرائم کی سزا نہ دی جائے۔ جب قرآن کریم کی رو سے کسی مجرم کی سفارش نہیں ہو سکتی تو اس کے جرائم یا گناہوں کے بخشے جانے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ لغت کی رو سے **غَفَرَ** کے معنی ہیں کسی کو ایسی چیز پہنانا جس سے وہ نقصان رساں چیزوں سے محفوظ رہے۔ چنانچہ **الْمَغْفِرُ** زرہ کی طرح آہنی حلقوں سے بنی ہوئی جانی کو کہتے تھے جو خود کے نیچے پہنی جاتی تھی اور جو گردن اور مونڈھوں کو اس طرح ڈھانپ لیتی تھی کہ ان پر تلوار وغیرہ کا اثر نہیں ہوتا تھا اور اس طرح اس کا پہننے والا حملہ آور کے دار سے محفوظ رہتا تھا۔ اس مادہ کے اس بنیادی مفہوم کی روشنی میں مغفرت کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ جسمانی طور پر دیکھئے تو انسان پر ہر آن ایسے جرائم کا حملہ ہوتا رہتا ہے جو اس کی صحت اور آخر الامر اس کی زندگی کو تباہ کر دیں۔ لیکن فطرت نے انسان کے اندر ایسی قوتِ مدافعت رکھی ہے جو ان تخریبی عناصر کا مقابلہ کرتی ہے اور ان پر غالب آکر انہیں ہلاک کر دیتی ہے۔ یوں انسان ہلاکت سے محفوظ رہتا ہے۔ اگر

کبھی یہ تخریبی عناصر وبائی امراض کی شکل اختیار کر لیں تو لوگوں کو حفاظتی تدابیر (PREVENTIVE MEASURES) اختیار کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ لیکن اگر کسی کی قوتِ مدافعت کمزور ہو جائے اور یہ تخریبی عناصر غلبہ پالیں تو معالج اس بیمار کی قوتِ مدافعت بڑھانے کی تدابیر اختیار کرتا ہے۔ اگر یہ قوت بڑھ جائے تو یہ ان تخریبی عناصر کو ہلاک کر دیتی ہے۔ ان تدابیر کو (CURATIVE MEASURES) کہا جاتا ہے۔ حفظِ ماتقدم کی تجاویز ہوں یا علاج کی تدابیر، انہیں پہلے ہلاکت سے محفوظ رکھنے کی تدابیر کہا جائے گا۔ طبیعی زندگی میں یہ مغفرت ہے اور ایسی تدابیر، طلب اور اختیار کرنے کو

استغفار کہہ کر پکارا جائے گا۔ استغفار کے معنی ہیں مغفرت (حفاظت) طلب کرنا۔

طبیعی زندگی کی طرح انسانی ذات کی زندگی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اس کی نشوونما اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان عناصر کے حملوں سے بچنے کے لئے حفاظتی تدابیر اختیار کی جائیں جو اس کی تخریب کا موجب ہوں۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ وہ تخریبی عناصر انسانی ذات پر غالب آجائیں تو پھر ایسی تدابیر کی ضرورت اشد ہو جائے گی جو انسانی ذات کی تقویت کا موجب بنیں۔ یعنی اقدارِ خداوندی پر اور شدت سے عمل کیا جائے۔ اس پر دگرام کے مطابق حفاظت مل جانے کو مغفرت کہا جائے گا۔ چنانچہ قرآن کریم نے اسے میزان کی تشبیہ سے محسوس طور پر سمجھایا ہے اس نے کہا ہے کہ انسانی زندگی کے دو پلڑے ہیں۔ ایک پلڑے میں تعمیری عناصر (نیکیاں) ہوتی ہیں اور دوسرے میں تخریبی عناصر (برائیاں یا گناہ)۔ **مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ** (۱۱۴) ”جس کا نیکیوں کا پلڑا بھکا رہے گا وہ خوشگوار زندگی بسر کرے گا“ **وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ** (۱۱۵)۔ لیکن جس کا یہ پلڑا ہلکا ہو جائے گا وہ تباہی کے جہنم میں جا کرے گا۔ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو اس وقت تباہی سے بچنے کی ایک ہی شکل ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ انسان کے تعمیری اعمال کے پلڑے میں اور وزن ڈال دیا جائے۔ یعنی زیادہ سے زیادہ تعمیری کام کئے جائیں۔ اس طرح تباہی سے حفاظت مل جانے کو مغفرت کہا جاتا ہے اور استغفار کے معنی ہوتے ہیں اس حفاظت کے لئے جدوجہد کرنا۔ قرآن کریم نے دو لفظوں میں بتا دیا ہے کہ تباہی سے یہ حفاظت ملتی کیسے ہے۔ اور یہ وہ بنیادی اصول ہے جو اس تمام مسئلہ کی نہایت عمدگی سے وضاحت کر دیتا ہے۔ اس نے کہا کہ:-

إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱۳) نِزْر ۱۱۳ : ۲۳ (۲۸)۔

یاد رکھو! تباہی سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ تم زیادہ سے زیادہ تعمیری (نیک کام) کرد۔ سیئات کو حسنات ہی دور کر سکتی ہیں۔

تمہاری حسنات کا وزن تمہارے تعمیری پلڑے کو جھکا دے گا۔ اسے خدا کی مغفرت کہا جاتا ہے۔

نَحْشَشْ کا غیر قرآنی تصور | یہ ہے قرآن کریم کی رو سے مغفرت کا تصور۔ لیکن اس کے معنی ”نَحْشَشْ“ کر دینے سے قوم پر جو تباہیاں آئیں اور آرہی ہیں ان کی تفصیل میں

جانے کی ضرورت نہیں۔ قوم تباہ کن جرائم پر جرائم کئے جلی جا رہی ہے، اخلاقی پستیوں کی آلائش میں ملوث ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس کے باوجود مطمئن ہے کہ خدا یہ سب کچھ بخش دے گا۔ اس نَحْشَشْ کے لئے کرنے کا کام اتنا

ہی ہے کہ خدا سے دعا مانگتے رہو کہ یا اللہ بخش دے۔ یا۔ اَسْتَغْفِرُ اللہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَاَتُوبُ اِلَیْهِ کی تسبیحیں پھیرتے رہو۔ یہ ہے وہ فریبِ نفس جس نے ہماری قوم کو جرائم اور بد اخلاقیوں پر اسقدر جرم کا کر دیا ہے۔ جب یقین یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ سب جرائم بخش دے گا تو پھر وہ کونسا احساس ہے جو انسان کو غلط کوشیوں سے باز رکھ سکے؟ قرآنِ کریم نے قدم قدم پر کہا کہ جنت صرف تمہارے اعمال کے بدلے میں ملے گی۔ لیکن ہم ہیں کہ جنت بھی خدا سے بخشش کے طور پر مانگتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے کسقدر درد و سوز سے (بظاہر طنزیہ انداز میں) کہا ہے کہ :-

بہشتے بہرِ پاکانِ حرم است * بہشتے بہرِ اربابِ ہمہست
بلو ہندی مسلمان را کہ خوش باش * بہشتے فی سبیل اللہ ہمہست

(ارمغانِ حجاز)

اور اس ”فی سبیل اللہ“ عطا شدہ بہشت کے متعلق وہ دوسری جگہ کہتے ہیں :-
آن بہشتے کہ خدائے تو بخشد ہمہیچ * تاجراتے مل تست جنانِ چینےست
اور یہ کہہ کر انہوں نے جزائے عمل کے قرآنی مفہوم کو ایک مصرعے میں سمو کر رکھ دیا، کہ :-
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ اس سرزمین میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہو تو خدا کے حضور سر جھکاتے ہوئے اور اپنی لغزشوں کے تباہ کن نتائج سے سامانِ حفاظت طلب کرتے ہوئے داخل ہو۔ ایسا کر دو گئے تو ہم تمہیں ان نقصانات سے بھی محفوظ رکھیں گے اور وَ سَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ (۲۸) اس پر کچھ اضافہ بھی کریں گے۔ یہ ”اضافہ“ مزید وصفا کا متقاضی ہے۔

محسین کا مادہ (ح۔ س۔ ن) ہے۔ عام طور پر سمجھایا جاتا ہے کہ زمانہ جاہلیت (قبل از اسلام) کے عرب بالعموم جاہل، گنوار اور وحشی تھے جنہیں نہ ذوقِ سلیم سے کوئی واسطہ تھا، نہ حسِ لطیف سے کوئی بہرہ۔ ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔ زیادہ تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں، لیکن ان کے ذوقِ لطیف کا اندازہ اس سے لگ

حسن کا مفہوم

سکتا ہے کہ ان کے ہاں حسن کی تعریف تھی ”صحیح صحیح توازن اور تناسب“ (PROPORTION)

ہم سمجھتے ہیں کہ حسن کی اس سے بہتر اور جامع تعریف ہو نہیں سکتی۔ اور یہ بات وہی قوم کہہ سکتی ہے جسے ذوقِ سلیم اور حسِ لطیف کا بہرہ وافر عطا ہوا ہو۔ حسن کا نام ہی صحیح تناسب کا ہے۔ کسی حسنِ مجسم، پری پیکر کی ایک آنکھ کی سیاہی بال برابر اپنے مقام سے ہٹتی ہوئی ہو تو اس کی ساری رعنائیاں شرمندہ ہو کر رہ جاتی ہیں اور ذوقِ لطیف اس سے ابا

کرنے لگ جاتا ہے۔ توازن کا ذرا سا بگاڑ بھی حسن کو ختم کر دیتا ہے۔

اور قرآن کریم کو دیکھئے کہ اس نے صحیح اعمال کو حسن عمل کہا کر پکارا ہے۔ اور ان کی جزا یا نتیجہ کو بھی حسن سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ ہم انسان اور نفس کے عنوانات میں بتا چکے ہیں، انسان کو مختلف قسم کی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد بھی ہیں۔ ان متضاد صفات یا صلاحیتوں میں صحیح صحیح توازن برقرار رکھنا، حسن عمل کی معراج ہے۔ صفات

خداوندی کے لئے قرآن کریم میں **الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ** (۵۹) کے الفاظ آتے ہیں۔ اس لئے کہ خدا کی ذات وہ ہے جس میں مختلف صفات اپنے پورے پورے تناسب و توازن کے

الاسماء الحسنیٰ

ساتھ انتہائی حسن کا رانہ انداز سے یکجا جمع ہیں یہی انداز جب (علیٰ حدیثیت) انسانی ذات میں پیدا ہو جائے تو اُسے خدا کے رنگ میں رنگے جانے سے تعبیر کیا جائے گا۔ (۲۸)۔ تخلیق کائنات کے سلسلے میں قرآن کریم میں کہا گیا ہے: **الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ** (۳۲)۔ خدا نے کائنات کی ہر شے کو بہترین تناسب کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس نہج سے خدا کو:

أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ (۲۲) کہا گیا ہے۔ خدا نے جو دین انسانوں کے لئے متعین کیا وہ بھی احسن ہے۔ چنانچہ سورۃ انسان میں ہے: **وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ. وَهُوَ مُحْسِنٌ** (۱)۔ اس نظام زندگی سے زیادہ حسین نظام اور کونسا ہو سکتا ہے جس میں ہر فرد اپنے جذبات، توجہات، بلکہ پوری کی پوری ذات کو قوانین خداوندی کے سامنے جھکا دے اور اس طرح نہایت حسن کا رانہ انداز سے زندگی بسر کرے؟ ایسا دین عطا کرنے والے خدا کے متعلق

کہا: **وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا** (۵)۔ خدا سے بڑھ کر احسن احکام دینے والا کون ہو سکتا ہے؟ اسی جہت سے خود قرآن کریم کو **أَحْسَنُ الْحَدِيثِ** (۳۹) کہا گیا۔ سورۃ الليل میں ہے **وَأَمَّا مَنْ يُبْخَلْ وَاسْتَغْنَىٰ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ** (۹)۔ جو شخص سب کچھ سمیٹ کر اپنے لئے رکھ لیتا ہے اور پھر اس خیال میں لگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے کہ مجھے کسی کی احتیاج نہیں اور معاشرے کے حسن کو بگاڑ دیتا ہے؟ آپ نے دیکھا کہ قرآن کریم نے نظام سرمایہ داری

کے متعلق کہا ہے کہ اس سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے اس سرمایہ داری کے نامندہ ”فاردن“ کے بارے میں کہا کہ: **وَإِحْسِنُ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ. وَلَا تَبْغِ الْفُسَادَ فِي الْأَرْضِ** (۱۲)۔ جس طرح

خدا نے تمہاری ہر کم کو دود کر دیا ہے اسی طرح تمہیں بھی چاہیے کہ تم معاشرے کی ناہمواریاں دور کرو اور ملک میں فساد مت برپا کرو۔ خدا فساد برپا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ معاشرے میں حسن پیدا کرنے یعنی اس کی ناہمواریاں دور کرنے کے لئے بنی اسرائیل (اور خود جماعت مومنین) سے کہا گیا کہ: **وَاقْرَءُوا لِلَّهِ قَرْضًا حَسَنًا** (۵)۔ عام ترجمہ تو ان الفاظ کا یہ ہے کہ ”تم اللہ کو قرض حسنہ دو“ لیکن

ظاہر ہے کہ اس سے مفہوم یہ ہے کہ جس کے پاس نہ انداز ضرورت دولت ہو وہ دوسروں کی ضروریات کو پورا کر کے دے تاکہ اس طرح معاشرے کا حسن (توازن) برقرار رہے۔ دوسری جگہ یہ کہا کہ: **إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ أَنْفُسَكُمْ** (۱)۔ اگر تم اس طرح معاشرے کے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کر دو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خود تمہاری ذات

کا توازن برقرار ہے گا یہاں سے ہمارے سامنے یہ حقیقت آگئی کہ قرآن کریم کی رو سے اعمالِ حسنہ یا حسنات کے معنی کیا ہیں۔ اس سے مراد ہیں ایسے کام، جن سے معاشرے کا بگڑا ہوا توازن درست ہو جائے اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ ایسے کام کرنے والوں کی اپنی ذات کا بھی توازن برقرار رہے۔ عصرِ حاضر کی اصطلاح میں اسے متوازن شخصیت (BALANCED PERSONALITY) کہا جائے گا۔ اس قسم کے کام کرنے والوں کو قرآن کریم میں محسنین کہہ کر پکارا گیا ہے اور اس سلسلے میں کہا ہے کہ حضرات انبیائے کرام سب محسنین تھے (۲/۸۵)۔

عدل و احسان | قرآن کریم نے کہا ہے: **إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ** (۲/۱۷۷)۔ اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔ عدل کے معنی تو یہ ہیں کہ جو کچھ کسی کا واجب ہے اسے دیدیا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر اس سے اس کی ضروریات پوری نہ ہو سکتی ہوں تو کیا اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے؟ یہ قرآنی نظامِ ربوبیت کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔ کہا کہ نہیں۔ اس کی کمی کو پورا کیا جائے تاکہ اس سے اس کا بگڑا ہوا توازن برقرار رہے۔ اسے احسان کہتے ہیں جو قرآن کریم کے معاشی نظام کا اصل الاصول ہے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر حکم دیا ہے: **وَيَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِحْسَانًا** (۲/۱۷۷) اس کے معنی یہ ہیں کہ جب والدین ضعیف ہو جائیں تو ان میں مختلف نوعیتوں کی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اولاد کو چاہیے کہ ان کی اس کمی کو پورا کرے۔ اسی کا نام احسان ہے۔

احسان کا بدلہ احسان | سورۃ الرحمن میں ایک عظیم آیت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ **هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ** (۲/۵۵)۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہے اور مفہوم اس سے یہ لیا جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص تم پر احسان کرے تو تم بھی اس پر احسان کرو اور اس طرح اس کے احسان کا بدلہ چکا دو۔ چنانچہ احسان فراموش کو معاشرے میں بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کا یہ قرآنی مفہوم نہیں۔ قرآن کریم نے تو مومنین کی یہ خصوصیت بتائی ہے کہ وہ جب کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرتے ہیں تو اس سے کہہ دیتے ہیں: **لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكْرًا** (۲/۲۷۱)۔ ہم نے تمہارے لئے جو کچھ کیا ہے۔ تم سے اس کے بدلے میں کچھ لینا تو درکنار، ہم تو اس کے لئے شکر یہ تک کے بھی متمنی نہیں۔ اس لئے کہ ہم نے یہ کچھ تمہارے لئے نہیں کیا۔ **لَوْ جَدَّ اللَّهُ** کیا ہے۔ جس مشران کی یہ تعلیم ہو، کیا وہ یہ کہے گا کہ اگر تم کسی پر احسان کرو تو اسے اپنا بے دام غلام بنا لو اور جب تک وہ اس کا بدلہ نہ چکا دے اس کے سر پر سوار رہو؟ اس آیتِ جلیلہ کا مفہوم بڑا بلند ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ معاشرے یا کسی فرد میں کسی قسم کی کمی آ جانے سے اس کا توازن بگڑ جائے تو تمہارا فریضہ ہے

کہ اس بگڑے ہوئے توازن کو سنوار دو۔ لیکن اس کے لئے کسی معاوضہ یا صلہ کے متمنی مت ہو۔ تم نے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کرنا ہے۔ یہ تمہارا فریضہ ہے۔ وہ برقرار ہو گیا۔ بس یہی تمہاری محنت کا معاوضہ ہے۔

ع۔ صلہ شہید کیا ہے، تب و تاب جاؤ دانہ

اب آیہ پیش نظر کی طرف، جس میں کہا گیا ہے: نَغْفِرُ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاسْتَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ (۲/۵۸) اگر تم قوانین خداوندی کے سامنے جھکے رہو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری حفاظت کر دی جائے گی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تمہارے لئے اس سے بھی زیادہ کیا جائے گا۔ آپ مریض کی مثال کو، جو پہلے بیان کی گئی ہے، ایک بار پھر سامنے لائیے اس میں بتایا گیا ہے کہ جب کسی کی قوتِ مدافعت کم ہو جاتی ہے تو مہلک عناصر اس پر غالب آ جاتے ہیں۔ معالج اس مریض کی قوتِ مدافعت کو بڑھا دیتا ہے جس سے وہ ہلاکت سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن علاج کا مرحلہ، یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ معالج اسے مزید مقویات دیتا ہے تاکہ اس کی قوتِ مدافعت بڑھ جائے اور وہ اس طرح تخریبی عناصر کے حملوں سے محفوظ رہے۔ یہ ہے مراد وَاسْتَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ (۲/۵۸) سے۔ یعنی اگر تم محسن کا راند انداز سے زندگی بسر کر دو گے تو تمہیں تمہاری لغزشوں کے نقصان رساں نتائج سے محفوظ ہی نہیں رکھا جائے گا۔ بلکہ تمہاری صلاحیتوں کو اس قدر مستحکم کر دیا جائے گا کہ تم زندگی کے بقیہ سفر کو بھی بخیر و عافیت طے کر سکو گے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم میں (ایک اور مقام پر) ایسا عین نکتہ بیان کیا گیا ہے جس پر غور کرنے سے نگہ بصیرت رقص کرنے لگ جاتی ہے۔ اس نے اہل جنت کے متعلق کہا ہے: لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ (۲/۲۵) اہل جنت جو کچھ چاہیں گے، انہیں ملے گا۔ بلکہ ہماری

جو چاہو گے اس سے بھی زیادہ

طرف سے اس سے بھی زیادہ۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب جنت میں، اہل جنت کی ہر خواہش پوری ہوتی جائے گی تو پھر اس سے زیادہ کا کیا سوال پیدا ہوگا؟ قرآن یہ کہتا ہے کہ انسان کی خواہشیں اور آرزوئیں اس دائرے تک محدود ہوتی ہیں جس کے اندر وہ زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔ اس دائرے سے آگے اس کا تصور بھی نہیں جاسکتا لیکن خدا کے پروردگار کی رو سے، انسان نے نہ معلوم زندگی کے کتنے ارتقائی منازل طے کرنے ہیں۔ جنت بھی ان منازل میں سے راستے کا ایک مقام ہے۔ اس سفر کا منتہی نہیں۔ لہذا اہل جنت کی خواہشات اس دائرے تک محدود ہوں گی۔ اس سے آگے ان کی نگاہیں جا ہی نہیں سکیں گی۔ لیکن نگہ خداوندی تو انتہا تک جاتی ہے۔ وہ ان کے حسنِ عمل کے بدلے میں وہ کچھ بھی دے گا جو ان کی اس دقت کی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرے اور اس کے علاوہ وہ انہیں اس قابل بھی بنا دیگا کہ وہ اس سے اگلی منزل کو بھی بحسن و خوبی طے کر سکیں۔ یہ ہے خواہشات سے زیادہ ملنے

کا قرآنی مفہوم۔ یہ ہیں سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ کے معنی۔

۴۰

خدا نے تو بنی اسرائیل کے لئے یہ کچھ چاہا تھا لیکن۔

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ۔ فَأَنزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ۔ (نیز ۱۶۶)

۲
۵۹

ہمارے ہاں کے مفسرین نے بالعموم کہا ہے کہ بنی اسرائیل سے کہا گیا تھا کہ اُس بستی میں داخل ہوتے وقت تم حِطَّةٰ کہنا۔ لیکن انہوں نے حِطَّةٰ کی بجائے حِنْطَةَ کہا (جس کے معنی گندم ہیں) اور اس کی وجہ سے ان پر عذاب نازل ہو گیا۔ یعنی ایک لفظ کی بجائے دوسرا لفظ کہہ دینے سے ان پر تباہی آگئی۔ یہ مفہوم جس قدر بے معنی ہے اس کے لئے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کا جو عملی نتیجہ ہمارے ہاں مرتب ہوا وہ یقیناً ایسا ہے کہ اس پر کھڑے ہو کر غور کیا جاتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم کی آیات کا تلفظ

الفاظ پر سارا زور

صحیح ہونا چاہئے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آیات کا صرف تلفظ صحیح ہونا چاہئے خواہ ان الفاظ کے معانی سمجھ میں آئیں یا نہ! اس نظریہ کی رو سے ہمارے ہاں صدیوں سے قرآنی الفاظ کے تلفظ کی صحت کو اس قدر اہمیت دی جا رہی ہے کہ بس اسی کو دین کا مقصود و مطلوب سمجھ لیا گیا ہے۔ اس نے ایک الگ فن کی حیثیت اختیار کر لی، جسے بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ مسلم ممالک کے بڑے بڑے جید قاری اس فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے حفاظ کی بھی یہی کیفیت ہے۔ ان کے ہاں الفاظ کی صحت پر انتہائی زور دیا جاتا ہے لیکن ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو قرآنی الفاظ کے معانی بھی جانتا ہو۔ کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں ایک جماعت پیدا ہو گئی ہے جس کا مشن یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کا ”کلمہ درست“ کراتی ہے۔ یعنی یہ لوگ ساری زندگی

تبلیغی جماعت

اس ”جہاد“ میں لگے رہتے ہیں کہ لوگ کلمے کے الفاظ صحیح طور پر ادا کریں۔ بالفاظ دیگر ان کے نزدیک اس امت پر ساری تباہیاں اس لئے آئی ہیں کہ لوگ کلمے کے الفاظ صحیح طور پر ادا نہیں کرتے۔ اگر امت ان الفاظ کو صحیح طور پر ادا کرنے لگ جائے تو پھر ان کے سب بگڑے ہوئے کام سنور جائیں۔

قرآنی لفظ ”قول“ کے معنی ”بات“ ہیں۔ لیکن خود ہمارے ہاں ”بات“ کا لفظ جن معانی میں بولا جاتا ہے اس سے ”قول کے بدل دینے“ کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ ہم ہر روز کہتے ہیں کہ ”چلو بھئی! یہاں بات بنتے نظر نہیں آتی۔“ یا یہ کہ ”بات بنتے بنتے بگڑ گئی“ ظاہر ہے ان فقرہوں میں بات سے مراد کوئی لفظ نہیں بلکہ معاملہ یا پروگرام

ہے۔ لہذا قرآن کریم نے کہا ہے کہ خدا نے جو پروگرام بنی اسرائیل کے سامنے رکھا تھا، انہوں نے اسے یکسر بدل دیا۔ انہوں نے ہماری بات کو بدل دیا۔ یہ ظلم تھا، فسق تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ غضب خداوندی کے مستوجب بن گئے۔ یعنی یہاں اللہ تعالیٰ نے خود کہہ دیا ہے کہ ان پر یہ تباہی اس لئے آئی کہ انہوں نے ظلم اور فسق کی رروش اختیار کر لی۔ آئیے ہم دیکھیں کہ ان سے کہا گیا تھا اور انہوں نے کیا کیا؟ سورۃ المائدہ میں اس کی تفصیل دی گئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: **يَقُومُوا دُخُلُوا الْأَرْضَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ۔ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَى أَدْبَارِكُمْ۔ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ (۵۱)**۔ ”دیکھو! یہ ارض مقدس تمہارے نام لکھی گئی ہے۔ اٹھو! اس کا قبضہ لے لو۔ دیکھنا دشمن کے مقابلے میں پیٹھ دکھا کر نہ بھاگ جانا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو بہت نقصان اٹھاد گے“ یہ بھی بات جو ان سے کہی گئی تھی۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا: **قَالُوا يَمُوسَى إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ۔ وَإِنَّا لَنَدْخُلُهَا حَتَّى يَخْرُجُوا مِنْهَا۔ فَإِن يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ (۵۲)**۔ ”اے موسیٰ! اس سرزمین میں تو بڑے بڑے جابر لوگ رہتے ہیں۔ جب تک وہ وہاں موجود ہیں

ارض مقدس پر قبضہ

ہم کبھی اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے۔ ہاں اگر وہ لوگ وہاں سے خود ہی نکل جائیں تو پھر ہم ضرور اس میں داخل ہو جائیں گے“ ذرا غور کیجئے اس منطق پر کہ دشمن خود بخود اپنے ملک کو خالی کر جاتے، تو پھر ہم آگے بڑھ کر اس پر قبضہ کر لیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کے ان دو بندوں (موسیٰ اور ہارون علیہما السلام) نے ان سے کہا کہ تم اس قدر بزدل اور دوں ہمت کیوں ہو رہے ہو؟ ذرا آگے بڑھ کر اس زمین پر قدم رکھو۔ **فَإِذَا دَخَلْتُمْ فَإِنَّكُمْ غَالِبُونَ۔ وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۵۳)**۔ ”اگر ایک دفعہ تم نے وہاں قدم رکھ دیا تو پھر غلبہ تمہارا ہی ہوگا۔ یہ بات تم سے خود خدا نے کہی ہے۔ اگر تمہیں ایمان کا دعویٰ ہے تو اس کی بات پر اعتماد کرو“ آپ کو معلوم ہے اس کے جواب میں انہوں نے کیا کہا: **قَالُوا يَمُوسَى إِنَّا لَنَدْخُلُهَا أَبَدًا مَّا دَامُوا فِيهَا۔ فَادْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ۔ فَحَاقَتِلَا۔ إِنَّا هُمْ نَاقِعِدُونَ (۵۴)**۔ ”اے موسیٰ! ہم نے ایک دفعہ جو کہہ دیا کہ جب وہ لوگ وہاں موجود ہیں، ہم ایک قدم آگے نہیں بڑھائیں گے۔ اگر تم وہاں جانے پر اس قدر ہی تلے بیٹھے ہو تو تم اور تمہارا بھائی دونوں جاؤ۔ ان لوگوں سے جا کر ٹو۔ ہم یہاں بیٹھے انتظار کریں گے۔ جب تم انہیں وہاں سے نکال دو گے تو ہم آجائیں گے“ لیجئے جواب مل گیا!!

(ضمناً) اس آیت میں آیا ہے: **فَإِذْ هَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ (۵۳)**۔ اس کے معنی یہ بھی کئے جاتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ تو اور تیرا رب دونوں جاؤ اور ان لوگوں سے ٹو“ لیکن عربی زبان میں ”رب“ بڑے بھائی کو بھی کہتے ہیں۔ میں نے

اسی مفہوم کو اختیار کیا ہے۔ بہر حال اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے تو مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہ سمجھی خدا سے یہ کہا: اِنِّیْ لَا اَمْلِکُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَنْحٰی۔ فَاَفَرَّقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ (۲۵)۔

بارِ خدا! میں اپنے آپ یا اپنے بھائی کے سوا کسی پر بھی کچھ اختیار نہیں رکھتا۔ اس قسم کی فاسق قوم میں اور ہم ہیں، تو یہی کوئی فیصلہ کر دے۔ اور خدا کا فیصلہ یہ تھا کہ: فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْہِم اَرْبَعِیْنَ سَنَةً یَّتِمُّوْنَ فِی الْاَرْضِ فَلَا تَأْسَ عَلٰی الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ (۲۶)۔ جب ان کی حالت یہ ہے تو وہ سرزمین، جو ان کے نام لکھ دی گئی تھی، چالیس سال تک ان پر حرام کر دی گئی ہے۔ تم انہیں ان جنگلوں اور صحراؤں میں سرگرداں پھرنے دو۔ ہم جانتے ہیں کہ ان کی اس بد نصیبی پر تمہیں تاسف ضرور ہوگا۔ لیکن جس قوم کی روش یہ ہو اس پر افسوس کرنے سے کیا حاصل؟ خدا کا یہ فیصلہ اس کے قانون وراثتِ ارض کے مطابق تھا جس میں کہا گیا ہے: اِنَّ الْاَرْضَ یَرِثُہَا عِبَادِی الصّٰلِحُوْنَ (۲۷)۔ زمین کے وارث تو وہی بندے ہو سکتے ہیں جن میں اس کی صلاحیت ہو۔ اس صلاحیت کا حکم بھی شامل ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام آب و گل کے ان پیکروں کو چالیس سال تک جنگلوں اور صحراؤں میں لٹے پھرتے رہے اور اس کے ساتھ ہی ان کی نو جوان نسل کی تربیت بھی کرتے رہے۔ جب یہ نئی نسل تربیت پا کر جوان ہوئی تو انہوں نے ایک جھپٹا مارا اور فلسطین کی موجودہ سرزمین پر قبضہ کر لیا۔ قوموں کی باز آفرینی کا طریقہ ہی یہ ہے کہ ان کے قدامت پرست، فرسودہ خیال اور رجعت پسند عنصر کو الگ کر کے نئی نسل کے افراد کی تعلیم و تربیت جدید ماحول میں نئے خطوط پر کی جائے تاکہ وہ تازہ دلوں اور زندہ عزائم لے کر ابھریں اور ہر مخالف قوت کو خن د خاشاک کی طرح بہا دیں۔ اسی لئے علامہ اقبالؒ نے اپنی اس آرزو کا اظہار کیا تھا کہ:

من کہ نو میدم زبیران کہن دارم از روزے کہ می آید سخن
بر جواناں سہل کن حسرت مرا بہر شاں پایاب کن ثروت مرا

اسی لئے ان کی دعا یہ تھی کہ:

جوانوں کو برمی آہِ حسرت پھر ان شاہین بچوں کو بالِ ہرے
خدایا! آرزو میری یہی ہے مرا نو بصیرت عام کر دے

بہر حال قرآن کریم میں ہے کہ ان کا اس روش کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان پر رجز کی مار ماری گئی۔ یہاں رجز کا لفظ بڑا غلط ہے۔ (الرَّجْزُ اُدْنٰی) کی ایک بیماری کا نام ہے جس میں اس کی ٹانگیں یا جسم کا پچھلا حصہ اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ جب وہ کھڑا ہونے لگے تو اس کی ٹانگیں ٹکڑ ٹکڑانے اور کپکپانے لگ جاتی ہیں اور وہ دو تین جھٹکوں کے بعد کہیں اٹھنے

کے قابل ہوتا ہے (ہمارے ہاں سیلوں کو بھی یہ مرض عاید ہو جایا کرتا ہے)۔ لہذا اس کے معنی ہیں کسی قوم کا اس قدر کمزور ہو جانا کہ وہ بمشکل اٹھنے کے قابل ہو سکے۔ اسے قرآن کریم نے رَجَزَ کہہ کر پکارا ہے۔ جنگ بدر کے سلسلے میں قرآن کریم میں آیا ہے کہ وہاں خدا نے ایسے سامان پیدا کر دیئے: وَيَذُوبُ عَنْكُمُ الرِّجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَى قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ (۸)۔ "جس سے تمہاری وہ کمزوری رفع ہو گئی جو دشمنوں کے پھیلانے والی تھی"۔ اس کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ تمہارے دل مربوط ہو گئے۔ تمہیں جمعیت خاطر نصیب ہو گئی۔ تمہارے قدم جم گئے۔ اس سے رَجَزَ کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔

اس آیت (۸) میں رَجَزُ مِنَ السَّمَاءِ کہا ہے۔ قوم بنی اسرائیل میں ایک ضعف و ناتوانی اور اضمحلال و کمزوری قوم فرعون کے استبداد کی پیدا کردہ تھی لیکن یہاں پہنچنے کے بعد انہوں نے قوانین خداوندی کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ ان کے حوصلوں کی یہ پستی اسی کا نتیجہ تھی۔ اسے قرآن کریم نے آسمان سے نازل شدہ رَجَزَ کہا ہے۔ اس کی تائید (۳۴) سے بھی ہوتی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ "جو ہمارے قوانین کو غیر مؤثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ الم انگیز رَجَزَ کے عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں" جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوا کہ آپ اس انقلابِ عظیم کو برپا کرنے کے لئے اٹھیے۔ (فَتَحْضَرُوا نَذْرًا) تو اس کے بعد کہا کہ اپنی جماعت کی اس طرح سے تربیت کیجئے: وَالرَّجَزَ فَأَهْجُرْ (۳۵)۔ ان کا ضعف و ناتوانی تبدیل بہ قوت ہو جائے اور ان میں ایک ہی جنبش سے اٹھ کھڑے ہونے کی طاقت پیدا ہو جائے۔

آیت زیرِ نظر (۲۸) میں ہے کہ بنی اسرائیل میں یہ رَجَزَ ان کے فسق کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اور سورۃ الانعام میں ہے کہ ایسا کچھ ان کے ظلم کی وجہ سے ہوا تھا۔ یعنی انہوں نے اپنا صحیح مقام چھوڑ دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ فسق کے متعلق مطالب الفرتان جداول میں آیت (۲۷) کے تحت (صفحہ ۳۳۴ پر) تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں اس قالب سے نکل جانا جس میں کسی کی صلاحیتیں نکلنے تک پہنچ سکیں۔



اس داستان میں اندازِ بیان یہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے کسی ایسی نعمت کا ذکر کیا گیا جس سے بنی اسرائیل کو پرہیز کیا تھا۔ اس کے بعد کہا گیا کہ جب انہوں نے کفرانِ نعمت کیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ پھر کسی اور نعمت کا تذکرہ کیا گیا۔ آیت (۲۸) میں سایہ فگن بادلوں اور من و سلویٰ کا ذکر تھا۔ اگلی آیت میں کہا گیا ہے :-

وَإِذَا سَأَلَكَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ
فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ
مَّشْرَبَهُمْ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْتُوا فِي الْأَرْضِ
مُفْسِدِينَ۔

۲
۴۰

اس کا عام ترجمہ یہ ہے ”جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے ہم سے پینے کا پانی مانگا تو ہم نے اس سے کہا کہ تم اس صحرا سے آگے بڑھ کر اس علاقے کی طرف چلے جاؤ جہاں چٹانیں ہیں۔ وہاں تمہیں پتھروں میں پنہاں پانی کے چشمے مل جائیں گے“ اس آیت میں ”ضرب عصا“ کا ذکر آیا ہے۔ اس کے متعلق ہم تفصیل سے پہلے بیان کر چکے ہیں جہاں قوم بنی اسرائیل کا سمندر پار کرنے کا ذکر آیا ہے (دیکھئے ۲/۵۰)۔ وہاں ہم بتا چکے ہیں کہ اس کے ایک معنی تو یہ ہوں گے کہ اپنی جماعت کو لے کر پتھر بیلے علاقے کی طرف نکل جاؤ۔ اور یہ بھی کہ وحی خداوندی نے ان چٹانوں کی نشاندہی کر دی جن پر پڑی ہوئی مٹی ہٹانے سے نیچے سے چشموں کا پانی پھوٹ نکلے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ یہ قوم بات بات پر بگڑ بیٹھتی تھی اور داؤدیلچا نا شروع کر دیتی تھی کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال کر لے آئے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بھی بائبل میں ہے :-

تب سارے بنی اسرائیل کی جماعت نے اپنے ہم سفرؤں میں خداوند کے فرمان کے مطابق سین کے بیابان سے کوچ کیا اور فیدیم میں پڑاؤ ڈالا۔ وہاں لوگوں کے لئے پینے کو پانی نہ تھا۔ سو لوگ موسیٰ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ پیئیں۔ موسیٰ نے ان سے کہا کہ تم مجھ سے کیوں جھگڑتے ہو اور خدا کا کیوں امتحان کرتے ہو۔ اور وہ لوگ پانی کے پیاسے تھے۔ سو لوگ موسیٰ پر بھجنے لگے اور کہا کہ تو ہمیں مصر سے کیوں نکال لایا کہ ہمیں اور ہمارے لڑکوں اور ہمارے مویشی کو پیاس سے ہلاک کر دے۔

(خروج ۱۷/۱-۷)

آیت زیر نظر میں کہا گیا ہے کہ وہاں بارہ چشمے نکلے اور انہیں بنی اسرائیل کے بارہ اسباط رقبیلوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ اقوام سابقہ میں حضرات انبیائے کرام اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت بھی قوم بنی اسرائیل کی طرف ہوئی تھی۔ پھر یہ قوم بھی قبیلوں میں بٹی ہوئی تھی اور مہنوزان کی تربیت ایسی نہیں ہوئی تھی کہ ان قبائلی تفریقات کو مٹا کر انہیں ایک امت بنا دیا جائے۔ انسانی تاریخ کے ابتدائی ادوار ایسے ہی تھے۔ لہذا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہر قبیلے یا خاندان کو الگ الگ چشمہ تفویض کر دیا کہ کسی قسم کا جھگڑا نہ ہو۔ اس کے

بعد قرآن کریم نے اپنی اس بنیادی تعلیم کو دہرایا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ خدا کے عطا کردہ رزق کو باہمی فساد کا موجب نہ بنایا جائے۔ اس سلسلے میں مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں بڑی شرح و بسط سے لکھا جا چکا ہے۔ (دیکھئے آیات ۲۰-۲۱ ذہ ۲۷-۲۸ اور اس جلد میں آیت ۲۰)۔ ان آیات میں فساد کا مفہوم بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ ان تشریحات کی یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

۴۔

بنی اسرائیل کو مصر کے علاقے سے باہر نکال لینے کا مقصد تو یہ تھا کہ انہیں قوم فرعون کی غلامی کے آہنی شکنجے سے نجات مل جائے اور دوسرا مقصد یہ کہ ان سے شہری زندگی کی سہل انگار عادات چھڑا کر ان کی تربیت صحرائی اور کوہستانی علاقوں میں اس طرح کی جائے کہ وہ محنت اور مشقت کے نوگر اور سختیاں برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں۔ علامہ اقبالؒ نے اسی نفسیاتی نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ:-

فطرت کے مقاصد کی کڑا ہے نگہبانی : یابندہ صحرائی یا مرد کوہستانی

اسی مقصد کے پیش نظر یہاں بنی اسرائیل کو بالکل سیدھی سادی اور فطری غذا دی گئی تھی۔ یعنی من اور سلوی۔ لیکن انہیں رہ رہ کر مصری کھانوں کے چٹخارے یاد آتے تھے خواہ وہ حاکم قوم کی چھوڑی ہوئی ہڈیاں چوسنے ہی سے کیوں نہ حاصل ہوتے ہوں۔ چنانچہ بائبل میں ہے:-

بنی اسرائیل کی ساری جماعت، زمین مصر سے خارج ہو کر دوسرے جہینے کے پندرہویں دن سین کے بیابان میں، جو ایلیم اور سینا کے درمیان ہے۔ پہنچے اور ساری جماعت بنی اسرائیل بولے کہ کاش ہم خداوند کے ہاتھ سے زمین مصر میں جس وقت کہ ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھتے تھے اور روٹی من بھر کر کھاتے تھے، مارے جاتے۔ تم ہم اس بیابان میں نکال لاتے ہو کہ سارے مجمع کو بھوک سے ہلاک کرو۔ (خروج ۱۶)

قرآن کریم نے ان کے اسی تقاضے کو اگلی آیت میں یوں بیان کیا ہے:-

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ۔ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّاءِهَا وَفُومَهَا وَعَدَسِهَا وَبَصِلَهَا۔ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ۔ اٰمِطُوْا مَصَدًّا۔ فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَأَلْتُمْ۔ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمْ

۲
۶۱

الذَّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآؤُا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ . ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ
بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ . ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا
يَعْتَدُونَ .

اس آیت کا مفہوم حسب ذیل ہے: ”(جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) تم نے سپاہیانہ زندگی پر، شہری زندگی کو ترجیح دی۔ اس کے لئے موسیٰؑ سے کہا کہ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم (اس صحرائی زندگی میں) صبح و شام ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے رہیں۔ اس لئے، تم اپنے نشوونما دینے والے سے ہمارے لئے زمینی پیداوار طلب کرو۔ سبزیاں، ترکاریاں، گلکاریاں، لہسن (یا مختلف قسم کے اناج)، مسور، پیاز (وغیرہ)۔ حالانکہ صحرائی زندگی تمہاری عسکری تربیت گاہ تھی اور وہاں کی خوراک ایسی تھی جو تم میں زندگی کی حرارت پیدا کر دیتی۔

موسیٰؑ نے کہا کہ (کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ تم اُس بہترین زندگی کی بجائے، جو تمہارے لئے تجویز کی جا رہی تھی، اس قسم کی ادنیٰ زندگی اختیار کرنا چاہتے ہو۔ اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو جاؤ، شہر کی زندگی اختیار کر لو۔ وہاں تمہیں یہ سب کچھ مل جائے گا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں عسکریت اور کشور کشائی کی صلاحیتیں مفقود ہو گئیں اور حکومت اور تساہل انگیزی کی خصلتیں پیدا ہو گئیں۔ اور، اس طرح، ان پر ذلت و خواری کا عذاب خداوندی مستولی ہو گیا۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ انہوں نے قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے انبیاء کی عزت و توقیر کے بجائے، انہیں ناحق ذلیل کرنے کی تدبیریں کرنے لگے، نیز، بعض کی جان تک کے لاگو ہو گئے۔ یہ سب کچھ ان کی سرکشی اور حدود فراموشی کا نتیجہ تھا۔“

اس آیت میں جو کہا گیا ہے: **إِهْبِطُوا حِصْرًا** تو اس کے یہ معنی نہیں کہ تم ملک مصر کی طرف واپس چلے جاؤ۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ اس دشت و صحرا میں تمہیں اس لئے لایا گیا تھا کہ تم شہری تمدن کی تن آساں زندگی کی جگہ سپاہیانہ زندگی کے خوگر بن جاؤ۔ تاکہ تمہیں ایک قوم غالب کی طرح سرسبز زیاں اور کامرانی نصیب ہو جائیں۔ لیکن اگر تم ذلیل و خوار ہی رہنا چاہتے ہو تو جاؤ! ادھر ادھر کئی بستیاں موجود ہیں ان میں جا بسو۔ وہاں تمہیں وہ کچھ مل جائے گا جس کی تم خواہش کر رہے ہو۔ اس میں **”إِهْبِطُوا“** کا لفظ خاص طور پر قابل غور ہے۔ جیسا کہ ہم آیت (۲/۶۸) میں بتا چکے ہیں، **هَبْطُ** کے معنی کسی بلند سطح سے پست سطح کی طرف آ جانے کے ہیں۔ لہذا انہیں بتا دیا گیا کہ تمہاری اس قسم کی خواہشات تمہیں پھر انہیں پستیوں کی طرف لے جائیں گی جن میں تم اس سے پہلے زندگی بسر

کرتے تھے۔ اس کے بعد کہا گیا ہے کہ ان پر ذلت و مسکنت کی مار ماری گئی۔ اور وہ غضبِ خداوندی کے مستوجب قرار پائے۔ ان الفاظ کا مفہوم آیات (۱/۲) پہلی جلد (صفحات ۵۳ - ۵۵) نیز آیات (۲/۲) و (۲/۳) زیر نظر جلد میں شرح و بسط سے بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس مقام پر اتنی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ ان پر ذلت و مسکنت اور غضب و عذابِ خداوندی نازل ہو گیا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ایسا صرف ان کی اس خواہش کی پاداش میں ہوا تھا۔ بنی اسرائیل کی یہ تاریخ زمانہ نزولِ قرآن میں اُنکے سامنے پیش کی گئی تھی، اس لئے ان کی یہ حالت کسی ایک واقعہ کے نتیجے میں نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ بہ بیعتِ مجموعی نتیجہ تھی ان کی تمام سرکشیوں اور بدعنوانیوں کا، جو تاریخ کے مختلف ادوار میں ان سے سرزد ہوئی تھیں۔ چنانچہ خود زیر نظر آیت کے آخری حصے میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ نتیجہ تھا اس کا کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی۔ حتکہ انبیاء تک کو قتل کر دیا۔ حدودِ فراموشی اور کھلی ہوئی بغاوت تک پر اتر آئے — معصیت (ع۔ ص۔ و) قانون شکنی اور نافرمانی کو کہا جاتا ہے اور عدوان کے معنی حد سے تجاوز کرنا ہیں۔ مقصد دونوں کا قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتنا اور خدا کی مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھ جانا ہے۔

اس آیت میں ”قتلِ انبیاء“ کی حقیقت و وضاحت طلب ہے۔ ہمارے زمانے کے ایک (جھوٹے) مدعیِ نبوت (مرزا غلام احمد) نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں ایک دلیل یہ بھی پیش کی تھی کہ جھوٹا مدعیِ نبوت قتل کر دیا جاتا ہے اور میں چونکہ قتل نہیں کیا گیا اس لئے میں جھوٹا مدعی نہیں ہو سکتا۔ ایسا کہنا، قرآنِ کریم کے حقائق سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ (جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں) عربی زبان میں قتل کے معنی کسی کو غیر مؤثر بنا دینا بھی ہیں لیکن اس کے معنی سچے قتل کر دینا بھی ہیں اور قرآنِ کریم میں کہیں یہ نہیں آیا کہ جھوٹے مدعیِ نبوت کو قتل کر دیا جائے گا۔ اس کے برعکس قتلِ انبیاء کا ذکر قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ (مثلاً دیکھئے ۲/۹۱ ذ ۳/۶ ذ ۳/۱۸ ذ ۴/۱۵۵) ان آیات میں قتلِ انبیاء کا ذکر ہے۔ اور آیات (۳/۱۸۴ ذ ۵/۱) میں قتلِ رسل کہا گیا ہے۔ انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام نے یہودیوں کی تباہی اور بربادی کا سبب بڑا سبب ان کے اسی

لے اس ضمن میں آیات (۲۹-۳۰) کو تائید میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان آیات میں ”قطع و تین“ کے معنی یہ نہیں کہ آخر کرنے کی سورت میں رسول کی رگِ قلب کو (عملِ جراحی کی طرح) کاٹ کر رکھ دیا جاتا۔ مقصد یہ ہے کہ اس صورت میں ان ذرائع و اسباب کو منقطع کر دیا جاتا جن سے اس کے کشن کو استحکام و ثبات حاصل ہوتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی اپنے مقام پر آئے گی۔

جرم کو قرار دیا ہے چنانچہ متی کی انجیل میں ہے :-

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو۔ تم پر افسوس ہے ! کہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راستبازوں کے منبر سے آراستہ کرتے ہو۔ اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے زمانہ میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے۔ اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ ہم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہیں۔ غرض اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھردو۔ اے سانپو۔ اے افعی کے بچو ! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے ؟ اس لئے دیکھو میں نبیوں اور داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں ان میں سے بعض کو قتل کرو گے اور صلیب پر چڑھا دو گے اور بعض کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے مار دو گے اور شہر بشہر ستاتے پھرو گے۔ تاکہ سب راستبازوں کا خون جو زمین پر بہا گیا، تم پر آئے۔ راستباز ہابیل کے خون سے لیکر ہر گناہ کے بیٹے زکریا کے خون تک، جسے تم نے مقدس اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ سب کچھ اس زمانہ کے لوگوں پر آئے گا۔

اے یروشلم ! اے یروشلم ! تو نبیوں کو قتل کرتی ہے اور جو تیرے پاس بھیجے گئے، انہیں سنگسار کرتی ہے۔ کتنی ہی بار میں نے چاہا کہ جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے جمع کر لیتی ہے اسی طرح میں بھی تیرے لڑکوں کو جمع کر لوں۔ مگر تم نے نہ چاہا۔
(متی ۲۳-۲۴)

قتلِ انبیاءِ رسول کی سب سے بڑی شہادت خود، رسول اللہ کے متعلق آیت (۳۳) سے ملتی ہے جہاں کہا گیا کہ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ (۳۳)۔ ”محمدؐ بجز این نیست ! کہ خدا کا ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے کئی رسول اپنے اپنے فرائض سرانجام دیکر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اگر کل کو یہ بھی مر جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم اٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یہاں خود رسول اللہ کے متعلق قتل کئے جانے کے امکان کا ذکر ہے۔ لہذا یہ کہنا غلط ہے کہ جھوٹا مدعی نبوت قتل کر دیا جاتا ہے، سچے نبی کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔

قرآنِ کریم میں ایک جگہ کہا گیا ہے : يٰۤاَيُّهَا الرُّسُولُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ - وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ - اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ (۵)۔ ”اے رسول ! جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل کیا جاتا ہے اسے دوسروں تک پہنچاؤ۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تم نے اپنے فریضہ رسالت کو سرانجام نہیں دیا، تمہارا کام تبلیغ

رسالت ہے۔ خدا تمہارے مشن کو لوگوں کی دست برد سے محفوظ رکھیگا۔ یاد رکھو! جو قوم حق و صداقت سے سرکشی برتنی ہے وہ کبھی صحیح راستہ اختیار نہیں کرتی۔ ظاہر ہے کہ یہاں وَاللّٰهُ يَعُصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (۲۴) سے مراد حضورؐ کی جسمانی حفاظت نہیں، حضورؐ کے مشن اور ما انزل اللہ کی حفاظت مقصود ہے۔ جہاں تک حضورؐ کی جسمانی حفاظت کا تعلق ہے جنگ احد میں حضورؐ کو کئی زخم آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیائے کرامؑ عند الضرورت خود میدان جنگ میں جایا کرتے تھے۔ بلکہ اپنی فوج کی قیادت کیا کرتے تھے۔ میدان جنگ میں قتل ہو جانا، ناممکنات میں سے نہیں۔ روایات میں ہے کہ حضورؐ نے اپنے مرض الموت میں فرمایا تھا کہ اس مرض کا بنیادی سبب وہ زہر ہے جو ایک یہودیہ نے حضورؐ کو کھانے میں دیدیا تھا۔ اگرچہ آپؐ نے وہ لقمہ اُگل دیا تھا لیکن زہر غیر محسوس طور پر اثر انداز ہو گیا تھا اور اس نے رفتہ رفتہ یہ شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ بھی تو قتل انبیاء کی شوق میں آتا ہے۔ قرآن کریم میں ایک اور آیت بھی ہے جس سے بعض اوقات ذہن اس طرف منتقل ہو سکتا ہے کہ خدا کے رسولوں کو قتل نہیں کیا جاسکتا تھا بلکہ وہ آیت یہ ہے: كَتَبَ اللّٰهُ لَآ غَلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِي (۵۸)۔

رسولوں کا غلبہ

خدا نے اسے واجب قرار دے رکھا ہے کہ وہ اور اس کے رسول غالب آکر رہیں گے؟ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ خدا کے رسول قتل نہیں کئے جاسکتے تھے کیونکہ اگر انہیں قتل کر دیا جاتا تو وہ غالب کس طرح آتے! لیکن جب اس آیت پر، اسے اس کے سیاق و سباق کے اندر رکھ کر، اور اسی قسم کی دیگر آیات کو ساتھ ملا کر، غور کیا جائے تو اس بات کی تائید ہوتی ہے جسے ہم نے ابھی ابھی (اوپر) بیان کیا ہے۔ اس آیت سے پہلے ان مخالفین کا ذکر چلا آ رہا ہے جن کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ حضورؐ کا پیش فرمودہ نظام خداوندی کامیاب نہ ہونے پائے۔ ان کے متعلق کہا کہ: اِسْتَحُوْذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْتُمْ هُمْ ذُرِّيَّةُ اللّٰهِ۔ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ۔ اَلَا اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۵۸)۔ ان لوگوں پر شیطان اس بری طرح مسلط ہو چکا ہے کہ انہوں نے قوانین خداوندی کو یکسر ترک کر دیا ہے۔ یہ درحقیقت شیطان کی پارٹی (حزب الشیطان) کے افراد ہیں۔ انہیں سن رکھنا چاہئے کہ حزب الشیطان آخر الامر خاسر و ناکام رہتی ہے۔ اِنَّ التَّائِيْنَ يَحٰدُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلٰتَيْنِ (۵۸)۔ یاد رکھو! جو لوگ بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کریں گے، وہ ذلیل و خوار ہوں گے۔ كَتَبَ اللّٰهُ لَآ غَلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِي۔ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ (۵۸)۔ اس لئے کہ خدا کا فیصلہ ہے۔ اس نے اسے واجب اور لازم قرار دے رکھا ہے۔ کہ خدا اور

ملہ کبھی خود میرا ذہن بھی اس طرف منتقل ہوتا تھا۔

اس کے رسول آخر الامر مظفر و منصور ہوں گے۔ یہ اس خدا کا فیصلہ ہے جو تمام قوتوں اور غلبہ کا مالک ہے اس لئے ہونہیں سکتا کہ دنیا کی کوئی قوت اس کے فیصلے کو ناکام کر سکے۔ ”نظام خداوندی کی مخالفت کرنے والے ”حزب الشیطان“ (شیطان کی پارٹی کے افراد) ہیں۔ ان کے برعکس ایک پارٹی خدا کی بھی ہے۔ یعنی حزب اللہ۔ اس پارٹی کے افراد کی کیفیت یہ ہے کہ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ۔ اُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ۔ وَآيَدَهُمْ بِرُوحٍ مِّنْهُ۔ وَيَدْخُلُهُمْ جَنَّتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا۔ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ۔ اُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ۔ اَلَا اِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۵۹)۔“ یہ لوگ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ ممکن ہی نہیں کہ جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان رکھیں وہ ان لوگوں سے دوستداری کے تعلقات استوار کریں جو اللہ اور اس کے رسول (دین خداوندی) کے دشمن ہوں، خواہ وہ ان کے ماں باپ، یا بیٹے بیٹیاں، یا بھائی بند، یا دیگر عزیز رشتے دار ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں راسخ ہو چکا ہے۔ اور مرضی خداوندی ان کی تائید و نصرت کا موجب بن رہی ہے۔ یہ اس جنت میں داخل ہوں گے جس کی شادابیوں میں کبھی فرق نہیں آئے گا۔ رضی اللہ عنہم و رضو عنہ۔ یہ لوگ حزب الشیطان کے مقابلہ میں، حزب اللہ ہیں۔ اور ساری دنیا کو سن رکھنا چاہیے کہ آخر الامر حزب اللہ (اللہ کی پارٹی) ہی کامیاب ہوتی ہے۔ حق غالب آکر رہتا ہے۔“

ان آیات سے ظاہر ہے کہ:-

۱۔ حزب الشیطان، دین خداوندی کی مخالفت کرتی تھی۔ اس سے مراد وہ تمام قوتیں ہیں جو نہیں چاہتی تھیں کہ نظام خداوندی قائم ہو۔

۲۔ ان کے مقابلہ میں حزب اللہ (خدا کی پارٹی) بھی جو ان دشمنوں کی مخالفت کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی تھی۔

۳۔ خدا کا وعدہ یہ تھا کہ حزب الشیطان بالآخر ناکام رہے گی اور حزب اللہ کامیاب ہوگی۔

۴۔ ۱ سے ”خدا اور اس کے رسولوں“ کے غالب آنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ رسولوں کے غالب آنے سے مراد اس نظام خداوندی کا غالب آنا ہے جسے وہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ مشن تنہا رسول کے ہاتھوں تکمیل تک نہیں پہنچتا تھا۔ اس میں اس کے رفقاء — جماعتِ مؤمنین — بھی شامل ہوتے

تھے۔ اسے ”محمد رسول اللہ والذین معہ“ (۲۴۸) کے ہاتھوں قائم ہونا اور باطل کے ہر نظام پر غالب آنا تھا۔ اس کشمکش میں اس جماعت کے کسی منہرد (خواہ وہ خود رسول ہی کیوں نہ ہو) کے وفات پا جانے یا قتل ہو جانے سے کسی قسم کا فرق نہیں پڑتا تھا۔ جتنا کہ یہ بھی ممکن تھا کہ اس نظام کو پورا پورا غلبہ رسول کی وفات کے بعد حاصل ہو، جیسا کہ قرآن کریم کی کئی ایک آیات سے واضح ہے (مثلاً) سورة الرعد میں ہے: **وَإِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَقَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاءُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ** (۱۳) جو کچھ ان مخالفین سے کہا جاتا ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا، اے رسول! ہو سکتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ تمہاری زندگی میں سامنے آجائے اور کچھ حصہ تمہاری وفات کے بعد تمہارا فریضہ اس پیغام کو عام کئے جاتا ہے۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانون مشیت کے مطابق اسکی تکمیل کب ہوگی۔ نظام خداوندی کا غلبہ ہر حال ہو کر رہے گا۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے: **هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ** (۹)۔ ”خدا وہ ہے جس نے اپنے رسولوں کو ضابطہ ہدایت یعنی حق پر مبنی نظام، دیکر بھیجا یہ نظام باطل کے ہر نظام پر غالب آکر رہے گا خواہ یہ بات مشرکین پر کیسی ہی گراں کیوں نہ گزرے؟ ظاہر ہے کہ یہ پروگرام (PROCESS) قیامت تک جاری رہے گا۔ کیونکہ ہر زمانے میں کوئی نیا نظام باطل ابھر کر سامنے آئے گا۔ جس پر نظام خداوندی نے غلبہ حاصل کرنا ہوگا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ **كُتِبَ اللَّهُ لَآ غَلْبَ لَنَا وَرُسُلِي** (۵۱) سے مراد یہ نہیں کہ یہ ناممکن تھا کہ حق و باطل کی آدیش میں رسول قتل ہو جاتا۔ مراد یہ ہے کہ اس کشمکش کا آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ دین خداوندی غالب آئے گا اور باطل کا نظام ناکام رہے گا۔ (اس نکتہ کی مزید تشریح اپنے مقام پر کی جائے گی کہ قرآن کریم میں آمدہ ”اللہ ورسول“ کی اصطلاح سے مراد نظام خداوندی ہے)

آیت زیر نظر (۲۱) میں قتل انبیاء بغیر الحق کہا گیا ہے۔ قرآن کریم نے ”حق کے ساتھ“ قتل کئے جانے کی تصریح خود کر دی ہے۔ سورة المائدہ میں ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل سے یہ کہا تھا کہ **مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا** (۲۷)۔ ”جس نے کسی ایک شخص کو بھی ناحق قتل کر دیا — یعنی بجز اس کے کہ اسے جرم قتل کی سزا کے طور پر یا جرم بغاوت کی پاداش میں قتل کیا جائے — تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری کی پوری نوع انسانی کو قتل کر دیا“ یہاں سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص کو قانون خداوندی کے مطابق کسی جرم کی پاداش میں قتل کیا جائے تو وہ قتل بغیر حق نہیں ہوگا۔

اس کے بعد قرآن کریم یہودیوں کے اس بنیادی عقیدہ کی پھر تردید کرتا ہے جس کا ذکر متعدد بار پہلے بھی آچکا ہے۔ یعنی ان کا یہ عقیدہ کہ دین صرف بنی اسرائیل کی نسل تک محدود ہے اور جنت بھی انہی کے لئے مخصوص۔ ان کے اس عقیدے کی تشریح آیت (۱۲۸) میں شرح و بسط سے کی جا چکی ہے۔

یہ عقیدہ کہ دین صرف بنی اسرائیل کی نسل تک محدود رہنا چاہئے، یہودیوں ہی کا نہیں۔ انجیل میں بھی یہ عقیدہ موجود ہے۔ مثلاً متی انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب اپنے حواریوں کو تبلیغ کے لئے بھیجا تو ان سے کہا:-

پاک چیز کتوں کو نہ دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ ڈالو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ انہیں پاؤں کے نیچے روندیں اور لپٹ کر تمہیں پھاڑیں (متی ۲۳)

اس کی تشریح انہوں نے آگے چل کر ان الفاظ میں کر دی:-

ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور انہیں حکم دے کے کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بیٹھڑوں کے پاس جانا۔ (متی ۲۳/۹)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ انجیل کی رو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیغام بھی بنی اسرائیل تک محدود تھا۔ عیسائیت کو جو عالمگیر مذہب قرار دیا گیا ہے تو یہ عیسائیوں کا بعد کا وضع کردہ عقیدہ ہے۔ انجیل اسے بنی اسرائیل تک ہی محدود رکھتی ہے۔ لہذا یہ عقیدہ یہود اور نصاریٰ دونوں کے ہاں موجود تھا اور اس کی تردید قرآن کریم نے اگلی آیت میں کر دی۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّبِئِينَ
مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ
عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔

۲
۹۲

اس کا مفہوم یہ ہے کہ دین خداوندی کا پیدائش سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی شخص خواہ وہ مسلمانوں کے ہاں پیدا ہوا یہودیوں کے گھر، عیسائیوں کے ہاں یا صابئین کے گھر، کسے باشد اجر بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لائے گا اور عمل صالحہ کرے گا تو ان لوگوں کا اجر ان کے رب کے ہاں سے ملے گا۔ انہیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ یہ آیت مطالبہ الفرقان کی پہلی جلد میں آیت (۲) کی تشریح کے سلسلہ میں (صفحات ۸۳-۸۴) پر آچکی ہے۔ اور وہاں اس کا مفہوم واضح انداز میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں ہم اتنا کہہ کر آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم نے

یہود و نصاریٰ کے اس عقیدے کی تردید کر دی کہ دین کسی خاص نسل یا قوم کی اجارہ داری ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے جو دین عطا کیا گیا ہے وہ تمام نوبہ انسان کے لئے ہے۔ وہ عالمگیر دین ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم داستان بنی اسرائیل کی اگلی کڑی کی طرٹ آجاتا ہے اور کہتا ہے :-
وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ

۲
۶۳

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ بنی اسرائیل دامن کوہ میں اقامت پذیر ہوئے تھے اور اس طرح ان کی حفاظت کا فطری سامان کر دیا گیا تھا کہ ان پر عقب سے کوئی حملہ آور نہ ہو۔ اس پہاڑ کو الطور کہا گیا ہے۔ طور کے معنی سرسبز پہاڑ کے ہیں لیکن اس لفظ کے ساتھ (ال) لگنے سے اس سے مراد ایک خاص پہاڑ ہو گیا۔ یہ وہ پہاڑ تھا جہاں پہلے پہل حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی سے نوازا گیا تھا (دیکھئے آیات ۱۹، ۲۸، ۲۹)۔ یہی وہ الطور تھا جس کے دامن میں اقامت پذیر بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا (۲۹، ۳۰، ۳۱)۔ یہی وہ الطور ہے جسے دو ایک مقامات پر سلسلہ رشد و ہدایت کی ایک کڑی کے طور پر شہادت میں... پیش کیا گیا ہے (دیکھئے ۵۲، ۹۵) اس الطور کے دامن میں بنی اسرائیل سے جو عہد لیا گیا تھا وہ کیا تھا؟ یہ کہ جو قوانین انہیں وحی کی رو سے دیئے جاتے ہیں انہیں ہر وقت اپنے پیش نظر رکھیں۔ سفر حیات میں انہیں حکم طور پر تھامے رہیں تاکہ وہ زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ رہیں۔ جسے خدا پر ایمان کہا جاتا ہے وہ درحقیقت خدا کے ساتھ ایک معاہدہ ہوتا ہے کہ ہم اس کے عطا کردہ قوانین کی اطاعت اور اس کی مقرر کردہ حدود کی پابندی کریں گے۔ ہمارے ہاں ایمان کا ترجمہ ”مان لینا“ کیا جاتا ہے جس کا کوئی عملی مفہوم نہیں ہوتا۔ ماننے کے معنی ہیں اس کی طرٹ سے بھیجی ہوئی راہنمائی کی پیروی کرنا۔ اسی کو خدا کے ساتھ عہد کہہ کر پکارا گیا ہے۔ جماعت مومنین اور اللہ تعالیٰ کے مابین، جو معاہدہ ہوتا ہے اس کے لئے آیت (۹۱) ملاحظہ کیجئے۔

بنی اسرائیل نے خدا سے یہ عہد کیا۔ لیکن :-
ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ - فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ

۲
۶۴

وہ اپنے عہد سے پھر گئے۔ اس کا نتیجہ ان کی تباہی ہونا چاہئے تھا لیکن چونکہ خدا کے پردگرم میں یہ تھا کہ انہیں

باز آفرینی کے مواقع دیئے جاتیں، اس لئے انہیں ہلاک نہیں کیا گیا بلکہ ان کی مہلت کے وقفے کو بڑھا دیا گیا۔ یہ خدا کا فضل تھا اور اس کی رحمت۔ کسی قوم کو مہلت کا وقفہ مل جانا، واقعی عنایتِ خداوندی میں سے ہوتا ہے۔ یہ ہوتا تو ہے اس کے قانون کے مطابق ہی، لیکن ضابطہٴ قوانین میں اس قسم کی گنجائش کا رکھا جانا، بہر حال عنایتِ خداوندی ہی ہے۔

لیکن اس قوم نے مہلت کے اس وقفے سے بھی فائدہ نہ اٹھایا اور اپنی خوتے سرکشی سے باز نہ آئے۔ اس کی شہادت میں واقعہٴ سبت کو پیش کیا گیا ہے:-

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدُوا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ - فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ۔

السَّبْتُ کے مادہ (س۔ ب۔ ت) کے بنیادی معنی ہوتے ہیں راحت اور سکون۔ اور اس سے مراد ہوتا ہے ترکِ عمل اور قطعِ کاروبار۔ چونکہ یہاں السَّبْتُ آیا ہے اس لئے اس سے مراد وہ دن ہے جس میں یہودی کاروبار نہیں کرتے۔ یعنی سنیچر کا دن۔

ہفتے میں ایک دن کی چھٹی (یا کاروبار کا ناغہ) آج کل معمول میں داخل ہے۔ یہ پابندی یہودیوں کے بھی معمول میں داخل تھی۔ (HASTINGS) نے اپنے انسائیکلو پیڈیا میں عہد نامہٴ صلیب، مثلاً اور تالمود کے حوالوں سے لکھا ہے کہ سبت جمعہ کی شام سے شروع ہو جاتا اور سنیچر کا پورا دن رہتا تھا۔ اس میں کاروبار کے علاوہ قریب اڑتیس دیگر امور بھی تھے جن کا کرنا منع تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں ناغہ کا دن قانونی طور پر متعین نہیں کیا گیا تھا اس لئے وہ لوگ اس میں اختلاف کرتے تھے اور اس کی وجہ سے گریز کی راہیں تلاش کیا کرتے تھے۔ اس اختلاف کو مٹانے کے لئے، اس کے لئے ایک خاص دن متعین کر دیا گیا سوچہ انجل میں ہے: **إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ** (۱۱۲) "السبت کا دن ان کے اختلافات کی وجہ سے مقدم کیا گیا"۔

ہفتے میں ایک دن کا ناغہ کوئی بڑی بات نہیں، لیکن جب زندگی کسی نظام کے تحت بسر کی جائے تو اس نظام کی طرف سے عاید کردہ چھوٹی سے چھوٹی پابندی پر قائم رہنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس قسم کے ڈسپلن سے قوم کی سیرت و کردار کا امتحان ہو جاتا ہے۔ جو لوگ انسی سی طبع (TEMPTATION) کا مقابلہ بھی نہ کر سکیں اور چور دروازوں سے اس پابندی کی خلاف ورزی کرنے لگ جائیں، وہ زندگی کی بڑی بڑی آزمائشوں میں کیا پورے اتیریں گے؟ قرآن کریم

نے اس واقعہ کا ذکر یہی بتانے کے لئے کیا ہے کہ یہودیوں میں اتنا سا کیر لیٹر بھی باقی نہیں رہا تھا۔ محکوم قوم کی کیفیت یہی ہو جاتی ہے۔ سورۃ الاعراف میں ہے کہ یہودیوں پر پابندی عاید کی گئی تھی کہ وہ ایک دن (مغلغلہ دیگر امور) پھیلیاں نہ پکڑیں۔ جانوروں میں یہ جنگلی حس (INSTINCT) ہوتی ہے کہ جب انہیں یقین ہو جائے کہ فلاں مقام پر ایفلاں وقت میں کسی قسم کا خطرہ نہیں تو وہ وہاں آنے جانے میں بیباک ہو جاتے ہیں۔ [اسی مقصد کے لئے جنگلوں میں مقامات امن (SANCTUARIES) کا تعین کر دیا جاتا ہے]۔ وہاں پھیلیوں کی بھی یہی کیفیت ہو گئی تھی۔ کچھ عرصہ کی مداومت کے بعد ان کی حس نے انہیں بتا دیا کہ اس دن ہمیں کوئی نہیں پکڑے گا، اس لئے وہ تیرتی ہوئی سطح آب پر آ جاتی تھیں۔ اور یہ، کردار کے خام، اتنی سی ترغیب کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ انہیں چوری چھپے پکڑ لیتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کا بہت بڑا ٹسٹ (TEST) تھا (۱۵۴/۲)۔ لیکن جب انہوں نے اس پابندی کو توڑا تو عذاب خداوندی میں گرفتار ہو گئے۔ اس کے لئے الفاظ ہیں فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ (۱۵۵/۲) اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "تم ذلیل بندر بن جاؤ" اور اس کی تفسیر میں کہا جاتا ہے کہ وہ سچ مچ کے بندر بن گئے تھے۔ اگرچہ ہمارے متقین میں سے بھی بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد مسخ سیرت ہے۔ مسخ صورت نہیں، یعنی ان کی شکلیں بندروں کی سی نہیں ہو گئی تھیں بلکہ ان کی سیرت بندروں کی سی ہو گئی تھی۔

بندر بن جانے کا مفہوم

لفظ قِرَدَةً کا مادہ (ق۔ر۔د) ہے۔ الْقَرَدُ اس اون کو کہتے تھے جو خود بخود جھڑ جائے اور کاتی نہ جاسکے۔ اس لئے اسے بیکار ہونے کی وجہ سے یوں ہی پھینک دیا جاتا تھا۔ اس سے یہ لفظ حقارت اور ذلت کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ الْقَرَدُ الرَّجُلُ کے معنی ہیں افسردگی اور درماندگی کی وجہ سے اس شخص پر جمود طاری ہو گیا۔ وہ ذلیل و خوار ہو گیا اور یوں سمجھو کہ وہ جھوٹ موٹ کا مردہ بن گیا۔ اس اعتبار سے وہ، ہر قابل نفرت اور حقارت انگیز شے کو قِرَدَةً کہتے تھے۔ چنانچہ یہ لفظ چیچڑی کے لئے بھی آتا ہے۔ اس سے الْقَرَدُ بندر کو کہتے تھے جو ان کے نزدیک بڑا قابل نفرت جانور تھا۔ یہی معنی لفظ خاسئین کے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم میں بار بار کہا گیا ہے کہ وَضَرِبْتُ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ وَالْمُسْكِنَةَ (۲)۔ اُن پر جمود طاری ہو گیا۔ وہ ذلیل و خوار ہو گئے۔ اسے يَحْزِي فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۲) بھی کہا گیا ہے۔ یعنی اسی دنیا کی زندگی میں ذلت و رسوائی۔ یہودیوں کی اس ذلت و خواری کی زندگی کے متعلق خود بائبل میں ہے کہ:-

اور خداوند تجھ کو سب قوموں کے درمیان زمین کے اس سرے سے اس سرے تک تتر بتر کرے گا اور

وہاں تو غیر معبودوں کی جو لکڑیاں اور پتھر ہیں جن سے نہ تو تیرے باپ دادے واقف تھے، اُن کی پرستش کرے گا اور ان قوموں میں تجھ کو آرام نہ ملے گا۔ بلکہ تیرے پاؤں کے تلوے کو قرار نہ ہو گا۔ کیونکہ خداوند وہاں تجھ کو دل کا دھڑکا اور آنکھوں کی دھندلاہٹ اور جی کی غمناکی دے گا۔ اور تیری زندگی تیری نظر میں بے ٹھکانا ہو جائے گی اور ثورات اور دن ڈرتا رہے گا اور تجھ کو اپنی زندگی پر کچھ بھروسہ نہ ہوگا۔ اپنے دل کے خون سے، جسے تو کھائے گا اور ان چیزوں سے، جنہیں تیری آنکھیں دیکھیں گی، صبح کو تو کہیگا اے کاش کہ شام ہوتی! اور شام کو کہیگا اے کاش صبح ہوتی۔ اور خداوند تجھ کو اس راہ سے، جس کی بابت میں نے تجھے کہا کہ تو پھر اسے نہ دیکھے گا کشتیوں پر مھر کو پھر سے جائے گا اور تم وہاں غلام اور لونڈی ہونے کے لئے اپنے دشمنوں کے ہاتھ نیچے جاؤ گے اور تمہیں کوئی مول نہ ملے گا۔

(استثناء (۲/۶۴))

خود زمانہ نزدِ قرآن میں یہودیوں سے کہا گیا تھا کہ اب پھر تمہارے سامنے ایک موقعہ آیا ہے کہ تم اپنی ذلت کی زندگی کو عزت اور سرفرازی کی زندگی میں تبدیل کرو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو نَلْعَنَهُمْ کَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ (۲/۶۴)۔ تمہیں زندگی کی خوشگوار یوں سے اسی طرح محروم کر دیا جائے گا جس طرح تمہارے اسلاف میں اصحابِ سبت کو محروم کر دیا گیا تھا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ ان لوگوں کو سچ کچ کا بندر نہیں بنا دیا گیا تھا بلکہ ان کی سیرت بندروں کی سی ہو گئی تھی۔ ان کی (APISH MENTALITY) کی شہادت قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ملتی ہیں۔ قرآن کریم نے مسخ شدہ سیرت کو محسوس انداز میں سمجھانے کے لئے اسی قسم کی تشبیہات سے کام لیا ہے۔ مثلاً وہ منافقین کے متعلق کہتا ہے: قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرِّ مِّنْ ذَلِكَ۔ مَثْوِيَّةٌ عِنْدَ اللَّهِ۔ مَن لَّعَنَهُ اللَّهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمْ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضَلُّ عَن سَوَاءِ السَّبِيلِ (۲/۶۵)۔ ”اے رسول! تم ان سے کہو کہ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ معیارِ خداوندی کی رُو سے کس کی حالت بدترین ہے؟ ان کی حالت جو زندگی کی خوشگوار یوں سے محروم ہو گئے۔ ان کی متاعِ حیات بھلس گئی۔ ان کی سیرت بدترین حیوانات — بندروں اور خنزیروں — جیسی ہو گئی۔ بڑی بڑی مستبد سرکش قوموں نے انہیں اپنی غلامی کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ یہی لوگ ہیں جو زندگی کے بدترین درجہ میں ہیں اور سب سے زیادہ راہِ بھٹکے ہوئے۔“ ان مقامات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کے ان الفاظ سے، جو اصحابِ سبت کے متعلق آئے ہیں

یہ مراد نہیں کہ وہ سچ مچ کے بندہ بن گئے تھے۔ اس قسم کی تفسیریں ان روایات پر مبنی ہیں جو یہودیوں نے وضع کر کے ہماری کتب روایات میں داخل کر دیں۔ لیکن قرآن کریم نے اپنے مفہوم کو اگلی آیت میں خود ہی واضح کر دیا ہے، جہاں کہا ہے:-

فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَخَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ۔

۲
۶۶

”ہم نے ان کی اس حالت کو ان لوگوں کے لئے بھی موجب عبرت بنایا جو اس دور میں موجود تھے اور ان کیلئے بھی، جو ان کے بعد آنے والے تھے۔ اور یہ چیز ان لوگوں کے لئے باعثِ موعظت ہے جو زندگی کی خطرناک گھاٹیوں سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں“ اگر وہ لوگ سچ مچ بندہ بنا دیئے گئے تھے تو ان کی یہ تبدیلی ان لوگوں کے لئے نزدیکِ عبرت ہو سکتی تھی جنہوں نے انہیں ایسا بننے دیکھا، لیکن بعد میں آنے والوں کے لئے یہ کس طرح وجہ موعظت ہو سکتی تھی۔ آج ہم سینکڑوں بندہ دل کو دیکھتے ہیں کیا ہم میں سے کسی کا ذہن بھی اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ یہ انہی بنی اسرائیل کی نسل سے ہیں؟ یا یہ کہ اگر ہم نے بھی احکامِ خداوندی سے سرکشی برتی تو ہم بھی انہی جیسے بندہ بن جائیں گے؟ سچ مچ کے بندہ ہمارے لئے باعثِ عبرت نہیں۔ البتہ قرآن کریم نے قدم قدم پر صحرا نور و خاتماں خراب، ذلیل و خوار یہودیوں کی مثال دیکر ہمیں سمجھایا ہے کہ جو لوگ احکامِ خداوندی سے سرتابی برتتے ہیں ان کی یہ حالت ہو جایا کرتی ہے۔

۔۔۔

اس کے بعد قرآن کریم ان کی خورے غلامی کے مظہر ایک اور واقعہ کو سامنے لاتا ہے، جب کہتا ہے کہ:-

۱۔ یہ چیز ہمارے روایت پرست متقدمین تک ہی محدود نہیں، خود ہمارے دور کے ایک مفسر ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں:-

بعض یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی جسمانی بیست بگاڑ کر بندہ بننے کی سی کر دی گئی تھی اور بعض اس کے یہ معنے لیتے ہیں کہ ان میں بندہ بننے کی سی صفات پیدا ہو گئی تھیں۔ لیکن قرآن کے الفاظ اور انداز بیان سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسخِ اخلاقی نہیں بلکہ جسمانی تھا۔ میرے نزدیک قرین قیاس یہ ہے کہ ان کے دماغ بعینہ اسی حال پر رہنے دیئے گئے ہوں گے جس میں وہ پہلے تھے اور جسم مسخ ہو کر بندہ بننے کے سے ہو گئے ہوں گے۔ (تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۸۴۔ طبع ۱۹۵۱ء)۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا
بَقْرَةً. قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُؤًا - قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ
أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ -

۲
۲۶

عام ترجمہ اس آیت کا یہ ہے "اور پھر وہ معاملہ یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے یہ سیدھی سادی سی بات کہی تھی کہ خدا کا حکم ہے کہ ایک گائے ذبح کر دو (بجائے اس کے کہ وہ اس صاف اور سیدھے حکم کی تعمیل کر دیتے، لگے طرح طرح کی کٹ جھٹیاں کرنے - پہلے) کہا: بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ خدا نے ایسی بات کا حکم دیا ہو - تم ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہو۔ موسیٰ نے کہا

ذبح بقر کا واقعہ

میں اس سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں احکام الہی کی تبلیغ میں تسخّر کروں اور جاہلوں کا شیوہ اختیار کروں۔ "بَقْرَ" گائے اور بیل دونوں کو کہتے ہیں۔ یہ جمع ہے۔ اس کا واحد، بَقْرَةٌ ہے۔ یہ قصہ سامری کے ضمن میں بتایا جا چکا ہے کہ بنی اسرائیل نے بھی مصریوں کی تقلید میں گوسالہ پرستی اختیار کر رکھی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے خود ساختہ سائنڈ (بقرة) کے بت کو جلا کر دریا برد کر دیا تھا لیکن قرآن کریم میں ہے وَأَشْرَبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ (۲/۶۳) "گوسالہ کی محبت ان کے دل کی گہرائیوں تک میں پیوست ہو چکی تھی۔ وہ ان کے خون کے ذروں تک میں حلول کر گئی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خدا پر خلوص قلب سے ایمان نہیں لئے تھے" اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی گوسالہ پرستی کے مستور جذبات کا مظاہرہ کسی نہ کسی شکل میں ہوتا رہا ہوگا، اس لئے ضرورت سمجھی گئی کہ کوئی ایسا اقدام کیا جائے جس سے یہ عقیدت ان کے دل سے نکل جائے۔ اس کا آسان طریق یہ تھا کہ کسی گائے یا سائنڈ کو خود ان کے ہاتھوں سے ذبح کر دیا جائے۔

اس تجویز یا حکم کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ ہندوؤں کے ہاں گائے کی پرستش ہوتی ہے۔ اگر کوئی ہندو، مسلمان ہو جائے تو وہ اور تو سب کچھ برداشت کر لیتا ہے لیکن اگر گائے کا گوشت اس کے سامنے آجائے تو اُسے بھر جھری آجاتی ہے۔ وہ اسے کھانے کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتا۔ اسے اپنے آپ کو اس پر مائل کرنے کے لئے ایک عرصہ لگ جاتا ہے۔ صدیوں سے متواتر چلے آنے والے معتقدات ایسے ہی گہرے ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت بنی اسرائیل کی تھی۔ ان کے دل سے اس دیوتا کی عقیدت اور محبت کو زائل کرنے کے لئے مؤثر ترین طریق یہی ہو سکتا تھا کہ ان کے دیوتا کو خود ان کے ہاتھوں ذبح کر لیا جائے۔ وہ اس حکم کی تعمیل سے علانیہ انکار تو نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس

سے ان کا کفر ثابت ہو جاتا تھا۔ انہوں نے اس سے بچنے کے لئے بہانہ سازیاں شروع کیں۔ سب سے پہلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا کہ تم ہم سے مذاق کرتے ہو۔ خدا اس قسم کا حکم کیوں دے گا۔

انہوں نے اس سلسلہ میں کیا کیا باتیں بنائیں۔ ان کا ذکر کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں جو ”اعوذ باللہ“ آیا ہے، اس کے قرآنی مفہوم کی وضاحت کر دی جائے کیونکہ اسے ہمارے ہاں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس لفظ کا مادہ (ع۔و۔ذ) ہے۔ عَاذْتُ بِوَكْدِهَا

اعوذ باللہ کا مفہوم

کے معنی ہیں مادہ کا اپنے نوزائیدہ بچے کے پاس کھڑے رہنا۔ اور اس کی حفاظت کرتے رہنا۔ عَاذُ بِالنَّشِيِّ کے معنی ہیں کسی چیز کے ساتھ چمٹے رہنا۔ یعنی اُسے مستقل طور پر اختیار کر لینا۔ جو جماعت، قرآنی نظام کے قیام کے لئے اٹھے گی اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ ہر مخالف قوت سے محفوظ رہنے کی تدبیر کرے۔ یہ تدبیر اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ جماعت، قوانین خداوندی کی زیادہ سے زیادہ تعمیل اور پابندی کرے۔ اسے ”خدا کی پناہ میں آنے سے“ تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان کی اس آرزو اور روش کو اَعُوذُ بِرَبِّ الْقَلْبِ (۱۳۳) یا اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ (۱۳۴) جیسے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورة المؤمن میں ہے کہ جب فرعون اور اس کی کاہنہ کے زیرِ غور یہ سکیم آئی کہ حضرت موسیٰ کو قتل کر دیا جائے تو آپ نے کہا: اِنِّیْ عُوذْتُ بِرَبِّیْ (۱۳۵) میں ان کی سازشوں کے خلاف، خدا کی پناہ میں آنا چاہتا ہوں“ (نیز ۱۳۶) حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے بچی کی پیدائش کے وقت کہا تھا: وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ (۱۳۷) ”بارِ الہا! میں اس بچی اور اس کی اولاد کو شیطانی سازشوں سے محفوظ رکھنے کی استدعا کرتی ہوں“ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کہلوا یا گیا: وَقُلْ رَبِّ اَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّیْطَانِ وَاَعُوذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُونِ (۱۳۸) ”اے رسول! تم کہو کہ شیطان کی سازشوں سے محفوظ رہنے کے لئے تیری پناہ طلب کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ مجھ پر حملہ آور نہ ہوں“ سورة الاعراف میں ہے: وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطَانِ نَزْعٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ۔ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (۱۳۹) ”اگر کسی قسم کا کوئی دوسوہ یا ان مخالفین کا کوئی سرغنہ تم میں باہمی فساد ڈالنا چاہے (۱۴۰) تو تم ضابطہ خداوندی کے ساتھ اور شدت سے متمسک ہو کر اس کی پناہ میں آ جاؤ۔ یاد رکھو! تمہارا خدا سب کچھ سنتا اور جانتا ہے“ ان تحریریں عناصر یا دسادس سے محفوظ رہنے کے لئے خدا کی حفاظت میں کس طرح آیا جاتا ہے اس کی وضاحت اس سے اگلی آیت میں یہ کہہ کر دی کہ: اِنَّ النَّبِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طَآئِفٌ مِّنَ الشَّیْطَانِ تَذَكَّرُوْا۔

فَإِذَا هُمْ مَبْصُرُونَ (۲/۲۷) یہ منقیوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی غلط (شیطانی) خیال، یونہی گھومتے پھرتے بھی ان کے پاس سے گزر جائے تو وہ فوراً قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں۔ اس سے یوں ہوتا ہے جیسے تاریکی میں یکایک روشنی سامنے آجائے اور صاف طور پر دکھائی دینے لگ جائے کہ انہیں اس حالت میں کیا کرنا چاہئے، اس مفہوم کی تائید قصۃ حضرت یوسف علیہ السلام سے بھی ہوتی ہے۔ جب عزیزِ مصر کی بیوی نے کمرے کے دروازے بند کر کے اپنی خواہش نفس کی تسکین کے لئے حضرت یوسف کو آمادہ کرنا چاہا تو آپ نے کہا: مَعَاذَ اللّٰهِ (۲/۲۷) ”میں تمہارے اس ارادے اور اقدام سے محفوظ رہنے کے لئے خدا کی پناہ طلب کرتا ہوں“ اور انہیں یہ پناہ اس طرح سے مل گئی کہ: وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ تَرٰ اَبْرٰهَانَ رَبِّهٖۚ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهٗ السُّوْءَ وَالْفَحْشَآءَۚ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْبٰخِلَصِيْنَ (۲/۲۷) ”وہ عورت اس کا تہیہ کر چکی تھی اور اس نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ اگر یوسف کی جگہ کوئی اور ہوتا جس کے سامنے اپنے پروردگار کی درخشندہ و تابناک اخلاقی قدر نہ ہوتی تو وہ بھی اس پر آمادہ ہو جاتا۔ اس اخلاقی قدر کے پیش نظر رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس بے حیائی کے کام سے مجتنب رہا اور یوں اس نے اپنے حسن سیرت سے ثابت کر دیا کہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے“ اس سے واضح ہے کہ ایسے مقامات پر خدا کی پناہ میں آنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان فوراً اس امر کو سامنے لے آئے کہ اس باب میں خدا کی راہنمائی کیا ہے اور پھر شدت سے اس پر کار بند ہو جائے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے سلسلے میں یہی حقیقت (۲/۲۷) میں بھی سامنے لائی گئی ہے۔

سورۃ النحل میں ہے کہ فَإِذَا أَقْرَأَتِ الْقُرْآنَ فَأَسْتَعِذُّ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ۔ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلٰی السَّادِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّهٖمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (۲/۲۷)۔ ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ ”جب تم قرآنی پروگرام پر عمل درآمد شروع کرو گے تو مفاد پرست اور سرکش قوتیں اس کی مخالفت کریں گی۔ اس وقت ضرورت ہوگی کہ تم اور زیادہ شدت کے ساتھ قوانینِ خداوندی سے وابستہ رہ کر تخریبی عناصر کا مضر تاثر سے، سامانِ حفاظت طلب کرو۔ یاد رکھو! یہ تخریبی قوتیں ان لوگوں پر کبھی غلبہ نہیں پاسکتیں جو قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین اور ان کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ رکھیں“ (نیز دیکھئے ۲/۲۷)۔

یہ قرآنی مفہوم فَأَسْتَعِذُّ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ کا۔ لیکن اب اس کی تعمیل کا طریق مرن یہ رہ گیا کہ قرآن مجید کی تلاوت کے آغاز میں اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ کے الفاظ دہرائے جاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں، اس سے ایک قدم اور بھی آگے بڑھایا جاتا ہے۔ لفظ تعویذ کا مادہ بھی یہی ہے۔ اب قرآنی آیات کا

مصرت یہ رہ گیا ہے کہ ان کے تعویذ بنا کر نگلے میں ڈال دیئے جائیں یا دروازوں کے ساتھ لٹکا دیئے جائیں، اور اس سے یہ اطمینان حاصل کر لیا جائے کہ اس سے ہر آفت سے حفاظت مل جائے گی۔ کیونکہ ہم خدا کی پناہ میں آگئے ہیں۔ جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جائے تو اس میں ہوتا ہی یہی ہے۔ اس میں حصول مقاصد کی عملی تدابیر کے بجائے الفاظ کی پرستش شروع ہو جاتی ہے۔

بہر حال، آپ پھر واقعہ ذبح گاد کی طرف آئیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں تم سے مذاق نہیں کر رہا۔ میں بالکل (SERIOUS) ہوں اور خدا کا حکم تم تک پہنچا رہا ہوں کہ تم ایک گائے ذبح کر دو۔ ظاہر ہے کہ گائے یا بیل کے لفظ سے ایک کچھ بھی سمجھ لے گا کہ اس سے کیا مراد ہے لیکن چونکہ ان کے دل میں چور تھا اس لئے انہوں نے خواہ مخواہ۔ موشگافیاں شروع کر دیں اور کہنے لگے :-

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ
فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ كَبِيرٌ ذَلِكَ فَاَعْلَمُوا مَا تُوْمَرُونَ۔

”خدا سے کہیے کہ وہ ذرا واضح طور پر بتائے کہ وہ گائے یا بیل کس قسم کا ہونا چاہیے۔ جب انہوں نے اس قسم کی جڑیٹا کا تقاضہ شروع کر دیا تو ان سے کہا گیا کہ وہ ساند نہ بوڑھا ہونا چاہیے نہ بچہ، بلکہ اس کے بین بین، ادھیڑ عمر کا ہونا چاہیے۔ لہذا جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے۔ اس کی تعمیل کرو۔“

اس پر انہوں نے کہا کہ بات اب بھی کچھ مشتبہ سی ہے :-

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْنُهَا۔ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ
صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا۔ تَسْرُ الشَّظِيرِينَ۔

”انہوں نے کہا کہ اپنے رب سے پوچھ کر یہ بھی بتاؤ کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔ کہا گیا کہ گہرے زرد رنگ کا ساند (بیل) جو دیکھنے والوں کی نگاہوں میں اچھا چمکے۔“

وہ اس پر بھی آمادہ بہ عمل نہ ہوئے اور مزید حجت بازی کے لئے کہا :-

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَبَهَ عَلَيْنَا
وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ۔

”اپنے رب سے کہو کہ ذرا کھول کھول کر بتائے کہ وہ بیل کیسا ہونا چاہیے۔ ہم پر بات واضح نہیں ہوئی۔ اس کی

مزید وضاحت کر دی جائے تو ہم یقیناً حکم کی تعمیل کریں گے؟

اس پر ان سے کہا گیا :-

قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي

الْحَرَثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا قَالُوا الْفَنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ -

فَذَبْحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ -

”وہ بیل ایسا ہونا چاہئے جسے نہ ہل میں جو تا گیا ہو اور نہ کنوئیں پر چلایا گیا۔ ہر طرح سے صحیح و سالم اور بے داغ۔ کہا کہ ہاں اب تم نے ٹھیک ٹھیک بتایا!“ اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے اس کی وضاحت کر دی کہ انہوں نے ایک معمولی سی بات میں بھی اس قدر موثر گافیاں شروع کر دیں۔ انہوں نے یہ کچھ اس لئے نہیں کیا تھا کہ پہلے بات واضح نہیں تھی۔ انہیں شروع ہی سے معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں سے ایک بیل ذبح کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کے دل سے ان کے معبود کی عظمت اور عقیدت نکل جائے۔ لیکن ان کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے ذبح کریں۔ مشکل یہ تھی کہ وہ اس کا کھلے بندوں اقرار بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے حیلہ سازیاں اور عذر تراشیاں شروع کر دیں اور اس قدر لمبی چوڑی باتوں کے بعد اس حکم کی تعمیل کی۔

اس واقعہ سے دو اہم نکات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو قوم دین کے حقائق اور نظام کو اچھی طرح سمجھنے اور اس طرح ان کی صداقت پر مطمئن ہوئے بغیر کسی وجہ سے ایمان لے آتی ہے وہ اپنے سابقہ عقائد (خواہ وہ اوہام اور خرافات ہی کیوں نہ ہوں) اپنے دل کی گہرائیوں میں ساتھ لے کر آتی ہے۔ اس کے لئے بڑی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت مسلسل

اور الترتیباً اس انداز سے کی جائے کہ یہ تمام عقائد ان کے دل سے نکل جائیں اور ان کی جگہ قرآنی عقائد نہایت سختگی سے ان کے قلب و ذہن میں جا گزریں

ہو جائیں۔ صدر اسلام میں اسی قسم کے تھے وہ نئے نئے ایمان لانے والے (بدوی قبائل) جن کے متعلق قرآن کریم میں ہے: قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا. قُلْ لَّمْ تَوْمِنُوا وَلَكِنْ قَوْلُوا اسْلَمْنَا. وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ. وَإِنْ تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا. إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۳۹)۔ ”یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ ان سے کہو کہ وہ ایسا نہ کہیں بلکہ یہ کہیں کہ ہم نے اس مملکت یا نظام

کے سامنے اپنے آپ کو (SURRENDER) کر دیا۔ یہ اس لئے کہ ابھی تک ایمان ان کے دل کے گہرائیوں میں نہیں اُترتا اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ سے کہا کہ ان سے کہو کہ وہ اس سے دل برداشتہ نہ ہو جائیں۔ اگر وہ خدا اور رسول کی اطاعت کرتے رہے تو ان کے اعمال کے معاوضہ میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی۔ اللہ غفور و رحیم واقع ہوا

ہے۔“ میں نے اپنی کتاب — شاہکار رسالت — میں اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ جب وہ قومیں، جن کے علاقے مسلمانوں نے فتح کئے تھے، شبائش، بغیر کسی سابقہ تعلیم و تربیت کے حلقہ اسلام میں داخل ہوئیں تو وہ اپنے تمام قدیم عقائد کو ساتھ لئے ہوئے آئیں اور چونکہ اس کے بعد بھی ان کے مناسب تعلیم و تربیت کا انتظام نہ ہو سکا اس لئے ان کے وہی عقائد اسلامی عقائد کی شکل اختیار کر کے ساری دنیا میں پھیل گئے اور وہی عقائد و نظریات اس وقت تک مسلسل آگے چلے آ رہے ہیں۔

یہ پرانے وقتوں کی بات ہے۔ خود (ہندوستان اور) پاکستان میں کثیر التعداد مسلمان ان اسلاف کی اولاد ہیں جو اسلامی تعلیم و تربیت کے بغیر خارجی محرکات کی بنا پر مسلمان ہو گئے تھے، وہ ہندو انہ عقائد اور رسوم اپنے ساتھ لائے اور چونکہ ان کے مسلمان ہونے کے بعد ان کی صحیح اسلامی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ ہو سکا، اس لئے وہ عقائد و رسوم بدستور ہم میں چلے آ رہے ہیں۔ لہذا ہمارا مروجہ اسلام، (خواہ وہ کہیں ہو) انہی عقائد و نظریات اور رسوم و مسالک کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے جنہیں ہمارے (غیر مسلم) اپنے ساتھ لئے حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ (اور طریق عمل) *يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ* (۲۳) بتایا گیا ہے۔ یعنی حضور کتاب و حکمت کی تعلیم سے افراد امت کی صحیح تربیت (یُزَكِّيهِمْ) کیا کرتے تھے۔ اگر ارشاد خداوندی اور سنت نبوی کے اتباع میں تعلیم و تربیت کا یہ سلسلہ جاری رکھا جاتا تو (نئے نئے مسلمانوں کے اپنے ساتھ لائے ہوئے) عقائد و مسالک، جزو اسلام نہ بن سکتے۔ لیکن ہم نے اس طریق نبوی کا اتباع چھوڑ دیا جس سے اسلام کچھ کا کچھ بن کر رہ گیا۔ اب جو تعلیم، مذہب کے نام سے دی جاتی ہے وہ انہی عقائد و مسالک کی تعلیم ہوتی ہے کیونکہ کتاب (قرآن) کا مقصد، ہمارے ہاں، اس کی تلاوت سے ثواب حاصل کرنے سے زیادہ کچھ نہیں رہ گیا۔ اور دین کی غایت اور مقصد کے رنگا بوں سے گم ہو جانے کی وجہ سے حکمت کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ یہی وہ ”غارت گئی“ ہے جس کا ماتم کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ —

منابع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی پیکس کا فردا کا غرہ خوں ریز ہے ساقی

ذبح بقرہ کے واقعہ کا یہ پہلا نکتہ ہے جو سامان عبرت فراہم کرتا ہے۔ اس کا دوسرا نکتہ بھی ایسا ہی اہم ہے۔ اور وہ یہ کہ قرآن کریم نے جو احکام اور قوانین اصولی طور پر دیئے ہیں اور ان کی جزئیات خود متعین نہیں کیں تو ایسا کچھ دانستہ اور خدا کے پردگراں کے مطابق کیا گیا ہے۔ دین کے اصول تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہتے تھے لیکن ان کی جزئیات

قرآنی احکام کی جزئیات | کو زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہنا تھا۔ اگر وہ (جزئیات) بھی قرآن کریم کے اندر دیدی جاتیں تو وہ بھی غیر متبدل قرار پاتیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ جب زمانے کے احوال و کوائف کے بدل جانے سے ان جزئیات پر عملدآمد مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا تو لوگ خود نفس اسلام ہی سے بظن ہو جاتے اور یہ خیال قائم کر لیتے کہ یہ ضابطہ قوانین کسی گزرے ہوئے زمانے میں تو ممکن العمل تھا، اب یہ اس زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں اس اہم گوشے کی وضاحت مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں آیت (۲/۲۱) کے تحت صفحات (۱۳۰-۱۲۵ پر) شرح و بسط سے کر دی ہے۔ اس کا دہرنا ضروری نہیں۔ البتہ ان دو آیات کا پھر سے درج کر دینا ضروری نظر آتا ہے جنہیں قرآن کریم نے ہماری ہدایت کے لئے سورۃ المائدہ میں محفوظ کر رکھا ہے۔ وہ آیات یہ ہیں :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءٍ إِنْ تُبَدِّلَكُمْ تَسْأَلُكُمْ - وَ إِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلَ الْقُرْآنُ تُبَدِّلْكُمْ - عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ - قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ - ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ - (۱۰۲-۱۰۱)

اے جماعتِ مومنین! جن امور کی تصریحات ہم نے خود نہیں کیں انہیں کرید کرید کر مت پوچھا کرو۔ اس وقت جبکہ وحی کا سلسلہ جاری ہے اگر (بفرض محال) ان امور کو بھی مسترد ان میں دیدیا جائے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ۔ قرآن میں دیدینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ان میں کبھی تبدیلی نہ ہو سکے گی اور جب تغیر حالات کی بنا پر وہ ناقابلِ عمل ہو جائیں گی تو تمہارے لئے ان کا بنا ہنا مشکل ہو جائے گا۔ تم سے پہلے بھی ایک قوم نے ایسا ہی کیا تھا۔ پھر ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ انہوں نے ان ناقابلِ عمل جزئیات سے پیچھا چھڑانے کے لئے خود دین کے ببادے ہی کو اتار پھینکا۔ لہذا جن جزئیات کا تعین ہم نے خود نہیں کیا، تم سمجھ لو کہ انہیں دانستہ ایسا رکھا گیا ہے۔

اس کی وضاحت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بھی موجود ہے۔

حضورؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے چند باتیں فرض مسترد دی ہیں۔ پس تم ان کو ضائع نہ کرو۔ چند چیزیں خدا نے حرام ٹھہرائی ہیں، تم ان کے قریب تک بھی نہ پھٹکو۔ اس نے چند حدود مقرر کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں کے بیان کرنے میں خاموشی اختیار کی ہے، تم ان کے متعلق کرید مت کرو۔ کیونکہ خدا

اور تیسرے مقام پر :

اور لوگوں نے خدا اور موسیٰ سے بگڑ کر یوں کہا کہ تم ہم کو مصر سے نکال لاتے کہ ہم بیابان میں مریں؟ یہاں
قونہ روٹی ہے نہ پانی۔ ہمارے جی کو اس ہلکی روٹی سے کراہیت آتی ہے۔ (گنتی ۲۱)

یہ ٹھوس واقعات تھے لیکن انسانی ذہن کو جولذت افسانوں سے ملتی ہے وہ حقیقت میں کہاں؟ اس لئے بائبل میں (جس
میں انسانی خیالات کی آمیزش ہو چکی ہے) اس کھلی ہوئی حقیقت کو چھوڑ کر افسانہ طرازی کی طرف رخ کر لیا گیا۔ انہوں نے
ایسا کیا تو یہ بات کچھ تعجب انگیز نہیں کیونکہ خدا کی کتاب اس کی اصلی شکل میں اُن کے پاس موجود نہیں رہی تھی اور ذہن
انسانی نے اسے افسانوں کا مجموعہ بنا دیا تھا۔ لیکن افسوس اس بات پر ہے کہ خود ہمارا نظریہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر
نہ رہ سکا، حالانکہ ہمارے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود تھی۔ اور اس میں یہ تمام واقعات نہایت وضاحت
سے مذکور تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس "اذیت رسانی" کے سلسلے میں بخاری میں حسب ذیل روایت درج ہے :-

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ موسیٰؑ نہایت با حیا
اور ستر کو چھپانے والے تھے۔ چونکہ ان کے مزاج میں شرم تھی اس لئے کوئی

ایک وضعی روایت

ان کے حصہ بدن کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ لیکن بعض موزی بنی اسرائیل نے ان کو ایذا پہنچائی اور کہنے لگے یہ
اس قدر پردہ صرف اس وجہ سے کرتے ہیں کہ ان کے بدن میں کوئی عیب ہے۔ برص ہے یا باد خایہ ہے یا
کوئی اور مرض ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ کا ارادہ ہوا کہ موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کی افترا بندی سے بری کر دے چنانچہ
ایک روز حضرت موسیٰؑ تنہائی میں غسل کرنے کھڑے ہوئے۔ کپڑے اتار کر پتھر پر رکھے اور خود غسل کرنے
لگے غسل سے فارغ ہو کر جب کپڑے پہننے کے لئے بڑھے تو پتھر کپڑے لے کر بھاگا۔ موسیٰؑ لڑکھی لیکر
(برہنہ) پتھر کے پیچھے یہ کہتے ہوئے چلے۔ او پتھر! میرے کپڑے۔ یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی ایک عجمت
نکتہ پہنچ گئے۔ لوگوں نے ان کو برہنہ دیکھ لیا اور معائنہ کر لیا کہ وہ بہت عمدہ ساخت کے آدمی ہیں
خدا نے تعالیٰ نے (اس ذریعہ سے) بنی اسرائیل کی افترا بندی سے ان کو بری کر دیا۔ بالآخر پتھر بھی رگ گیا۔
موسیٰؑ نے اپنے کپڑے لے لئے اور لاٹھی سے پتھر کو مارنے لگے۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم موسیٰؑ
کے مارنے کی وجہ سے پتھر پر تین یا چار یا پانچ نشان پڑ گئے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا خدا تعالیٰ کے
مذکورہ ذیل قول کا یہی مطلب ہے **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا** (۳۳)۔

آپ خود سوچ لیجئے کہ جو متلآن ان روایات و تفاسیل کی رو سے سمجھا جائے گا اس سے اسلام کا کس قسم کا تصور ذہن میں پیدا ہوگا۔ اسی قسم کا اسلام ہے جس سے ہماری نئی نسل، جس نے سوچنا شروع کیا ہے، مذہب سے برگشتہ ہو رہی ہے۔ اگر اس کے سامنے قرآن کریم اس کی حقیقی شکل میں پیش کیا جائے تو وہ نہیں سکتا کہ وہ اسے حرجاً نہ بنالے۔ میں یہ کچھ اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ میں ان نوجوانوں کے سامنے قرآن کریم کو بلا آمیزش پیش کرتا ہوں جس سے بڑے حوصلہ افزا، خوشگوار نتائج مرتب ہوتے ہیں۔



نوٹ: ترتیب کے اعتبار سے اس جگہ پانچویں باب کا خلاصہ آنا چاہئے تھا۔ لیکن پانچویں اور چھٹے باب میں اس قدر معنوی تسلسل ہے کہ ان دونوں کا خلاصہ یکجا دیا جانا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بنا بریں آیات ۵۵ تا ۱۱۲ کا خلاصہ چھٹے باب کے آخر میں دیا جائے گا۔

چھٹا باب

داستانِ بنی اسرائیل — مسلسل

(آیات ۷۲ تا ۱۱۲)

- ۱۔ واقعہ قتل اور طریق تفتیش
- ۲۔ یہودیوں کی قساوتِ قلبی۔
- ۳۔ قانونِ مکافاتِ عمل
- ۴۔ والدین اور اولاد کا تعلق
- ۵۔ کتاب کے ایک حصہ پر ایمان دوسرے سے کفر۔ یہ ثنویت باعثِ تذلیل ہے۔
- ۶۔ ہمارے علماء کی حالت۔
- ۷۔ آنے والے کا عقیدہ
- ۸۔ سیکولر ازم۔ سوشلزم۔ کمیونزم۔ سب خلافِ اسلام ہیں۔
- ۹۔ حضرت سلیمانؑ کے خلاف بہتان تراشی۔ ہاروت و ماروت کا افسانہ
- ۱۰۔ جادو کی حقیقت۔ باطنیت کا عقیدہ۔ تعویذ۔ ورد، وظائف
- ۱۱۔ علامہ اقبالؒ اور تصوف
- ۱۲۔ قریش کی طرف سے اسلامی نظام کی مخالفت۔
- ۱۳۔ مخالفین سے اعراض اور علیحدگی کا حسن کارانہ طریق۔
- ۱۴۔ قانونِ مکافاتِ عمل

چھٹا باب

(آیات ۷۲ تا ۱۱۲)

داستانِ بنی اسرائیل — مسلسل

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادْرَأَتْكُمْ فِيهَا وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ - فَقُلْنَا اضْرِبُوهَا بَعْضُهَا . كَذَلِكَ يُخَيِّ اللَّهُ الْمَوْتَى وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ -

۲
۷۲-۷۳

ان آیات کی تفسیر میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اُس سے ان کا مفہوم واضح ہونے کے بجائے الجھ کر رہ گیا ہے۔ اس سلسلے میں متہیداً ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم میں جو کچھ آیا ہے، اصولی طور پر اُسے مختلف گوشوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس کے ایک، اور بنیادی گوشے کا تعلق انسانی راہنمائی (ہدایت) سے ہے۔ اس میں جو احکام دیئے گئے ہیں ان کے معانی متعین ہیں جنہیں ہر ذہنی سطح کا انسان (بشرطیکہ وہ قرآنِ کریم کی زبان اور اسلوبِ بیان سے واقف ہو) باسانی سمجھ سکتا ہے۔ دوسرے گوشے کا تعلق خارجی کائنات میں نافذ قوانین اور نظام سے ہے۔ ان قوانین کے مطابق حقائق کے کماحقہ سمجھنے کے لئے اشیائے کائنات سے متعلق

قرآنی حقائق کے تین گوشے

علومِ دُنیوی (قوانینِ فطرت) سے واقفیت ضروری ہے۔ ان قوانین میں اکثر و بیشتر ایسے ہیں جن کا انکشاف علومِ سائنس کی رو سے کر لیا گیا ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کے متعلق تحقیق جاری ہے۔ ان (آخر الذکر) کے متعلق جو کچھ سرِ درست کہا جائے گا وہ قیاس ہوگا۔ لیکن قرآنِ کریم میں جو کچھ آیا ہے وہ بہر حال قطعی اور یقینی ہے۔ اس لئے ان امور کے متعلق ہم یہی کہیں گے کہ جب انسانی علم مزید ترقی کر جائے گا تو ان آیاتِ قرآنیہ کا قطعی مفہوم ہمارے سامنے آجائے گا۔ ان کے یقینی ہونے پر بہر حال ہمارا ایمان ہے۔ یہی کیفیت اُن تاریخی واقعات کی ہے جنہیں قرآنِ کریم نے اپنے دعاوی کی تائید میں بطور شہادت پیش کیا ہے۔ ان میں سے اکثر واقعات کی تصدیق و توثیق تاریخی انکشافات سے ہو چکی ہے اور کچھ ایسے ہیں جن سے یہ تحقیق ہنوز پردہ نہیں اٹھا سکی۔ ان کے متعلق بھی سرِ درست یہی کہا جائے گا کہ

ان کے سچا ہونے پر ہمارا ایمان ہے اور جب تاریخی تحقیقات آگے بڑھیں گی تو وہ ان کی تصدیق کر دیں گی۔ جس طرح (مثلاً) فرعون کی لاش کے محفوظ رکھے جانے کا جو واقعہ قرآن کریم میں مذکور ہے، صدیوں تک تاریخی تحقیق کے اعتبار سے وہ پردہ اخفا میں رہا تاں کہ اہرام مصر کے نیچے می شدہ لاشوں کے اکتشاف کے بعد قرآن کریم کا بیان حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آگیا۔ اس سے اگلا گوشہ ان حقائق پر مشتمل ہے جن کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے۔ (مثلاً) مرنے کے بعد کی زندگی اور اس کی کیفیات۔ ان حقائق کی کنہ و ماہیت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے، البتہ دلائل و شواہد کی مدد سے ان کے متعلق ذہن میں ایک تصور قائم کر سکتے ہیں۔ بایں ہمہ، ان کے حقیقت ثابتہ ہونے پر بھی ہمارا ایمان ہے۔

جس واقعہ کا ذکر آیات زیر نظر (۲۰۱-۲۰۲) میں آیا ہے، تاریخی تحقیق ابھی تک اس پر سے پردہ نہیں اٹھا سکی۔ اس لئے اس کے متعلق سب سے درست جو کچھ کہا جائے گا، بہر حال قیاسی ہوگا۔ لیکن قیاس کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ قرآنی اصول و قوانین یا اس کی مجموعی تعلیم کے خلاف نہ جائے۔

ان تصریحات کی روشنی میں، ان آیات کے مفہوم کی طرف آئیے۔ ان سے پہلی آیات میں گائے یابیل

(سانڈ) کے ذبح کرنے کا واقعہ مذکور ہے۔ عام طور پر مفسرین کا خیال

واقعہ قتل کی عام تفسیر

اس طرف گیا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق بھی ذبح بقرہ سے ہے یعنی ان

آیات میں واقعاتی تسلسل ہے۔ اس اعتبار سے عام طور پر کہا یہ گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں ایک قتل

ہو گیا اور قاتل کا پتہ نہ چل سکا۔ چنانچہ وہ باہمدگر جھگڑنے اور ایک دوسرے کے خلاف الزام دھرنے

لگے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جس بات کو یہ لوگ پرشیدہ رکھتے تھے (یعنی یہ کہ قاتل کون ہے) اُسے ہم

ظاہر کئے دیتے ہیں۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اُن سے کہا کہ اس ذبح شدہ گائے کی لاش کا

ایک ٹکڑہ اس مقتول (مردہ) کی لاش کے ساتھ لگاؤ۔ انہوں نے ایسا کیا تو مردہ جی اٹھا اور اس

نے بتا دیا کہ اس کا قاتل کون ہے۔ اس راز کے افشا کرنے کے بعد وہ پھر مر گیا۔ جن لوگوں کو اس مفہوم

سے اختلاف ہے ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ وہ شخص درحقیقت مرا نہیں تھا بلکہ بیہوش ہو گیا تھا۔

یا اس میں عمل نفس بند ہو گیا تھا اور اس کے جسم کے بعض اعضاء کو حرکت دینے سے اس میں عمل نفس

پھر سے جاری ہو گیا یا وہ ہوش میں آگیا تھا۔ وہ ان آیات کے بعض الفاظ کے مجازی معانی کی تائید

سے اس نتیجہ تک پہنچنے کے مدعی ہیں۔ لیکن (ہمارے نزدیک) کسی شخص کا بیہوش ہو جانا یا اس پر سکتہ طاری ہو جانا تو کوئی ایسا اہم یا غیر معمولی واقعہ نہیں جسے قرآن کریم اتنی اہمیت دیتا۔ ہمارے خیال میں وہ مقتول تھا اور مردہ کا تھا۔ اہمیت اس واقعہ کو یوں بھی ہے کہ قرآن کریم نے یہ نہیں کہا کہ اُسے ان میں سے کسی ایک شخص نے قتل کیا تھا: قَتَلْتُمْ جَمْع کا صیغہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی اجتماعی سازش کا نتیجہ تھا، اور مقتول بھی کوئی اہم شخصیت تھی۔ جہاں تک اس مفہوم کا تعلق ہے کہ خدا نے یہ کہا کہ اُس مذبح گائے یا بیل کی لاش کے کسی ایک ٹکڑے کو مقتول کی لاش کے ساتھ مس کر دو تو اس سے مقتول زندہ ہو جائے گا۔ اور وہ زندہ ہو گیا۔ تو اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک معجزہ تھا جسے قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ معجزہ کس کا تھا؟ معجزہ کے متعلق تو عقیدہ یہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نبی کے ہاتھوں سرزد ہوتا تھا، اور اس طرح وہ اس نبی کے دعوئے نبوت کی دلیل یا شہادت بن جاتا تھا۔ لیکن یہ معجزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں سرزد نہیں ہوا، لہذا یہ معجزہ اُس گائے کا ہو گیا جسے ذبح کیا گیا تھا۔ اور یہ بات تسلیم کئے جانے کے قابل ہی نہیں۔ اُس گائے کو بنی اسرائیل کے ہاتھوں اس لئے ذبح کرایا گیا تھا کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ گائے عام مویشیوں کی طرح ایک مویشی ہے جو خود اپنی بھی حفاظت نہیں کر سکتی۔ وہ انسان کے قابو اور قبضہ میں ہوتی ہے جسے وہ جس وقت چاہے ذبح کر سکتا ہے۔ لہذا اسے معبود سمجھنا انتہائی حماقت ہے۔ لیکن اگر کیفیت یہ ہو کہ اُس ذبح شدہ گائے میں بھی یہ قدرت ہو کہ اُس کے چھوٹنے سے ایک مردہ زندہ ہو جائے تو اس کے معبود ہونے میں شبہ کیا رہتا ہے؟ یہ تو عجیب سی بات ہوتی کہ بنی اسرائیل کے دل سے گائے کی عظمت و عقیدت زائل کرنے کے لئے اُسے اُن کے ہاتھوں ذبح کرایا گیا، اور پھر اس ذبح شدہ گائے کو ایسی قدرت کا حامل ثابت کر کے دکھا دیا جو خدا ہی کے شایانِ شان ہو سکتی ہے۔ اس سے تو اس کے معبود ہونے میں کوئی شبہ ہی باقی نہیں رہتا۔

اب آگے بڑھیے۔ اس تفسیر کی رو سے کہا یہ جاتا ہے کہ خدا کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ وہ مردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں اس تصور کو سامنے لائیے کہ مردہ گائے کے ایک ٹکڑے کو لاش کے ساتھ مس کیا گیا تو وہ مردہ زندہ ہو گیا۔ اور اس کے بعد خدا نے کہا کہ كَذٰلِكَ يُخَيِّ اللّٰهُ الْمَوْتٰی (۲/۷۱) "اس طرح خدا مردوں کو زندہ کیا کرتا ہے۔ اور زندہ کرے گا؟ اس میں كَذٰلِكَ (یعنی اس طرح) کا لفظ

قابلِ غور ہے۔ یعنی خدا نے کہا یہ ہے کہ ہم مردہ انسانوں کے جسموں کے ساتھ مردہ حیوانات کے بعض ٹکڑوں کو مس کریں گے اور اس طرح مردے جی اٹھیں گے! اس تفسیر کے بے معنی (بلکہ قرآنی تصور کے خلاف) ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ اگر خدا کو یہی مقصود تھا کہ وہ مقتول زندہ ہو کر اپنے قاتل کا پتہ نشان بتا دے تو اس کے لئے اس ذبح شدہ گائے کو درمیان میں لانے کی ضرورت کیا تھی؟ کیا اللہ تعالیٰ اس کے بغیر اپنے حکم سے براہِ راست ایسا نہیں کر سکتے تھے؟

اس کی تفسیر میں قیاس کا رُخ کس سمت کی طرف ہونا چاہیے، اس کا تعین آیت (۲) کے آخری الفاظ نے خود ہی کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ **وَيُؤَيِّدُكُمُ الْيَتِيمَ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ** (۲)۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی باتیں بتاتا ہے تاکہ تم عقل و فکر سے کام لو! اس کے معنی یہ ہیں کہ اس واقعہ میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے اُسے عقل و فکر کی رو سے سمجھا جانا چاہیے۔ اگر یہ خارقِ فطرت معجزہ ہوتا تو اسے سمجھنے کے لئے عقل کو اپیل کیا ہی نہیں جاسکتا۔ معجزہ تو کہتے ہی اُسے ہیں جس کے سمجھنے سے عقل عاجز آجائے۔ بنا بریں، اس کے متعلق جو قیاس بھی کیا جائے اس کی بنیاد عقل و فکر پر ہونی چاہیے۔ یعنی اُسے عقل و بصیرت کے خلاف نہیں ہونا چاہیے۔

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اس واقعہ کا تعلق ذبحِ بقر کے واقعہ سے نہیں جیسا کہ پہلے بھی

بتایا جا چکا ہے، قرآنِ کریم کی ان اور اسی پہنچ کی دیگر آیات میں بنی اسرائیل کی تاریخ

کو سامنے لایا گیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر نزولِ قرآنِ کریم کے زمانے

ہمارا قیاس

تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ لہذا زیرِ نظر واقعہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے کسی اور دور سے متعلق ہے۔ اس کا تعلق ذبحِ بقر کے زمانے یا واقعہ سے نہیں۔ یہ ایک الگ واقعہ ہے۔ ہمارے قیاس کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ اُس قوم کے کسی گروہ نے خفیہ سازش سے کسی نامور ہستی کو قتل کر دیا اور کوشش کی کہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ ظاہر ہے کہ اس سے قوم میں کھلبلی مچ گئی ہوگی اور قاتل کے تعین میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہوئے ہوں گے جس سے وہ ایک دوسرے پر الزام دھرتے ہوں گے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے قاتل کے پہنچانے کا ایک نفسیاتی طریقہ بتا دیا جو اس زمانے میں وحی کے ذریعے ہی بتایا جاسکتا تھا۔ آپ پہلے کسی لاش کا تصور ذہن میں لائیے۔ وہ مرنے والا اپنے آخری سانس تک تمام گھردالوں کے لئے عزیز ترین ہستی اور محبت و پیار کا پیکر تھا۔ لیکن سانس بند ہو جانے کے بعد جب وہ زندہ انسان کے بجائے مردہ ہو گیا تو اس کی لاش سے گھر پر ہیبت طاری ہو گئی جس کمرے میں اُس لاش کو رات بھر کے لئے رکھا گیا، کوئی

شخص اس میں تنہا جانے کی جرأت نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ رات بھر مڑے کی چارپائی کے گرد بہت سے لوگ (بالعموم عورتیں) جمع رہتی اور کچھ پڑھتی پڑھاتی رہتی ہیں تاکہ خیال لاش کی طرف نہ جانے پائے۔ کیفیت ہو جاتی ہے لاش کی۔ اور وہ لاش اگر کسی مقتول کی ہو تو اسکی ہیبت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ قتل کا جرم ایسا سنگین ہوتا ہے کہ قاتل کسی فوری جذبے کے ماتحت اس کا خفیہ رکاب تو کر لیتا ہے لیکن جب جذبات کی شدت ماند پڑ جاتی ہے تو اس جرم کا احساس اس کے دل میں کرب و اضطراب کی ہیجانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ خون چھپا نہیں رہتا۔ وہ مجرم کے سر پر چڑھ جاتا ہے۔ آجکل سنگین خفیہ جرائم کی تفتیش کے سلسلے میں خاص نفسیاتی طریق عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ ان طریقوں کے ماہرین ملزم سے مختلف سوالات کے دوران اُس کے چہرے کی علامات اور آثار سے اکثر اوقات صحیح نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ اب ایسے آلات بھی ایجاد ہو گئے ہیں جو ملزم کے دوران خون، دل کی دھڑکن، نبض کی رفتار کو اس طرح ریکارڈ کرتے جاتے ہیں کہ اُن سے اس کی قلبی کیفیت کا اندازہ کر لینا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ تو پھر

تفتیش کا نفسیاتی طریق

بھی ماہرین علم النفس کے وضع کردہ طریق ہیں، ہمارے ہاں بالکل نچلی سطح پر چور کا پتہ لگانے کا ایک طریقہ تھا، (اور دیہات وغیرہ میں اب بھی ہے) جسے ”لوٹا گھمانا“ کہتے ہیں۔ ایک سیانا ”لوٹالے“ کر بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ پڑھتا ہے اور جن لوگوں پر چوری کا شبہ ہوتا ہے اُن سے کہا جاتا ہے کہ ایک ایک شخص اگر لوٹے پر ہاتھ رکھے۔ عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ جو چور ہو گا اُس کے ہاتھ رکھنے سے لوٹا گھوم جائے گا۔ لوٹا گھومتا گھماتا تو کچھ نہیں، لیکن جب چور لوٹے پر ہاتھ رکھتا ہے تو اس کا رنگ ضرور فق ہو جاتا ہے اور ہاتھ کانپنے لگتے ہیں (غالباً یہیں سے ہمارے ہاں ”چور کی داڑھی میں تنکا“ کا محاورہ رائج ہو گیا۔ اگرچہ اب عادی مجرم اپنی داڑھیاں منڈائے رکھتے ہیں تاکہ ان میں تنکا نہ اٹکے، ہم سمجھتے ہیں کہ قصہ زیر نظر میں اسی قسم کا نفسیاتی طریق تھا۔ جو بذریعہ وحی بتایا گیا تھا۔ اس پر کچھ تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ وحی اس قسم کی باتیں بھی بتایا کرتی تھی، انسان کے ابتدائی ادوار میں تو کیفیت یہ تھی کہ حضرت نوح علیہ السلام کو سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لئے کشتی بنانے کا طریق بھی وحی کے ذریعہ بتایا گیا تھا۔ (۲۴/۲۵)۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کہا یہ گیا ہو گا کہ جن لوگوں پر قتل کا شبہ ہے اُن میں سے ایک ایک شخص لاش کے قریب آئے اور لاش کا ہاتھ اٹھا کر اس کے جسم سے لگا دیا جائے۔ تفتیش کنندہ اس کا گہری نظر سے جائزہ لیتا جائے کہ کس پر کس قسم کی کیفیت

طاری ہوتی ہے۔ یا ان سے پہلے ہی کہہ دیا جائے کہ قاتل تنہائی میں سچی سچی بات بتادے ورنہ اس لاش کے چھونے سے سارا راز کھل کر سامنے آجائے گا۔ تفتیش کے اسی طریق پر غور و فکر کی دعوت قرآن کریم نے دی ہے اور اسی غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ اب تفتیشِ جرائم کا نفسیاتی طریق عام ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اس مفہوم کے سلسلے میں، البتہ ایک بات وضاحت طلب رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ كَذٰلِكَ يُخَيِّئُ اللّٰهُ الْمَوْتٰى (۱۳۷)۔ لغوی اعتبار سے تو اس کا ترجمہ یہی ہوگا کہ ”اس طرح خدا مردوں کو زندہ کرتا ہے“ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، اس سے لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۱۳۷) (ناکہ تم عقل و فکر سے کام لے سکو) کا ربط قائم نہیں رہتا، اس لئے ان الفاظ کے لغوی نہیں بلکہ مجازی معانی لینے ہوں گے۔ امام راغب نے ”حیات“ کے معنی قوتِ عقل و عمل بھی بتائے ہیں اور کسی بات کے ظاہر یا واضح ہو جانے کے بھی۔ چنانچہ حَيِّی الطَّرِیْقُ کے معنی ہیں ”راستہ ظاہر یا واضح ہو گیا۔ اور طَرِیْقُ حَیِّی کے معنی ہیں واضح راستہ۔ اور جب موت کا لفظ اس کے مقابل آئے گا تو اس سے مفہوم کسی بات کا پوشیدہ ہو جانا ہوگا۔ چنانچہ عقل و ہوش یا حواس کے گم ہو جانے پر بھی موت کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ آیت (۱۳۷) میں مَا كُنْتُمْ تَشْكُرُوْنَ (۱۳۷)۔ (جسے تم چھپاتے ہو) کو آیت (۱۳۷) میں الْمَوْتِی (مخفی یا پوشیدہ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ (خدا ظاہر کر دے گا) کی یُخْرِی اللّٰهُ سے وضاحت کر دی گئی ہے۔ آیات زیر نظر میں نقطہ ماسک ”پوشیدہ راز کا ظاہر کرنا تھا“ نہ کہ مردہ کو زندہ کر کے دکھانا۔ وہ راز اس طرح سے ظاہر ہو گیا۔ یوں بھی قرآن کریم نے مجرموں کو اُن کے جرائم کی سزا دینے کو ”حیات“ سے تعبیر کیا ہے۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ لَّيَّالٍۭی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۱۷۹)۔ اے ارباب عقل و بصیرت! اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ مجرموں کو اُن کے جرائم کی سزا ملنے سے قوم کو زندگی (حیات) عطا ہو جاتی ہے۔

بہر حال جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، یہ ہمارا قیاس ہے۔ حقیقت اُس وقت سامنے آئے گی جب تاریخی تحقیق اس واقعہ سے پردہ اٹھائے گی۔ اُس وقت تک ہمیں یہی کہنا چاہیے کہ بحالات موجودہ ہماری فکر کی مدد ہی ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ امام ابن کثیر جیسے مفسر جو قدامت پرستی اور انجوبہ پسندی میں عام طور پر بہت شدت اختیار کرتے ہیں، اس واقعہ کے ضمن میں انہوں نے بھی کچھ ایسا ہی موقف اختیار کیا ہے۔ وہ گائے کے ٹکڑے کو لاش کے ساتھ چھونے کے ضمن میں

لکھتے ہیں کہ :-

اس کا بیان نہ تو قرآن میں ہے نہ کسی صحیح حدیث میں، اور نہ ہمیں اس کے معلوم ہونے سے کوئی فائدہ ہے، نہ، نہ معلوم ہونے سے کوئی نقصان ہے۔ سلامت ردی اسی میں ہے کہ جس چیز کا بیان نہیں، ہم بھی اس کی تلاش و تفتیش میں نہ پڑیں۔

(تفسیر ابن کثیر۔ پارہ اول۔ صفحہ ۱)

اس کے برعکس ہمارے دور کے مفسر، ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے،

اس سے ہمیں افسوس ہی نہیں، سخت صدمہ ہوا۔

مودودی صاحب کا قرآن پر اعتراض | ہمیں ان کے خیالات سے اتفاق بھی ہو سکتا ہے

اور اختلاف بھی۔ اختلاف کی صورت میں ہمیں کسی قسم کا صدمہ تو ایک طرف، تأسف بھی نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن جب کوئی ایسی بات سامنے آجائے جس سے (معاذ اللہ) خدا کی اس کتاب عظیم پر حرف آتا ہو تو اُس سے ہمیں واقعی دلی افسوس اور صدمہ ہوتا ہے۔ وہ ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں :-

اس مقام پر بات تو بالکل صریح معلوم ہوتی ہے کہ مقتول کے اندر دوبارہ اتنی دیر کے لئے جان ڈالی گئی کہ وہ قاتل کا پتہ بتا دے۔ لیکن اس غرض کے لئے جو تدبیر بتائی گئی تھی یعنی "لاش کو اسکے ایک حصے سے ضرب لگاؤ" اس کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے۔ تاہم اس کا قریب ترین مفہوم وہی ہے جو قدیم مفسرین نے بیان کیا ہے۔ یعنی یہ کہ اوپر جس گانے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا، اُسی کے گوشت سے مقتول کی لاش پر ضرب لگانے کا حکم ہوا۔ اس طرح گویا بیک کرشمہ دوکار ہوئے۔ ایک یہ کہ اللہ کی قدرت کا ایک نشان انہیں دکھایا گیا۔ دوسرے یہ کہ گائے کی عظمت و تقدیس اور اس کی معبودیت پر کبھی ایک کاری ضرب لگی کہ اس نام نہاد معبود کے پاس اگر کچھ بھی طاقت ہوتی تو اُسے ذبح کرنے سے ایک آفت برپا ہو جانی چاہیے تھی نہ کہ اُس کا ذبح ہونا اُلٹا اس طرح مفید ثابت ہو۔

(تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ مطبوعہ ۱۹۵۱ء۔ صفحہ ۸۶)

اس "بیک کرشمہ دوکار" کے متعلق ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ جو کچھ ہم نے اس کے معجزہ ہونے اور اس گائے کی عظمت و تقدیس کے مستم ہو جانے کے سلسلے میں پہلے لکھا ہے وہ اس کی تردید کے لئے کافی ہے۔ لیکن

جس بات سے ہمیں صدمہ ہوا وہ مودودی صاحب کے یہ الفاظ ہیں کہ ”اس غرض کے لئے جو تدبیر بتائی گئی تھی“

اس کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے۔

قرآن کے الفاظ ہیں ”ابہام“۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ غیر مسلم تو اس قسم کے اعتراض کیا کرتے ہیں لیکن کسی مسلمان سے قرآن کریم کے متعلق اس قسم کی جسارت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو فُورٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِينٌ (۱۶) کہا ہے یعنی روشن اور نہایت واضح کتاب؛ ایسی واضح کہ تَبَيَّنَّا لِكُلِّ شَيْءٍ (۱۶) ہر شے کو نہایت وضاحت سے بیان کرنے والی؛ جس کتاب کے متعلق خود اللہ تعالیٰ یہ کہتے ہوں، اس کے متعلق یہ کہنا کہ اُس کے الفاظ میں کچھ ابہام محسوس ہوتا ہے، بہت بڑی جسارت ہے۔ یعنی بجارتے اس کے کہ اس کا اعتراف کیا جائے کہ ہماری فکر ہنوز اتنی بلند نہیں ہوئی کہ ان الفاظ کے حقیقی مفہوم کو سمجھ سکے، کیونکہ تاریخی تحقیق ابھی وہاں تک نہیں پہنچ سکی، یہ کہنا کہ اس کے الفاظ میں ابہام ہے، ہم تو سمجھ نہیں سکے کہ اسے کیا کہا جائے؟ یعنی اپنی فکر کی نارسائی کا اعتراف کرنے کے بجائے خدا کی کتاب کو مبہم قرار دینا۔ استغفر اللہ۔ اقبالؒ نے شاید ایسے ہی لوگوں کے متعلق کہا تھا کہ:-

تری نگاہِ فرومایہ ہاتھ ہے کوتاہ ترا گناہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ

ان صاحب کا کہنا یہ ہے کہ ”یہ میرا گناہ نہیں، نخیلِ بلند کا گناہ ہے۔ کیونکہ میرا ہاتھ کوتاہ نہیں اور میری نگاہ فرومایہ نہیں ہو سکتی“ ہم عاجز بندوں کا تو بہر حال ایمان یہ ہے کہ

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے درد و صاف

رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میسرِ پیانے کا ہے !

(۱۰)

خدا کی کتاب مبین کو مبہم کہنے والوں کی یہی قسارتِ قلبی ہے جس کی طرف (بالواسطہ) اگلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے جہاں کہا ہے:-

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ . فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً . وَإِنْ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ . وَإِنْ مِنْهَا لَمَا يَشْقَقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ . وَإِنْ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ

وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ۔

(بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ، تمہارے ساتھ یہ کچھ ہوتا رہا، تم بگڑتے اور بنتے رہے، لیکن مسلسل تکبر اور رعونت سے تمہارے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ اس لئے کہ بعض پتھر بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے پانی کے قطرے ٹپک پڑتے ہیں اور بعض ایسے کہ وہ پھٹ جاتے ہیں تو ان کے اندر سے پانی کے چشمے اور ندیاں بہہ نکلتی ہیں اور ایسے پتھر بھی ہوتے ہیں کہ وہ قوانینِ خداوندی کی رو سے اپنی سختی کو چھوڑ کر نرم پڑ جاتے ہیں لیکن تمہارے دل ہیں کہ نہ وہ انسانیت کی غمخواری میں نرم ہوتے ہیں اور نہ اپنی رعونت کو چھوڑ کر صداقت کے سامنے جھکتے ہیں۔

مسلسل سرکشی اور متمادی نخوت اور تکبر سے انسان کے دل کی جو حالت ہو جاتی ہے اُسے قرآن کریم نے بہ ہیئتِ مجموعی پتھر سے تشبیہ دی ہے۔ (کالحجارة۔ پتھر نہیں بلکہ پتھر کی مانند) یہ وہی تمثیلی انداز ہے جو سورۃ الحشر کی آیت (۱۱۹) میں اختیار کیا گیا ہے، جہاں کہا ہے کہ لَوْ اَنْزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَى جَبَلٍ لَّرَاٰيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ۔ وَتِلْكَ اَلْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۵۹) اس قرآن کی اثر انگیزیوں کا عالم یہ ہے کہ اگر مثال کے طور پر ہم اسے قلبِ کوہ کے اندر رکھ دیتے (اور اسے احساسِ عطا کر دیتے) تو تو دیکھتا کہ اس کی خلاف ورزی کے احساس سے اس پر لرزہ طاری ہو جاتا اور ذمہ داریوں کے خیال سے اس کا جگر شق ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی مثالیں ہم اس لئے بیان کرتے ہیں کہ لوگ عقل و فکر سے کام لیں اور سوچیں کہ یہ قرآن کن عظمتوں کا مالک ہے اور اس کی خلاف ورزی کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔

آیہ زیرِ نظر میں ہے ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ دَہِیًّا قَسَاوَاتٍ کے معنی سخت ہو جانا ہیں۔ حَجَرٌ قَاسٍ، ٹھوس

اور سخت پتھر کو کہتے ہیں۔ اَرْضٌ قَاسِيَةٌ سخت چٹیل زمین، جس میں کچھ پیدا نہ ہو۔

قساوتِ قلبی | اس سے قساوتِ قلبی یا سنگدلی کا تصور سامنے آ جاتا ہے۔ دلوں کی یہ حالت کیسے ہو جاتی ہے اس کے متعلق جماعتِ مومنین سے کہا کہ لَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ۔ قَطَالٌ عَلَيْهِمُ اَلْاَمَدُ۔ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ۔ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَسِقُونَ (۵۴) دیکھنا! تم کہیں سابقہ اہل کتاب کی طرح نہ ہو جانا۔ انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی۔ (حند، تعصب اور تقلید کی

روش اختیار کی، اور پھر جب اس روش پر چلتے ایک عرصہ گزر گیا تو ان کے دل سخت ہو گئے اور وہ راہِ راست سے پھر کر ایک طرف کو ہو گئے۔ اس کے بعد خود ان اہل کتاب (یہودیوں) سے کہا کہ اِغْلُظُوا اَنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْاَزْمِنَ بَعْدَ مَوْتِهَا۔ (۵۷)۔ اب بھی مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ مردہ زمین کو کس طرح حیاتِ تازہ عطا کر دیتا ہے۔ تم بھی اگر اُس کے قوانین سے ہم آہنگی اختیار کرو تو ہمارے دلوں کی سختی نرمی سے بدل سکتی ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ فَمَا تَقْضِيهِمْ مِّمَّا قَالَتْ لَهُمْ لَعْنُهُمْ۔ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِمْ۔ وَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ۔ (۵۸)۔ انہوں نے خدا سے جو عہد باندھے

دل کس طرح سخت ہو جاتے ہیں

تھے انہیں ایک ایک کر کے توڑ دیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ نعمائے خداوندی سے محروم ہو گئے اور رفتہ رفتہ ان کے دل ایسے سخت ہو گئے کہ وہ خدا کی رحمت میں تحریف کرنے لگ گئے اور اس کے ایک حصے کو یکسر فراموش کر دیا۔ وحی خداوندی میں تحریف اور آمیزش کس طرح سے ہوتی ہے اس کے متعلق (۲۲) میں کہا کہ رسول اللہ سے پہلے ہر رسول کے ساتھ ہی ہوتا رہا کہ اُس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد شیطانی عناصر اس کی وحی میں آمیزش کر دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہوتا یا ان کے دل سخت ہو چکے ہوتے، وہ تحریف اور آمیزش ان کے لئے باعثِ فتنہ بن جاتی (۲۲) اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وَلَٰكِنْ قَسَتْ قُلُوبُهُمْ۔ وَفَرَّقَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ مَا كَانُوا يَجْعَلُونَ (۲۳)۔ شیطان ان کے غلط اعمال کو نہایت خوشنما بنا کر دکھاتا۔ سورہ الزمر میں کہا کہ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرًا لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّنْ رَّبِّهِ فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ اُولَٰئِكَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۲۴) کیا وہ شخص جس کے سینے میں کشادہ پیدا ہو چکی ہے اور وہ سفرِ حیاتِ خدا کی عطا کردہ روشنی کی راہنمائی میں طے کر رہا ہو، اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جس کا دل قوانینِ خداوندی کی طرف سے سخت ہو چکا ہو۔ ایسے لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں ہوتے ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا کہ قساوتِ قلبی شرحِ صدر کی ضد ہے۔ اور شرحِ صدر اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور وہ انسان بڑا خوش بخت ہے جسے یہ حاصل ہو جائے۔ کشادہ قلب، وسعتِ ظرف، پہنائی نگاہ، حق و صداقت قبول کرنے کے لئے ہر وقت آمادگی، اور نخل اور خود غرضی کے مقابلے میں دوسروں کی ہمدردی کے لئے اپنے سینے کا کھلا رکھنا۔ یہ ہیں شرافتِ انسانیہ کے خصائصِ کبریٰ۔ اور یہود انہی خصائص سے محروم ہو چکے تھے۔ جہاں تک نخل اور خود غرضی کا تعلق ہے، یہودیوں کی دناست دنیا

میں ضرب امثل بن کر رہ گئی ہے۔ یہودی ذہنیت (JEWISH MENTALITY) کا مفہوم کسے معلوم نہیں؟ شیکسپیر نے اپنے ڈرامہ (THE MERCHANT OF VENICE) میں (SHYLOCK) کے کردار میں، یہودیوں کی جس ذہنیت کا نقشہ کھینچا ہے وہ ان کی قساوت بلکہ شقاوت قلبی کی زندہ شہادت ہے۔

کارل مارکس نے جس کا خاندان نسلًا یہودی تھا اگرچہ اس کے باپ نے یہودیت کو ترک کر کے عیسیت

کا مذہب اختیار کر لیا تھا، زرپرستی کو ”یہودیت“ سے تعبیر کیا ہے۔

— واضح رہے کہ جرمن زبان میں یہودیت اور کاروبار دونوں کے

یہودیوں کی خود غرضی

لئے (JUDENTUM) کی اصطلاح مستعمل ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہودیت، یعنی کاروبار (تجارت) ایک ایسا مذہب ہے جس میں زر و دولت، کی حیثیت خدا کی ہے۔

یہودی کا دنیاوی مسلک کیا ہے، کاروبار — اس کا دنیاوی خدا کون ہے، روپیہ — یہ زر، اسرائیل کا وہ حاسد خدا ہے جو کسی دوسرے کو خدا برداشت نہیں کر سکتا۔ ذرا انسان کے تمام خداؤں کو تخت سے اتار دیتا ہے اور ان کو اشیائے بازاری میں بدل دیتا ہے۔ زر تمام چیزوں کی آفاقی قدر ہے۔ لہذا اس نے ساری دنیا کو — دنیا سے انسانیت اور دنیا سے فطرت دونوں کو — ان کی اپنی تدردوں سے محروم کر دیا ہے۔ اور انسان، اس کی پرستش کرتا ہے۔ لہذا یہودیوں اور غیر یہودیوں کی آزادی اور تجارت کا انحصار، بنی نوع انسان کے یہودیت، یعنی تجارتی کاروبار سے نجات حاصل کرنے پر ہے۔

(بحوالہ موسیٰ سے مارکس تک۔ از سبط حسن صفحہ ۸۶-۸۵)

یہ تھے یہودی جن کے متعلق تشرآن کریم نے کہا کہ اُن کے دل پتھروں جیسے ہو گئے بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ کیونکہ پتھروں میں ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اُن کی دراڑوں میں سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں۔ ایسے بھی کہ جب وہ کہیں سے شق ہو جاتے ہیں تو ان میں سے صاف شفاف قطرات آب موتیوں کی طرح ٹپکنے

لے خود پاکستان کے ہمسایہ ”یہودی“ (ہندوؤں) کے ہاں بھی دولت کی پرستش ہوتی ہے۔ لکشمی، دولت ہی کی دیوی کا نام ہے اور دھن (مال) کا لفظ ان کے ہاں انتہائی خوش نصیبی اور مبارک بادی کے لئے بولا جاتا

لگ جاتے ہیں۔ ایسے بھی کہ وہ قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکتے ہیں تو ان کی سختی اور صلابت میں نرمی (لچک) پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ شقی القلب ایسے ہیں کہ نہ کسی مظلوم کی مظلومیت پر ان کا دل پگھلتا ہے، نہ کسی رستم رسیدہ انسان سے ہمدردی میں ان کی آنکھوں سے آنسو تک ٹپکتا ہے۔ اقبالؒ نے جو کہا تھا کہ ”نم بہ چشمِ منماں کم دیدہ ام“ تو اس میں انہی جیسے سرمایہ داروں کی طرف اشارہ ہے۔ آج بھی دنیا میں یہودیوں کی سرمایہ داری نے جس طرح جسدِ انسانیت سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا ہے، اس کا کسے علم نہیں۔ غریبوں اور محنت کشوں کا استحصال ان کا شیوہ اور سلب و نہب ان کا شعار ہے۔ یہ سب انکی قسادتِ قلبی کی وجہ سے ہے۔ آیت زیرِ نظر کے آخری الفاظ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۲) نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ اُن کی اس قسادتِ قلبی کا مظاہرہ اُن کی سیرت و کردار کی شکل میں نمودار ہوتا رہتا ہے۔

ضمناً، اس آیت میں ایک لفظ خشیت بھی آیا ہے۔ آیت (۲) میں ”فارہبون“ کی تشریح کرتے

ہوئے وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے کہ خوفِ خدا کا مفہوم کیا ہے۔ اس مادہ خشیت کا مفہوم خشیت کے بنیادی معنی ہونے میں کسی کام کا انجام معلوم ہونے کی وجہ سے اُس سے اندیشہ کرنا اور احتراز برتنا۔ سورۃ طہ میں قرآنِ کریم کے متعلق ہے اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَن يَخْشَى (۲)۔ یہ قرآن اس شخص کے لئے آیہ عبرت ہے جو جانتا ہے کہ ان قوانین کی خلاف ورزی کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اسی کا نام خشیتِ خداوندی ہے۔

(۰)

یہودیوں کی اس ذہنیت کو سامنے لانے کے بعد جماعتِ مومنین سے کہا کہ :-

﴿۲﴾ اَفَتَطْمَعُونَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يَحْرِفُوْنَهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَغْلَمُوْنَ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضورؑ کی وساطت سے جماعتِ مومنین سے کہا کہ ”کیا تم اس کی توقع رکھتے ہو کہ یہ قوم، تمہاری بات مان کر قرآنِ کریم پر ایمان لے آئے گی؟ ایسا سمجھنا تمہاری خوش فہمی ہوگا۔ ان کی حالت یہ ہے کہ عوام تو ایک طرف، ان کے مذہبی پیشوا، خود اپنی کتابوں میں تحریف کرتے رہے، اور اب

بھی ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ تمہاری محفلوں میں شریک ہوتے ہیں۔ اللہ کا کلام (قرآن مجید) سنتے ہیں۔ اُسے اچھی طرح سے سمجھتے اور جانتے ہیں کہ وہ واقعی خدا کا کلام ہے۔ لیکن یہاں سے اٹھتے ہیں تو خدا کی ان آیات کو نہایت مسخ شدہ صورت میں دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جن لوگوں کی بددیانتی اور جراتِ دزدیگی کا یہ عالم ہو، اور وہ دیدہ دانستہ، جانتے بوجھتے ایسا کرتے ہو، اُن سے اس کی توقع رکھنا کہ وہ قرآن کی صداقت کو مخلصانہ طور پر قبول کر لیں گے۔ — این خیال است و محال است و جنوں؟

ضمناً ہم نے ”افتطمعون“ کا ترجمہ توقع کرنا کیا ہے۔ لیکن توقع اور طمع میں بڑا باریک فرق ہے۔ توقع کا تعلق ذہن اور خیال سے ہوتا ہے اور طمع کے معنی ہوتے ہیں وہ خواہش اور آرزو جو دل میں پیدا ہو۔ اس سے واضح ہے کہ نبی اکرمؐ اور جماعتِ مومنین دل سے چاہتے تھے کہ یہ راہِ گم کردہ قوم کسی طرح صحیح راستے پر آجائے تاکہ ان کی ذلت و خواری کی زندگی، خوشگوار یوں اور سرنساز یوں میں بدل جائے۔ ایک طبیبِ مشفق کی طرح جو دل سے چاہتا ہے کہ کسی طرح مریض کا دکھ دور ہو جائے۔ حضورؐ کی شفقتِ قلبی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق خصوصیت سے کہا گیا ہے کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ۔ (۲۶) ”تو تو اس غم سے اپنی جان کھلائے گا کہ لوگ صداقت کو کیوں نہیں مانتے۔“

قرآنِ کریم نے جو یہ کہا ہے کہ یہ لوگ تمہاری محفلوں میں آکر کلام اللہ سنتے ہیں اور باہر جا کر اُسے توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں تو یہ چیز نہ کسی خاص قوم تک محدود ہے، نہ کسی خاص زمانے میں مقید، نہ وہپگنڈے میں ہوتا ہی یہ ہے کہ کسی شخص کی بات کو صحیح شکل میں پیش نہیں کیا جاتا، اسے توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے اور یہ اہلس کا خاص حربہ ہے۔

(۱)

اس کے ساتھ ہی قرآنِ کریم نے ان کے مذہبی پیشواؤں کی ایک اور ذہنیت کو بھی واشگاف کیا ہے جہاں

کہا ہے:-

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بِعُضْمُرٍ إِلَى

بَعْضٍ قَالُوا اتَّخَذُوا لَهُمْ سَبِيلًا لَقَدْ عَلِمْتُمْ لِيُجَاوِبَكُمْ
بِهِ عِنْدَ رَبِّكُمْ - أَفَلَا تَعْقِلُونَ

”جب یہ لوگ تمہاری محفلوں میں آتے ہیں یا تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے ہیں۔ منافقین کی اس روش کا ذکر آیت (۲۴۶) (پہلی جلد ص ۲۰۹) میں آچکا ہے جہاں ان کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ اور جماعتِ مومنین کو دھوکا دینے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ جب یہ لوگ تمہاری محفل سے اٹھ کر اپنے مذہبی پیشواؤں کے پاس جاتے ہیں تو وہ ان سے کہتے ہیں کہ تم نے کہیں مسلمانوں کو اپنی کتابوں کی وہ باتیں تو نہیں بتا دیں جن سے ثابت ہو کہ اُن کا رسول برحق ہے اور اس طرح وہ ان حوالوں کو تمہارے خلاف پیش کر کے تمہیں شکست دے دیں؟ وہ (ان کے سر غنے) ان سے کہتے کہ تم وہاں جاتے ہو تو اپنے حواس برقرار رکھا کرو اور اس کی احتیاط برتنا کر دو کہ تمہاری زبان پر بھولے سے بھی کوئی ایسی بات نہ آنے پائے۔

ان کی منافقت

زمانہ نزولِ قرآن میں، یہودیوں کی مبینہ آسمانی کتابوں کی یہ کیفیت تھی کہ ایک تو وہ عبرانی زبان میں تھیں، جس سے غیر یہودی بالعموم ناواقف تھے۔ اس لئے انہیں معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اُن کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ پھر، ان کے مذہبی پیشوا ان کتابوں کو بالعموم دوسروں سے چھپا کر بھی رکھتے تھے۔ ان کتابوں میں بڑی حد تک تغیر و تبدل ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اُن میں ایسی چیزیں موجود تھیں جو ایک آنے والے رسول کا ذکر کرتی تھیں اور اس کی جو علامات بتاتی تھیں اُن پر حضورِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پورے اُترتے تھے۔ احبار و رہبان، اپنے اُن لوگوں سے، جو مسلمانوں کی محفلوں میں جاتے، تاکیداً کہتے تھے کہ اُن سے کہیں تم یہ نہ کہہ دینا کہ ہماری کتابوں میں ایک آنے والے رسول کا ذکر ہے اور اس کی یہ علامات بتائی گئی ہیں۔ ایسا کرو گے تو وہ خود تمہاری شہادات کو تمہارے خلاف پیش کر کے ثابت کر دیں گے کہ وہ آنے والے رسولِ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم یہی ہیں۔ اس کا تمہارے پاس کوئی جواب نہیں ہو گا۔ اس لئے اس کی بڑی احتیاط برتنا۔

دنیا سے مذاہب میں ہلچلی یہی ہے۔ مذہبی پیشوا اپنی تعلیم کو ”گیت و دیا“ بنا کر رکھتے ہیں تاکہ اس پر ان کی اجارہ داری قائم رہے اور کسی دوسرے کی اس تک رسائی نہ ہو۔ اور تو اور وہ خود اپنے غوام سے بھی حقیقی تعلیم کو چھپا کر رکھتے ہیں۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ خود ہمارے ہاں اس کی کتنی احتیاط برتی جاتی ہے

کہ مسلمانوں کے سامنے قرآنِ خالص نہ آنے پائے۔ کیونکہ اس سے مذہبی پیشوائیت کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے!

(۰)

ان اہل کتاب کے علماء اور مشائخ ایسی احتیاط برتتے تھے۔ لیکن ان کی ان چالوں کی یہ کہہ کر تردید کر دی کہ:-

[۲/۷۷] اَوَلَا يَعْلَمُونَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ۔

ان کی حماقت ملاحظہ فرماؤ کہ یہ اپنی کتابوں کی صحیح تعلیم کو اُس خدا سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں جس نے وہ کتابیں نازل کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسی ازلی علم کی بنا پر سابقہ کتابوں کی حقیقی تعلیم کو قرآنِ کریم کے اندر شامل کر دیا۔ جہاں تک ان کی اس کوشش کا تعلق تھا کہ مسلمان اُن کی کتابوں کو سمجھنے نہ پائیں تو وہ بھی ناکام نہ رہ گئیں (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) ان کی کتابیں عبرانی زبان میں تھیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ سے فرمایا کہ وہ عبرانی زبان سیکھ لیں، تو انہوں نے ہفتہ عشرہ کے اندر اس میں اتنی مہارت پیدا کر لی جس سے وہ یہودیوں کی کتابوں کو سمجھنے کے قابل ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل و بنیاد کی رو سے عربی اور عبرانی زبان ایک ہی ہیں۔ بلکہ عبرانی زبان کی اُم (دماں) بھی عربی زبان ہے۔ اس لئے جس شخص کو عربی زبان پر عبور ہو، اُسے عبرانی زبان کے سمجھنے اور سیکھنے میں زیادہ دشواری لاحق نہیں ہو سکتی۔ غالباً یہی وجہ تھی جو (تاریخ میں ہے کہ) حضرت عمرؓ اسلام قبول کرنے سے پہلے، دوسرے ملکوں میں جاتے تو وقت نکال کر یہودیوں کے اہل علم لوگوں کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ان کی زبان سمجھتے تھے۔ بہر حال، یہودی علماء کی کوششوں کے باوجود ان کی کتابوں کی کوئی بات مسلمانوں سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

ضمناً آیت (پہلے) میں اَتَّحَدُّثُوْنَہُمْ کا لفظ آیا ہے۔ لفظ حدیث کے عام معنی بات کے ہیں۔ اس اعتبار

سے خود قرآنِ کریم کو بھی حدیث کہا گیا ہے، یعنی خدا کی بات۔ سورہ

النسار میں ہے وَمَنْ اٰصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا (پہلے) اللہ

لفظ حدیث کے معنی

سے زیادہ سچی بات کہنے والا کون ہے؟ اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کی ”یہ سچی باتیں“ قرآن مجید ہی کے اندر ہیں۔ اسی بنا پر مخالفین کو جو چیلنج دیا گیا تھا تو ان سے کہا گیا تھا فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖ اِنْ كُنْتُمْ كَاٰتِلٰٓہٗا

صَدِّقَيْنَ۔ (۲۴)۔ اگر یہ اپنے اس دعویٰ میں سچے ہیں کہ قرآن، خدا کا کلام نہیں، انسان کا وضع کردہ ہے تو یہ اس کی مثل کوئی حدیث (بات) لا کر بتائیں۔

اسی مادہ سے حَدَّثَ کے معنی ہوتے ہیں کسی بات کا چرچا کرنا یا اُسے عام کرنا۔ سورۃ الضحیٰ میں ہے۔
وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ (۹۳)۔ اے رسول! تم خدا کی نعمتوں کا عام چرچا کرو! اس لفظ کے یہی معنی آیت (۲۴) میں ہیں۔

واضح رہے کہ یہاں ہم نے لفظ حدیث کے عام معانی سے متعلق گفتگو کی ہے۔ اس کے اصطلاحی مفہوم (احادیث رسول اللہ) سے متعلق اپنے مقام پر گفتگو کی جائے گی۔

(۰)

اوپر سلسلہ کلام یوں چلا آ رہا تھا کہ اہل کتاب کے مذہبی پیشوا، اپنی کتابوں کی تعلیم کو، خود اپنے عوام کی نگاہوں سے بھی پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے اور اُن کے لئے ایسا کرنا چنداں مشکل نہیں تھا۔ کیونکہ ان عوام کی حالت یہ تھی کہ

[۲/۷۸] وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيٍّ وَإِنْهُمْ
إِلَّا يَظُنُّونَ

اس کے عام معنی یہ ہیں کہ یہ عوام امی تھے اور کتاب کے متعلق امانی سے زیادہ کچھ علم نہیں رکھتے تھے۔ یہاں امی اور امانی کے الفاظ تشریح طلب ہیں۔

لفظ امی کا مادہ (ا۔م۔م) ہے اور اس کے بنیادی معنی ”ماں“ کے ہیں۔ اس اعتبار سے کسی بچے کی اصل و بنیاد کو ام کہا جاتا ہے۔ اسی سے لفظ امت ہے جس کے معنی قوم یا جماعت کے ہیں (اس کا تشریحی مفہوم آگے چل کر اپنے مقام پر آئے گا)۔

لفظ امی کے معنی ایسے شخص کے ہیں جو اپنی پیدائشی حالت پر ہو۔ یعنی جس حالت میں اُسے اس کی ماں نے جنا تھا وہ اُسی حالت میں ہو۔ اس سے اس لفظ کے معنی غیر تعلیم یافتہ یا آن پڑھ ہو گئے۔ اہل کتاب اپنے سے غیر عربوں کو امی کہتے تھے اور اس سے مراد بھی ایسی قوم جس کے پاس کوئی آسمانی کتاب موجود نہ ہو۔ چنانچہ وہ عربی اور امی کو مرادف معانی میں استعمال کیا کرتے تھے۔ سورۃ آل عمران میں ہے کہ یہ اہل کتاب کہتے ہیں۔ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّسِّينَ سَبِيلٌ۔ (۲۴)۔ ان عربوں (غیر اہل کتاب)

کے ساتھ ہم جو جی میں آئے کریں، ہم سے اس کا مواخذہ نہیں ہوگا۔ یہاں آئی کا لفظ اہل کتاب کے مقابلے میں آیا ہے اور انہی معانی میں دوسری جگہ ہے۔ وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ دَالًّا مِّنْ دُونِ مَا أُوتُوا لِيُتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي هُوَ أَعْلَمُ بِمَا تُفْعَلُونَ (۱۲) ”اے رسول! تم اہل کتاب سے بھی کہو اور امتیں سے بھی کہ کیا تم اسلام لاتے ہو یا نہیں؟ یہاں قرآن کریم نے امتیں کا لفظ اہل کتاب کے مقابلے میں استعمال کیا ہے۔ اور چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت انہی غیر اہل کتاب عربوں میں ہوئی تھی اس لئے سورۃ الجمعہ میں ہے۔ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيَّاتِ رَسُولًا مِّنْهُمْ (۱۲) ”اللہ وہ ہے جس نے ان امتیوں میں، خود انہی سے ایک رسول مبعوث کیا۔“

عرب، مکہ کو ام القریٰ (۱۲) کہتے تھے۔ اس شہر کی نسبت سے اہل مکہ کو بھی آئی کہا جاتا تھا۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ اصطلاحی اعتبار سے لفظ آئی کے معنی ہیں (۱) اُن پڑھ۔ (۲) اس قوم کا فرد جس کی طرف قرآن سے پہلے کوئی کتاب نہیں آئی تھی یعنی غیر اہل کتاب۔ اور (۳) مکہ کا رہنے والا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو قرآن کریم نے کہا ہے۔ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ (۱۲) ”یہ لوگ (مومنین)، نبی آئی کا اتباع کرتے ہیں“ تو اس میں لفظ آئی کے تینوں معانی لئے جا سکتے ہیں یعنی مکہ کا باشندہ یا اس قوم کا فرد جس کی طرف پہلے کتاب نہیں آئی تھی۔ اور اُن پڑھ۔

جہاں تک حضور کے اُن پڑھ ہونے کا تعلق ہے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ حضور کی یہ کیفیت نبوت سے پہلے کی تھی۔ نبوت ملنے کے بعد حضور کی یہ حالت نہیں رہی

حضور اُن پڑھ نہیں رہے تھے

تھی۔ چنانچہ سورۃ عنکبوت میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی: وَمَا كُنْتُمْ تَشْلُوْنَ مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخْطَوْنَ بَيْمِينِكَ (۲۹) ”اے رسول! تو نبوت ملنے سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھ سکتا تھا، نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتا تھا۔ اس آیت میں مِنْ قَبْلِهِ لے واضح طور پر بتا دیا کہ حضور نبوت سے پہلے بے شک لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، لیکن نبوت کے بعد یہ کیفیت نہیں رہی تھی۔ لہذا یہ سمجھنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام عمر اُن پڑھ رہے تھے، قرآن کریم کی صراحت کے خلاف ہے۔

اب لفظ آئی کی طرف آئیے۔ اس کا مادہ (م۔ ن۔ ی) ہے۔ بنیادی طور پر اس کے دو معنی ہوتے ہیں۔ (۱) خواہشات۔ آرزوئیں، تمنائیں، جذبات۔ اور (۲) کسی کتاب کی تلاوت، یعنی مفہوم سمجھے بغیر اس کا

لفظ امانی کے معنی محض پڑھ لینا۔ رسول کی کتاب کے مندرجات کے لئے یہ لفظ (۲۸) میں آیا ہے۔ اس کی تشریح پہلے بھی گذر چکی ہے۔ اور اس کے بعد اپنے مقام پر بھی آئے گی۔ یہاں اتنی تنبیہ کافی ہے کہ عام تراجم میں جو اس کے معنی تمنائیں یا آرزوئیں کیا جاتے ہیں وہ صحیح نہیں۔ جہاں تک اس کے دوسرے مفہوم (تمنا، آرزو) کا تعلق ہے، سورہ البقرہ میں ہے۔ وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصْرِيًّا - تِلْكَ آمَانِيَهُمْ - (۲۸) یہ لوگ کہتے ہیں کہ جنت میں یہود اور نصاریٰ کے سوا کوئی نہیں جاسکے گا۔ یہ محض ان کی خوش فہمیاں ہیں۔ باطل آرزوئیں ہیں۔ خود پیدا کردہ تمنائیں ہیں۔ دوسری جگہ، ان کے ساتھ مسلمانوں کو بھی شامل کر کے یہ ہیئت مجموعی کہا کہ یادرکھو! لَيْسَ بِأَمَانِيَتِكُمْ وَلَا آمَانِيِ أَهْلِ الْكِتَابِ - (۲۹)۔ "جنت میں داخل نہ تمہاری آرزوؤں اور تمنائوں کے مطابق ہوگا نہ اہل کتاب کی۔ یہ محض تمہاری خوش فہمیاں ہیں" مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يَجْزِيهِ وَلَا يَجِدْ لَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا (۳۰) جو بھی غلط کام کرے گا اس کی سزا پائے گا۔ اور خدا کے سوا اس کا کوئی ایسا حامی اور مددگار نہیں ہوگا، جو اسے اس کی سزا سے بچاسکے۔ اس کے برعکس مَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى - وَهُوَ مُؤْمِنٌ - فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ - وَلَا يُظْلَمُونَ ذَقِيرًا (۳۱)۔ "جو قرآنی معیار کے مطابق اچھے کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ قرآن کی صداقت پر یقین رکھتا ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوسکیں گے اور ان پر ذرہ برابر بھی ظلم و زیادتی نہیں ہوگی"

ان دو الفاظ (امنی اور امانی) کے معانی متعین ہونے کے بعد آیت (۲۸) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی ان مذہبی پیشواؤں کی جو سازش ہے کہ کتاب کی تعلیم کو عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھ جائے وہ اس میں اس لئے کامیاب ہو جاتے ہیں کہ عوام ان پڑھ ہوتے ہیں اور کتاب کے ساتھ محض ان کی عقیدت وابستہ ہوتی ہے۔ وہ اسے ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر گھر میں کسی اونچی جگہ رکھتے ہیں۔ کھولتے ہیں تو اسے چومتے ہیں، آنکھوں سے لگاتے ہیں، اس کی طرف پیٹھ نہیں کرتے۔ اس کی سطروں اور لفظوں پر انگلی پھیر کر سمجھتے ہیں کہ ہمیں ثواب حاصل ہو گیا ہے۔ اس طرح کتاب اللہ، ان کی اس قسم کی فریب انگیز خوش فہمی اور مزین آرزوؤں کا مرجع بننے سے زیادہ کچھ معنی نہیں رکھتی۔ یہاں ان میں ایسے ہوتے ہیں جو محض کتاب

کے الفاظ دہراتے رہتے ہیں، یہ جانے بغیر کہ ان الفاظ کے معانی اور مفہوم کیا ہے، یہ کتاب کو ناظرہ پڑھتے ہیں۔ اس کی محض تلاوت کرتے ہیں، اسے حفظ کر لیتے ہیں، اس سے زیادہ انہیں کتاب کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ جب عوام کی یہ حالت ہو تو ان کے مذہبی پیشوا، انہیں جو کچھ بتا دیں وہ اُسی کو کتاب کی تعلیم سمجھ لیں گے۔

(۱۰)

مذہبی پیشوا، ان کی اس جہالت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور

فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ
هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ
لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا
يَكْسِبُونَ

”یہ مذہبی پیشوا، خود اپنی طرف سے، جو جی میں آئے لکھتے رہتے ہیں اور عوام کے سامنے اسے شریعتِ خداوندی کہہ کر پیش کر دیتے ہیں۔ اس سے مقصد محض روٹی کمانا ہوتا ہے۔“ ارشادِ خداوندی ہے کہ انکے یہ خود وضع کردہ فتاویٰ بھی ان کی تباہی کا موجب ہوتے ہیں۔ اور جو کچھ یہ ان کے ذریعے کماتے ہیں وہ بھی ان کی بربادی کا باعث۔ شریعت سازی اور دینِ فردشی تباہی اور بربادی کا سب سے بڑا سبب ہوتا ہے۔ (ان امور کی تشریح جلد اول میں زیرِ آیت (۲۴، ۲۵) اور زیرِ نظر جلد میں آیات (۲۴، ۲۵) کے تحت کی جا چکی ہے)

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کی تکذیب کرنے والوں کے متعلق کہا (جس سے ظاہر ہے کہ اس سے

خود ہمارے ہاں کے دین فروش علماء مراد ہیں) کہ اَفْبِهَذَا الْحَدِيثِ اَنْتُمْ
دین فروش مَدَّ هِنُونَ۔ وَ تَجْعَلُونَ رِثَاكُمْ اَنْتُمْ تُكْذِبُونَ۔ (۲۵، ۲۶) کیا تم
قرآن جیسی عظیم کتاب سے خود بھی پھسلتے ہو اور دوسروں کو بھی پھسلاتے ہو، اور اس کی تکذیب کرتے
ہو، تا کہ اس طرح تم روٹی کما سکو۔ تم نے تکذیبِ دین کو ذریعہٴ معاش بنا رکھا ہے۔“ حقیقت یہ ہے
کہ جب بھی دین، ذریعہٴ معاش بن جائے تو انسان کو یہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس میں کسی مذہب کی پیشوائیت
کی بھی تخصیص نہیں۔

(۱۱)

پھر ان مذہبی پیشواؤں کی کیفیت یہ ہے کہ یہ خود بھی اس قسم کی خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں، اور دوسرے لوگوں سے بھی کہتے ہیں کہ

﴿۲﴾ وَقَالُوا لَنْ نَمَسَّ النَّارَ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً قُلْ أَتَّخَذْتُمُ عِنْدَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَنْ يَخْلَفَ اللَّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ.

”اول تو ہم لوگ جہنم میں جائیں گے ہی نہیں اور جائیں گے بھی تو صرف چند دنوں کے لئے۔ اس کے بعد ہمارے بزرگ ہمیں وہاں سے نکال کر جنت میں لے جائیں گے۔“ ان کی اس خوش فہمی کی تردید میں کہا کہ ”ان سے پوچھو کہ کیا تم نے خدا سے اس قسم کا کوئی وعدہ لے رکھا ہے؟ اگر ایسا وعدہ لے رکھا ہے، تو پھر تو تمہارا کہنا بالکل بجا اور درست ہے کیونکہ خدا اپنے عہد اور وعدہ کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا۔“

،،

لیکن ایسا ہرگز نہیں۔ تم خدا کے متعلق اس قسم کی باتیں کرتے ہو جن کے لئے تمہارے پاس کوئی سند اور دلیل نہیں۔ جیسا کہ تمہیں بار بار بتایا جا چکا ہے (اور یہ تفصیل آیت (۲۸۲) کے تحت سابقہ صفحات میں سامنے آچکی ہے)، خدا کا غیر متبدل قانون یہ ہے کہ:-

﴿۲۸۱-۲۸۲﴾ بَلَىٰ مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ - وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ.

”جس قوم نے بھی قانون خداوندی کی خلاف ورزی کی اور اس روش کو ایسا عام کیا کہ سارا معاشرہ

خطا کاریوں میں گھر گیا اور ہر طرف فساد ہی فساد رونما ہو گیا۔ تو اس قوم کی کھیتیاں **قانون مکافات** مجلس کر رہ جائیں گی اور وہ لوگ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ ان کا مقام جہنم ہوگا۔ ان کے برعکس، جو قوم خدا کے قانون کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے صلاحیت بخشش پر وگرام پر عمل پیرا ہوگی تو ان لوگوں کو اس دنیا اور آخرت دونوں میں، جنتی زندگی نصیب ہوگی اور ان کی کھیتیاں ہمیشہ لہلہاتی رہیں گی۔“ یہ ہے خدا کا قانون مکافات عمل۔

آیت (۲۸۲) میں ایمان اور جنت کے الفاظ آئے ہیں۔ ان کا مفہوم جلد اول میں زیر آیت (۲۸۱)

صفحہ ۳۳۳۔ اور آیت (۲) صفحہ ۷۸ پر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اصل یہ ہے کہ آیت (۲) میں آیت (۲۵)

عمل اور فعل میں فرق

کو سمٹا کر بیان کیا گیا ہے۔ البتہ لفظ اعمال (واحد۔ عمل) کے مفہوم میں ایک دونکات وضاحت طلب ہیں۔ عمل اور فعل دونوں کے معنی "کام" کے ہیں۔ لیکن (امام راغب نے کہا ہے کہ) "عَمَلٌ ہر وہ کام ہے جو کسی چانداری سے ارادۂ سرزد ہو۔ اس کے برعکس فَعْلٌ کا لفظ حیوانات کی طرف اس وقت بھی منسوب ہو سکتا ہے جب اُن سے کوئی کام بلا قصد سرزد ہو۔ حتیٰ کہ جمادات کی طرف بھی۔ عَمَلٌ کا لفظ ان کی طرف بہت کم منسوب ہوتا ہے۔ صاحب محیط نے تو بعض اہل لغت کا یہ قول بھی نقل ہے کہ عَمَلٌ در حقیقت عِلْمٌ کی مقلوب شکل ہے۔ لہذا عمل کے لئے عِلْمٌ لایفک ہے۔ علاوہ ازیں، علماء لغت کے نزدیک عمل کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کام محض ہنگامی طور پر سرانجام نہ دیا گیا ہو بلکہ وہ عام طور پر (التزاماً) کیا جاتا ہو۔

ان تصریحات کی رو سے عمل اس کام کو کہا جائے گا جو بالارادہ کیا جائے اور التزاماً کیا جائے۔ جو کام محض عادتاً کئے جاتے یا میکانیکی طور پر، ان پر عمل کے لفظ کا اطلاق نہیں ہو سکے گا، نہ ہی ان کاموں پر جو کبھی کبھار کر دیئے جاتے ہیں۔ اس بنا پر آپ خود ہی سمجھ لیجئے کہ قرآن کریم نے جن کاموں کو اعمال کہہ کر پکارا ہے ان سے کس قسم کے کام مراد ہیں۔ یہی ہیں وہ کام جن سے مثبت اور تعمیری نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اور جتنے اعمالی کاموں کا نتیجہ ہے اور اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ "مذہبی اعمال" سے جنت کی عمارت استوار کیوں نہیں ہو سکتی۔ یہ کام رسماً، عادتاً یا تقلیداً سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ اس لئے خود لغت کی رو سے بھی "اعمال" کی شق میں نہیں آتے۔ اور ظاہر ہے کہ جس کام پر "عمل" کے لفظ تک کا اطلاق نہ ہو سکے اس کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے؟

(۰)

دین کے ان اصولوں کی طرف توجہ منقطع کرانے کے بعد داستانِ بنی اسرائیل کی اگلی کڑیاں سامنے لائی گئی ہیں۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآئِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ۔
وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا۔ وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا. وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ. ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ. وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ.

اس آیت میں بنی اسرائیل کو پھر یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ تم سے خدا نے ایک عہد لیا تھا۔ (اس عہد کا اجمالی ذکر (۲۴) میں آچکا ہے) وہاں یہ کہا گیا ہے کہ تم وحی خداوندی کو نہایت محکم طور پر تھامے رہو۔ اب اس اصولی حکم کی جزئیات کا ذکر آتا ہے۔ اصولی حکم تو یہ کہہ کر دہرایا گیا کہ خدا کے سوا کسی کی محکومیت اور عبدیت اختیار مت کرو۔ فرمانبرداری اور اطاعت شکاری اسی کے احکام کی کرو۔ کسی اور کے احکام کی نہیں۔

ان احکام میں سب سے پہلے کہا کہ والدین، رشتہ داروں، یتیمی اور مساکین سے احسان کرو۔ ان میں سب سے پہلے لفظ والدین آتا ہے۔ مادہ (و۔ ل۔ د) کے معنی ہیں طریق تولید کی رو سے افزائش نسل۔ خواہ وہ ابتدائی جرثومہ کی سطح پر ہو یا انتہائی حیوانات کی سطح پر جن میں خود انسان بھی شامل ہے۔

تولید و تخلیق میں فرق | اللہ تعالیٰ کا طریق پیدائش تخلیقی (CREATION) ہے۔ تولیدی (PRO CREATION) نہیں۔ اسی لئے اس نے خود اپنے متعلق کہا۔

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ (۳۱)۔ نہ خدا طریق تولید کی رو سے وجود میں آیا ہے اور نہ ہی وہ اس طریق سے کسی کو وجود میں لاتا ہے۔ عیسائیوں نے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ عقیدہ وضع اور اختیار کیا کہ وہ ابن اللہ۔ خدا کے بیٹے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تردید چار الفاظ میں کر دی کہ بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ اَتَىٰ يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ۔ وَلَمْ تَكُنْ لَهٗ صَاحِبَةً۔ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ۔ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۳۲)۔ اس آیت جلیلہ میں ایک عظیم حقیقت کی پردہ کشائی کی گئی ہے۔ پہلے تین الفاظ میں تو یہ کہا کہ خدا کی قدرت کاملہ کی کیفیت تو یہ ہے کہ وہ اس محیر العقول کارگر کائنات کو عدم سے وجود میں لایا ہے۔ یعنی کسی ساز و سامان، سالہ یا اسباب کے بغیر۔ جو خدا یہ کچھ کر سکتا ہے اس کے لئے یہ کون سی مشکل بات ہے کہ اپنا ایک بیٹا بھی پیدا کر لے۔ لیکن (اس نے کہا کہ) ہم نے تخلیق کائنات کے بعد کچھ قوانین وضع اور نافذ کئے ہیں جن کے مطابق یہاں کا جملہ کاروبار سرانجام پاتا ہے۔ ان میں سے ایک قانون یہ بھی ہے کہ سلسلہ افزائش نسل نہ مادہ کے اختلاط کے بغیر جوہر میں نہیں آئے گا۔ (مثلاً) انسانی بچے کی تولید کے لئے بیوی اور شوہر کے اختلاط کی ضرورت ہے۔

خدا کا بیٹا!

اور اس بات کو تو یہ لوگ (عیسائی بھی) تسلیم کرتے ہیں کہ خدا کی کوئی بیوی نہیں۔ لہذا جب اس کی کوئی بیوی نہیں تو اس کے مقرر کردہ قانونِ تولد کی رو سے اس کے ہاں بیٹا کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے نافذ کردہ قوانین میں خود اپنے لئے بھی استثناء نہیں کرنا چاہتا حالانکہ اگر وہ چاہے تو ایسا کر سکتا ہے۔ لہذا خدا کا عملِ افزائش تخلیقی ہے۔ جہاں تک انسان کا تعلق ہے، حیوانی سطح پر اس کا طریقِ افزائش بھی تولیدی ہے لیکن انسانی سطح پر اس کے عمل میں عملِ تخلیق کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے اور چونکہ صرف حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنا، ایمان نہیں، کفر ہے (۱۱۴) اسی لئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ

ہر کہ اور اوقتِ تخلیق نیست نزدِ ماجز کا فردِ زندگی نیست

(۰)

اب آگے بڑھئے۔ ہمارے ہاں تو والدین سے مراد صرف ماں باپ، اور اولاد سے مراد بیٹے اور بیٹیاں ہوتی ہیں لیکن عربی زبان میں والدین کا سلسلہ ماں باپ سے اوپر تک چلا جاتا ہے یعنی دادا نانی وغیرہ اور اولاد کا سلسلہ بیٹے اور بیٹیوں سے نیچے یعنی پوتا، پوتی، نواسہ، نواسی وغیرہ۔ اس کی اہمیت ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔ جہاں قرآنی قانونِ وراثت کے سلسلے میں بتایا جائے گا۔ یتیم پوتا اپنے دادا کی وراثت سے حصہ پانے کا حقدار ہوتا ہے۔ یہاں قرآنِ کریم کے انہی احکام تک محدود رہنا چاہتے ہیں جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے۔ واضح ہے کہ اس آیت میں کہا تو یہ گیا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل سے یہ عہد لیا تھا۔ لیکن انہی الفاظ میں یہی احکام، متعدد مقامات پر، خود مسلمانوں کو بھی دیئے گئے ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہو (۱۱۴)

پہلا حکم یہ ہے کہ والدین سے احسان کرو۔ لفظ احسان کے معنی آیت (۸۶) کی تشریح کے سلسلے میں چند صفحات پہلے بیان کئے جا چکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی جو کمی واقع ہوگئی ہو، (اس کی اس کی کو دور کرنے کے اس کے توازن کو برقرار کر دینا۔ بڑھاپے کی عمر میں انسان میں کئی لحاظ سے کمی آجاتی ہے۔ اس کی جسمانی قوتوں میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے اور کئی اور طبعی صلاحیتوں میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس طرح اس کا طبعی توازن بگڑ جاتا ہے۔ غالب کے الفاظ میں یہ

ہو گئے مضمحل قوی غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں

اسی حقیقت کو قرآنِ کریم نے ایک مقام پر ان الفاظ میں واضح کیا ہے کہ وَ مَنْ تَغَيَّرَ مُنْكَهٖ فِي الْخَلْقِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔ (۱۱۴) کیا تم اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ کبر سن کی وجہ سے انسان کے جسمانی

ڈھانچے اور اس کی طبعی قوتوں اور صلاحیتوں میں کسی قدر کمی واقع ہو جاتی ہے، وہ کس قدر نگوں سار ہو

جاتا ہے؛ دوسری جگہ کہا۔ **وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّؤَدُّ إِلَىٰ آذِلَّةِ الْعُقُورِ** [یعنی لَا يَعْلَمُ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا۔ (۱۱)]، تم میں بعض لوگوں میں جن

کی عمر لمبی ہوتی ہے، سمجھنے کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ علم میں اضافہ تو ایک طرف، ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ جو کچھ پہلے یاد تھا وہ بھی بھول جاتا ہے؛ ان مقامات سے واضح ہے کہ بڑھاپے میں عام طور پر انسان میں اپنی ضروریات آپ پوری کرنے کی قوت بھی نہیں رہتی اور اس کی بعض صلاحیتوں میں بھی بڑی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے اولاد کو یہ حکم دیا کہ تم ان کی اس کمی کو پورا کرو۔ ان کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے علاوہ ان کی دل جوئی بھی کرتے رہو۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، بڑھاپے میں انسان بچوں کی سی باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔ بچوں کی باتوں میں نہ منطقی ربط ہوتا ہے، نہ ترتیب و تسلسل۔ اس کے باوجود تم ان کی باتوں سے زچ نہیں پڑ جاتے بلکہ ان سے لطف اندوز ہوتے ہو۔ لیکن جب یہی کیفیت بوڑھے والدین کی ہو جاتی ہے تو اس سے تم زچ پڑ جاتے اور انہیں ڈانٹنے لگ جاتے ہو۔ دیکھئے قرآن کریم میں کیسے بلیغ انداز میں اس حقیقت کی طشیر توجہ دلائی ہے جہاں کہا ہے:-

وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ. وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا. إِمَّا يَبُلُغَنَّ
عِنْدَكَ الْكَبَرُ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أِفْ. وَلَا تَنْهَرْهُمَا
وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا. وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذَّلِيلِ مِنَ الرَّحْمَةِ. وَ
قُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيْنِي صَغِيرًا. (۲۴-۲۵)

”تیرے رب نے یہ حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی اطاعت نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان سے پیش آؤ۔ اگر ان میں سے کوئی ایک یا دونوں عمر رسیدہ ہو جائیں تو انہیں ڈانٹ ڈپٹ مت کرو۔ ان سے نہایت نرمی سے اس انداز سے بات کرو جس سے ان کی عزت نفس مجروح نہ ہونے پائے۔ اپنا شفقت کا ہاتھ ان کے سر پر رکھو اور خدا سے یہ دعا مانگو کہ وہ تمہیں اس کی توفیق عطا فرمائے کہ جس حسن لطافت سے انہوں نے تمہاری بچپن میں نشوونما کی تھی، تم بھی اسی طرح ان کی نشوونما اور رفاقت کا سامان بہم پہنچاؤ۔“

اس حکم میں دو ایک اور اہم نکات بھی پوشیدہ ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ انسان اپنے طبعی تقاضوں کو

حیوانات کی طرح جبلی طور پر پورا کرتا ہے۔ مثلاً بھوک لگنے پر کھانا کھانا، پیاس کے لئے پانی پینا، افزائش نسل کے لئے جنسی اختلاط۔ ان امور کے لئے انسان کو وحی کی رو سے تاکید کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ ہدایت تو اس کی جبلت میں رکھ دی گئی تھی۔ البتہ انہی امور میں اس کی انسانی سطح پر جن پابندیوں کی ضرورت تھی ان کی راہ نمائی وحی کی رو سے کر دی گئی۔ مثلاً کھانے پینے میں حلال و حرام کی تمیز، جنسی اختلاط کے لئے ازدواجی زندگی سے متعلق حدود و قیود۔ حیوانی سطح پر ان حدود و قیود کی ضرورت نہیں تھی۔ انکا ملحوظ رکھنا خاصہ انسانیت ہے۔ اس اصول کی روشنی میں اس حقیقت پر نگاہ ڈالئے کہ اپنے بچوں کی پرورش ہر حیوان جبلی تقاضے کی رُسرے کرتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے بھی انسان کو کہیں یہ تاکید نہیں کی کہ تم اپنے بچوں کی پرورش کیا کرو۔ لیکن ماں باپ سے حسن سلوک حیوانی جبلت کا تقاضا نہیں تھا۔ اس کے لئے وحی کی رو سے انسان کو تاکید کی گئی۔ اور یہ تاکید والدین تک ہی محدود نہ رکھی گئی بلکہ اس کا سلسلہ آگے بھی بڑھایا گیا۔

اگرچہ بعض بلند سطح کے حیوانات میں نر اور مادہ کی رفاقتی زندگی کا نقشہ سامنے آتا ہے، لیکن عائلی زندگی (فیملی لائف) کا تصور ان کے ہاں نہیں ملتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ جس عمر تک بچے کو ماں باپ کی طرف سے پرورش اور حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے اس حد تک تو ان میں ”عائلی زندگی“ کا نقشہ نظر آتا ہے۔ لیکن جب بچہ اس عمر سے آگے بڑھ جاتا ہے تو عائلی زندگی کے روابط تو ایک طرف، نہ بچہ ماں باپ کو پہچانتا ہے نہ ماں باپ بچے کو جانتے ہیں۔ ان میں کیسے بیگانگی اور علیحدگی ہوتی ہے۔ اگر یہی کیفیت انسان کی تمدنی زندگی میں بھی پیدا ہو جائے تو یہ حیوانی سطح کی زندگی ہوگی انسانی سطح کی نہیں۔ یورپ نے عائلی زندگی کو بالعموم حیوانی سطح تک برقرار رکھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ذرا بڑا ہونے پر نہ ماں باپ کو اولاد سے کوئی تعلق رہتا ہے، نہ اولاد کو ماں باپ سے کوئی واسطہ۔ اور ان کے ہاں بوڑھے ماں باپ، جس تنہائی اور بے کسی کی زندگی بسر کرتے ہیں، وہ عبرت و موعظت کی زندہ شہادت ہوتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہاں کی بعض حکومتیں ان در ماندہ، واما ندہ اور دھتکائے ہوتے انسانوں کے لئے روٹی، کپڑے اور رہائش کا انتظام کر دیتی ہیں، لیکن صرف روٹی، کپڑا تو انسانی زندگی کا سہارا نہیں ہوتے، انسانی جذبات، رفاقت، شفقت، عطف اور محبت کے بھی مترقاضی ہوتے ہیں۔ ان کے پورا کرنے کا وہاں کوئی انتظام نہیں ہوتا یہ

توصیف (FAMILY UNIT) بھی میں پورے ہو سکتے ہیں۔ بچوں کی صحیح تربیت بھی گھر کے ماحول میں ہو سکتی ہے اور بڑھاپے کی یا س انگیز تنہائیوں کا مدد ابھی یہیں ممکن ہے۔ گھر میں بچے ہوتے ہیں تو وہ بوڑھے دادا، دادی کے دوست اور بھولی بن جاتے ہیں کیونکہ ان میں بھی تو بچپنا اچکا ہوتا ہے۔ یہ، اور اس قسم کے دیگر مصالح ہیں، جن کی بنا پر اسلامی معاشرے میں خاندانی وحدت برقرار رکھنے کی تلقین و تاکید ہے۔

اب ایک قدم آگے بڑھیے اور ستران کریم کی ایک اور حقیقت نگہی پر غور کیجئے۔ دنیا کے ہر مذہب میں، بلکہ ان کے ہاں بھی جو کسی متعین مذہب کے پابند نہیں، اس بات کو ایک مسئلہ کی سی پوزیشن حاصل ہو چکی ہے کہ ”ماں باپ کی اطاعت فرض ہے“ اسے ایک ایسی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے جس پر کسی قسم کے غور و فکر کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ بعض مذاہب

ماں باپ کی اطاعت

میں تو اس کے متعلق ایسی شدت اختیار کی جاتی ہے کہ ماں باپ کی پوجا تک کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جو اس فریضہ کی جس حد تک ادائیگی کرتا ہے اس کا مقام اسی قدر بلند سمجھا جاتا ہے۔ اس کی مثال ہندو دھرم اور ان کی تاریخ میں ملتی ہے۔ مہاراجہ رام چندر نے اپنے باپ (مہاراجہ دسرتھ) کے حکم کے سامنے سر جھکاتے ہوئے راج پاٹ تیاگ کر بن باس اختیار کر لیا حالانکہ وہ حکم علم و دلیل پر مبنی نہیں تھا بلکہ خالصتہً جذباتی تھا۔ باپ ہمارے نوجوان رام چندر کی اس فرمانبرداری سے اس کا مقام اتنا بلند تصور کیا گیا کہ اسے ایشور کا اوتار قرار دے کر اس کی پرستش شروع ہو گئی۔ ہندو دھرم اور معاشرت میں ان کا آج تک یہی مقام چلا آ رہا ہے۔ ان کے ہاں، ہوی کا خاوند کی پوجا کرنا اور اولاد کا ماں باپ کی پرستش کرنا، عظیم ترین نیکی کے کام ہیں۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اس چیز کو دنیا کے ہر مذہب اور ہر قوم میں ایک مسئلہ کے طور پر مانا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے اس مسئلہ کو ٹوٹا اور اس کی بجائے ایسی راہ اختیار کی جو مبنی بر حقیقت و صداقت ہے اس نے ماں باپ کی اطاعت کو کہیں فرض قرار نہیں دیا بلکہ کہا یہ کہ ان کے ساتھ احسان کرو۔ بات بڑی واضح ہے۔ جہاں تک بچپن کی عمر کا تعلق ہے، بچے کو یقیناً ماں باپ کی ہدایت پر چلنا چاہیے کیونکہ اس میں ابھی نہ خود اپنے نفع و نقصان میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی ہوتی ہے نہ ہی اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ لیکن جب بچہ جوان ہو جائے دسین رشد تک پہنچ جائے، تو اسے ان انسانوں کی اطاعت کا حکم

دینا، جن کے متعلق خود قرآن یہ کہتا ہے (اور ہماری روزمرہ کی زندگی اس کی شہادت دیتی ہے) کہ وہ ارذل العمر کے درجے میں پہنچ چکے ہوتے ہیں، اس کی زندگی کی گاڑی کو بہت پیچھے دھکیل دینے کے مرادف ہوگا۔ زمانے کے تقاضے بڑی تیزی سے بدلتے رہتے ہیں اور بڑھاپے میں انسان ان نئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ لہذا وہ معاملاتِ حاضرہ کے فیصلے اپنے سابقہ دور کے تقاضوں کے مطابق ہی کر سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ فیصلے ان نئے تقاضوں میں (FIT-IN) نہیں ہو سکتے۔ ایک نوجوان کو اس قسم کے فیصلوں کی اطاعت پر مجبور کرنا۔ اور وہ بھی یہ کہہ کر یہ خدا کا حکم ہے۔ اُس کے دل میں جس قسم کی نفسیاتی کشمکش پیدا کر دیگا، اور اُس کے جو پریشان کن، اور بعض حالات میں، فساد انگیز نتائج پیدا ہوں گے، ان کا مشاہدہ ہم آئے دن کرتے رہتے ہیں۔ اس قسم کے حالات ان نوجوانوں کی زندگی میں زیادہ ردِ نما ہوتے ہیں جو ماں باپ کے ہر حکم کو ارشادِ خداوندی کی طرح واجبِ تعمیل تصور کرتے ہیں۔ اس سے بالخصوص، ان کی ازدواجی زندگی جس قدر تلخ ہو جاتی ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ قرآن کریم نے جس مسئلہ کو محض جذباتی قرار دے کر اس کی جگہ ایک حقیقت پسندانہ حکم دیا تھا، ہم نے اُسی مسئلہ کو اپنے ہاں مذہبی فریضہ قرار دیدیا۔ اور اس کے نتائج بھگت رہے ہیں۔

اسوۃ ابراہیمی | ہندو دھرم نے "رام" کی زندگی کو قابلِ تقلید نمونہ قرار دیا تھا۔ لیکن قرآن کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کو اسوۃ حسنہ قرار دیا (۱۹)، اور ان کی اس زندگی کا ابتدائی تعارف ہی یہ کہہ کر کیا کہ "يَا بَتِّ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا" (۱۹) "اے میرے باپ! تم ان بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہو جن کی کیفیت یہ ہے کہ وہ نہ کچھ سن سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے۔ نہ کسی معاملے میں تمہاری کوئی مدد کر سکتے ہیں۔" "يَا بَتِّ اِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْ اِهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا" (۱۹) "اے میرے باپ! مجھے حقائق کا وہ علم دیا گیا ہے جس سے تم محروم ہو۔ لہذا تم میرا اتباع کرو۔ میں تمہیں سیدھے راستے کی طرف لے جاؤں گا" ساری دنیا میں مسئلہ یہ تھا کہ بیٹے کو ماں باپ کا اتباع کرنا چاہیے۔ یہاں بیٹا باپ سے کہہ رہا ہے کہ تم میرا اتباع کرو۔ سوال باپ اور بیٹے کے رشتے کا نہیں، فیصلہ کن امر تو یہ ہے کہ علم و حقیقت کے راستے پر کون ہے۔ اسوۃ ابراہیمی کا یہی اتباع تھا جس کے لئے خصوصیت سے کہا کہ ماں باپ سے حسنِ سلوک ضرور کرو لیکن اگر وہ تمہیں خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنے کے لئے کہیں، تو ان

کا کہنا قطعاً نہ مانو۔ (۲۹ : ۳۱)۔ دینِ خداوندی میں اتباع نہ باپ کا ہے نہ بیٹے کا۔ اتباع حق و صداقت کا ہے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ انسانی تاریخ میں یہ روش نہیں رہی کہ آنے والی نسل نے ہر حال میں جانے والی نسل کا اتباع کیا ہو۔ اگر یہ صورت رستی تو انسان آج بھی، ابتدائی زمانے کے انسانوں کی طرح غاروں میں زندگی بسر کرتا کیونکہ اسلاف کے اتباعِ مسلسل کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ اس قسم کا اتباع حیوانات میں ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کی بکری بھی ویسی ہے جیسی سب سے پہلے نطنے کی بکری تھی۔ اقبال کے الفاظ میں:-

چہ خوش بودے اگر مرد نکو تے زبتِ پاستاں آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوہ خوب پیمبر ہم رہ احب داد رفتے (پامِ مشرق)

(۰)

والدین کے بعد قرآنِ کریم نے ذی القربیٰ کے ساتھ احسان کا حکم دیا ہے۔ قرنیٰ کا مادہ (ق۔ رب) ہے جس کے معنی قریب ہونے کے ہیں۔ عام طور پر اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ والدین کے بعد جو بھی زیادہ شریبی ہوں، ان سے بھی حسنِ سلوک سے پیش آؤ لیکن ذی القربیٰ کی اصطلاح عام طور پر رشتہ داروں کے لئے آتی ہے۔ واضح رہے کہ قرنیٰ کے معنی رشتہ دار نہیں، رشتہ داری ہیں۔ جب اس کے ساتھ (ذویا ذی) آئیں گے تو اس کے معنی رشتہ داروں کے ہوں گے۔ اس فرق کی اہمیت آگے چل کر سامنے آئے گی جہاں مودت فی القربیٰ (۲۴) کی تشریح کی جائے گی۔ بہر حال، ذی القربیٰ کے ساتھ حسنِ سلوک کے حکم نے خوش معاہدگی اور تعاون کے لئے، تمدنی زندگی میں اور وسعت پیدا کر دی۔ اس کے بعد کہا کہ بیتا آئیے بھی حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ یتیم کے بنیادی معنی ایسے شخص کے ہیں

جو تنہا رہ جائے۔ اصطلاحی طور پر یہ لفظ ان لوگوں کیلئے بولا جاتا ہے جن کے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں۔ اور وہ اس طرح تنہا رہ

جائیں۔ لیکن عربوں کے ہاں اس کا یہ محدود مفہوم نہیں تھا۔ وہ ان جوان لڑکیوں کو جنہیں خاوند نہ ملیں یا بیوہ عورتوں کو بھی اس میں شامل کرتے تھے۔ اس مفہوم کی اہمیت آگے چل کر سامنے آئے گی جہاں تعدادِ ازدواج کا ذکر آئے گا۔ یتیم کے معانی کی وسعت کے اعتبار سے اس کے اندر ہر وہ شخص آجائے گا جو معاشرے میں تنہا رہ جائے اپنے آپ کو تنہا محسوس کرے۔ غور سے دیکھتے کہ غیرِ سترا فی معاشرے میں ہر شخص

اپنے آپ کو یتیم (تنہا) محسوس کرتا ہے۔ ہم تو ایک طرف رہے، ہمارے ذہن میں یورپ اور امریکہ کی معاشرتی زندگی کا کچھ ایسا تصور ہے کہ وہاں کوئی شخص بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرتا ہوگا۔ لیکن وہاں کی "ییتی" کا اندازہ اس سے لگائیے کہ کچھ عرصہ ہوا امریکہ سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس نے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ اس میں اہل امریکہ کی معاشرتی زندگی کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔ اس کتاب کا نام تھا

(THE LONELY CROWD) یہ عنوان خود وہاں کے "یتیم" معاشرے کا غماز ہے۔ افراد کی یہ ییتی صرف نصب العین کی وحدت اور قلب و نگاہ کی ہم آہنگی سے دور ہو سکتی ہے۔ ایسے معاشرہ میں قرآن کے الفاظ میں "انفراد کے دل ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں" (۲۱)۔ اور جب معاشرہ کی یہ کیفیت ہو جائے تو پھر اس میں کوئی فرد اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرتا۔ ہر حال، قرآن کریم نے جو یہ حکم دیا تھا کہ یتامی کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آؤ تو اس سے اس کا بھی مطلب نہیں تھا کہ ان کی طبعی ضروریات ہی کو پورا کرو۔ بلکہ یہ مطلب بھی تھا کہ ان کے ساتھ ایسا رابطہ رکھو کہ انہیں محسوس ہی نہ ہونے پڑے کہ وہ تنہا ہیں۔ دیتائی کے متعلق دیگر احکام اپنے مقام پر آئیں گے

اس سے آگے ہے کہ مساکین کے ساتھ بھی احسان کرو۔ اور ان کی کمی کو پورا کرو۔ اس لفظ کا مادہ — (س. ک. ن) ہے۔ جس کے معنی ہیں حرکت کا بند ہو جانا۔ کسی کا ایک مقام پر رک کر رہ جانا۔ چلنے کی سکت ذرہ نہا۔ عام طور پر اس سے یہ مفہوم لیا جائے گا کہ جن لوگوں کا کسی وجہ سے چلتا ہوا کاروبار رک جائے ان کی اس کمی کو پورا کر دو تاکہ ان کی کاروباری مشینری پھر سے حرکت میں آجائے۔ یہ مساکین کے مفہوم کا ایک گوشہ ہے۔ اس اصول کو مد نظر رکھنے سے اسی قسم کے کئی اور گوشے بھی سامنے آسکتے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ ان مقامات پر قرآن کریم رشتہ داری کے تعلق سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ ان شقوں میں ہر ضرورت مند انسان شامل ہے۔ حتیٰ کہ بعض آیات میں، ان میں "ابن السبیل" کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ یعنی کوئی اجنبی مسافر جو مہتابے ملک میں سے گزر رہا ہو، اگر اس کو بھی کوئی ضرورت پیش آگئی ہے تو تم، اُسے بھی پورا کرو۔ ان احکام میں اپنے اور بیگانے کی کوئی تمیز و تخصیص نہیں۔ یہ بات آیت کے اگلے الفاظ سے واضح ہو جاتی ہے جہاں کہا ہے کہ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا۔ (۲۴)۔ اس کا عام ترجمہ تو یہ ہوگا کہ لوگوں سے اچھی باتیں کیا کرو۔ لیکن حُسْن کا جو مفہوم پہلے بیان کیا چکا ہے اور لفظ "قَوْل" کی جو تشریح پہلے ہو چکی ہے (ملاحظہ ہو ۲۵)، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے

کہ اس سے مراد اچھی اچھی باتیں کرنا ہی نہیں بلکہ دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملات اور روابط میں توازن برقرار رکھنے کی اہمیت بھی شامل ہے۔ ایک حسین اور متوازن معاشرہ میں، ہر بات، ہر عمل، ہر حرکت، ہر اقدام حسن کا رازہ انداز لئے ہوتا ہے!

اس کے بعد اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا حکم ہے جس کی جامعیت کے متعلق اس سے پہلے (جلد اول اور اسی جلد کے سابقہ ابواب میں) وضاحت سے گفتگو کی جا چکی ہے۔ یہاں اتنا اضافہ ضروری ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا حکم امتِ محمدیہ ہی کو نہیں دیا گیا۔ یہ تو دین کی اساس ہے۔ اور چونکہ دین، شروع سے آخر تک اصولی طور پر ایک ہی چلا آ رہا تھا اس لئے ہر رسول کی امت کو یہ حکم دیا گیا تھا۔ یہاں بنی اسرائیل مخاطب ہیں۔ آگے چل کر دیگر اقوام کا ذکر بھی آئیگا۔

بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ تم نے عہد کیا تھا کہ ان احکام کی تعمیل کرو گے۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد تم (باستثنائے چند) اس قول و قرار سے پھر گئے۔ اتنی بات، ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ کے الفاظ سے پوری ہو جاتی تھی لیکن اس کے بعد وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ (یہ) سے ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا تھا کہ یہ کسی عہدِ گزشتہ کے ہنگامی واقعہ کا ذکر ہے کسی زمانے میں، یہودیوں کی اُس وقت کی نسل کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہوگا۔ لیکن وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ سے اس امر کی وضاحت کر دی کہ تم ہو ہی ایسے۔ تمہاری ہمیشہ یہ روش رہی کہ ایک بات کا عہد کر کے اُس سے پھر گئے۔ تمہاری یہ روش عارضی یا ہنگامی نہیں تھی۔ تمہاری ساری تاریخ اس پر شاہ ہے کہ تم کرتے ہی یہی کچھ رہے ہو۔ تمہاری ذہنیت ہی ایسی ہو چکی ہے۔ قول و قرار کے بعد اس سے پھر جانا، تمہاری عادتِ مستمرہ اور فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ تم نے پہلے بھی یہی کچھ کیا تھا اور آج بھی یہی کچھ کر رہے ہو۔ اس سے عہدِ نزولِ قرآن کی اولین جماعتِ مومنین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ یہودیوں کے قول و قرار اور معاہدات پر یونہی اعتماد نہ کر لینا۔ یہ اُن سے پھر جایا کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ قرآنِ کریم کے دیگر مقامات سے واضح ہے، انہوں نے ایسا ہی کیا۔

(۱۰)

اس کے بعد بنی اسرائیل کے اسی عہد و میثاق کی ایک اور شق سامنے آتی ہے اور وہ ایک عظیم

حقیقت درکنا رہے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا
تَخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَ
أَنْتُمْ تَشْهَدُونَ

سابقہ آیات میں کئی ایک مقامات پر نبی اسرائیل سے کہا گیا ہے کہ خدا نے تم سے یہ عہد بھی لیا تھا۔ وہ عہد بھی۔ تم نے اس بات کا اقرار و پیمان بھی کیا تھا، اُس بات کا بھی۔ لیکن تم اپنے ہر عہد سے پھر گئے۔ ہر پیمان و اقرار سے روگردانی کی۔ اسی سلسلے میں زیرِ نظر آیت میں کہا گیا ہے کہ تم سے دو اور باتوں کے عہد بھی لئے گئے تھے۔ ایک یہ کہ تم باہمی خونریزی نہ کرو گے۔ اور دوسرے یہ کہ اپنے لوگوں کو ان کے گھروں سے نہیں نکالو گے۔ تم نے اس کا اقرار بھی کیا تھا اور تمہارے مذہبی صحیفوں میں، ایسا کچھ لکھا بھی ملے گا، اس لئے تم آج بھی اس کے گواہ ہو کہ تم سے یہ عہد لیا گیا تھا اور تم نے اس کا اقرار بھی کیا تھا۔

(۰)

لیکن

ثُمَّ أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ. وَتَخْرِجُونَ فَرِيقًا مِنْكُمْ
مِنْ دِيَارِهِمْ. تَظْهَرُونَ عَلَيْهِم بِالْإِثْمِ وَالْعُدَاوَانِ. وَإِنْ
يَأْتُوَكُمْ أَسْرَى تَفْدُوهُمْ. وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ.
أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ. فَمَا جَزَاءُ
مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ
يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ. وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُونَ

تم نے ان ہر دو احکام کی خلاف ورزی کی۔ تم نے باہمی خونریزی بھی کی اور اپنے لوگوں کو ان کے گھروں سے بھی نکالا۔ یہاں باہمی خونریزی کی بجائے قتل کا لفظ آیا ہے۔ جیسا کہ آیت (۲/۸۶) کی تشریح میں بتایا جا چکا ہے، قتل کے معنی سچے قتل کر دینا بھی ہیں اور کسی کو پست و ذلیل کر دینا اور غیر موثر بنا دینا بھی۔ آیت (۲/۸۶) میں چونکہ خوں ریزی کا ذکر ہے اس لئے یہاں قتل کے لئے خوں ریزی بھی ہو سکتے ہیں لیکن جو کچھ اگلی آیت میں کہا گیا ہے اس کی رو سے غور کیا جائے تو اس کے معنی پست اور ذلیل کر دینا، کمزور

اور ناتوان بنا دینا بھی ہو سکتے ہیں۔

جیسا کہ ہم کئی مقامات پر لکھ چکے ہیں، قرآن کریم میں اہم سابقہ کی یہ داستانیں اس لئے بیان کی گئی ہیں کہ ان میں جو اصول پوشیدہ ہیں وہ آنے والوں کے لئے بھی راہ نمائی کا موجب بنیں۔ اس آیت میں ایک ایسا اہم اصول بیان کیا گیا ہے جو باطل کے نظام کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے اس لئے یہ انتہائی غور و فکر کا متقاضی ہے۔ قرآن کریم نے یہودیوں سے کہا یہ ہے کہ تم کرتے یہ بھتے کہ خود اپنی قوم کے ایک طبقے کو مغس اور غریب، کمزور اور ناتواں بنا کر انہیں ان کے گھروں تک سے نکال باہر کرتے تھے۔ ان بے گھر، بے در، خانماں خراب، ضعیف و

ایک عجیب فریب نفس

ناتواں لوگوں کو ادھر ادھر کے طاقتور قبائل قید کر لیتے تھے۔ اُس کے بعد ہتھارے مذہبی پیشوا اس قسم کا وعظ کہتے تھے کہ قیدیوں کو قید سے چھڑانا بڑے ثواب کا کام ہے۔ چنانچہ تم یہ ثواب کمانے کے لئے باہمی چندے اکٹھے کرتے اور ان قیدیوں کا فدیہ ادا کر کے انہیں قید سے چھڑا لیتے۔ ان سے کہا گیا کہ ایسا کرنے سے تم اپنے آپ کو کتنے بڑے فریب میں مبتلا رکھتے ہو۔ قیدیوں کو قید سے آزاد کرانے کا ثواب تو کماتے پھرتے ہو۔ لیکن اتنا کبھی نہیں سوچتے کہ ان لوگوں کو اس حالت تک پہنچا دینا، جس میں دوسرے لوگ انہیں اچک کر لیجا لیں، کتنا بڑا سنگین جرم ہے۔ تم ایسے سنگین جرم کا ارتکاب کرتے وقت تو ذرا متامل نہیں ہوتے۔ اس سے ہمارے دل میں نہایت سی کھٹک بھی پیدا نہیں ہوتی۔ تم ان لوگوں کو بے دھڑک اس حالت تک پہنچا دیتے ہو اور اس کے بعد انہیں قید سے چھڑانے کی ”نیکیاں“ کماتے پھرتے ہو۔

اس سے یہ اہم اصول ہمارے سامنے آتا ہے کہ کسی کو ایسی حالت تک پہنچا دینا جس میں وہ خود تمہاری یاد دہندوں کی مدد کا محتاج ہو جائے، نظامِ خداوندی میں جرمِ عظیم ہے۔ اور پھر اس کی مدد کر کے اپنے آپ کو اطمینان دلا لینا اور خوش ہو جانا کہ ہم نے اتنا بڑا ثواب کا کام کیا ہے، فریبِ نفس سے زیادہ کچھ نہیں۔ آئیے ہم دیکھیں کہ اس قرآنی صداقت میں ہمارے لئے ہی نہیں، ساری دنیا کے لئے کتنا بڑا اصول پوشیدہ ہے۔

آج ساری دنیا کی آبادی بنیادی طور پر، دو طبقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک طبقہ دولت مندوں کا، دوسرا طبقہ مفلسوں اور غریبوں کا۔ اس کے بعد ساری دنیا اس غم میں گھلی جا رہی اور اس

”جہادِ عظیم“ میں مصروف نظر آتی ہے کہ ان غریبوں اور مفلسوں کی مدد کس طرح کی جائے۔

باطل کا اقتصادی نظام اور مذہب

لیکن اس بنیادی سوال پر کوئی غور نہیں کرتا کہ امیروں اور غریبوں کے یہ دو متضاد طبقات وجود میں کس طرح آتے ہیں؟ پیدائش کی رو سے کوئی انسانی بچہ نہ غریب ہوتا ہے نہ امیر۔ آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہو گا کہ کوئی بچہ پیدائش کے وقت ہیرے اور جواہرات کے ہار اپنے گلے میں، اور جائیروں، ملوں و فیکٹریوں کی ملکیت کی دستاویزات ہاتھ میں لے کر پیدا ہوتا ہو۔ اور دوسرا بچہ خالی ہاتھ دنیا میں آتا ہو۔ سب بچے دنیا میں یکساں طور پر خالی ہاتھ آتے ہیں، اور اس کے بعد ہم خود ان میں سے بعض بچوں کو دولت مند بنادیتے ہیں اور بعض کو غریب۔ طبقہٴ امار کے بچوں کو دولت، جائیدادیں اور جاگیریں میراث میں مل جاتی ہیں اور غریب ماں باپ کے گھر پیدا ہونے والے بچے ان کے خدمت گزار اور محنت کش بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہزاروں ایکڑ زمین کے رقبہ کا مالک (بچہ یعنی زمیندار) کچھ کام نہیں کرتا۔ اس کے برعکس اس کے مزارعے سال بھر خون پسینہ ایک کر کے اناج پیدا کرتے ہیں اور اُس میں سے انہیں اتنا بھی نہیں ملتا کہ ان کی اور ان کے بچوں کی طبعی ضروریات زندگی بھی پوری ہو سکیں۔ جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں وہ امیر، امیر تر بنتا چلا جاتا ہے اور یہ غریب، غریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ دیہات سے نکل کر شہر کی طرف آ جلیے۔ یہاں ملوں اور فیکٹریوں میں محنت کش اور ملازم کام پر لگائے جاتے ہیں۔ ان فیکٹریوں کے مالک ان مزدوروں کی اجرت (WAGES) مقرر کرتے ہیں۔ (WAGES) کس طرح سے مقرر ہوتی ہیں، یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ (غالباً) حکمائے یونان میں سے کسی کا قول ہے کہ تاریخِ انسانیت میں سے وہ دن سیاہ ترین تھا جب کسی غلام نے اپنے آقا کو اتنا کم کر دیا جو اس سے زیادہ تھا جتنا وہ آقا اس غلام پر خرچ کرتا تھا۔ اس دور کی بے نقاب غلامی ہو یا عصرِ حاضر کی نقاب پوش غلامی (جسے مزدوری یا محنت کشی کہا جاتا ہے) ہر آقا، اپنے مزدور کو اس سے کم دے گا جتنا وہ مزدور کم کر دیتا ہے۔ (مثلاً) کسی مزدور سے یہ طے پاتا ہے کہ وہ آٹھ گھنٹے روزانہ کام کرے گا۔ اور اسے دس روپیہ یومیہ اجرت ملے گی۔ وہ مزدور چار گھنٹے میں اتنا کام کر دیتا ہے جس سے مالک کو دس روپے مل جائیں۔ اس کے بعد وہ بقایا چار گھنٹوں میں جس قدر محنت کرتا ہے اسے اس کا کچھ معاوضہ نہیں ملتا۔ وہ سارے کام کا کارخانے کے مالک کے پاس چلا جاتا ہے۔ کارخانہ دار اس پر نو

نگار رکھتا ہے کہ وہ مزدور ایک منٹ کے لئے بھی بیکار نہ بیٹھے لیکن اس سے اسے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ جو اجرت اس مزدور کو دی جاتی ہے اس سے اس کی اور اس کے اہل و عیال کی ضروریات زندگی بھی پوری ہوتی ہیں یا نہیں۔ اس سے محنت کشوں کے طبقہ کو آہستہ آہستہ ایسے مقام پر پہنچا دیا جاتا ہے جہاں ان پر ناقوں تک کی فوبت آ جاتی ہے۔ ایسے میں مذہب آگے بڑھتا ہے اور ان دولت مندوں سے کہتا ہے کہ ان غریبوں کی مدد کرنا تم پر فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صدقات، خیرات، زکوٰۃ اور دیگر بہبود کے کاموں کے لئے سخت تاکید و احکام نازل کئے ہیں۔ ایسا کرنا بڑے ثواب کا کام ہے۔ چنانچہ دولت مندوں کا یہ طبقہ بڑے فخر سے خیرات کے کاموں میں حصہ لیتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اس سے خوشنودی باری تعالیٰ حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم ان سے کہتا ہے کہ اے صدقہ و خیرات اور زکوٰۃ سے، ان مفلس اور محتاجوں کی مدد کر کے ثواب کمانے والو! ذرا یہ بتاؤ کہ انہیں مفلس اور محتاج بنایا کس نے ہے؟ تم پہلے انہیں مفلس اور محتاج بنا دیتے ہو اور پھر ان کی مدد کر کے خوش ہو جاتے ہو کہ ہم بڑا ثواب کا کام کر رہے ہیں حالانکہ انہیں اس حالت تک پہنچانا سنگین ترین جرم تھا۔ **هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ** (۲۹) دولت مند طبقہ، اور ان کی حمایت کرنے والے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ زمین دار نے اپنی ملکیت کی زمین، ان مزارعوں کو دی لہذا بٹائی لینا ان کا "شرعی حق" ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ انہیں زمین پر اپنی ملکیت جتانے کا حق کیسے چل ہو گیا؟ کرہ ارض کی ساری زمین خدا کی پیدا کردہ ہے۔ اور اس نے اسے تمام نوع انسان کے لئے یکساں ذریعہ رزق بنایا ہے۔ خدا کی ملکیت کو اپنی ملکیت سمجھ لینا، خود خدا بن جانا ہے۔ (اس نکتہ کی وضاحت اس کتاب کی پہلی جلد میں آیت (۲۹)، ص ۲۹) کی تشریح میں کی جا چکی ہے) اسی طرح کارخانے کے مالک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنا سرمایہ لگا رکھا ہے اس لئے اسے اس سرمایے کا نفع لینے کا حق حاصل ہے۔ ان سے کوئی نہیں پوچھتا کہ کارخانے کے موجودہ مالک (یا اس کے باپ دادا) کے پاس یہ سرمایہ آیا کہاں سے؟ یہ انہی مزدوروں کی اس چار گھنٹے کی محنت کا ماحصل ہے جس کا انہیں کچھ معاوضہ نہیں دیا گیا تھا۔

انفرادی سرمایہ داروں سے آگے بڑھ کر، آج کل فلاحی مملکت (WELFARE STATE) کا نظام سامنے آتا ہے۔ اس میں خود مملکت سرمایہ کار ہوتی ہے اور مزدوروں، مفلسوں کے لئے

فلاح و بہبود کی اسکیمیں، وہی ”صدقہ“ خیرات“ کے ثواب کمانے کے کام! حتیٰ کہ عصرِ حاضر میں جس انقلاب (سوشلزم) کا اس قدر ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے، اس میں بھی محنت کشوں کو اجرتیں (WAGES) ہی دی جاتی ہیں اور اجرتیں مقرر کرنے کا اصول و معیار، وہی سرمایہ دارانہ ہے۔

قرآن، نظامِ سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت، دونوں کے خلاف چیلنج لے کر سامنے آتا ہے اور اعلانیہ کہتا ہے کہ ان انسانوں کو مفلسی اور محتاجی، غریبی اور ناداری کی اس حالت پر پہنچانے کا ذمہ دار یہ باطل نظام ہے جو سرمایہ دار طبقے کا وضع کردہ اور مذہبی پیشواؤں کی باطل تاویلات کے سہارے قائم ہے کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو اس حالت تک پہنچا دے جس میں وہ، ان کا دست نگر بننے پر مجبور ہو جائے۔ دین کے قائم کردہ نظام میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس نظام کی تفصیلات پہلی جلد میں زیرِ آیت (۱/۲۷، ۲/۲۷، ۳/۲۷، ۴/۲۷، ۵/۲۷، ۶/۲۷، ۷/۲۷، ۸/۲۷، ۹/۲۷، ۱۰/۲۷، ۱۱/۲۷، ۱۲/۲۷، ۱۳/۲۷، ۱۴/۲۷، ۱۵/۲۷، ۱۶/۲۷، ۱۷/۲۷، ۱۸/۲۷، ۱۹/۲۷، ۲۰/۲۷، ۲۱/۲۷، ۲۲/۲۷، ۲۳/۲۷، ۲۴/۲۷، ۲۵/۲۷، ۲۶/۲۷، ۲۷/۲۷، ۲۸/۲۷، ۲۹/۲۷، ۳۰/۲۷، ۳۱/۲۷، ۳۲/۲۷، ۳۳/۲۷، ۳۴/۲۷، ۳۵/۲۷، ۳۶/۲۷، ۳۷/۲۷، ۳۸/۲۷، ۳۹/۲۷، ۴۰/۲۷، ۴۱/۲۷، ۴۲/۲۷، ۴۳/۲۷، ۴۴/۲۷، ۴۵/۲۷، ۴۶/۲۷، ۴۷/۲۷، ۴۸/۲۷، ۴۹/۲۷، ۵۰/۲۷، ۵۱/۲۷، ۵۲/۲۷، ۵۳/۲۷، ۵۴/۲۷، ۵۵/۲۷، ۵۶/۲۷، ۵۷/۲۷، ۵۸/۲۷، ۵۹/۲۷، ۶۰/۲۷، ۶۱/۲۷، ۶۲/۲۷، ۶۳/۲۷، ۶۴/۲۷، ۶۵/۲۷، ۶۶/۲۷، ۶۷/۲۷، ۶۸/۲۷، ۶۹/۲۷، ۷۰/۲۷، ۷۱/۲۷، ۷۲/۲۷، ۷۳/۲۷، ۷۴/۲۷، ۷۵/۲۷، ۷۶/۲۷، ۷۷/۲۷، ۷۸/۲۷، ۷۹/۲۷، ۸۰/۲۷، ۸۱/۲۷، ۸۲/۲۷، ۸۳/۲۷، ۸۴/۲۷، ۸۵/۲۷، ۸۶/۲۷، ۸۷/۲۷، ۸۸/۲۷، ۸۹/۲۷، ۹۰/۲۷، ۹۱/۲۷، ۹۲/۲۷، ۹۳/۲۷، ۹۴/۲۷، ۹۵/۲۷، ۹۶/۲۷، ۹۷/۲۷، ۹۸/۲۷، ۹۹/۲۷، ۱۰۰/۲۷) میں اور زیرِ نظر جلد میں آیات (۱/۲۷، ۲/۲۷، ۳/۲۷، ۴/۲۷، ۵/۲۷، ۶/۲۷، ۷/۲۷، ۸/۲۷، ۹/۲۷، ۱۰/۲۷، ۱۱/۲۷، ۱۲/۲۷، ۱۳/۲۷، ۱۴/۲۷، ۱۵/۲۷، ۱۶/۲۷، ۱۷/۲۷، ۱۸/۲۷، ۱۹/۲۷، ۲۰/۲۷، ۲۱/۲۷، ۲۲/۲۷، ۲۳/۲۷، ۲۴/۲۷، ۲۵/۲۷، ۲۶/۲۷، ۲۷/۲۷، ۲۸/۲۷، ۲۹/۲۷، ۳۰/۲۷، ۳۱/۲۷، ۳۲/۲۷، ۳۳/۲۷، ۳۴/۲۷، ۳۵/۲۷، ۳۶/۲۷، ۳۷/۲۷، ۳۸/۲۷، ۳۹/۲۷، ۴۰/۲۷، ۴۱/۲۷، ۴۲/۲۷، ۴۳/۲۷، ۴۴/۲۷، ۴۵/۲۷، ۴۶/۲۷، ۴۷/۲۷، ۴۸/۲۷، ۴۹/۲۷، ۵۰/۲۷، ۵۱/۲۷، ۵۲/۲۷، ۵۳/۲۷، ۵۴/۲۷، ۵۵/۲۷، ۵۶/۲۷، ۵۷/۲۷، ۵۸/۲۷، ۵۹/۲۷، ۶۰/۲۷، ۶۱/۲۷، ۶۲/۲۷، ۶۳/۲۷، ۶۴/۲۷، ۶۵/۲۷، ۶۶/۲۷، ۶۷/۲۷، ۶۸/۲۷، ۶۹/۲۷، ۷۰/۲۷، ۷۱/۲۷، ۷۲/۲۷، ۷۳/۲۷، ۷۴/۲۷، ۷۵/۲۷، ۷۶/۲۷، ۷۷/۲۷، ۷۸/۲۷، ۷۹/۲۷، ۸۰/۲۷، ۸۱/۲۷، ۸۲/۲۷، ۸۳/۲۷، ۸۴/۲۷، ۸۵/۲۷، ۸۶/۲۷، ۸۷/۲۷، ۸۸/۲۷، ۸۹/۲۷، ۹۰/۲۷، ۹۱/۲۷، ۹۲/۲۷، ۹۳/۲۷، ۹۴/۲۷، ۹۵/۲۷، ۹۶/۲۷، ۹۷/۲۷، ۹۸/۲۷، ۹۹/۲۷، ۱۰۰/۲۷) میں گزر چکی ہیں۔ انہیں ایک نظر پھر دیکھئے۔ یہاں اتنا افاضہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں مزارعت (بٹائی)، یا اجرت کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ تصور ہی قرآن کے معاشی نظام کے خلاف ہے۔ اس نظام میں ہر ایک کی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور زاید از ضرورت کسی کے پاس نہیں رہتا۔ باقی رہا یہ کہ خود قرآن کریم میں بھی صدقہ اور خیرات وغیرہ کا ذکر آیا ہے تو اس کے متعلق ہم قرآن کے معاشی نظام سے متعلق ان آیات میں ذکر کر چکے ہیں جن کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے۔ (مزید تشریح ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)

آیہ زیرِ نظر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بالادست طبقہ درحقیقت ایک برادری ہوتا ہے جو زیرِ دست طبقہ کے مقابل متعہ نماز قائم کر لیتا ہے۔ بالادست طبقہ کے لوگ، زیرِ دست طبقہ پر غالب رہنے کے لئے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اس مدد کے لئے قرآن نے ائموں اور عدوان کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ائم سے مراد ہوتی ہے ایسے کام جو اضحلال پیدا کر دیں اور عدوان ان کاموں کو کہتے ہیں جن سے انسان حد سے بڑھ جاتے۔ یہ طبقہ ایسی اسکیمیں بناتا رہتا ہے جن سے محنت کشوں اور مزدوروں کی قوتیں مضاعف ہو جاتیں اور سرمایہ دار طبقہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس طرح یہ لوگ اپنے اس نظام کو مستحکم کرتے رہتے ہیں۔ ان کی ہر اسکیم محنت کشوں کے ائم اور سرمایہ داروں کے عدوان کا موجب ہوتی ہے، اور اسے شرعی سند، مذہبی پیشوائیت، ہم پہنچاتی

ہے۔ کوئی فرعون، ہامان کے بغیر فرعون نہیں بن سکتا۔ نہ ہی ان میں کوئی قارون جنم لے سکتا ہے۔

(۱)

زیرِ نظر آیت میں قرآنِ کریم نے بنی اسرائیل سے کہا ہے کہ پہلے تم لوگوں کو اس حالت میں پہنچا دیتے ہو کہ انہیں دوسرے لوگ اپنا قیدی یا غلام بنائیں اور پھر ان قیدیوں یا غلاموں کو رہائی دلانے کے لئے فدیہ دیتے ہو۔ ایک حدیث میں ہے کہ :-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت پر ایک ایسا ہی زمانہ آئے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر آیا تھا۔ بالکل درست اور ٹھیک، جیسی کہ دونوں جوتیاں برابر اور ٹھیک ٹھیک ایک جیسی ہوتی ہیں۔

(ترمذی۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ باب اعتصام بکتاب و سنت)

جس مقصد کے لئے ہم نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اُس تک پہنچنے سے پہلے ایک ہتھیری وضاحت ضروری ہے۔ یہ، اور اس قسم کی دیگر روایات کو عام طور پر پیش گوئیاں کہا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ پیش گوئیاں نہیں بلکہ حقائق سے اخذِ نتائج ہے۔ (پیش گوئی علمِ غیب کا دوسرا نام ہے اور علمِ غیب خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ قرآنِ کریم میں آنے والے حالات سے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ خدا کی طرف سے ہے کسی انسان کی طرف نہیں) احادیث کے معاملے میں ہمارے ہاں دشواری یہ ہے کہ کسی حدیث کا پورا

روایات میں پیش گوئیاں

پس منظرِ بیان نہیں کیا گیا صرف ”قولِ رسول“ درج کر دیا گیا ہے۔ اس سے بات اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ مندرجہ بالا حدیث کے ضمن میں ہم سمجھتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہو گا کہ اگر مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑ دیا تو ان کی حالت بھی بعینہ بنی اسرائیل کی سی ہو جائے گی کیونکہ انہوں نے بھی خدا کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ وہ جو قرآنِ کریم میں آیا ہے کہ وَقَالَ الرَّسُولُ يُرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُومًا (۲۵)۔ ”رسول اللہ، بحضور رب العزت عرض کریں گے کہ اے میرے رب! حقیقت یہ ہے کہ میری قوم نے اس قرآن کو ترک کر دیا تھا۔ (مہجور بنا دیا تھا)۔ اس سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

اب ہم پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ زمانہ نزولِ قرآن میں غلامی کا رواج عام تھا۔ تو میں

بالعموم جنگ میں گرفتار شدہ قیدیوں کے مردوں کو غلام اور عورتوں کو لونڈیاں بنا لیتے تھے۔ اس کے بعد انکی خرید و فروخت کے بازار بھی گرم رہتے تھے۔ قرآن کریم نوع انسان کو ہر طرح کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے آیا تھا اس لئے ظاہر ہے کہ وہ غلامی جیسی لعنت کو کیسے باقی رہنے دیتا۔ جنگ کے قیدیوں کے متعلق اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

غلامی اور قرآن کریم

فَاِمَّا مِّنَّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءٌ (۷۶)۔ ان قیدیوں کو بہر حال رہا کرنا ہوگا۔ اگر ان کی قوم ان کا فدیہ دیدے۔ قیدیوں کے بدلے میں قیدی یا مقرر کردہ فدیہ۔ تو انہیں اس طرح چھوڑ دو۔ اور اگر حالات ایسے ہوں جن میں فدیہ کی شکل پیدا نہ ہو سکے تو انہیں بطور احسان چھوڑ دو۔ یعنی انہیں بہر حال چھوڑنا ہوگا۔ جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآن کریم میں یہی ایک آیت ہے۔ اور یہ اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ قرآن کریم نے غلام اور لونڈیاں بنانے کے دروازے کو اس طرح ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ باقی رہے وہ غلام اور لونڈیاں جو اس وقت عرب معاشرے میں موجود تھے۔ ان کے متعلق ایسے احکام دیدیئے جن سے وہ یا تو رفتہ رفتہ آزاد خاندانوں کے جزو بن جائیں اور یا آزاد انسانوں کی طرح اپنی الگ زندگی بسر کریں۔ قرآن کریم میں غلاموں اور لونڈیوں (ماملکت ایمانکم) کے متعلق جتنے احکام ہیں، وہ سب اسی سلسلے میں ہیں۔ اس میں آپ شروع سے آخر تک دیکھ جائیے؛ غلاموں کو آزاد کرو، آزاد کرو، کی تاکید جا بجا ملے گی اور کسی ایک جگہ بھی یہ لکھا نہیں ملے گا کہ دوسروں کو غلام بناؤ۔

یہ تو تھے قرآن کریم کے احکام۔ لیکن جب ہم نے قرآن کو چھوڑ دیا تو ہم نے غلامی کو اسلام کا جزو بنا لیا۔ چنانچہ آپ ایک طرف یہ دیکھیں گے کہ ہمارے سلاطین، وزراء، امار، حتیٰ کہ علماء کے طبقہ کے محلات میں سینکڑوں، ہزاروں کی تعداد میں لونڈیاں چلتی پھرتی نظر آئیں گی اور دوسری طرف ان لونڈیوں کی خرید و فروخت کے متعلق ”احکام شریعت“ کی تصریحات دکھائی دیں گی۔ یہ چیز ہمارے متقدمین تک ہی محدود نہیں، عصر حاضر کے مفسرین اور اسلام کے نام نہاد

مودودی صاحب اور غلامی

تفسیر ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی۔ تفہیم القرآن — ہے۔ وہ اس باب میں لکھتے ہیں :-

حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے (جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو) رہا کر دے چاہے ان سے فدیہ لے لے۔ چاہے ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کر لے جو دشمن کے ہاتھ میں

ہوں۔ اور چاہے انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے اور سپاہی انہیں اپنے استعمال میں لائیں۔

(تفہیم القرآن - جلد اول صفحہ ۳۰۳ - اشاعت ۱۹۵۱ء)

انہوں نے اس اجمال کی تفصیل اپنی کتاب — تفہیمات - حصہ دوم — میں بڑی شرح و بسط سے بیان کی ہے۔ وہ اس میں کہتے ہیں کہ ان لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنے کی بھی ضرورت نہیں (صفحہ ۳۱۵) نیز

اسلامی شریعت میں نکاح کے لئے تو چار کی حد مقرر ہے۔۔۔۔۔ لیکن لونڈیوں کے لئے ہر

سے کوئی حد رکھی ہی نہیں گئی۔ (ایضاً صفحہ ۳۱۹)

جہاں تک لونڈیوں کی خرید و فروخت کا تعلق ہے، وہ لکھتے ہیں:-

اس قسم کے لونڈی غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان

سے فدیہ وصول کرنے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے

اُس کو وہ معاوضہ لے کر دوسرے شخص کو منتقل کر دیتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۳۲۳)

طرف تماشہ یہ کہ اس کے ساتھ ہی ہماری تفاسیر میں غلاموں کو آزاد کرنے کو اتنے بڑے ثواب کا کام بتایا گیا

ہے جس کا مقابلہ شاید ہی کوئی دوسرا عمل کر سکے۔ یعنی ایک طرف یہ کہا گیا ہے کہ خدا کا یہ حکم ہے کہ تم ان

قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بناؤ اور دوسری طرف یہ کہ خدا نے غلاموں اور لونڈیوں کو رہا کرنا بڑا ثواب کا

کام قرار دیا ہے۔ غور کیجئے کہ کیا یہ بعینہ وہی شکل نہیں جسے بنی اسرائیل نے اختیار کر رکھا تھا۔ یعنی ایک

طرف اپنے لوگوں کو گھروں سے نکالنا اور دوسری طرف انہیں چھڑا کر لانے کا ثواب کمانا۔ کس قدر صحیح

فرمایا تھا حضورؐ نے کہ میری امت نے اگر تیرا آن کو چھوڑ دیا تو یہ نعل بہ نعل بنی اسرائیل کی پیروی کر لے

لگ جائے گی!

(۱)

قرآن کریم نے بنی اسرائیل کے خلاف یہ الزام عاید کرنے کے بعد کہا کہ اَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ

وَ تَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ (پہلے) تمہاری حالت یہ ہے کہ تم کتاب خداوندی کے ایک حصہ پر تو ایمان رکھتے

ہو اور دوسرے حصے سے کفر برتتے ہو! یہ نکتہ بھی بڑا غور طلب ہے۔ آیت زیر نظر کی رو سے ان سے یہ

کہا گیا ہے کہ تمہاری کتاب میں یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ اپنے لوگوں کو گھروں سے نہ نکالنا اور یہ حکم بھی کہ

قیدیوں کو چھڑانا بڑا نیکی کا کام ہے۔ تمہاری حالت یہ ہے کہ اس دوسرے حکم خداوندی پر تو ایمان رکھتے

ہو لیکن پہلے حکم سے کفر برتتے ہو۔ یہ کتاب کے ایک حصے پر ایمان لانے اور اس کے دوسرے حصے سے انکار کرنے کے مرادف ہے۔ اور اس کے بعد کہا کہ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ۔ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ۔ (۲۱) یاد رکھو! تم میں سے جو لوگ بھی ایسی روش اختیار کریں گے اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ

نہیں ہوگا کہ وہ اس دنیا میں بھی ذلت و خواری کی زندگی بسر کریں گے اور اگلی دنیا میں اس سے بھی زیادہ شدید، الم انگیز،

اور رسوا کن عذاب میں ماخوذ کئے جائیں گے۔ اور یہ سب ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوگا۔

دین، ایک نظامِ حیات عطا کرتا ہے۔ اور حیات (زندگی) کی صورت یہ ہے کہ وہ ناقابلِ تقسیم و مدت

(INDIVISIBLE UNIT) ہے جس کے حصے بخرے نہیں کئے جاسکتے۔ اور جب دین، نظامِ حیات عطا کرتا

ہے تو ظاہر ہے کہ اسے بھی مختلف حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ اسے قبول کیا جائے گا تو پورے کا پورا

اور مسترد کیا جائے گا تو پورے کا پورا۔ اسی لئے کہا گیا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَدْخُلُوْا فِي

السَّلَامِ كَآفَّةً ۚ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمُّ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۔ (۲۲) اے

جماعتِ مومنین! تم اس نظام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی

مت کرو۔ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دین کے حصے بخرے کر دینا شیطان کا

اتباع ہے۔ کتاب اللہ کے بعض حصوں کو قبول کر لینا اور بعض سے انکار کر دینا، کفر ہے، کھلا ہوا کفر۔

اور اس کا نتیجہ اس دنیا میں ذلت و خواری اور آخری زندگی میں عذابِ الیم۔

غلط فہمی میں مبتلا ذہن یہ کہے گا کہ یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ جس نے دین کے جس حصے سے انکار کیا اُسے

اُس حد تک تو مبتلا سے عذاب ہونا چاہیے۔ لیکن اس نے اس کے جس حصے کو قبول کیا تھا، اُسے اس کا

صلہ تو ملنا چاہیے۔ اس مغالطہ آفریں دلیل کے ابطال کے لئے طبعی زندگی کی ایک مثال کو سامنے

لائیے۔ طبیب آپ کے مرض کی تشخیص کر کے ایک نسخہ مرتب کرتا ہے جو مختلف اجزاء (ادویات) پر

مشتمل ہوتا ہے۔ اگر آپ اس نسخے کو پورے کا پورا استعمال کریں گے تو وہ اپنا صحت بخش نتیجہ مرتب کرے گا۔

لیکن اگر آپ ایسا کریں کہ اس نسخے کے دس اجزاء میں سے پانچ کو تولے لیں اور بقیہ پانچ کو چھوڑ

دیں تو کیا آپ کو اس سے ”پچاس فیصد“ شفا حاصل ہو جائے گی؟ پچاس فیصد شفا حاصل ہونا تو

ایک طرف، نہ معلوم اس سے آپ میں اور کتنے عوارض پیدا ہو جائیں۔ نسخہ کے بعض اجزاء کو چھوڑ دینا تو ایک طرف، اگر آپ طبیب کے متعین کردہ اوزان میں بھی کسی قسم کی کمی بیشی کر دیں گے تو اس کا نتیجہ بھی نہ معلوم کیسا ہلاکت انگیز برآمد ہو جائے! یہی کیفیت دین کے نظام کی ہے۔ یہ نظام اسی صورت میں اپنے خوشگوار نتائج پیدا کریگا جب اسے بالکل اختیار کیا جائے۔ اگر اس کے بعض حصوں کو اختیار کیا جائے اور بعض کو چھوڑ دیا جائے تو اس کا نتیجہ ذلت و خواری کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اور اس کی زندہ شہادت ہماری اپنی حالت ہے۔ ہم نے دین کو پرسنل لاز اور پبلک لاز (مذہب اور سیاست) میں تقسیم کر کے اسے ”مذہب“ میں تبدیل کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے، اہم صدیوں سے (باوجود سب کچھ ہونے کے) جس ذلت و خواری کی زندگی بسر کر رہے ہیں اُس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ ہمارے ”مذہب“ میں کتاب اللہ کے بعض احکام پر تو بہر حال عمل ہو رہا ہے۔ کیا ان اعمال کا کوئی خوشگوار نتیجہ مرتب ہوتا ہے؟ کیا ان کے باوجود ہماری ذلت و خواری بڑھتی نہیں جا رہی؟ اور یہ پہلے بالوحشت بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کا واضح فیصلہ ہے کہ جس قوم کی اس دنیا کی زندگی ذلت و خواری کی ہوگی اس کی آخرت کی زندگی بھی ذلت و خواری ہی کی ہوگی۔ (نہ ۱۱، ودیگر آیات)

عصر حاضر کی سیاسی اصطلاح میں اس نظام کو جس میں انسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، سیکولر ازم کہا جاتا ہے۔ اس میں ہر شخص کو اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق پوجا پڑھنا، بھگتی، پرستش، نماز، روزہ اور دیگر مذہبی رسوم کی ادائیگی کی اجازت ہوتی ہے۔ لیکن ”دنیاوی امور“ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی رو سے طے پاتے ہیں۔ یہ کتاب کے ایک حصے پر ایمان اور دوسرے حصے سے کفر کی تین مثال ہے۔ کتاب اللہ (قرآن کریم) نے ان امور کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا۔ تحریک پاکستان کے دوران نیشنلسٹ علماء اور علامہ اقبالؒ (اور ان کے ہمنواؤں) کے درمیان یہی تکتہ مابہ النزاع تھا۔ نیشنلسٹ علماء کا موقف یہ تھا کہ ہندو میں اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو ”مذہبی آزادی“ حاصل ہوگی اور مطالبہ پاکستان کے مدعیوں کا کہنا یہ تھا کہ قرآن کی رو سے اس آزادی کو آزادی کہا ہی نہیں جاسکتا۔ اس میں آزادی سے مراد دین کی آزادی ہے۔ نیشنلسٹ علماء کے اسی موقف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ یہ مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

ہم نے بہر حال ”دین کی آزادی“ کیلئے مملکتِ پاکستان کو حاصل کر لیا لیکن واسے بر حالِ ما، کہ ہم نے یہاں دہی سیکوٹر نظام جاری کر رکھا ہے۔ آئین کی رو سے تو ہماری مملکت ”اسلامی جمہوریہ“ ہے۔ لیکن عملاً یہاں یہ حالت ہے کہ مرکزی حکومت کی مختلف وزارتوں میں ایک وزارت ”امور مذہبیہ“ کی بھی ہے۔ گویا ”مذہبی امور“ ان امور سے الگ ہیں جو دیگر وزارتوں سے متعلق ہیں۔ ”امور مذہبیہ“ میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اوقاف، حتیٰ کہ مزارات پر عرسوں کی تقریبات وغیرہ شامل ہیں۔ کیا یہ وہی سیکولر ازم نہیں جسے تحریکِ پاکستان کے دوران، نیشنلسٹ علماء پیش کرتے تھے۔ اور جسے غیر اسلامی قرار دے کر ہم نے پھٹکار دیا تھا۔ اگر اسلامی نظام اسی کا نام ہے کہ مملکت میں ایک وزارت ”امور مذہبیہ“ سے متعلق بھی ہو تو اس کی ضمانت تو ہندو بھی دیتا تھا۔

اب ہم اس سلسلہ کی آخری کڑی پر پہنچتے ہیں۔ جب پہلی بار دین کا نظام قائم کیا جائے گا، یعنی مذہب کے نظام کو چھوڑ کر دین کے نظام کی طرف آیا جائے گا، تو دین کا نظام ایک دن میں قائم نہیں ہوگا، یہ بتدریج قائم ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان تدریجی مراحل میں بعض اجزاء دین کے ہوں گے اور بعض چیزیں غیر اسلامی بھی ساتھ چلیں گی۔ یہ صورت حال، افستومنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض کے ذیل میں نہیں آئے گی۔ قرآن کریم کی حکمت بالغہ دیکھئے کہ اس نے یہاں قومون

دین کے نظام کی تدریجی تکمیل

— ایمان لانے کا ذکر کیا ہے، دین کی عملی اقامت کا ذکر نہیں

کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو قوم دین کا نظام قائم کرنے کے لئے اٹھے اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اس نظام کی صداقت (کتاب اللہ) پر بالکلیہ ایمان رکھے۔ اس ایمان کے بعد وہ، غلط نظام کی جگہ تدریجاً صحیح نظام کی طرف بڑھتی جائے لیکن ہر مرحلہ میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھے کہ یہ زندگی ہنوز اسلامی زندگی نہیں کہلا سکتی۔ ہم اسلامی زندگی کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ وہ اسلامی اس وقت کہلائے گی جب دین کا نظام بالکلیہ قائم ہو جائے گا اور اس میں کسی غیر دینی عنصر کی رت تک بھی باقی نہیں رہے گی۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے جہاں دین کی آخری شکل کے لئے احکام دیئے ہیں وہاں ان تدریجی مراحل سے گزرنے کے لئے بھی ہدایات اور قوانین عطا کئے ہیں۔ دین کی آخری شکل وہ ہوگی جس کے متعلق انبیاؑ نے کہا ہے کہ

کس دریں جا سائل و محروم نیست عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اُس میں غریب اور امیر کے طبقات باقی نہیں رہیں گے۔ اس لئے امیروں کی طرف سے غریبوں کو صدقہ اور خیرات دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن ان تدریجی مراحل میں تو یہ تفریق موجود ہوگی اگرچہ اس کی شدت رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی جائے گی۔ قرآن کریم میں صدقہ اور خیرات کے ذریعے غریبوں اور مسکینوں کی مدد کرنے یا ترکہ اور وراثت وغیرہ کے سلسلے میں جو احکام آئے ہیں، اُن کا تعلق انہی عبوری ادوار سے ہے۔ مکمل دین میں تو صورت یہ ہوگی کہ نہ کسی کے پاس ضرورت سے زائد (فاصلہ دولت) ہوگی اور نہ کوئی فرد اپنی ضروریات زندگی سے محروم، لہذا دوسروں کی امداد کا محتاج ہوگا۔ اسی دور کے متعلق کہا گیا ہے کہ یَسْتَلُوْكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ قُلِ الْعَفْوُ۔ (۲۱۶) ”اے رسول! تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کی ضروریات کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہو سب کا سب؛ اس وقت مذہب میں ہمارى حالت یہ ہے کہ ہم صدقہ اور خیرات کے متعلق آیات پر تو ایمان رکھتے ہیں، لیکن ”قُلِ الْعَفْوُ“ کے حکم سے کفر برتتے اور فریب نفس کے لئے اس کی طرح طرح کی تاویلیں کرتے رہتے ہیں جن کے لئے ہمارے ہاں بکثرت وضعی روایات موجود ہیں لیکن اس فریب نفس سے ہم خدا کے قانونِ مکاناتِ عمل سے تو نہیں بچ سکتے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ جو لوگ کتاب اللہ کے ایک حصے پر ایمان رکھیں گے اور دوسرے انکار کریں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اس دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کریں گے اور آخرت میں شدید ترین عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ یہ ہے ”تَوْمَنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَ تَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ“ کی ذمہ مثال، جس پر ہم کاربند ہیں اور ذلت و خواری کے اُس عذاب میں ماخوذ جسے قرآن کریم نے اس کا فطری نتیجہ بتایا ہے۔

(۱)

یہ اس لئے کہ
اُولَئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوْا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ فَلَا يَخَفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ۔

ان لوگوں نے آخری زندگی کو دنیاوی مفاد کے بدلے میں بیچ دیا۔ اس لئے ان کا اس عذاب سے بچ جانا تو ایک طرف، اس میں ذرا سی تخفیف بھی نہیں کی جائے گی اور نہ ہی دنیا کی کوئی طاقت انہیں اس عذاب سے نجات دلائے گی۔ (تفصیل اس کی جلد اول میں، زیرِ آیت (۲۱۶) گزر چکی ہے)

(۲)

اس کے بعد کہا۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ . وَتَقَيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ
وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ
الْقُدُسِ . أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَى أَنْفُسُكُمْ
اسْتَكْبَرْتُمْ . فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ .

آسمانی رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تک ہی محدود نہیں رہا تھا، ان کے بعد بھی، تمہاری طرف خدا کے رسول یکے بعد دیگرے آتے رہے اور اس سلسلے کی آخری کردی حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔

یہاں لفظ تقینا آیا ہے جس کے معنی یکے بعد دیگرے، علی التواتر آنے کے ہیں۔ (نیز دیکھئے ۲۴ ذ ۵۶)۔
دوسری جگہ کہا گیا ہے۔ ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرًا۔ (۲۴) علمائے لغت نے کہا ہے کہ تترہ میں، وقفوں کے ساتھ، یکے بعد دیگرے آنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ دنیا کی ہر قوم کی طرف رسول بھیجے گئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب کسی ایک قوم یا ایک ملک میں رسولوں کی آمد کا ذکر ہوگا تو اس میں یکے بعد دیگرے کا سلسلہ سامنے آئے گا۔ ایک رسول، اور دوسرے رسول کی آمد کے درمیانی وقفہ کے سلسلہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا۔ قَدْ جَاءَكُمْ تَهْوَلُنَا مَبِیِّنٌ لَكُمْ عَلَى فِتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ۔ (۲۴) دے اہل کتاب! تمہاری طرف ہمارا یہ رسول، رسولوں کی درمیانی مدت میں آیا ہے، دراصل فترہ کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کی گرم جوشی یا اثر کا ماند پڑ جانا۔ ایک رسول جو دینِ خداوندی دے کر جاتا تھا، اُس کے بعد اُس کے متبعین اس میں آمیزش کر دیتے تھے جس کی وجہ سے اُس دین کی گرم جوشی پہلے کی سی نہیں رہتی تھی۔ اس لئے اُس کے بعد ایک دوسرا رسول بھیجا جاتا تھا جو دین کو پھر سے اس کی اصلی شکل میں پیش کرتا تھا۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے سورۃ الحج کی آیت (۲۴) میں وضاحت سے بیان کیا ہے۔ چونکہ جس دینِ خداوندی کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا اسے قرآن کریم میں محفوظ کر دیا گیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی رسول کے آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آیت (۲۴) میں مِنْ قَبْلِكَ کے الفاظ آتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ سے پہلے تو رسولوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا، لیکن ختم نبوت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہی، کیونکہ وحی خداوندی، قرآن کریم میں محفوظ کر دی گئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی امت نے دین میں آمیزش کر دی جس کی وجہ سے اُس کی حرارت ماند پڑ گئی۔ یعنی دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن اس میں پھر وہی پہلی سی حرارت پیدا کرنے کے لئے کسی رسول کے آنے کی ضرورت نہیں۔ یہ فرضیہ اس امت کا ہوگا کہ یہ قرآن خالص کی رو سے پھر اُسی نظام کو قائم کر دے۔

بہر حال آیہ زیرِ نظر میں کہا یہ گیا ہے کہ بنی اسرائیل کی طرف انبیائے کرام کا سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات گرامی تک جاری رہا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تفصیلی گفتگو **روح القدس** متعلقہ مقام پر کی جائے گی۔ یہاں اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ انہیں روح القدس کے ذریعے تقویت پہنچائی تو لفظ روح کے بنیادی معنی تو انائی کے ہیں، لیکن قرآن کریم نے اسے وحی کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ لفظ قدس کی تشریح آیت (پ) میں گزر چکی ہے۔ وحی کے قدس ہونے میں دونوں کا مضمون ہے۔ ایک تو یہ کہ رسول کی طرف نازل کردہ وحی اس کی ذات تک محدود نہیں رہتی تھی۔ اُس کا فرضیہ تھا کہ اُسے اپنی وسعت کے مطابق دور دور تک پھیلے۔ اور دوسرے یہ کہ ہر رسول کی طرف بھیجی ہوئی وحی ان آمیزشوں اور آلاشوں سے پاک اور صاف ہوتی تھی جو سابقہ رسولوں کی وحی میں ملا دی جاتی تھیں۔ ہم ذرا آگے چل کر بتائیں گے کہ روح القدس کی اصطلاح وحی لانے والے حضرت جبریل کے لئے بھی استعمال کی گئی ہے۔

قرآن کریم نے بنی اسرائیل پر ایک اور الزام عاید کیا ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی رسول تمہاری طرف آتا تھا اور وہ دین خداوندی پیش کرتا تھا تو تمہاری کیفیت یہ ہوتی تھی کہ اس میں جتنا حصہ تمہیں پسند آتا، (یعنی جس سے تمہارے مفادات پر زور نہ پڑتی)، تم اُسے تو قبول کر لیتے اور جو تمہارے مفادات اور جذبات کے خلاف جاتا اُس سے سرکشی برت کر انکار کر دیتے۔ اس سرکشی میں تم دو طریقے اختیار کرتے۔ یا تو تم اُس رسول کی تکذیب کرتے یا اُسے غیر موثر بنا دیتے اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ تم اُسے جان ہی سے مار دیتے تو قتلِ انبیاء کی تفصیل آیت (پ) کے تابع گزر چکی ہے۔

قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ وحی خداوندی میں تم اس کا انتخاب کرتے کہ اس کا کون سا حصہ ماننا چاہئے اور کون سے حصے سے انکار کر دینا چاہئے (تفصیل آیت (پ) میں گزر چکی ہے) تو یہی روش تم نے نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی اختیار کر رکھی ہے۔ چنانچہ سورہ بنی اسرائیل میں ہے: **وَ إِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَمِعْ لَهُ**۔ اے رسول! جب تو قرآن میں خدا کے واحد

قرآن خالص سے نفرت

کا ذکر کرتا ہے تو ان لوگوں کے دل میں نفرت کے جذبات ابھرتے ہیں۔ اور یہ منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کی طرف سے اس قسم کے تقاضے آتے تھے کہ، **قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا اِئْتِنَا بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا اَوْ بَدِّلْهُ**۔ (۱۱۱)۔ خدا کے قانون مکانات عمل کو ناپسند کرنے والے لوگ تجھ سے کہتے ہیں کہ تو اس قرآن کی جگہ کوئی دوسرا قرآن پیش کر دے یا اس میں ان کے حسبِ منشا تبدیلی کر دے۔ **قُلْ مَا يَكُونُ لِي اَنْ اُبَدِّلَ لَهٗ مِنْ تِلْكَ اَيِّ نَفْسِي اِنْ اَتَّبِعْ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ اِنِّيْ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَجِئَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ**۔ (۱۱۲)۔ اے رسول! تو ان سے کہہ دے کہ یہ میرے بس کی بات نہیں کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر دوں۔

..... میرا فریضہ تو اتنا ہی ہے کہ مجھے جو کچھ خدا کی طرف سے ملے، میں اُسے تم تک پہنچا دوں۔ اتنا ہی نہیں میں خود اسی قرآن کا اتباع کرتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے اس کی ذرا سی بھی خلاف ورزی کی تو میں بھی خدا کے عذاب سے بچ نہیں سکوں گا۔ لہذا میں اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

یہ بات بنی اسرائیل کے متعلق ہو رہی تھی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خود ہم نے بھی وحیِ خداوندی (قرآن کریم) کے ساتھ یہی کچھ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ: **اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ**۔ **اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرًا لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُوْنَ**۔ (۱۱۳)۔ کیا ان لوگوں کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تیری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جسے تو ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ کتاب جس میں ان لوگوں کے لئے جو صداقت پر ایمان لائیں، رحمت بھی ہے اور موعظت بھی۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ مومنین کے لئے قرآن کافی ہے۔ لیکن ہم دھڑکتے سے کہتے ہیں کہ نہیں، ہمارے لئے قرآن تنہا کافی نہیں۔ اس کے ساتھ اس کی مثل (مثلاً معاً) کچھ اور چیزوں کی بھی ضرورت ہے۔ چنانچہ اس کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آنے والی وحی کی دو قسمیں تھیں۔ ایک وحی متلو، جو قرآن کے اندر محفوظ ہے اور دوسری وحی غیر متلو، جو احادیث کی شکل میں بعد میں جمع کی

گئی۔ یہ احادیث، قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل ہیں۔ اس عقیدے کے متعلق آیات (۱۱۱) جلد اول ص ۲۱۱ میں گفتگو کی جا چکی ہے۔ یہ عقیدہ ہمارے دل کی گہرائیوں میں اس قدر پیوست ہو چکا ہے کہ اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ انسانی ہدایت کے لئے قرآن کریم کافی ہے تو اسے کافر اور ملحد قرار دے دیا جاتا ہے قرآن کریم نے جو کہا تھا وَإِذَا ذُكِّرْتُمْ رَبَّنَا فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَوْ عَلَيَّ آدَمًا رِهْمٌ نُّفُورًا (۱۱۱)۔ ”جب تو قرآن میں خدا سے واحد کا ذکر کرتا ہے تو یہ لوگ نہایت نفرت کے ساتھ منہ پھیر کر چل دیتے ہیں“ تو یہ منظر ہر روز ہمارے سامنے آتا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ منظر بھی کہ وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ۚ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ (۱۱۲)۔ ”جب اکیلے خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دلوں میں عجیب قسم کی کدورت اور کبیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جب اُس کے سوا اوروں کا بھی ذکر آ جاتا ہے تو ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں“ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے کس قدر عبرت آموز انداز میں ہمارا نقشہ کھینچا ہے۔ یاد رکھیے! روایات، تاریخ، تفسیر وغیرہ قرآن کریم کے سمجھنے میں مدد و معاون ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی قرآن کی مثل نہیں ہو سکتی۔ قرآن بے مثل و بے نظیر، خدا کی کتابِ واحد ہے۔ قرآن کی مثل تو خود قرآن کا ترجمہ بھی نہیں ہو سکتا۔

(۱)

اس کے بعد قرآن کریم نے یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں (علماء) کی ایک اور ذہنیت کا ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ :-

﴿۸۸﴾ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ ۚ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ۚ

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ذرا سٹھرو اور دیکھو کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ واقعی حق و صداقت پر مبنی ہے یا اگر

لے (فٹ نوٹ منو سابقہ) ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے قرآن دیا گیا ہے اور منکر ہے۔ قرآن کے ساتھ قرآن ہی جیسا کچھ اور بھی اس روایت کا وضعی ہونا بالکل بدیہی ہے کیونکہ قرآن کریم تو ساری دنیا کو چیلنج کرتا ہے کہ تم سارا قرآن تو ایک طرف اس کی کسی ایک سورۃ کی مثل ہی لاکر بتا دو۔ (تفصیل آیات ۱۱۱-۱۱۲ جلد اول ص ۲۱۱) میں گزر چکی ہے

ایسا نہیں تو جو کچھ ہم تہا سے سہل سے پیش کرتے ہیں اُسے بھی اچھی طرح پرکھ کر دیکھ لو۔ اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم نے جو کچھ سمجھنا تھا سمجھ لیا۔ تم یوں سمجھ لو کہ ہمارے دلوں پر غول چڑھے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے باہر کی کوئی بات بھی ان تک نہیں پہنچ سکتی۔ یا یہ ایسے برتن ہیں جو پہلے ہی لبالب بھرے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان میں ایک قطرے تک کی مزید گنجائش نہیں۔ ہم نے جس قدر علم حاصل کرنا تھا، کر لیا۔ اب اس میں کسی اضافے کی گنجائش نہیں۔ اس ذہنیت کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اُسے اس آیت کے آخری الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی وضاحت ہم ذرا آگے چل کر کریں گے۔ اس مقام پر اتنا بتا دینا کافی ہو گا کہ

حصولِ علم کی ضرورت | وہ جیتے جاگتے انسان نہیں رہتے، جانوروں کے متجرا (FOSSIBILIZED)

ڈھلچے بن کر رہ جاتے ہیں۔ انسانی زندگی ارتقائی منازل طے کر رہی ہے۔ وہ زمانے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان علم کے ارتقاء کا ساتھ دے۔ بلکہ مومن کا تو یہ مقام ہے کہ وہ اپنے زمانے کی امامت کرے۔ شاہراہِ حیات پر کسی ایک مقام پر یہ سمجھ کر کھڑے ہو جانا کہ ہم علم کی انتہا تک پہنچ گئے ہیں، مصائبِ زندگی میں شکست خوردگی کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مکمل راہِ نمائی قرآنِ کریم میں دے دی۔ اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہے نہ اضافے کی گنجائش۔ لیکن اس اصولی راہنمائی کی روشنی میں سفرِ زندگی طے کرنے کے لئے تو حصولِ علم کی ضرورت ہوگی اور یہ ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ اس ضرورت کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ وہ ذاتِ اقدس و اعظم جو علم کی بلندیوں پر فائز رہتی، اسے بھی یہ دعا سکھائی گئی: **وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا** (پہلا) اے میرے نشوونما دینے والے! میرے علم میں اضافہ کرتا جا! ظاہر ہے کہ اس دعا میں وہ علم بھی شامل تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحیِ مہل پہنچا اور جو ہنوز آخر تک نہیں پہنچا تھا۔ یعنی قرآن کی تنزیل کا سلسلہ جاری تھا اور اس کے ساتھ وہ علم انسانی بھی جس کی روشنی میں حضور نے اس آسمانی ہدایت کو ایک محسوس نظام کی شکل میں قائم کر کے دکھانا تھا حضور کی حیاتِ طیبہ کو ہمارے لئے اسوۂ حسنہ (جسین ترین نمونہ) قرار دیا گیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اُس اسوۂ کے اتباع میں یہ دعا ایسی ہے جو ہر قلبِ مومن میں زندہ آرزو کی طرح بچلتی رہنی چاہیے۔ اے میرے نشوونما دینے والے! میرے علم میں اضافہ کر۔

لیکن وہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر میری امت نے قرآن کو چھوڑ دیا تو اس کی حالت

بعیتہ بنی اسرائیل کی سی ہو جائیگا تو اس کی زندہ شہادت، ہمارے مذہب ہی پیشوا ہیں جو اپنے آپ کو علماء کہہ کر پکار رہے ہیں۔ ان کے علم کی کیفیت تو یہ ہوتی ہے کہ وہ نہ دین کے کام کا ہوتا ہے نہ دنیا کے۔ لیکن ان کی نخوت، تکبر کا یہ عالم ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے آپ کو ہر قسم کے علم سے مستغنی سمجھتے ہیں اور کسی کی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ان حضرات کی کیفیت کیا ہے اس کے متعلق — ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہمارے علماء کی حالت | ہوگی۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ان کے متعلق، خود انہی میس کچھ نامور

شخصیات کی آراء پیش کر دیں جن کے دلوں کے قفل اللہ تعالیٰ نے کھول دیئے تھے اور اسی لئے ان میں حقیقت شناسی کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ اس سلسلے میں ہم متقدمین اور متاخرین کی آراء اس قدر کثرت سے پیش کر سکتے تھے کہ ان سے ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جاتی۔ لیکن ہم صرف چند ایک پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ ہمارے حلقہ علماء میں امام غزالی کا مقام بہت بلند سمجھا جاتا اور ان کی کتاب ”احیائے علوم الدین“ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی اس مشہور تصنیف کی جلد اول کا ایک پورا باب (یعنی چھٹا باب) علماء کے خلاف تنقید کے لئے وقف کر دیا ہے۔ وہ اس باب میں پہلے یہ بتاتے ہیں کہ اعتراف حقیقت یا علمی انکسار کے بارے میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کبارؓ کی کیفیت کیا تھی وہ لکھتے ہیں کہ :-

ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ عزیر نبی ہیں یا نہیں۔ اور میں نہیں جانتا کہ تبع دین کا قدیم بادشاہ (ملعون تھا یا نہیں)۔ اور میں نہیں جانتا کہ ذوالقرنین نبی ہیں یا نہیں۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ

حضرت ابن عمرؓ سے اگر کوئی دس مسئلے پوچھتا تو آپ ایک کا جواب دیتے اور نو کے جواب میں خاموش رہتے۔۔۔۔۔ فقہاء سلف میں سے کسی ایسے بزرگ ہیں جو ”ادری“ (میں جانتا ہوں) کے بجائے ”لا ادری“ (میں نہیں جانتا) زیادہ کہتے تھے۔

ان حضرات کا یہ مسلک بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ :-

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سے بشیر ایمان نصیب ہوا تھا۔ لیکن عنقریب تمہارے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو کہیں گے کہ ہم نے

قرآن مجید پڑھ لیا ہے۔ ہم سے زیادہ پڑھنے والا کون ہے۔ ہم نے اس کا علم حاصل کر لیا ہے ہم سے زیادہ علم حاصل کرنے والا کون ہے۔۔۔۔۔ یہ امت کے بڑے لوگ ہوں گے۔

جامعہ ازہر (مصر) مذہبی علوم کی قدیم ترین درس گاہ ہے اور ساری دنیا میں مستند سمجھی جاتی ہے۔ دوسری طرف مفتی محمد عبدہ (مرحوم) کا نام اور مقام بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ خود بھی جامعہ ازہر کے استاد رہے ہیں۔ علمائے ازہر کے متعلق ان کا کیا خیال تھا اس کی بابت ان کے نامور شاگرد علامہ رشید رضا (مرحوم) لکھتے ہیں کہ:-

ان کا خیال تھا کہ علمائے ازہر اور ان کی قسم کے اور بڑے بڑے شیوخ و علماء وہ لوگ ہیں جن کی اصلاح کی امید باقی نہیں رہی۔۔۔۔۔ جو شخص ازہر یا اس کی قبیل کے مدارس میں جتنی زیادہ مدت تک تحصیل علم کرتا ہے اتنی ہی اُس میں تحصیل علم کی صلاحیت مغتو ہو جاتی ہے
(تفسیر المنار۔ جلد اول صفحہ ۱۸۱)

(مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) کو امام الہند کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ سنیے کہ وہ علماء کے متعلق کیا کہہ گئے ہیں۔ وہ اپنی مشہور تصنیف ”تذکرہ“ میں لکھتے ہیں:-

مدتوں غور کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ امت اسلامیہ کے تمام مفاسد کی اصلی جڑ دوہی چیزیں ہیں جن کو یونانیت اور عجمیت سے تعبیر کرنا چاہیے۔ سارے برگ و بار و ثمراتِ فساد کو انہی سے ظہور و نمو ہوا۔ آج ہمارے مدارس میں جو علوم، باسِمِ اصل و اساس علوم شرعیہ پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، اگر کسی صاحبِ حکمت کی نظر کمیایوی ان کی تحلیل و تفرید کرے تو کھل جائے کہ کس قدر حصہ ان کا شریعتِ اصلیہ اور دینِ خالص سے مرکب ہے اور کس قدر اس فتنہ عالمِ آشوب، یونانیت و عجمیت سے، کوئی شے اس سے ذبحی۔ جتنے کہ علومِ الہیہ و بلاغت و بیان اور عملاً جزئیاتِ اعمال و رسوم و ہنیاتِ معاشرت و غیر ذالک۔ جب یہ حال علوم شرعیہ بلکہ نام نہاد اصولیہ کا ہے تو پھر ان اساطیر و ادبام کا کیا پوچھنا، جن کو بے لقب شریف ”معقولات“ پکارا جاتا ہے۔ وان من العلم جہلاً۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

ان کا سرمایہ ناز علم حق نہیں ہے جو تفرقہ مٹاتا اور اتباعِ سبیل متفرقہ کی جگہ ایک ہی

صراطِ مستقیم پر چلتا ہے بلکہ یکسر جہل و خلاف ہے۔ نفس پرستی اس کی کثافت کو خیر کر دیتی ہے اور دنیا طلبی کی آگ اس کی ناپاکی کے بخارات کو اور تیز کرتی رہتی ہے۔

ان کے علم کے علاوہ، وہ ان کے کردار کے متعلق لکھتے ہیں :-

سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے لیکن علمائے دنیا پرست کبھی یکجا اکٹھے نہ ہوں گے۔ کتوں کا مجمع ویسے تو خاموش رہتا ہے۔ لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور ادھر ان کے پنجے تیز اور دانت زہراؤد ہو گئے۔ یہی حال ان سگانِ دنیا کا ہے۔ ساری باتوں میں متفق ہو سکتے ہیں لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سڑ رہی ہو وہاں پہنچ کر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ فساد و فجار خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کا جامِ تندرستی پیتے ہیں اور چور اور ڈاکو مل جل کر راہ زنی کرتے ہیں۔ مگر یہ اگر وہ خدا کی مسجد اور زہد و عبادت کے صومعہ و خانقاہ میں بیٹھ کر بھی متحد و یک دل نہیں ہو سکتا اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کی طرح چیرتا پھاڑتا اور پنجے مارتا ہے۔ میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیار و الفت کی باتیں سننے میں آجاتی ہیں، مگر عین محراب کے نیچے پیشوائی امامت کے لئے ان میں سے ہر ایک کا ہاتھ دوسرے کی گردن پر بڑھتا اور خونخواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائی کے خون پر لگی ہوتی ہے۔ حضرت مسیحؑ نے احبارِ یہود سے فرمایا تھا، تم نے داؤد کے گھر کو ڈاکوؤں کا بھٹ بنا دیا ہے، ڈاکوؤں کے بھٹ کا حال تو معلوم نہیں لیکن ہم نے مسجد کے صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غراتے اور خون آشام دانت مارتے دیکھا ہے۔

(تذکرہ - صفحہ ۸۲ - ۸۳)

دارالمصنفین (اعظم گڑھ) سے شائع ہونے والا مجلہ ”معارف“ (جس کے مدیر سید سلیمان ندوی مرحوم تھے) مذہبی دنیا میں بڑے بلند مقام کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ستمبر ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں تحریر تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم مولویوں، جن کا خطاب میر باقر داماد کی ”الافق المبین“ کے الفاظ میں ”لا یکنونیون“ اور ”لا نسلیون“ بھی ہے یعنی ”لا یکنون کذا“ (ایسا کیوں نہیں ہو سکتا) اور ”لا نسلم“ (ہم یہ تسلیم نہیں کرتے) یہ دو حربے ہمارے ہاتھوں میں ایسے ہیں کہ جب تک جس مسئلہ کے متعلق جو جی میں آئے ہم کہتے چلے جا سکتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ہم مدرسہ والوں

کے درمیان کسی بدقسمت آدمی کی کوئی بات جا پڑے جنگلوں کے درخت اور گھاس، جن سے کاغذ تیار کئے جاتے ہیں، شاید کانپ اٹھتے ہوں۔ جب ان کو خبر ملتی ہو کہ مولویوں نے ”آستینیں“ لہ لا یكون کذا“ اور ”لا نسلم“ کہنے کے لئے چڑھائی ہیں۔ سمندر بھی تھرا اٹھیں کہ ان کا پانی بھی ہم مولویوں کے لہ لا یكونیات اور لا نسلمیات کی سیاہی کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ (کذا) یہ مسئلہ کہ مزارعت (یعنی زمینداری، خواہ بٹائی پر ہو یا نقدی پر)۔ ائمہ سلف میں کچھ لوگ اس معاملہ کے عدم جواز کے قائل تھے۔ یا مسلمانوں کی تاریخ و فلسفہ کی کتابوں میں علوم الدوائل کا جس حصہ میں ذکر کیا جاتا ہے اس میں ”بودا سف“ کا لفظ عام طور پر جہاں کہیں استعمال ہوا ہے، مراد اس سے گوتم بدھ ہے۔ یہ تو غیر معروف مسائل ہیں، نمازیں آئین زور سے کہنا بہتر ہے یا آہستہ۔ رفع الیدین، امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کا پڑھنا، روزمرہ کے اسلامی عبادات کے اجزاء ہیں۔ لیکن ان عام مسائل کے متعلق بھی جیسا کہ دنیا جانتی ہے لہ لا یكون اور لا نسلم کے قصے آج تک ختم نہیں ہوئے ہیں، ہزار ہا صفحات فریقین کی طرف سے لکھے جا چکے ہیں اور ہنوز روز اول ہے۔ (کذا)

ان حضرات کی یہی ذہنیت نہیں کہ یہ انفرادی طور پر سمجھتے ہیں کہ انہیں سمجھنے، سوچنے کی ضرورت نہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ :-

یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی، دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایہ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اسی کا نام فقہ اسلامی ہے جو ائمہ ہدیٰ کی تحقیقات کا مجموعہ ہے..... اگر تحقیقات اسلامی سے ایسے مفہومات مراد ہوں جو مکمل اور تنقیح شدہ موجود ہیں تو موجودہ دور کی تحقیق اگر اس کے مطابق ہے تو بلا ضرورت ہے۔ اور اگر تحقیق اس کی خلاف ہے تو مردود ہے۔ اس پر امت محمدیہ کا اجماع ہے۔

ان مختصر سی مثالوں سے آپ نے دیکھ لیا کہ ”قالوا قلوبنا غلف“ کس طرح ہمارے علمائے کامسک بن

لہ جامعہ اشرفیہ (لاہور) کے مفتی جمیل احمد تھانوی کا فتوے جو ہفتہ وار البشیا کی ۴ اگست ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں شائع

ہوا تھا۔ (بحوالہ ماہنامہ طلوع اسلام۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء)

چکا ہے۔ ان کی یہی وہ ذہنیت ہے جس کے پیش نظر علامہ اقبالؒ نے ان حضرات کے خلاف اس کثرت سے تنقید کی ہے کہ اُسے یکجا کیا جائے تو ایک صحیفہ مرتب ہو جائے۔ ان کی تنقید میں طنز و تشبیہ کا نشتر بھی ہے اور سوز و گداز کا رسم بھی۔ مثال کے طور پر دو چار قطعات پیش خدمت ہیں۔ وہ سعید حلیم پاشا (مجموع) کی زبان سے کہتے ہیں :-

دیدہ ام روح الامیں را در خروش
نزدِ اوام الکتاب افسانہ

ادشگری ہائے آں قرآن فروش
زاں سوئے گردوں دلش بیگانہ

اور اُس کے بعد ایک نالہ زہرہ گداز کے ساتھ کہتے ہیں :-

آسمانش تیرہ از بے کوکبی
ملت از قال و اقوالش فرد فرد

بے نصیب از حکمت دین نجی
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد

اور مقطع کا بند یہ کہ :-

کورما در زاد و نور آفتاب
دین ملا فی سبیل اللہ فساد

مکتب و ملا و اسرار کتاب
دین کافر، فکر و تدبیر جہاد

اور بال جبریل میں ساتی نامہ کے یہ اشعار ان پر مستزاد :-

مگر لذت شوق سے بے نصیب
لغت کے بھڑوں میں الجھا ہوا
بتان عجم کے پکاری مٹام

بھاتا ہے دل کو کلام خطیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
متدن، تصون، شریعت کلام

حقیقت خرافات میں کھو گئی

یہ امت روایات میں کھو گئی

اس کے جواب میں ان میں سے ہر شخص یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ یہ ”علمائے سورہ“ کے متعلق ہے، ہمارے متعلق نہیں۔ اور ان میں سے ہر فرقے کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے فرقے کے علماء، علمائے حق ہیں اور باقی فرقوں کے علماء، علمائے سورہ اور قرآن کا ارشاد یہ ہے کہ جب امت فرقوں میں بٹ جائے تو مَحَلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فِرْحُونٌ۔ (۳۳) ”ہر فرقہ کیساں طور پر فریب نفس میں مبتلا رہتا ہے“ ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ ان میں ایسے حضرات بھی ہیں جو طبعاً منکر المزاج بھی ہیں اور وسیع القلب

بھی۔ لیکن یہ ان کی ذاتی خصوصیات ہیں۔ جو تعلیم ان لوگوں کو دی جاتی ہے اس کا نتیجہ وہی تنگ نظری اور تعصب و عنوت اور نخوت ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

بات چلی تھی اس سے کہ بنی اسرائیل کے احبار و رہبان کی ذہنیت یہ ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں: قُلُوبُنَا غُلْفٌ۔ (دیکھ)۔ قرآن کہتا ہے کہ: بَلْ لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ ذٰلِكَ) ”نہیں، یہ اُن کے کفر کی وجہ سے خدا کی لعنت ہے“ اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس ذہنیت کو کفر سے تعبیر کیا اور یہ بات بڑی واضح ہے۔ وہ کہتا ہے: اَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّنْ رَبِّهِ - فَوَيْلٌ لِلنَّفْسِئَةِ قُلُوبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللَّهِ - اُولَٰئِكَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ (۳۹)۔ ”انسان کی ایک کیفیت تو یہ ہے کہ اس کا

تنگ نظری کفر ہے

سینہ کھلا ہوا ہو، دل میں کشادہ ہو، نگاہ میں وسعت ہو، تلاش حقیقت کے لئے سر میں سودا اور دل میں تڑپ ہو، حصولِ علم کے لئے سرگرداں ہو۔ یہ ہیں وہ لوگ، جنہیں خدا کی طرف سے شمعِ ہدایت مل جاتی ہے۔ اس کے مقابل، وہ لوگ جن کے سینے میں دل نہیں، پتھر کا ٹکڑا ہو، وہ ساری عمر غلط راستوں پر چلتے رہتے ہیں۔ دوسری جگہ ہے: فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْإِسْلَامِ - وَمَنْ يُرِدْ اَنْ يُضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاٰنَمَا تَصْعَدُ فِي السَّمَاءِ (۴۰)۔ ”ہدایت و سعادت طلب کرنے والوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ قبولیتِ حق کے لئے ان کے سینوں میں کشادہ پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن جن کے دلوں میں ایسی طلب نہ ہو، ان کا سینہ اس طرح بھنچا ہوا ہوتا ہے گویا وہ ضيق النفس (دم) کے مریض ہو۔ سینہ نہایت تنگ، ایسا تنگ کہ کھل کر سانس بھی نہ لے سکیں۔ ہموار زمین پر چل رہے ہوں تو یوں نظر آئے گویا کسی پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں۔ جن کی ذہنیات اس قسم کی ہو، انہیں ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے قرآن نے اسے کفر سے تعبیر کیا ہے اور اس کا نتیجہ بتایا ہے لعنت۔

ہمارے ہاں تو لعنت کا لفظ گالی بن کر رہ گیا ہے لیکن عربی لغت اور قرآن کریم کے استعمال کی

رو سے یہ لفظ گالی نہیں۔ اس کے معنی ہوتے ہیں زندگی کی خوشگوار یوں سے

محروم ہو جانا، سعادت و برکات سے دور رہنا۔ مثلاً قوم عاد کی تباہی

کے سلسلے میں کہا کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ وَاتَّبِعُوا

لعنت کے معنی

فِي هَذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَ يَوْمَ الْقِيَمَةِ - (۱۱)۔ اس دنیا میں بھی مخرمیاں ان کے پیچھے لگی رہیں اور قیامت میں بھی ان کی یہی حالت ہوگی۔ اور اُس کے بعد ہے اَلَا اِنَّ عَادًا كَفَرُوا رَبَّهُمْ۔ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُودٍ - (۱۲)۔ یہاں لفظ بُعْد (دُور) نے لعنت کے مفہوم کو واضح کر دیا۔ یہی الفاظ قوم سرعون کے ضمن میں بھی آئے ہیں۔ (۱۳ ز ۱۴)۔ اس مقام پر اتنی وضاحت کافی ہے۔ آگے چل کر جہاں جہاں یہ الفاظ (لَعْنَتٌ يٰ مَلْعُونٌ وَغیرہ) آئیں گے، متعلقہ آیات خود ان کی وضاحت کرتی جائیں گی۔

زیر نظر آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ یہ لوگ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ہمیں علم حاصل کرنے کی حاجت نہیں۔ ہمیں کسی کی بات تک سننے کی بھی ضرورت نہیں۔ ہمارا علم مکمل ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ ذہنیت کا فرانہ ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان علم اور حقیقت کی برکات سے محروم رہ جاتا ہے فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ - (۱۵)۔ ان میں سے غال غال لوگ ایسے نکلیں گے جن میں حق و صداقت کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔“

(۱۱)

جب ان کی ذہنیت یہ ہے تو پھر ان سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ قرآنِ کریم میں پیش کردہ صداقتوں پر غور و فکر کر کے انہیں قبول کریں۔ چنانچہ اگلی آیت میں ہے۔

وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ۔ وَ كَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا۔ فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَّا عَرَفُوا۔ كَفَرُوا بِهِ۔ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ۔

یہ لوگ اس کتاب کی صداقت سے انکار کر رہے ہیں اور سرکشی برت رہے ہیں جو ان کے انبیاء کی حقیقی تعلیم کی مخالفت نہیں کرتی بلکہ اس کی تائید کرتی ہے۔ اور اُن دعاوی کو سچ کر کے دکھانے والی ہے جو ان سے کئے گئے تھے۔ یہ ایک سچے نبی کی آمد کا انتظار کر رہے تھے اور خدا سے دعائیں مانگا کرتے تھے کہ وہ آئے تو یہ اپنے مخالفین پر غلبہ پاسکیں۔ یہ اُس تعلیم کی صداقت کو اچھی طرح پہچانتے ہیں جسے یہ رسول لے کر آیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ اس سے سرکشی برت رہے ہیں اس سے نہ تو اس رسول کا کچھ بگڑے گا، نہ خدا کی کتاب کا کچھ نقصان ہوگا۔ ان کا اپنا ہی نقصان ہوگا کیونکہ یہ زندگی

کی ان خوشگوار یوں اور سرفرازیوں سے محروم رہ جائیں گے جو اس کتاب کی اطاعت سے حاصل ہو سکتی ہیں۔

اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ قرآن کریم مصدق و یعنی پسح کر کے دکھانے والا ہے ان دعویٰ کا جو ان کی کتابوں میں موجود ہیں۔ قرآن کریم کے مصدق ہونے کا مفہوم آیت (۱۲) میں بیان کیا جا چکا ہے، اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ یہ جو کہا گیا ہے کہ یہ آنے والے کے انتظار میں تھے اور خدا سے دعائیں مانگا کرتے تھے کہ اسے جلدی بھیج تاکہ ہم اپنے مخالفین پر غلبہ حاصل کر لیں تو یہ نکتہ وضاحت طلب ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء کرام دنیا سے تشریف لے جاتے وقت اپنی امت سے کہہ جاتے تھے کہ اگر اس کتاب میں تحریف ہو گئی یا اس نظام میں بگاڑ پیدا ہو گیا تو پھر ایک اور نبی آئے گا جو تعلیم خداوندی کو انسانی آمیزشوں سے پاک اور صاف کر دے گا اور نظام خداوندی کی گاڑی

تورات میں آنے والے نبی کی پیش گوئی

کو پھر سے صحیح پٹری پر ڈال دے گا۔ قرآن کریم کے بعض مقامات سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ متعدد بار بتایا جا چکا ہے، انبیائے سابقہ کی طرف نازل شدہ کتابوں میں سے کوئی بھی اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں دنیا میں موجود نہیں۔ بائبل، زندہ مذہب کی کتاب ہے لیکن اسکی جو کیفیت ہے وہ اس کی اس تاریخ سے سامنے آچکی ہے جسے گذشتہ اوراق میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں بھی بعض آثار ایسے پاتے جلتے ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کے انبیاء ایک آنے والی کی بشارت دے کر جایا کرتے تھے مثلاً عہد نامہ عتیق کی کتاب استثنائے باب اٹھارہ آیت اٹھارہ میں ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ:

میں ان کے لئے، ان کے بھائیوں میں سے، تجھ سے ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اسی کے منہ میں ڈال دوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے فراؤں گا وہ سب ان سے کہے گا اور ایسا ہو گا کہ جو کوئی میری باتوں کو، جنہیں وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے گا تو میں اس کا حاب اس سے لوں گا۔

ان کی کتابوں کی اسی قسم کی بشارات تعقیب جن کی رو سے یہودی ایک آنے والے نجات دہندہ کے

انجیل میں بھی | انتظار میں تھے (اور اب تک انتظار میں ہیں) انجیل میں اس آنے والے کی بشارت، اس سے بھی واضح تر الفاظ میں موجود ہے۔ چنانچہ یوحنا کی انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے متبعین سے جو آخری باتیں کیں، ان میں یہ بھی کہا کہ :-

لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا۔ یعنی سچائی کا روپ جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا اور تم بھی گواہ ہو کیونکہ شروع سے میرے ساتھ ہو۔ (باب ۱۵ - آیات ۲۷-۲۸)

اس سے اگلے باب نمبر ۱۶ میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ میں نے یہ باتیں تم سے کیں، تمہارا دل غم سے بھر گیا۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار (یا دکیل یا شفیع) تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصور وار ٹھہرائے گا۔ گناہ کے بارے میں اس لئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے۔ راست بازی کے بارے میں اس لئے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے بھرنہ دیکھو گے۔ عدالت کے بارے میں اس لئے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے۔ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں، مگر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ، یعنی سچائی کا روپ آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا۔ لیکن جو کچھ سے گا وہی کہے گا۔ اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کر دے گا۔ (آیات ۱۴-۱۶)

آپ بائبل کے اسلوب بیان یا زبان کا خیال نہ کیجئے۔ ادل تو نہ معلوم ان میں کتنی تحریف ہو چکی ہے، اور حضور کے متعلق پیش گوئی | دو سکرے کہ اصلی زبان ترجمہ در ترجمہ ہو کر یہ کتاب کچھ سے کچھ بن چکی ہے۔ دیکھیے صرف یہ کہ ان

تحریف شدہ کتابوں میں بھی ایسے آثار ملتے ہیں جن میں ایک آنے والے کے متعلق بشارات موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے دی گئی بشارت کا ذکر تو خود قرآن کریم میں ان الفاظ میں موجود ہے کہ :-

وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَتَّبِعُوا إِسْرَآئِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ مُبِينٌ (۲۵۷)

حضرت عیسیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ میں تمہاری طرف خدا کا فرستادہ ہوں اور جو کچھ تمہارے پاس تورات و کتب سابقہ میں آیا تھا اُسے سچ کر کے دکھانے کے لئے آیا ہوں اور میں تمہیں اللہ کے ایک رسول کی خوشخبری دیتا ہوں جو میرے بعد آئیگا۔ اس کا نام احمد ہوگا۔

لیکن اب جب وہ آنے والا ان کے پاس واضح دلائل کے ساتھ آگیا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کی وحی لے کر نہیں آیا، جو کچھ یہ پیش کر رہا ہے، اس کا خود تراشیدہ ”کھلا ہوا جھوٹ ہے۔

ہم اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ انجیل میں اس آئیوے کے متعلق کیا الفاظ استعمال ہوئے تھے اور قرآنی آیت میں حضور کا اسم مبارک احمد کیوں آیا ہے۔ واضح ہے کہ حضور اپنے دونوں اسمائے گرامی محمد اور احمد سے متعارف اور موصوف ہیں۔ یہاں ہم اتنا کہہ کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں کہ جس آنے والے کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی وہ زمانہ نزول قرآن میں آچکا تھا۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے۔ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ (۲۵۷) جب وہ آئیوے آگیا تو یہ کہنے لگے کہ وہ جھوٹا ہے۔ قرآن کے الفاظ فَلَمَّا جَاءَهُمْ واضح طور پر بتاتے ہیں کہ زمانہ نزول قرآن میں وہ آنے والا ان کی طرف آچکا تھا۔

آنے والے کی یہ شہادات تو باطل سے ملتی ہیں، ویسے تمام دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کے متبعین کے ہاں ایک آئیوے کا عقیدہ موجود ہے مثلاً ہندو ہر مذہب میں آنے والے کا عقیدہ

کھنکی اوتار کے انتظار میں ہیں۔ بدھ مت کے پیرو متیا کے انتظار میں، جینی ایک تری تھنکر کے منتظر ہیں، مجوسی مہترا کے انتظار میں، جو ان کے عقیدے کی رو سے زندہ آسمان پر چلے گئے تھے اور وہ دوبارہ اپنی اصلی صورت میں آئینگے اور یا اس کے مثل اور بروز کی شکل میں۔ یہودی اور عیسائی کس طرح ایک آنے والے سیمہ کی انتظار میں ہیں، اس کا ذکر ابھی بھی کیا جا چکا ہے۔ اب مذاہب کے ان عقاید سے ترشح ہوتا ہے کہ ان کے انبیاء نے ایک بعد میں آنے والے کی بشارت دی ہوگی۔ قرآن کریم کی رو سے یہ بعد میں آنے والا، حضور نبی آخر الزماں

صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں آگیا اور دنیا کو وہ کتاب خداوندی دے گیا جو خدا کی طرف سے آبیوالی آخری کتاب ہے۔ وہ غیر متبدل بھی ہے اور محفوظ بھی۔ اس سے آنے والوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اسی کو ختم نبوت کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے حضور کے بعد کوئی "مامورین اللہ" نہیں آئیگا۔ "مامورین اللہ" صرف حضرات انبیائے کرام ہوتے تھے اور جب انبیائے کرام کی آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مامورین من اللہ کی آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ حضور کے بعد مامورین من اللہ کی آمد کا عقیدہ، ختم نبوت کی مہر کو توڑ دیتا ہے۔

لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو دین کی اساسات ہی بدل جاتی ہیں۔ ختم نبوت یعنی مامورین من اللہ کی آمد کے سلسلے کے ختم ہو جانے کا عقیدہ اسلام کی اصل واساس ہے۔ اگر یہ عقیدہ نہ رہے تو قرآن کریم کے مکمل، غیر متبدل، محفوظ اور آخری کتاب ہونے کا عقیدہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اور جب قرآن کریم کے متعلق یہ عقیدہ ختم ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اسلام کی اساس ہی باقی نہیں رہتی۔ لیکن جب اسلام، دین کی جگہ مذہب بن گیا تو دیگر اہل مذاہب کی طرح ہمارے ہاں بھی آنے والے کا عقیدہ رائج ہو گیا۔ بلکہ اس باب میں ہم باقی اہل مذاہب سے بھی آگے نکل گئے۔ وہ تو ایک ہی آنے والے کے انتظار میں ہیں اور ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم ہر صدی پر ایک مامورین اللہ (مجدد) کے آنے کا عقیدہ رکھتے ہیں اور قیامت کے قریب امام مہدی کی آمد اور حضرت علی علیہ السلام کے آسمان سے نازل ہونے کا عقیدہ بھی۔ اور اس کے باوجود ہم ختم نبوت پر بھی ایمان رکھنے کے مدعی ہیں اور قرآن کریم کے مکمل، غیر متبدل اور محفوظ کتاب ہونے کے عقیدے کے حامل بھی۔ مامورین من اللہ کی آمد کے عقیدہ کے ماننے والے کہہ دیتے ہیں کہ یہ حضرات کوئی نئی کتاب لے کر نہیں آئیں گے۔ یہ

لیکن ہم بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں | قرآن کریم کو سمجھانے کے لئے ہی آئینگے۔ آپ غور کیجئے کہ جس

لہ (نٹ نوٹ صفحہ گزشتہ) مختلف اہل مذاہب اپنے مذہب کے اولین راہنما کو مختلف القاب سے پکارتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں ایسے کہ خدا نے ہر قوم کی طرف انبیاء بھیجے۔ اس اعتبار سے یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ ان مذاہب کے اولین راہنما انبیائے کرام ہی تھے۔ یہ وجہ ہے کہ ہم نے ان کے لئے انبیاء کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ لوگ انہیں باقی مذاہب کہہ کر پکارتے تھے۔ لیکن انبیائے کرام دین کے بانی نہیں ہوتے تھے وہ تو دین خداوندی کو ان فوں تک پہنچانے والے ہوتے تھے۔ باقی رہے بانیان مذاہب تو حضرات انبیائے کرام مذہب لاتے ہی نہیں تھے۔ وہ دین خداوندی لاتے تھے۔ اس لئے انہیں بانیان مذاہب نہیں کہنا چاہیئے۔

کتاب کی کیفیت یہ ہو کہ اس کے سمجھنے کے لئے بھی کسی آسمان سے آنے والے کی ضرورت پڑے، اس کا یہ دعوئے کہ وہ نہایت واضح اور سبب و منیر کتاب ہے، کیا معنی رکھے گا؟ آنے والے کے عقیدے کے متعلق میں نے اپنی کتاب ”شاہکار رسالت“ اور اس کے بعد دوسری کتاب ”ختم نبوت اور تحریک احمدیت“ میں بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ لیکن چلتے چلتے ایک منظر کا سامنے لانا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ مذاہب عالم میں سے ہر ایک کا عقیدہ یہ ہے کہ جس آنے والے کا انہیں انتظار ہے وہ قیامت کے قریب آئے گا اور جب تک وہ ان کے مذہب کو باقی مذاہب پر غالب نہیں کر دیگا، قیامت نہیں آئے گی۔ آپ ذرا سامنے لائیے اس منظر کو کہ ہندو دھرم، بدھ مت، جین مت، مجوسیت، یہودیت، عیسائیت اور اجازت دیجئے کہ ان کے ساتھ خود ہم مسلمانوں کے عقیدے کی رد سے وہ بھی جن کے ہم منتظر ہیں، یہ سب قریب قیامت کے وقت دنیا میں آجائیں، اور ان میں سے ہر ایک اپنے مذہب کو دوسرے مذاہب پر غالب کرنے کے جہاد میں مصروف ہو تو اس وقت اس کمرۂ ارض کا نقشہ کیا ہوگا؟ یہاں تو قیامت سے پہلے ہی قیامت آجائے گی!

بہر حال، اللہ تعالیٰ نے تمام نوع انسان کے لئے اپنا آخری ضابطہ دین نازل کر کے اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے کر آنیوالوں کے عقیدے کو ختم کر دیا۔ اسی لئے رسالت محمدیہ ابد درکنار ہے اور اس کے سواپ کرم کا دامن قیامت تک تمام نوع انسان کو محیط۔ جی چاہتا ہے کہ میں اس مقام پر ان الفاظ کو مقطع کے طور پر درج کر دوں جن پر میں نے اپنی مایہ ناز تصنیف - معراج انسانیت - کے باب بعنوان ”صبح بہار“ کو ختم کیا تھا۔ یعنی

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا، آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرف انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے نہ کسی دوسری مشعل راہ کی ضرورت رہی، نہ کسی اور لادائی طریقیت کی احتیاج۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم کے نقوش قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں۔ اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ درپکار اٹھتا ہے کہ :-

مقام خویش اگر خواہی دریں دیر بحق دل بند راہِ مصطفیٰ رو

بہر حال، آیت (۹۱) میں کہا گیا ہے کہ یہودیوں نے رسالتِ محمدیہ کے انکار سے اپنی باز آفرینی کے موقعہ کو ہاتھ سے کھو دیا اور یہ ان کی انتہائی حیران کن بھیجی تھی اور بڑا ہی کھائے کا سودا، یعنی

۹۱ **يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنۡ اَنْفُسُكُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِغَيۡبٍۭا**
اَنْ يُنۡزِلَ اللّٰهُ مِنْ فَضۡلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادٍۭٓ ؕ فَبَاۤءُوْ
بِغَضَبٍۭ عَلٰى غَضَبٍۭ - وَلِلۡكَافِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِۡنٌ

انہوں نے دنیاوی مفاد کے چند درہم کا سدھ کے عوض اپنی ذات کی متاع بے بہا کو فروخت کر دیا۔ یعنی انہوں نے خدا کی کتاب سے کسرشی برتی۔ اور اس کسرشی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ عذر و تکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہ کتاب۔ (معاذ اللہ)۔ حق و صداقت پر مبنی نہیں۔ بالکل نہیں، انہوں نے غور و فکر کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ انہوں نے محض اس خدا اور تعصب کی وجہ سے اس سے انکار کر دیا کہ نبوت بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسماعیل کے گھرانے میں کیوں آگئی۔ یعنی وہی قدیمی خدا اور تعصب جو انہیں بنی اسماعیل کے ساتھ تھا، ان کے قبولیت حق و صداقت کے راستے میں دیوار بن کر حائل ہو گیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنے سابقہ جرائم کی وجہ سے جس عذاب میں مبتلا تھے، اس انکار و کسرشی سے اس میں اور اضافہ ہو گیا۔ ان خانماں خرابوں کو مدینہ اور اس کے مضافات میں سر چھپانے کے لئے ٹھکانہ میسر آ گیا تھا لیکن انہوں نے وہاں مسلمانوں کے خلاف ایسی سازشیں کیں کہ وہاں سے بھی انتہائی ذلت کی حالت میں نکلنا پڑا۔ قرآن کریم نے اسے عَذَابٌ مُّهِۡنٌ کہہ کر بچا رکھا ہے۔ یعنی نہایت رسوا کن عذاب۔

(۱۰)

اسی تسلسل میں قرآن کریم نے کہا ہے:-

۹۲ **وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُوْمِنُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ**
عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَاۤ وَّرَآءَہٗ وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا
مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس ضابطہ خداوندی کی صداقتوں پر ایمان لاؤ تو یہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ نہیں، ہم تو اسی پر ایمان رکھیں گے جو ہماری طرف نازل کیا گیا تھا۔ اور اس کے سوا ہر بات

سے انکار کر نیگے۔ حالانکہ جس کتاب کی طرف انہیں دعوت دی جا رہی ہے وہ ان کی طرف نازل شدہ سچی تعلیم کے خلاف نہیں۔ بلکہ وہ ان دعاوی کو پس کر دکھانے والی ہے جو خود ان کے ہاں موجود ہیں اور جن کے لئے یہ ایک آنے والے کا انتظار کر رہے تھے۔ ان سے کہو کہ اگر تمہارا اعتراض یہی ہے کہ تم اس قرآن کو اس لئے نہیں مانتے کہ یہ ایک غیر اسرائیلی نبی کی طرف نازل ہوا ہے تو یہ بتاؤ اس سے پہلے جو اسرائیلی انبیاء کرام تمہاری طرف آتے تھے، تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے؟ تم ان کی تحقیر و تذلیل میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ تمہاری مخالفت اس حد تک بڑھ جاتی تھی کہ تم انہیں قتل بھی کر دیا کرتے تھے (۱۱۰ ذیل)۔ لہذا، تمہارا یہ دعویٰ کہ تم اسرائیلی انبیاء پر ایمان لایا کرتے تھے خود تمہاری اپنی تاریخ کی رُو سے جھوٹا ثابت ہو رہا ہے۔ در کیوں جانیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو بنی اسرائیل میں سے تھے۔ کیا تم اُنکے دعوائے نبوت پر ایمان لائے تھے؟ اُن پر ایمان لانا تو ایک طرف، تم تو بڑے فخر سے کہتے پھر رہے ہو کہ ہم نے انہیں صلیب پر لٹکا دیا۔ انہیں (معاذ اللہ) ایک لعنتی کی موت مار دیا!

(۱۱)

اور آگے بڑھو! ۹۲
وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن بَعْدِهَا وَأَنتُمْ ظَالِمُونَ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تم اپنے مذہب کا موسس اور اپنا مورث اعلیٰ مانتے ہو، سوچو کہ تم نے خود ان کے ساتھ کیا کیا۔ انہوں نے واضح تعلیم خداوندی پیش کی اور تم نے اس کا جواب اس طرح سے دیا کہ وہ تم سے چند دن کے لئے الگ ہوئے تو تم نے ایک بچڑے کی پرستش شروع کر دی۔ یہ کچھ کم ظلم نہیں تھا، جو تم نے اُن کی زندگی میں، اُن کے ساتھ، اور خود اپنے ساتھ کیا۔

(۱۲)

اس سے اگلی آیت میں ہے:- ۹۳
وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأَشْرَبُوا

فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ قُلْ بِسْمَايَا مَرْكُم بِهِ اِيْمَانُكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ۔

طور کے دامن میں تم سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ تم کتاب خداوندی کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے، اسکی تعلیم کو بگوش ہوش سنو گے اور پھر اس کی اطاعت کرو گے۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا کہ تم نے اسے اچھی طرح سن اور سمجھ لیا ہے۔ لیکن اس کے بعد تم نے کیا کیا؟ بجائے اس کے کہ تم اس کی اطاعت کرتے تم نے اعلانیہ اور کھلے بندوں اُس کی خلاف ورزی کی۔ یہ اس لئے کہ تم نے اس کتاب کے الفاظ کو تو سنا، لیکن اُسے اپنے دل میں جگہ نہ دی کیونکہ تمہارے من میں چور تھا۔ تمہارے دل میں گوسالہ کی محبت اور عقیدت حلول کئے ہوئے تھی۔ اے رسول! ان سے کہو کہ یہ ہے تمہارا سابقہ ریکارڈ اور یہ ہے تمہارے ایمان کی حقیقت۔ لہذا تمہارا یہ کہنا کہ ہم اس لئے قرآن پر ایمان نہیں لاتے کہ ہم پہلے ہی وحی منزل من اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، جو ہماری طرف نازل ہوئی تھی، خود فریبی اور فریب دہی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر تمہارا ایمان، تمہیں یہی کچھ سکھاتا اور اسی قسم کی منافقت کی زندگی بسر کرنے کا حکم دیتا ہے تو قف ہے ایسے ایمان پر!

بنی اسرائیل سے متعلق بات کی تو وضاحت ہو گئی لیکن اس میں جو سبق ہمارے لئے پوشیدہ ہے وہ

ہمیں دعوت غور و فکر دیتا ہے۔ قرآن کریم نے کہا
قرآن کو سنا اور عمل اس کیخف لا کرنا ہے کہ دین کا عملی مفہوم ہے سَمِعْنَا وَ اطَعْنَا۔

احکامات خداوندی کو اچھی طرح سے سنو، سمجھو اور ان کے مطابق عمل کرو۔ یعنی ان کا سنا اور سمجھنا اسلئے ضروری ہے کہ اس کے بعد ان پر عمل کیا جاسکے۔ لیکن اگر کیفیت یہ ہو کہ آپ احکام خداوندی کے الفاظ سنتے رہیں۔ اور اُس کے بعد عمل اُس کے خلاف کرتے رہیں تو اس کا جو نتیجہ ہوگا وہ ظاہر ہے۔ ذرا سوچئے کہ کیا ہماری یہی حالت نہیں ہو چکی! جس قدر ہم خدا کی کتاب کو پڑھتے یا سنتے ہیں، اس کی مثال دنیا میں کہیں اور نہیں ملے گی۔ اور اس کے بعد اپنی عملی زندگی میں، ہم جس طرح اس کے خلاف چلتے ہیں اس کی مثال بھی دنیا میں کہیں اور نہیں ملے گی۔ خدا نے کہا تھا کہ کہو سَمِعْنَا وَ اطَعْنَا۔ ہم نے سنا اور ہم اس کے مطابق عمل کریں گے۔ ہم اس کے برعکس، زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں کہ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا۔ (۲۶)۔ ہم نے سنا، بہت اچھی طرح سے سنا۔ لیکن ہم عمل اس کے خلاف کریں گے۔ قرآن کریم کو روزانہ پڑھنے اور سننے کے علاوہ، ہم رمضان المبارک کے ایک مہینے میں جس التزام سے اسے سنتے ہیں۔ اور پورے

مہینے میں ہی نہیں اُس کے بعد ایک ایک رات میں جس طرح اُسے ختم کرتے ہیں (اسے شبینہ کہا جاتا ہے)۔ یہ ”سننے“ کی انتہا ہے۔ ہمارے ہر اجتماع کا آغاز قرآنی آیات کے سننے سے ہوتا ہے۔ دوردور سے قاری آتے ہیں۔ اور قرآن سننے کی محفلیں گرماتے ہیں۔ اب تو ان کی قرأتیں گرامفون کے ریکارڈز تک میں بھر دی جاتی ہیں۔ کہ جب جی چاہے قرآن کے الفاظ کو سُن لیا جائے۔ حرم کعبہ کے متعلق بڑے وجد آفریں انداز میں کہا جاتا ہے کہ وہاں سال بھر، دن اور رات کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جس میں قرآن مجید کے الفاظ فضا میں گونجتے نہ سناؤ دیتے ہوں۔ یہ سب سَمِعْنَا (سننے) کے مظاہر ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہ سوچئے کہ کیا آج دنیا کا کوئی گوشہ بھی ایسا ہے جہاں سے اَطَعْنَا (ہم اس کی اطاعت کرتے ہیں) کی آواز بلند ہوتی ہو؟ اسکے برعکس عَصَيْنَا (ہم اس کے خلاف کرتے ہیں) کے مظاہر ہر مقام پر نظر آئینگے۔ میکائیکی طور پر کتاب اللہ کے الفاظ کو پڑھتے اور سنتے رہنا، لیکن ”گوسالوں“ کی عقیدت کو دل کی گہرائیوں میں پیوست رکھنا، یہ ہے ہمارا مسلک اور مشرب۔ اس مسلک کو پختہ تر کرنے کے لئے اس قسم کے عقاید وضع کر لئے گئے کہ قرآن مجید کے ایک ایک حرف کے پڑھنے سے دس دس نیکیاں مل جاتی ہیں۔ مثلاً السَّحَابُ کہنے سے تیس نیکیوں کا ثواب مل جاتا ہے۔ مذہب کی تمام تنگ و تنگدستیاں کا منتہی نیکیاں کمانا ہوتا ہے۔ اگر نیکیاں اس قدر آسان طریق سے مل جائیں تو کچھ اور کرنے کی ضرورت کیا رہ جاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے ”ناظرہ“ قرآن شریف پڑھانے (اور پڑھنے) کے اہتمام کئے جاتے ہیں۔ اسے خود پڑھا جاتا ہے اور اس طرح پڑھنے کا ”ثواب“ مردوں کو بخشا جاتا ہے۔ اسے قریب المرگ مریض کو سنایا جاتا ہے کہ اس کی جان آسانی سے نکل جائے۔

یہ ہیں (سَمِعْنَا) کی متعدد شکلوں کی چند ایک مثالیں جو امت میں صیروں سے رائج چلی آرہی ہیں۔ اس (سَمِعْنَا) کی جس پر عمل پیرا ہونے سے انقلاب عظیم برپا ہو جاتا!

اس (اپنی) جگر خراش داستان کے بعد پھر بنی اسرائیل کی طرف آجائیے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم خدا کی چھٹی اولاد ہیں (۲/۱۸۱) اور جنت پر ہماری واحد اجارہ داری ہے (۲/۱۳۳) قرآن کریم نے ان سے کہا کہ :-

قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمْ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔ ۲/۹۳

تم اس دنیا میں انتہائی ذلت و خواری کی زندگی بسر کر رہے ہو۔ خدا کی اس وسیع و عریض زمین پر تمہیں کہیں ٹھکانہ تک میسر نہیں آسکتا۔ اس سو راندہ و آں سودر ماندہ، مارے مارے پھر رہے ہو۔ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ جنت تمہارا انتظار کر رہی ہے تو پھر تم سوچ کیا رہے ہو؟ موت کی تمنا کرو اور اپنی جان دید و اور سیدھے اس جنت میں چلے جاؤ جس میں ہر قسم کا راحت و آسائش کا سامان موجود ہے۔ جس شخص ریا قوم کو آنکھ بند کرتے ہی اس قسم کی زندگی میسر کر سکتی ہو وہ اس ذلت و خواری میں دن کیوں بسر کرے؟ موت کی تمنا تمہارے اس دعویٰ کی صداقت کی دلیل ہونی چاہیے۔

لیکن قرآن کریم نے خود ہی کہہ دیا کہ :-

وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ۔ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ۔ ۲/۹۵

یہ کبھی مرنے کی تمنا نہیں کریں گے۔ ان کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جب کبھی جان دینے کا موقعہ آیا تو یہ وہاں سے نہایت بزدلی سے بھاگ اٹھے (۲/۹۳)۔ یہ اس لئے کہ ان کا دعویٰ بھی محض دکھاوے کا ہے کہ جنت ان کا انتظار کر رہی ہے۔ یہ جس قسم کی معصیت اور بد عملی کی زندگی بسر کرتے ہیں اس کا انہیں اچھی طرح احساس ہے اور اس وجہ سے یہ کبھی موت کی تمنا نہیں کر سکتے۔ یہ جانتے ہیں کہ خدا ہمارے ان جبرائے اچھی طرح واقف ہے اس لئے ہمیں ان کی سزا مل کر رہے گی۔

موت انسان کے لئے بہت بڑا محاسبہ خویش (TEST) کا مقام ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے کہا ہے کہ بَخَلِّقِ

الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا

موت محاسبہ خویش کا ذریعہ ہے (۲/۹۶)

اس (TEST) سے تم اپنا محاسبہ کر سکو کہ تمہاری ذات میں کس قدر استحکام پیدا ہو چکا ہے؟ جس کی ذات میں استحکام

پیدا ہو چکا ہو وہ تو موت کو عروس کی طرح گلے لگا لیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ موت، میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

ہو اگر خود زگرہ خود گرہ خود گیر خودی یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی منہ سکے

موت سے مرنا تو ایک طرف، یہ تو اس کے سامنے، ایک جہانِ تازہ کا دروازہ کھول دیتی ہے اور اس دردناک کے کھنسنے سے آئندہ زندگی کے وہ حسین مناظر اس کے سامنے نمودار ہو جاتے ہیں جن کی طرف یہ لپک کر جاتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

مومن کی علامت یہ ہے کہ وہ موت کا نہایت خندہ پیشانی سے استقبال کرتا ہے۔ لہذا قرآن کہتا ہے کہ یہ یہودی جو اپنی کرتوتوں سے اچھی طرح واقف ہیں، بھلا موت کی تمنا کیا کریں گے؟

وَلْتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيٰوةٍ - وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا

۲
۹۶

يُودِ أَحَدٌ هُمْ لَوْ يَعْمُرُ الْفَسَنَةَ - وَمَا هُوَ بِمُزَحِّزٍ مِنَ الْعَذَابِ

أَنْ يُعْمَرَ - وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ -

موت کی تمنا کرنا تو ایک طرف، یہ تو زندہ رہنے کے لئے مشرکین سے بھی زیادہ حریص نظر آئیں گے۔ لیکن ان سے پوچھو کہ کیا اس دنیا میں زیادہ عرصہ تک رہنے سے تم اپنے اعمال کی سزا سے بچ جاؤ گے؟ تم یہاں زیادہ سے زیادہ کتنے عرصہ تک زندہ رہ سکتے ہو؟ کہہ لیجئے، سو برس، ڈیڑھ سو برس، سو یا ڈیڑھ سو برس تو ایک طرف، تم اگر ہزار برس تک بھی اس دنیا میں رہو تو موت سے پھر بھی رستگاری نہیں ہو سکے گی۔ موت ایک دن آئے گی اور تم اگر یہے گی۔ بارگاہِ خداوندی کے مفرد (اشتہاری) مجرم بھاگ کہ کہیں نہیں جا سکتے۔ انہیں اس عدالت میں حاضر ہونا ہو گا۔ جہاں سے انہیں ان کے کئے کی سزا مل کر رہے گی۔ وہ اس سے چھوٹ نہیں سکتے۔ لہذا اس سزا سے بچنے کا طریقہ نہیں ہے کہ تم بھاگتے پھرو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کر لو۔

لیکن، جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، محض فسی تعصب کی بنا پر اس رسولؐ کے خلاف، تمہارا جذبہٴ بغض و حسد تمہیں اس طرف آنے نہیں دے گا۔ نتیجہ اس کا یہ ہو گا کہ تم یہاں بھی ذلت و خواری کی زندگی بسر کرو گے اور مرنے کے بعد بھی الم انگیز عذاب میں مبتلا ہو گے۔ تم کہتے یہ ہو کہ نبوت، بنی اسرائیل کے گھرانے میں ہی رہنی چاہیے تھی۔ یہ بنی اسرائیل کے گھرانے کی طرف کیوں آگئی؟

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ - مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ - مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ

۲
۹۷-۹۸

وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَلَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ۔

جبریل نہ تو اپنی طرف سے وحی کو وضع کرتا ہے اور نہ ہی اسے اس کا اختیار حاصل ہے۔ رباؤں کہتے ہیں کہ اسے اس کی کیا مجال ہے کہ وہ خدا کی وحی جیسے چاہے۔ اے آئے۔ جبریل اور دیگر ملائکہ کا تو فریضہ زندگی یہ ہے کہ وہ احکام خداوندی کی تعمیل کرتے ہیں، اور پوری پوری وفا شعار ہی کے ساتھ تعمیل کرتے ہیں۔ اس لئے تمہارا یہ کہنا کہ وحی تو درحقیقت بنی اسرائیل کے کسی فرد تک پہنچانی مقصود تھی لیکن جبریل نے اسے بنی اسماعیل کے ایک فرد کو دیدیا۔ جبریل کے تم پہلے ہی دشمن چلے آئے تھے۔ اب اس کے خلاف ایک اور جرم عائد کرنے کا نہیں موقع ہاتھ آگیا۔ لیکن تم نے کبھی سوچا بھی کہ تمہارے اس اعتراض کی نشتر کہاں تک پہنچتی ہے، یہ تو خود خدا کے خلاف اعتراض ہے کہ اس نے اس قسم کے کارندے رکھ چھوڑے ہیں؟ خدا کے خلاف اعتراض، اور تمام نظام وحی پر اور ان وسائط (ملائکہ) پر، جو اس کے حکم سے تدبیر امور کرتے ہیں — یعنی جبریل، میکائیل سمیت تمام ملائکہ پر اعتراض — اس قسم کا اعتراض درحقیقت خدا اور اس کے نظام سے کھلا ہوا انکار ہے۔ سوچو، کہ جو لوگ اس قسم کی ردش اختیار کئے ہوئے ہوں، انہیں خدا کی تائید و حمایت کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟

وحی کے متعلق اجمالی سی گفتگو، مطالب الفرقان کی پہلی جلد میں آیات (۱-۲) (۱/۱۲۲)

نزل وحی میں کی جا چکی ہے۔ تفصیلی گفتگو اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں ہم اتنا دھڑا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ:

- (۱) خدا کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہونے کو وحی کہا جاتا ہے۔ اس قسم کا علم صرف انبیائے کرام کو ملتا تھا۔ غیر انہی کو خدا کی طرف سے براہ راست علم نہ مل سکتا تھا، نہ مل سکتا ہے۔ قرآن کریم میں کثرت اور الہام وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں۔

- (۲) جہاں تک وحی کے سرچشمہ کا تعلق ہے، وہ فوق الفطرت (SUPRA-NATURAL) تھا لیکن جو کچھ وحی کی رو سے دیا جاتا تھا، یعنی وحی کا متن (TEXT)، وہ فوق العقل (SUPRA-RATIONAL) نہیں ہوتا تھا، یعنی اسے علم و بصیرت اور عقل و فکر کی رو سے سمجھا جاسکتا تھا۔

- (۳) خدا کی یہ وحی، اپنی آخری شکل میں، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کو خدا کی طرف سے براہ راست علم نہیں مل سکتا۔ اسی کو ختم نبوت کہتے ہیں۔

نبی کو وحی کس طرح ملتی تھی، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ خدا نے صرف اتنا ہی بتایا ہے کہ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ (۱/۱۰۱)۔ ”اے جبریل، خدا کے حکم کے مطابق، قلب نبویؐ پر نازل کرتا تھا“ دوسری جگہ جبریل کو روح الامیں کہہ کر پکارا گیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ: وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ

الْمُنْذِرِينَ (۱۹۳-۱۹۲)۔ ”یہ قرآن خدائے رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ روح الامین نے اسے تیرے قلب پر نازل کیا ہے“ سورۃ النحل میں اسے روح القدس کہا گیا ہے (۱۶۴) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں بھی اسے روح القدس ہی کہا گیا ہے (۲/۸۰ و ۲/۸۳ و ۲/۸۵)۔ روح کا مفہوم بھی اپنے مقام پر بیان کیا جائے گا۔ قرآن کریم میں صرف ایک اور مقام پر جبریل کا لفظ آیا ہے۔ جہاں کہا گیا ہے کہ رسول کو، اللہ، جبریل، مؤمنین اور ملائکہ کی تائید اور حمایت حاصل ہے (۲۶)۔ ملائکہ کے متعلق اسی جلد کے پہلے باب میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے نیز ان کی تسبیح و تقدیس کا مفہوم بھی سامنے آچکا ہے۔ اُسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ میکائیل کا لفظ صرف (۲/۸۸) میں آیا ہے۔ یہودی میکائیل کو اپنا دوست سمجھتے تھے اور جبریل کو دشمن۔

آیت (۲/۸۸) کے آخر میں کہا گیا ہے کہ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ (۲/۸۸)۔ عام ترجمہ اس کلمہ ہی ہوگا کہ ”خدا کفار کا دشمن ہے“۔ لیکن دشمن کا لفظ جس مفہوم میں ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے اس کی رو سے خدا کو کسی کا ”دشمن“ کہنے سے اس کے متعلق بڑا غلط تصور ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ لفظ ”عَدُوٌّ“ (یا عداوت) کا مفہوم آیت (۲/۲۶) میں بیان ہو چکا ہے۔ اس کے بنیادی معنی، دو چیزوں میں بُعْد یا مغائرت پیدا ہو جانے کے ہیں۔ جو شخص بھی قوانینِ خداوندی کر چھوڑ کر دوسرے قوانین کی اطاعت کرتا ہے، ظاہر ہے کہ وہ خدا سے ہٹ جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، وہ زندگی کی ان سعادات و برکات سے محروم رہ جاتا ہے جو اُسے قوانینِ خداوندی سے حاصل ہونی تھیں۔ خدا کی عداوت سے یہی مفہوم ہے۔ اس

خدا کے دشمن ہونے کا مفہوم

کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو مؤمنین کا ولی، اور مؤمنین کو خدا کا ولی کہہ کر بکارا ہے (۲/۲۶)۔ ولی، ولایت، اولیاء اللہ وغیرہ قرآنی اصطلاحات کا مفہوم۔ آگے چل کر اپنے مقام پر سامنے آئے گا۔ یہاں اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے جو تقویت حاصل ہوتی ہے اُسے اس قسم کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ ”خدا مؤمنین کا ولی“ ہے۔ ورنہ خدا کے لئے نہ عَدُوٌّ کا لفظ ہمارے عام مفہوم کی رو سے آیا ہے، نہ ولی (دوست) کا لفظ ہمارے مروجہ مفہوم کے مطابق۔

یہودیوں کے متعلق کہا یہ جا رہا تھا کہ وہ اس وحیِ خداوندی کی مخالفت کرتے ہیں۔ جو رسول اللہ کی طرف بھیجی جا رہی ہے۔ اس سے وہ کسی دوسرے کا نقصان نہیں کرتے، خود اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ وہ اتباعِ وحی سے حاصل ہونے والی خوشگوار یوں سے محروم رہ جائیں گے۔ اسی کو کہیں لعنت سے تعبیر کیا گیا ہے، کہیں عداوت سے۔

بات یوں شروع ہوئی تھی کہ یہودی جبریل کے اس لئے دشمن ہو گئے کہ اس نے اس وحی کو ایک غیر اسرائیلی تک کیوں پہنچا دیا۔ اس کے لئے کہا:۔

﴿۹۹﴾ وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۖ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ ۚ

”اے رسول! ہم نے اس وحی کو بذاتِ خود تمہاری طرف نازل کیا ہے“ یہاں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ وحی بھینچنے کا طریق کوئی بھی کیوں نہ اختیار کیا گیا ہو، وحی خدا کی طرف سے نازل ہوتی تھی۔ اس میں نہ تو اس قوت کا کوئی عمل دخل ہوتا تھا، جس کے ذریعے یہ وحی پہنچائی جاتی تھی، اور نہ ہی اس رسول کا کوئی دخل جس کی طرف یہ وحی بھیجی جاتی تھی وحی خاصِ علمِ خداوندی کا نام ہے جو ان وسائط سے نوح انسان تک پہنچائی جاتی تھی — خدا سے نبی کی طرف، بذریعہ روح الامیں اور اس کے بعد اس نبی کے ذریعے دوسرے انسانوں تک۔ اس کے بعد کہا کہ اس سے انکار صرف فاسق کرتے ہیں۔ فاسق کا مفہوم پہلی جلد میں، زیرِ آیت (۲/۹۹ صفحہ ۳۷۲ پر) بیان کیا جا چکا ہے مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وحی ایک قالب (PATTERN) عطا کرتی ہے جس کے اندر رہتے ہوئے انسانی ذات کی نشو و نما ہو سکتی ہے۔ اس قالب کے اطراف و جوانب کو حدودِ اللہ

کہا جاتا ہے۔ جو لوگ ان حدود کی پابندی نہیں کرتے انہیں فاسقین کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

فاسقین کا مفہوم

اگر ذرا بہ نظرِ تعمق دیکھا جائے تو دین اور لادینی میں بنیادی فرق یہی ہے۔ دین، خدا کی طرف سے متعین کردہ حدود کے اندر زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ نہ ان حدود میں تبدیلی کی جاسکتی ہے نہ ان سے تجاوز۔ جو شخص دین سے انکار کرتا ہے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ کسی غیر متبدل پابندی کے تابع زندگی بسر نہیں کرنا چاہتا۔ وہ کھل چھٹی چاہتا ہے کہ جس طرح اس کا جی چاہے کرے۔ مشہور روسی قلمکار، دوستووسکی (DOSTOEVESKY) نے اس حقیقت کو چار الفاظ میں محصور کر دیا ہے جب کہا کہ ”تم خدا کا انکار کر دو تو ہر چیز جائز قرار پا جائے گی“ اسی کو اباحتِ با فسق کہا جاتا ہے۔ سیکولرزم، کمیونزم، سوشلزم وغیرہ میں کشش و جاذبیت ہی یہ ہے کہ اس میں ہر غیر متبدل اخلاقی پابندیوں سے آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی کو فسق کہا جائے گا۔ قرآنِ کریم نے یہاں کہا ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے وحی سے انکار کے لئے جو وجوہات پیش کی جاتی ہیں وہ محض پردہ ساز ہوتا ہے۔ اس انکار کی علتِ العلل یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر قسم کی پابندی سے آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ اس وضاحت کی روشنی میں یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے گی کہ قرآن نے جو کہا ہے کہ وحی کی صداقتوں سے صرف فاسقین انکار کرتے ہیں، تو یہ کتنی بڑی حقیقت کی پردہ کشائی ہے۔

ان پابندیوں سے آزاد رہنے کی ذہنیت کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اسے اگلی آیت میں ان الفاظ میں بیان کر دیا گیا کہ:-

﴿۲﴾ اَوْ كَلَّمَا عٰهَدُوْا عٰهَدًا نَّبَذُوْهُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَۚ

"جب یہ کسی سے عہد و پیمان کرتے ہیں تو اگرچہ وہ عہد و پیمان پوری کی پوری قوم کی طرف سے ہوتا ہے لیکن انہی میں کا ایک گروہ اس معاہدہ کو توڑ دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ کسی مستقل قدر یا غیر متبدل اصول پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ مصلحت کوئی ان کا شیوہ اور مفاد پرستی ان کا شعار ہے، وہ خواہ کسی طریق سے حاصل ہو جائیں، قرآن کریم نے جو یہاں کہا ہے کہ معاہدہ تو پوری قوم کی طرف سے ہوتا ہے، لیکن ان میں سے کچھ لوگ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو اس میں بھی میکا ولی سیاست کے ایک اہم گوشے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آپ ابتدائی سطح پر محنتوں کی زندگی کو سمجھتے۔ ان میں ایسے گھرانے بھی ہوتے ہیں جو ایک آدھ آدمی ایسا رکھ چھوڑتے ہیں جو دوسروں سے رٹائی جھگڑا کرتا رہے۔ جب اہل محلہ اس کی شکایت لے کر آتے ہیں تو نہایت معصومیت سے کہہ دیا جاتا ہے کہ بھائی کیا کریں! یہ بڑکا اس

معاہدہ کی پابندی

قسم کا نکل آیا ہے۔ یہ ہمارے قباذ میں ہی نہیں۔ اسے ہم بھی برداشت کر رہے ہیں، تم بھی برداشت کرو۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ ایسا ہی سرکش ہے تو تم نے اسے... گھر میں رکھ کیوں چھوڑا ہے کہ اہل محلہ کے لئے فتنہ و فساد کا موجب بنتا رہے؟ اسے نکال باہر کرو۔ لیکن وہ کبھی ایسا نہیں کریں گے۔ گھرانوں اور خاندانوں سے آگے بڑھیے تو جماعتوں اور پارٹیوں میں بھی اس قسم کے لوگ رکھے جاتے ہیں جو دوسروں کے خار پہلو بنے رہتے ہیں جس سے معاشرے کا امن و چین تباہ ہو جاتا ہے۔ پارٹیوں سے آگے بڑھ کر قوموں کی طرف آئیے تو یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ہمسایہ قوم کے ساتھ امن و سلامتی کا معاہدہ کر رکھا ہے لیکن آج سرحد کے اس حصے میں فساد پھاڑا جاتا ہے، کل اس حصے میں۔ پھر اس کے لئے تحقیقاتی کمیشن بٹھائے جاتے ہیں جس کا نتیجہ ہوائے لیاپوچی کے، کچھ نہیں نکلتا۔ ہمسایہ قوم سے امن کا معاہدہ اس لئے کیا تھا کہ انہیں امن اور چین کی زندگی نصیب ہو۔ لیکن عملاً ہوتا یہ ہے کہ معاہدہ برقرار رہتا ہے مگر امن و چین نصیب نہیں ہوتا۔ معاہدہ کے معنی اس امر کا اطمینان ہو جانا ہے کہ فریق مخالف کی طرف سے اس کی خلاف ورزی نہیں ہوگی، یہ فریق مقابل کی ذمہ داری ہے کہ ان کے کسی فرد یا گروہ کی طرف سے اس کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔ اگر وہ اس کا انتظام نہیں کرتے یا نہیں کر سکتے تو ایسے معاہدے کے معنی کچھ نہیں رہتے۔ قرآن کریم نے یہاں اسی حقیقت پر زور دیا ہے۔

مقدمہ زندگی سے آگے بڑھتے تو مذہب کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ یہ یہود جو اس طرح تمہاری مخالفت کر رہے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ان کا شروع سے دھیرہ ہی یہی رہا ہے۔ مثلاً ابھی کل کی بات ہے کہ:-

وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ۔

ان کی طرف خدا کا ایک رسول آیا جو خود انہی میں سے (یعنی بنی اسرائیل میں سے) تھا۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ اس نے آکر کہا کہ میں تمہارے سابقہ انبیاء کی تعلیم کی مخالفت کرنے کے لئے نہیں آیا بلکہ ان دعاوی کو سچ کر دکھانے کے لئے آیا ہوں جو تم سے کئے گئے تھے ان میں سے کچھ لوگوں نے تو اسے تسلیم کیا لیکن باقی قوم نے اس کی تعلیم کو یوں جنس کا سد کی طرح اٹھا کر پھینک دیا جیسے یہ جانتے ہی نہیں تھے کہ ان سے کیا کہا گیا تھا اور یہ رسول کیا کرنے کے لئے آیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا طرز عمل یہودیوں

کتاب اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کی مخالفت

ہی سے مخصوص نہیں۔ جب اور جہاں بھی

دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو شخص بھی انہیں کتاب اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے اس کی یوں مخالفت کی جاتی ہے جیسے یہ جانتے پہچانتے ہی نہیں کہ وہ کس کتاب کی طرف دعوت دیتا ہے؟ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی۔ یہود اور نصاریٰ دونوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔ اور جب حضورؐ کے بعد اسلام بھی دین کے بجائے مذہب بن گیا تو جس شخص نے بھی مسلمانوں کو قرآن کی طرف دعوت دی اس کی اسی طرح مخالفت ہوئی جس طرح ہر اہل مذہب، ہر منزل من اللہ کتاب کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ آج بھی، قرآن کریم کی طرف دعوت دینے والوں کی، خود مسلمانوں کی طرف سے جس طرح مخالفت ہوتی ہے، وہ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے۔

یہ کچھ تو یہودیوں نے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا لیکن ان سے بھی پہلے انہوں نے اسی قسم کی سازش ایک اور رسول کے خلاف کی تھی، یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام کے خلاف۔ قرآن کریم نے اس پوری داستان

کو ایک ہی آیت میں سمٹا کر رکھ دیا ہے جو درج ذیل ہے :-

وَ اتَّبِعُوا مَا نَزَّلْنَا عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَلَا تَتَّبِعُوا سُلُوكَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَلَكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ وَمَا يَعْلَمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ

یہ آیت، اُن آیات میں سے ہے جس کے مروجہ ترجمہ اور وضعی روایات پر مبنی تفاسیر نے، نہ مرن یہ کہبت سے الجھا و بیدار کر دیئے ہیں بلکہ بعض اہم حقائق کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق ذرا تفصیل سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں شاہ عبدالقادر (مرحوم) کا اردو زبان میں سب سے پہلا ترجمہ ہے جسے بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ چونکہ مروجہ وقت سے اس زمانے کا اسلوب بیان کچھ ثریدہ سا ہو گیا تھا۔ اس لئے شیخ الہند، مولانا محمود الحسن دیوبندی (مرحوم) نے اس اسلوب کو قدے مروجہ قالب میں ڈھالا اور وہ ترجمہ مولانا شبیر احمد عثمانی (مرحوم) کے حواشی کے ساتھ شائع ہوا۔ اس ترجمے کو خاصی شہرت حاصل ہے۔ اس لئے میں وہی ترجمہ پیش کرتے دیتا ہوں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ان اہل کتاب نے، کتاب اللہ کو تو اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا اور :-

پیچھے ہوئے اُس علم کے جو پڑھتے تھے شیطان، سلیمان کی بادشاہت کے وقت۔ اور کفر نہیں کیا سلیمان نے لیکن شیطانوں نے کفر کیا کہ سکھلاتے تھے لوگوں کو جادو۔ اور اس علم کے نیچے ہوئے جو اتراد و فرشتوں پر شہر بابل میں، جن کا نام ہاروت اور ماروت ہے۔ اور نہیں سکھاتے تھے وہ دونوں فرشتے کسی کو، جب تک یہ نہ کہدیتے کہ ہم تو آزمائش کے لئے ہیں، سو تو کا فرمت ہو۔ پھر ان سے سیکھتے وہ جادو، جس سے جدائی ڈالتے مرد میں اور اس کی عورت میں، اور وہ اس سے نقصان نہیں کر سکتے کسی کا بغیر حکم اللہ کے اور سیکھتے ہیں وہ چیز، جو نقصان کرے ان کا اور فائدہ نہ کرے۔ اور وہ خوب جان

چکے ہیں کہ جس نے اختیار کیا جادو کو، نہیں اس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ۔ اور بہت ہی بری چیز ہے جس کے بدلے بیچا انہوں نے اپنے آپ کو، اگر ان کو سمجھ ہوتی۔

اس پر حسب ذیل حاشیہ درج ہے :-

خلاصہ یہ کہ یہود اپنے دین اور کتاب کا علم چھوڑ کر، علم سحر کے تابع ہو گئے۔ اور سحر لوگوں میں دو طرف سے پھیلا۔ ایک حضرت سلیمانؑ کے عہد میں، چونکہ جنات اور آدمی ملے جلے رہتے تھے تو آدمیوں نے شیطانوں سے سحر سیکھا اور نسبت کر دیا حضرت سلیمانؑ کی طرف کہ ہم کو انہی سے پہنچا ہے۔ اور ان کو حکم جن دانس پر اسی کے زور سے تھا۔ دوسرے پھیلا ہاروت اردت کی طرف سے۔ وہ دو فرشتے تھے شہر بابل میں۔ بصورت آدمی رہتے تھے۔ ان کو علم سحر معلوم تھا۔ جو کوئی طالب اس کا جانا، اول اس کو روک دیتے کہ اس میں الجھنا رہے گا اور اس پر بھی باز نہ آتا تو اس کو سکھا دیتے۔

اس سے دو تین وضاحت طلب سوال سامنے آتے ہیں :-

(۱) یہودی کفر اور جادو کی نسبت، حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف کرتے تھے (قرآن کریم نے اس کی تردید کی ہے)۔

(۲) عام طور پر مشہور ہے کہ بابل میں، دو فرشتے آدمیوں کی شکل میں رہتے تھے، جادو ان کے ذریعے

پھیلا — اور

(۳) یہ سوال، کہ خود، جادو کیا ہے اور قرآن کریم کی رو سے اس کی حیثیت کیا ؟

آپ نے دیکھا کہ یہ سوال کس قدر اہم ہیں اور اس قابل کہ ان کی پوری پوری وضاحت سامنے آ جائے۔

سب سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام کے خلاف یہودیوں کی افترا پردازیاں دیکھئے۔ واضح رہے کہ حضرت

سلیمان علیہ السلام بنی اسرائیل کے اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں — ان کا صحیفہ — غزل الغزلات — بابل

میں موجود ہے۔ اس کے باوجود آپ دیکھتے کہ خود بابل اور یہودیوں کے دیگر مقدس نگر پھر میں، حضرت سلیمان علیہ السلام

کے متعلق کیا کچھ ملتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کا بیٹا (رجعام) برسرِ اقتدار آیا لیکن یہ بڑا کمزور حکمران تھا۔ اس لئے اس کے

زمانے میں بہت سے فتنوں نے سراٹھایا۔ ان سرکشی اختیار کرنے والوں میں ایک شخص ریربعام نامی تھا جسے حضرت

سلیمان علیہ السلام نے شمالی حصہ مملکت کا گورنر مقرر کیا تھا لیکن اس نے بہت سے اور لوگوں کو ساتھ ملا کر سلطنت کے

خلاف بغاوت شروع کر دی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے اس کی سرکوبی کرنا چاہی لیکن وہ

بھاگ کر مصر چلا گیا۔ آپ کی وفات کے بعد واپس لوٹا اور دس اسباط بنی اسرائیل کو ساتھ ملا کر مملکت کے خلاف

جنگ کی اور اپنی حکومت قائم کر لی۔ نہ صرف حکومت، بلکہ بیت المقدس کے مقابلے میں بیت خانے تعمیر کرائے جہاں اعلانیہ بت پرستی ہوتی تھی۔ بنی اسرائیل، یوں بارِ دگر، بت پرستی کی لعنت میں گرفتار ہو گئے۔ بت پرستی کے ساتھ، وہ سب اودھام و خرافات، جو مندروں میں عام تھے، یعنی جادوگری، کہانت، توہم پرستی، غرضیکہ کفر و شرک کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو ان پر مسلط نہ ہو چکا ہو۔ چنانچہ خود بائبل میں اس کا ذکر موجود ہے۔ کتاب سلاطین نمبر ۱، باب (۱۲-۱۱) میں ہے:-

حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص یربعام نامی نے جیا کا ہن کے ساتھ مل کر آپ کی سلطنت کے خلاف سخت سازشیں کی تھیں۔ اس وقت تو وہ اپنی مساعی میں کامیاب نہ ہو سکا، لیکن رجعام کے عہد سے اس نے بڑی قوت حاصل کر لی اور بنی اسرائیل کے دس اسباط کو اپنے ساتھ ملا کر رجعام کو شکست دی۔ اس نے بیت المقدس کے ہیکل کے مقابلے میں ددبت خانے تعمیر کرائے، جہاں سونے چاندی کے بتوں کی پرستش ہوتی تھی۔

اس سے واضح ہے کہ بت پرستی وغیرہ پھیلائی تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے دشمنوں نے، لیکن خود بائبل کی اسی کتاب ”سلاطین“ میں اسے حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کی مملکت کے خلاف جو ریشہ دوانیاں ہوئی تھیں وہ آپ پر (معاذ اللہ) خدا کا عذاب تھا جو بت پرستی کے جرم کی پاداش میں نازل ہوا تھا۔ اس میں کہا گیا ہے:-

سواز بسکہ اس کا (حضرت سلیمانؑ) دل خداوند اسرائیل کے خدا سے، جو اسے دوبارہ دکھائی دیا، برگشتہ ہوا،

حضرت سلیمانؑ اور تورات

اس لئے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا کہ اس نے اسے حکم کیا تھا کہ وہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے، پر اس نے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا۔ اس سبب سے خداوند نے سلیمان کو کہا از بسکہ تجھ سے ایسا ایسا کچھ ہوا اور تو نے میرے عہد کو اور میری شریعتوں کو جو میں نے تجھے فرمایا، حفظ نہ کیا، اس واسطے میں سلطنت کو تجھ سے پھاڑ لوں گا اور تیرے خادم کو دوں گا، لیکن تیرے باپ داؤد کی خاطر سے میں تیرے جیتے جی ایسا نہ کروں گا، پر تیرے بیٹے کے ہاتھ سے پھاڑ دوں گا۔ مگر ساری سلطنت نہ پھاڑ لوں گا بلکہ اپنے بندے داؤد کی خاطر اور میرے دشمن کے لئے، جسے میں نے چن لیا ہے ایک فرقہ تیرے بیٹے کو دوں گا۔

(سلاطین نمبر ۱۱: ۴۰)

اس سے ذرا پہلے ہے:-

پرسلیمان بادشاہ بہت سی اجنبی عورتوں کو فرعون کی بیٹی کے سوا چاہتا تھا۔ موآبی۔ اور عموئی اور آدمی اور صیدائی اور حتی عورتوں کو۔ ان قوموں کی جن کی بابت خداوند نے بنی اسرائیل کو حکم کیا کہ تم ان کے پاس اندھ نہ جاؤ اور وہ تم پاس اندر نہ آئیں کہ وہ یقیناً تمہارے دلوں کو اپنے معبودوں کی طرف مائل کرالیں گی سو سلیمان انہیں سے عاشق ہو کے لپٹا۔ اس کی سات سو جوداں بیگمات تھیں اور تین سو حرمین۔ اور اس کی جودوں نے اس کے دل کو پھیرا۔ کیونکہ ایسا ہوا کہ جب سلیمان بوطرھا ہوا تو اس کی جودوں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف مائل نہ تھا۔ جیسا کہ اس کے باپ داؤد کا دل تھا، سو سلیمان نے صدانیوں کی دیسی غنات اور بنی عموں کے نفرتی مفکر کی پیروی کی۔ اور سلیمان نے خداوند کی نظر میں بدی کی اور اس نے خداوند کی پیروی اپنے باپ داؤد کی طرح نہ کی۔

(سلاطین (۱) ۲۱۱)

آپ دیکھتے کہ یہودیوں کی کتاب مقدس میں خود ان کے پیغمبروں کے متعلق کس قسم کے افسانے ملتے ہیں! اس مقام پر تو حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر ہے۔ بائبل میں بہت سے دیگر الوالعزم انبیائے کرام کے متعلق جس قسم کی خرافات ملتی ہیں، انہیں دیکھ کر حیا کی آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ ہر حال یہ تھی کفر کی وہ روش، جسے یہودیوں نے حضرت سلیمان کی طرف منسوب کر رکھا تھا۔ اب آئیے جادو کی طرف۔ تالمود میں حضرت سلیمان کے متعلق لکھا ہے کہ ان کے پاس ایک انگشتی تھی جس پر اسم اعظم کندہ تھا۔ جس کی تاثیر سے انسان حیوان، چرند، پرند، جنات، بھوت سب آپ کے مسخر تھے۔ جب آپ

جادو اور حضرت سلیمان

کی سلطنت مستحکم ہو گئی تو آپ کو اپنی قوت بڑا ناز ہو گیا۔ یہ بات خداوند یہو کو ناگوار گزری، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیوؤں کا بادشاہ احمودیس چالاک سے آپ کی انگشتی چرا کر لے گیا، اور آپ کا ہم شکل بن کر تخت پر بیٹھ گیا۔ حضرت سلیمان کی قوت کا راز تو اسی انگشتی میں تھا، جب وہ چھن گئی تو سب کچھ گیا۔ چنانچہ آپ جان بچا کر بھاگے اور فقیروں کا بھیس بدل کر بھیک مانگنے لگے۔ آخر شاہ رسمون کے ملک میں پہنچ کر آپ نے شاہی باورچی خانے میں نوکری کر لی۔ قضا کار بادشاہ کی بیٹی آپ پر عاشق ہو گئی۔ جب بادشاہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے ان دونوں کو جنگل میں نکال دیا۔ ایک دن ایک ماہی گیر پھلی لے کر ادھر سے گزر رہا تھا۔ بھکارن شہزادی نے

اس نے غور فرمایا کہ مسلمانوں میں اسم اعظم کا تصور کہاں سے آیا؟

دہ پھلی اس سے خرید لی، اور جس وقت اس کا پیٹ چاک کیا تو اس میں سے ایک انگوٹھی برآمد ہوئی (حضرت سلیمانؑ جنہوں نے اپنا نام قہلت رکھ چھوڑا تھا) فوراً پہچان لیا کہ یہ وہی انگوٹھی ہے، اُسے فوراً اٹھالیا اور آٹکھ چھپکنے کے عرصے میں یرکشم پہنچ کر اس غدار کو قتل کیا اور خود تخت حکومت پر متمکن ہو گئے (یہودی تالمود)۔ یہ ہیں وہ خرافات جو یہودیوں کی مقدس ترین کتابوں میں خدا کے اس برگزیدہ رسول کی طرف منسوب ہیں۔

قرآن کریم عظیم کتاب ہے۔ اس کے دشمن (یہود و نصاریٰ وغیرہ) خود اپنے انبیاء اور بزرگوں کے متعلق اس قسم کے خرافاتی افسانے وضع کرتے ہیں اور قرآن ان حضرات کی مدافعت کرتا ہے۔ مثلاً انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کل بارہ شاگرد تیار کر سکے تھے۔ ان میں سے ایک نے تو چند پیسوں کے عوض خبری کر کے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا اور جب آپ کے خلاف مقدمہ چلا تو باقی گیارہ کے گیارہ ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے، اس کے برعکس قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام مخالففتوں کے هجوم میں گھر گئے تو آپ نے اپنے رفقاء سے پوچھا

حضرت عیسیٰ کے حواری

مُحْضُ غَدَاكِ خَاطِرُ اس مصیبت کے وقت میرا ساتھ دے گا؟ تو ان سب نے بیک زبان پکار کر کہا کہ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ (۳)۔ ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ آپ دیکھ لیجئے گا کہ ہم کس طرح احکام خداوندی کے سامنے اپنا تسلیم خم کرتے ہیں، اتنا ہی نہیں کہ قرآن کریم نے محض تاریخی حقیقت سے اس واقعہ کا ذکر کر دیا ہو۔ اس نے جماعتِ مومنین سے کہا ہے کہ تمہیں اپنی زندگی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی سب سے زیادہ اختیار کرنی چاہئے (۴) ظاہر ہے کہ جب قرآن کریم سابقہ انبیائے کرام کے رفقاء اور متبعین کے متعلق اس انداز سے مدافعت پیش کرتا ہے تو وہ خود حضرات انبیائے کرام کا دامن ان آلودگیوں سے کیوں نہ پاک اور صاف کرے گا جن سے خود ان کے نام لیواؤں نے انہیں ملوث کر رکھا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا دامن ان دونوں تہمتوں سے یہ کہہ پاک کر دیا کہ: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلَا لِيَنَّ الشَّيْطٰنِ كَفَرُوْا يَعْلَمُوْنَ النَّاسَ السَّحَرُ

قرآن کریم اور حضرت سلیمانؑ

(۲)۔ یہ قطعاً غلط ہے کہ سلیمانؑ نے کفر کی ردش اختیار کر لی تھی۔ اس نے قطعاً ایسا نہیں کیا تھا۔ یہ تو اس کے دشمن، شیاطین تھے جنہوں نے کفر کی ردش بھی اختیار کی اور وہ لوگوں کو جادو بھی سکھاتے تھے، قرآن کریم نے یہ کچھ آج سے چودہ سو سال پہلے کہا اور دیکھئے کہ اب خود اہل بائبل کی تحقیق نے انہیں کس نتیجے پر پہنچایا ہے۔ انہیں نیکو بیڈیا بلیکا میں کہا گیا ہے کہ:-

اتنا تو غالباً صحیح ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی اسرائیلی اور غیر اسرائیلی، متعدد بیویاں تھیں، لیکن آپ نے ان سب کے لئے عبادت خانے نہیں بنوائے تھے، نہ ہی خدائے یہوہ کے ساتھ اپنی بیویوں کے دیوتاؤں کی پرستش شامل کی تھی۔ انہیں اس سرزمین میں، جو خداوند یہوہ کی وراثت تھی، خدائے واحد کے انکار کا خیال بھی نہیں آسکتا تھا۔ اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کہ وہ اپنی بصیرت کے مطابق خدائے یہوہ کا وفادار پرستار تھا۔

اور وکشنری آف بائبل میں اس کی تائید ان الفاظ میں آئی ہے:-

ایسا باور کرنا مشکل ہے کہ سلیمان بادشاہ، خدائے یہوہ سے مرتد ہو کر بت پرست ہو گیا تھا۔ یہ تو قرآن کریم نے کہا، لیکن اب یہ دیکھیے کہ ہمارے ہاں کی اسی مستان کی تفاسیر میں اس سلسلے میں کیا کچھ ملتا ہے۔ ہماری کتب تفاسیر کے سلسلے میں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ اگر یہ مفسرین اس قسم کی باتوں کو یہ کہہ کر پیش کرتے کہ یہ ان کھلنے خیالات ہیں تو بعد میں آنے والے، ان سے اختلاف بھی کر سکتے تھے اور ان کی تردید بھی۔ لیکن ان تفسیروں کا معاملہ ہی الگ ہے۔ قرآن کریم کی سب سے پہلی مفصل اور مبسوط تفسیر ابن جریر طبری نے (تیسری صدی ہجری میں) مرتب کی۔ اس میں آیات کی تفسیر میں کہا یہ گیا ہے کہ رسول اللہ نے ایسا فرمایا ہے۔ یا فلاں صحابی سے یوں مروی ہے۔ یعنی اس تفسیر میں جو کچھ لکھا گیا اسے رسول اللہ

ہماری تفاسیر میں کیا کہا گیا ہے

یا صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کر دیا۔ اس کے بعد حنفی تفسیریں مرتب ہوئیں، وہ سب کم و بیش تفسیر طبری ہی کو بطور سند پیش کرتی ہیں۔ اب آپ غور کیجیے کہ اگر کسی آیت کے متعلق یہ کہا جائے کہ رسول اللہ نے اس کی تفسیر یوں بیان فرمائی ہے تو کون مسلمان ہے جو یہ کہنے کی جرأت کر سکے کہ مجھے اس سے اختلاف ہے؟ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ جو کچھ امام طبری نے لکھ دیا وہی کچھ آج تک آخری سند بن کر چلا آ رہا ہے۔ اس سلسلہ میں غور طلب سوال یہ ہے کہ امام طبری نے جو کچھ کہا اس کا مدار روایات پر ہے۔ روایت کے معنی یہ ہیں کہ میں نے فلاں سے سنا، اس نے فلاں سے سنا، اس نے فلاں سے سنا۔ اب اگر اس طرح سے شنید کا سلسلہ دو، تین سو سال تک پیچھے لے جایا جائے تو اس کی سند کیا ہو سکتی ہے کہ جو کچھ آخری راوی نے بیان کیا وہ بالضرور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ اس پر کھ کے لئے قابل اعتماد طریق یہ ہے کہ جس بات کو بھی رسول اللہ کی طرف منسوب کیا جائے اس کے متعلق یہ دیکھ لیا جائے کہ وہ قرآن کریم کے خلاف تو نہیں۔ اگر وہ قرآن کریم کے مطابق ہے تو ایسا باور کر لینے میں کوئی تاثر نہیں ہونا چاہئے کہ اُسے حضور کا ارشاد گرامی سمجھا جاسکتا ہے لیکن

اگر وہ قرآن کریم کے خلاف ہو تو ظاہر ہے کہ وہ حضور کا قول نہیں ہو سکتا، لہذا اُسے مسترد کر دینا چاہئے۔ یہ ہے وہ مسلک جو روایات، تاریخ اور تفاسیر کے سلسلے میں، میں نے اختیار کر رکھا ہے۔

اوپر بتایا گیا ہے کہ یہودیوں نے کفر اور سحر کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کیا۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں اس کی تردید کر دی۔ اس کے بعد آپ دیکھئے کہ ہماری کتب تفاسیر میں اس سلسلے میں کیا لکھا ملتا ہے۔ امام طبری کی تفسیر بڑی ضخیم تھی۔ امام ابن کثیر نے اسے نسبتاً مختصر شکل میں پیش کیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ تفسیر بڑی مقبول ہے۔ اس تفسیر میں زیر نظر آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہا گیا ہے:-

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک انگوٹھی تھی جب آپ پاخانے جاتے تو اپنی بیوی حضرت جادہ کو بے جاٹے۔ جب حضرت سلیمانؑ کی آزمائش کا وقت آیا اس وقت ایک شیطان جن آپ کی صورت میں آپ کی بیوی صاحبہ کے پاس آیا اور انگوٹھی طلب کی، جو دیدی گئی۔ اُس نے پہن لی اور تخت سلیمانی پر بیٹھ گیا۔ تمام جنات وغیرہ حاضر خدمت ہو گئے۔ حکومت کرنے لگا۔ ادھر جب حضرت سلیمانؑ واپس آئے اور انگوٹھی طلب کی تو جواب ملا تو جھوٹا ہے انگوٹھی تو حضرت سلیمانؑ لے گئے۔ آپ نے سمجھ لیا کہ یہ خدا کی طرف سے آزمائش ہے۔ ان دنوں میں شیاطین نے جادو کی اور نجوم کی اور کہانت کی اور شعرا شعراء کی اور غیب کی جھوٹی سچی خبروں کی کتابیں لکھ لکھ کر حضرت سلیمانؑ کی کرسی تلے دفن کرنی شروع کر دیں۔ آپ کی آزمائش کا یہ زمانہ ختم ہو گیا۔ آپ پھر تخت و تاج کے مالک ہوئے۔ عمر طبعی کو پہنچ کر جب رحلت فرمائی تو شیاطین نے انسانوں سے کہنا شروع کیا کہ حضرت سلیمانؑ کا خزانہ اور وہ کتابیں جن کے ذریعہ سے وہ ہواؤں اور جنات پر حکمرانی کرتے تھے اور اُن کی کرسی تلے دفن ہیں۔ چونکہ جنات اُس کرسی کے پاس نہیں جاسکتے تھے اس لئے انسانوں نے اسے کھودا تو وہ کتابیں برآمد ہوئیں۔ بس ان کا چرچا ہو گیا اور ہر شخص کی زبان پر چڑھ گیا کہ حضرت سلیمانؑ کی حکومت کا راز یہی تھا بلکہ لوگ، حضرت سلیمانؑ کی نبوت سے انکار ہو گئے اور آپ کو جادوگر کہنے لگے۔

(تفسیر ابن کثیر۔ پارہ اول صفحہ ۱۲۵)

معالم التریل، ہمارے ہاں کی ایک اہم تفسیر ہے۔ اس میں مندرجہ بالا "افسانے" یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ:- جب اس جن (یعنی جعلی سلیمان) کو حکومت کرتے کچھ عرصہ گزر گیا تو حضرت سلیمانؑ کے صحابی آصف نے آپ کی ازواج مطہرات سے پوچھا کہ باہر تو اس کا (یعنی جعلی سلیمان) جس کے متعلق انہیں علم نہ تھا کہ وہ جعلی ہے)

حال بہت بُرا ہے، تمہارے ساتھ اس کا برتاؤ کیسا ہے؟ اس کے جواب میں آپ کی ازدواج نے کہا کہ یہاں اس کا حال بدتر ہے۔ یہ تو حیض کی حالت میں بھی اجتناب نہیں کرتا۔ اور غسل جنابت بھی نہیں کرتا۔ ان تفاسیر کے افسانوی اور اُن روایات، جن پر یہ تفاسیر مبنی ہیں، کے وضعی ہونے میں شبہ کیا رہ جاتا ہے؟

•••

اب آئیے آیت زیر نظر کے دوسرے گوشے، یعنی ہاروت و ماروت کی طرف تاریخی

بابل اور سحر کاری

انکشافات اس پر شاہد ہیں کہ زمانہ قدیم میں بابل، سحر و کھانت اور شعبہ گری و فسون سازی کا گہوارہ تھا۔ چنانچہ راجزہ اپنی مشہور کتاب — بابل اور اشوری مذہب — میں لکھتا ہے:-
اہل بابل و نینوا کے مذہب کا معتد بہ حصہ جھاڑ پھونک کا مجموعہ بن کر رہ گیا تھا۔ (صفحہ ۱۲۵)
انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایٹھکس کا مقالہ نگار بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ ”اہل بابل کا مذہبی لٹریچر، سحر و کھانت سے بھرا پڑا تھا۔ جب کلدانیوں (اہل بابل) کی قومیت کا شیرازہ بکھرا تو وہ تمام دنیا میں پھیل گئے اور جہاں جہاں گئے انہوں نے شعبہ بازی اور افسوں طرازی کی اس نظر فریب تعلیم کو عام کرنا شروع کر دیا۔“ (دیکھئے RAGOZIN کی کتاب کا لٹریا) یہودی شعبہ بازی اور سحر و کھانت کے بہ دل شیدا بن گئے۔ اہل بابل کے بکھرے ہوئے معلموں کا سب سے زیادہ اثر انہی توہم پرستوں پر ہوا۔ چنانچہ جیوش انسائیکلو پیڈیا اس پر شاہد ہے کہ یہودیوں میں اہل بابل ہر جگہ نگاہ تقدس دیکھے جانے لگے اور انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی رو سے) ان کی تعلیم یہودیوں کے ہاں عام ہو گئی۔ اس پر جیوش انسائیکلو پیڈیا ر جلد ہشتم کی حسب ذیل شہادت قابل غور ہے:-

قدیم یہودیوں میں جادو کی تعلیم عام تھی۔ حتیٰ کہ صدر مجلس یا محکمہ قضا کی رکنیت کے لئے جادو کا علم لایینفاک شرط سمجھا جاتا تھا، خواہ یہ جادو کفار سے ہی کیوں نہ سیکھا جائے۔ ان کے بڑے بڑے علماء اسی علم کے ماہر تھے، اور قانون کی نگاہ میں اس کا اثر مسلم تھا۔ لوگ اہل علم کی باتوں کی پرواہ کرتے یا نہ کرتے، لیکن ساحرین کی عقیدت ان کے رگ دریشے میں سما چکی تھی۔ اسی نے انہیں تباہ کر دیا۔

اس کے بعد آئیے اپنی کتب تفاسیر کی طرف۔ تفسیر ابن کثیر میں آیت زیر نظر (۲/۱۰۶) کی تفسیر میں لکھا ہے:-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اتارا اور اودن لی اولاد

سے یہودی (بلکہ سامی اقوام) میں مروجہ جادو کی تفاسیل (G. CAMPBELL THOMPSON کی کتاب SEMITIC MAGIC & ITS ORIGIN AND DEVELOPMENT) میں ملاحظہ کیجئے۔

ہاروت وماروت [بھیلی اور زمین میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہونے لگی تو فرشتوں نے کہا کہ دیکھو یہ کس قدر بد لوگ ہیں، کیسے نافرمان اور سرکش ہیں، ہم اگر ان کی جگہ ہوتے تو ہرگز ہرگز خدا کی نافرمانی نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اچھا تم اپنے میں سے دو فرشتوں کو پسند کر لو۔ میں ان میں انسانی خواہشات پیدا کرتا ہوں اور انہیں زمین پر بھیجتا ہوں، پھر دیکھتا ہوں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہاروت وماروت کو پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں انسانی طبیعت پیدا کی اور ان سے کہہ دیا کہ دیکھو بنی آدم کو تو میں نے نبیوں کی معرفت اپنے حکم احکام پہنچانا ہوں لیکن تم سے بلا واسطہ خود کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، نہ کھانا، نہ شراب نہ پینا، ابے دونوں زمین پر اترے، اور زہرہ کو ان کی آزمائش کے لئے حسین و شکیل عورت کی صورت میں ان کے پاس بھیجا جسے دیکھ کر یہ مفتون ہو گئے اور اس سے زنا کرنا چاہا۔ اس نے کہا اگر تم شرک کر دو تو میں منظور کرتی ہوں۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ تو ہم سے نہ ہو سکے گا۔۔۔۔۔ وہ چلی گئی۔ پھر آئی اور کہنے لگی اچھا اس بچے کو قتل کر ڈالو، تو مجھے تمہاری خواہش پوری کرنی منظور ہے۔ انہوں نے اسے بھی نہ مانا۔ وہ پھر آئی اور کہا کہ اچھا یہ شراب پی لو۔ انہوں نے اسے ہلکا گناہ سمجھ کر اسے منظور کر لیا۔ اب نشہ میں مست ہو کر زنا کاری بھی کی اور اس بچے کو بھی قتل کر ڈالا۔ جب ہوش و حواس درست ہوئے تو اس عورت نے کہا جن جن کاموں کا تم پہلے انکار کرتے تھے، سب تم نے کر ڈالے۔ یہ نادم ہوئے۔ انہیں اختیار دیا گیا کہ یا تو عذاب دنیا کو اختیار کر دیا عذاب آخری کو۔ انہوں نے دنیا کے عذاب پسند کئے۔

(ابن کثیر پارہ اول صفحہ ۱۲۲)

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں :-

صحابہ اور تابعین سے بھی اس قسم کی روایتیں بہت کچھ منقول ہیں۔ بعض میں ہے کہ زہرہ ایک عورت تھی اوس نے ان فرشتوں سے یہ شرط کی تھی کہ تم مجھے وہ دعا سکھا دو جسے پڑھ کر تم آسمان پر چڑھ جاتے ہو۔ انہوں نے سکھا دی۔ یہ پڑھ کر چڑھ گئی اور وہاں تارے کی شکل میں بنا دی گئی۔ (ابن کثیر پارہ اول صفحہ ۱۲۳)

اس کے بعد ہے :-

ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہ واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے کا ہے۔ یہاں بابل سے مراد بابل دنیاوند ہے۔ اس عورت کا نام عربی میں زہرہ تھا اور نصی زبان میں اس کا نام بیدخت تھا اور فارسی میں نامہید تھا۔ یہ عورت اپنے خاوند کے خلاف ایک مقدمہ لائی تھی۔ جب انہوں نے اوس سے برائی کا ارادہ کیا

تو اوس نے کہا پہلے مجھے میرے خاوند کے خلاف حکم دو تو مجھے منظور ہے۔ ادنیوں نے ایسا ہی کیا پھر اوس نے کہا مجھے یہ بھی بتادو کہ تم کیا چڑھ کر آسمان پر چڑھ جاتے ہو اور کیا چڑھ کر اترتے ہو؟ ادنیوں نے یہ بھی بتا دیا۔ چنانچہ چڑھ کر آسمان پر چڑھ گئی لیکن اترنے کا وظیفہ بھول گئی اور وہیں ستارے کی صورت میں مسخ کر دی گئی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب بھی زہرہ ستارے کو دیکھتے تو لعنت بھیجا کرتے تھے۔ اب ان فرشتوں نے جب چڑھنا چاہا تو نہ چڑھ سکے سمجھ گئے کہ اب ہم ہلاک ہوئے۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ پہلے پہل چند دنوں تک تو یہ فرشتے ثابت قدم رہے۔ صبح سے شام تک عدل کے ساتھ حکم کرتے رہتے۔ شام کو آسمان پر چڑھ جاتے پھر زہرہ دیکھ کر اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکے۔ زہرہ ستارے کو ایک خوبصورت عورت کی شکل میں بھیجا گیا تھا۔ (ابن کثیر۔ پارہ اول صفحہ ۱۲۸-۱۲۹)

اس قسم کی تفسیروں کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ متقدمین کی تفاسیر ہیں، جنہوں نے روایات کے بارے میں زیادہ پھان پھٹک سے کام نہیں لیا، لیکن اس زمانے میں، جو تفاسیر لکھی جا رہی ہیں ان میں اس قسم کا رطب دیا بس شامل نہیں کیا جاتا۔ ہمارے

مودودی صاحب کی تفسیر

ہاں (LATEST) تفسیر ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تفہیم القرآن ہے۔ آپ دیکھتے کہ اس بارے میں اس میں کیا لکھا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے :-

اس آیت کی تاویل میں، مختلف اقوال ہیں، مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے، وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں بنی اسرائیل کی پوری قوم بابل میں قیدی اور غلام بنی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو انسانی شکل میں ان کی آزمائش کے لئے بھیجا ہوگا، جس طرح قوم لوط کے پاس فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے، اسی طرح ان اسرائیلیوں کے پاس وہ پیروں اور فقیروں کی شکل میں گئے ہوں گے۔ وہاں ایک طرف انہوں نے بازارِ سحر میں اپنی دکان لگائی ہوگی اور دوسری طرف وہ اتمامِ حجت کے لئے ہر ایک کو خبردار بھی کر دیتے ہوں گے کہ دیکھو ہم تمہارے لئے آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں، تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود لوگ ان کے پیش کردہ عملیات اور نقوش اور تعویذات پر ٹوٹے پڑتے ہوں گے۔

فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو۔ وہ سلطنتِ الہی کے کارپرداز ہیں۔ اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا خبر کہ اس وقت بھی ہمارے گرد و پیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آکر کام

لے رہے ہیں کہیں نہیں کہا کہ وہ فرشتے تھے۔

کر جاتے ہوں گے۔ رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز سکھانا جو بجائے خود بری تھی تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے دردی سپاہی کسی رشوت خوار حاکم کو نشان زدہ سکے اور نوٹ لے جا کر رشوت کے طور پر دیتے ہیں تاکہ اُسے عین حالتِ ارتکابِ جرم میں پکڑیں اور اس کے لئے بے گناہی کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں۔

(تفہیم القرآن۔ جلد اول صفحہ ۹۸ طبع ۱۹۵۱ء)

ہم اس تفسیر پر اپنی طرف سے کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ اسے ہم قارئین کی بصیرت پر چھوڑتے ہیں۔ البتہ ایک نکتے کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ :-

فرشتوں کے انسانی شکل میں آ کر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو

قرآن کریم میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف جنگوں میں ملائکہ کے نزول اور تائید کا ذکر آئے ہیں۔ اور ہر مقام پر یہ کہا گیا ہے ”كَهَئِذَا هَآءِ“ تم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔ (۹/۱۱۱ ذ ۹/۱۱۲)۔ یعنی قرآن کریم بالفاظ صریح کہہ رہا ہے کہ فرشتے (اور تو اور، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کبارؓ تک کو بھی) نظر نہیں آ سکتے تھے۔ اور مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ فرشتوں کے انسانی شکل میں آ کر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو۔ یعنی ان کے نزدیک ہاروت ماروت دو فرشتے تھے جو انسانی شکل میں، بابل میں لوگوں کو، خلاف حکم خداوندی، جادو کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اور اس کے لئے ”جو مصلحت خداوندی“ تھی اُسے آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔

یہ ہے نمونہ ان تفاسیر کا، جن کی رو سے قرآن کریم کو دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔



قرآن کریم کی روشنی میں اس آیت جلیلہ کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ ”وَإَتَّبِعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيْطَانُ عَلَىٰ مُلْكٍ سُلَيْمَانَ“ (۱۰۱)۔ ان (یہودیوں) کی کیفیت یہ تھی کہ یہ خدا کی صحیح تعلیم کو چھوڑ کر ان افسانوں کے پیچھے لگے رہتے تھے جو ان کے سرغنوں نے مملکتِ سلیمان کے خلاف تراش رکھے تھے۔ ان میں سے

ایک افسانہ یہ تھا کہ سلیمانؑ جیسا پیغمبر سحر آفرینیوں اور شعبہ بازیوں کو ماننے لگ گیا تھا۔ ایسا کرنا کفر ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کے رسول، کفر کا شیوہ تقیاً

نہیں کیا کرتے۔ اس لئے ”وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ“۔ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا۔ يَعْلَمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ (۱۰۱)۔ سلیمانؑ کفر کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔ ایسا کچھ اس کے مخالفین کہا کرتے تھے۔ جو لوگوں کو جادو

سکھایا کرتے تھے۔

(پھر قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ) یہ قصہ بھی، جو ان لوگوں میں مشہور ہے، صحیح نہیں کہ بابل میں کوئی دو فرشتے، ہاروت و ماروت تھے اور ان کی طرف وحی کے ذریعے سحر نازل ہوتا تھا جسے وہ لوگوں کو سکھاتے تھے۔ اعتراض سے بچنے کے لئے یہ لوگ اس افسانہ میں اتنا اضافہ کر دیتے ہیں کہ وَمَا يَعْلَمُونَ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ (۲/۱۰۱)۔ ”جب لوگ ان کے پاس جادو سیکھنے کے لئے آتے تو وہ ان سے کہتے کہ دیکھو ہمارا وجود تو ایک فتنہ ہے۔ تم کیوں کفر کی روش اختیار کرتے ہو؟ لیکن جب اس پر بھی لوگ باز نہ آتے تو وہ انہیں ایسے جادو ٹوٹکے سکھادیتے جن کے ذریعے وہ میاں اور بیوی میں تفرق پیدا کر دیں۔ یہ بھی افسانہ ہی ہے۔ بابل میں نہ ایسے کوئی فرشتے تھے اور نہ ان کی طرف بجانب اللہ کچھ نازل ہوتا تھا۔ نہ وہ لوگوں کو اس قسم کی تنبیہ کرتے تھے۔ یہ سب ان لوگوں کی افسانہ تراشیاں ہیں۔ جہاں تک اس عقیدے کا تعلق ہے کہ جادو ٹوٹکے کسی کو نقصان پہنچا دیتے ہیں تو یہ عقیدہ بھی سرے سے غلط ہے۔ نفع و نقصان تو قوانینِ خداوندی کی روپی سے پہنچا کرتا ہے نہ کہ اس قسم کی توہم پرستیوں سے (فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ - وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ (۲/۱۰۲)) ان کے مذہبی پیشوا، اس قسم کے افسانوں کے سہارے لوگوں کو جادو ٹوٹکے سکھاتے تھے۔ اسے انہوں نے اپنا ذریعہ معاش بنا رکھا تھا۔ یہ ایسے بیوقوف نہیں تھے کہ انہیں معلوم نہ ہو کہ جو شخص اپنا دین و ایمان بیچ کر کرب و غریب کی تجارت کرتا ہے، وہ یہاں تو چار پیسے کما لیتا ہے لیکن اخروی زندگی کی خوشگواہیوں میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلْقٍ (۲/۱۰۳) پس افسوس ہے ان کی اس خرید و فروخت پر کیا ہی بُری متاع ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کی نجات بیچ ڈالی۔ کاش وہ جانتے کہ وہ خود اپنے ہاتھوں کس طرح اپنے آپ کو برباد کر رہے ہیں (وَلَيْسَ مَا شَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۲/۱۰۴))

یہ ہے اس آیتِ جلیلہ کا صحیح مفہوم۔ اس میں حرفِ مآلے سارا مفہوم واضح کر دیا ہے۔ اس کی رو سے قرآن یہ کہتا ہے کہ اس قسم کی کوئی بات سرے سے غلطی ہی نہیں۔ یہ سب ان کا خود تراشیدہ افسانہ ہے۔ (حرفِ مآلے اس سارے افسانے کی نفی کر رہا ہے)۔

اور اگلی آیت میں ہے کہ :-

﴿۲۳﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ خَيْرٌ لَّوْكَانُوا يَعْلَمُونَ

”اگر اس قسم کی روش اختیار کرنے کی بجائے، منزل من اللہ صدقوں پر ایمان رکھتے اور اس قسم کی تباہ کن روش سے بچتے، تو انہیں خدا کے ہاں سے وہ کچھ ملتا، جو اس سے کہیں زیادہ گراں بہا ہوتا جو یہ ان فریب کاریوں سے کماتے ہیں۔ اے کاش! ایسی صاف اور سیدھی بات ان کی سمجھ میں آجاتی۔۔۔ بات تو صاف اور سیدھی ہے لیکن انسان کی مفاد پرستیاں اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔ یہی کچھ ان لوگوں کے ساتھ ہوا تھا۔“

❖

اس کے بعد آخری گوشہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ سحر (جادو) کی حقیقت کیا ہے اور قرآن مجید کا اس باب میں موقف کیا؟ اس جلد کے پہلے باب بتایا جا چکا

جادو کی حقیقت

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کارگہ کائنات کو پیدا کیا تو اس کے ساتھ ہی وہ قوانین بھی نافذ کر دیئے جن کے مطابق اسے سرگرم عمل رہنا تھا۔ ان قوانین کی اصل و بنیاد، قانون علت و معلول (LAW OF CAUSE AND EFFECT) ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہاں جو واقعہ بھی ظہور میں آتا ہے اس کا ایک سبب ہوتا ہے یا یہ کہ ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ ان قوانین کا علم حاصل کرنے کی صلاحیت انسان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے۔ یہ جس قدر ان قوانین کا علم حاصل کرتا جائے گا، نہرواقعہ کا سبب اس کی سمجھ میں آتا جائے گا۔ نوع انسان کی ابتدائی زندگی میں اس نے ہنوز یہ علم حاصل نہیں کیا تھا اس لئے اسے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا، کہ واقعات کا ظہور کس طرح سے ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا تھا کہ ایک اچھے بھلے آدمی کو سزا ہو گیا لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ بخار کیوں ہوا؟ اس کا سبب کیا ہے؟ اور جب اس کا سبب ہی اس کو سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا تو اسے یہ بھی کس طرح معلوم ہو سکتا تھا کہ اس کا ازالہ کس طرح کیا جائے؟ یہی کیفیت، نت نئے دن، خارجی کائنات میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات کی تھی۔ واقعات اس کے سامنے آتے تھے لیکن ان کے اسباب کا اسے کچھ علم نہیں ہوتا تھا۔ ان حالات میں وہ اس کے سوا اور کیا کر سکتا تھا کہ اپنے ذہن میں کچھ غیر مرنی قوتوں کا خیال پیدا کرے اور یہ سمجھ لے کہ ان واقعات کی خالق وہ قوتیں ہیں۔ انہیں آپ دیوی دیوتا کہہ لیجئے۔ سیلاب آتا تو اس کا یہ خیال اس سے کہتا کہ پانی کے دیوتا کو غصہ آگیا ہے جس کا نتیجہ یہ سیلاب ہے ان میں سے کچھ بزرگ لوگ ان رسوم کو سدا انجام دیتے تھے۔ ان رسومات کا نام پوجا پاٹ، پرستش یا (WORSHIP) تھا۔ ماہرین علم الانسان

(ANTHROPOLOGISTS) اسے ”عہد پرستش“ یا (AGE OF WORSHIP) سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ لوگ ان رسومات کو ادا کرتے تھے لیکن ان کے اپنے ہاتھ میں اقتدار کوئی نہیں تھا۔ جب ان کا ذہن آگے بڑھا تو انہوں نے ایک ایسا عقیدہ وضع کیا جس کی رو سے یہ قوت اور اقتدار ان کے ہاتھ میں آگئے۔ وہ عقیدہ یہ تھا (مثلاً) کسی شخص کو بخار آتا تو وہ کہتے کہ کسی دشمن نے کوئی ٹونا ٹوٹکا کیا ہے۔ ہم ایسا منتر جانتے ہیں جس سے اس شخص کا بخار بھی اتر جائے اور ٹونا کرنے والے کا بھی ستیاناس ہو جائے اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ کہتے کہ ہمارے پاس ایسا علم بھی ہے جس سے ہم دیوتاؤں کو بھی مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ ہماری مرضی کے تابع چلیں۔ اس عقیدہ کی رو سے یہ زیرک لوگ رفتہ رفتہ بہت سی غیر مرئی قوتوں کے مالک بن گئے۔ اس طرح مذہبی پیشوائیت یا (PRIEST-CRAFT) کا آغاز ہوا۔ پھر یہ علم انسان اس دور کو، ”دورِ سحر“ (AGE OF MAGIC) کہہ کر پکارتے ہیں۔

انسان کی طبیعت عجوبہ پسند واقع ہوئی ہے۔ جو واقعات التزاماً اور معمولاً اس کے سامنے آتے رہتے ہیں اس کا ذہن ان سے مانوس ہو جاتا ہے اس لئے ان میں نہ کچھ اجنبیت محسوس کرتا ہے نہ ہی وہ اس کے لئے وجہ حیرت بنتے ہیں۔ لیکن جن واقعات کے اسباب اس کی سمجھ میں نہیں آتے وہ اس کے لئے بڑے تھیرانگیز اور تعجب خیز قرار پاتے ہیں اور وہ بچوں کی طرح ان میں بڑی کشش اور جاذبیت، بلکہ لذت و انبساط محسوس کرتا ہے۔ تاریخ انسانی کے اولین دوروں میں انسان کی یہ عجوبہ پسندی ہر مقام پر ابھری ابھری نظر آئے گی وہ دور تو بعد میں ختم ہو گیا لیکن انسانی عجوبہ پسندی کا جذبہ اس کے ساتھ ختم نہیں ہوا۔ علم انسانی کے آگے بڑھنے کے ساتھ اس میں کمی ضرور واقع ہو گئی لیکن یہ یکسر معدوم نہیں ہو سکا۔ اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ جادو یا (MAGIC) کا لفظ آج بھی بڑے بڑے دانشوروں تک کے لئے کشش اور لذت اندوزی کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے۔

یوں تو (MAGIC) کا لفظ اشارہ کناں ہے کہ اس کی ابتداء مجوس (MAGIS) کے ہاں سے ہوئی۔ لیکن عصرِ حاضر کی تحقیق کا رخ اس طرف ہے کہ اسے سب سے پہلے ایک باضابطہ علم یا فن کی صورت قدیم مصری مذہب نے عطا کی۔ وہاں سے یہ یونان کی طرف گیا اور اس کے بعد بائبل میں (جو بعد میں) اس کا مشہور مرکز قرار پا گیا۔ یونان میں اس کی نسبت ایک افسانوی نام (HERMES TRISMAGISTUS) کی طرف کی گئی ہے۔ جہاں سے اسے (HERMETIC SCIENCE) کا نام ملا ہے۔ یہ فن مشرق کے ظلمتِ کدوں میں ابھی تک اسی قدیم نقاب میں لپٹا چلا آتا ہے۔ لیکن ممالکِ یورپ میں سحر و نیروجات (OCCULTISM) نے ایک سائنس کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے اور اس کی سوسائیاں مختلف مقامات پر موجود ہیں۔

عالمِ سحر کے معتقدین کا عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے حواس کی دنیا سے ماوراء، ایک عالمِ مثال (ASTRAL WORLD) ہے جس میں تمام موجوداتِ عالم (افراد و حوادث) کے عکس موجود رہتے ہیں۔ وہاں ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی تخصیص نہیں۔ ماضی اور حال کے افراد و حوادث کی طرح مستقبل کے افراد و حوادث بھی اپنی عکسی صورت میں اس عالمِ مثال میں موجود رہتے ہیں اور وہاں سے اس کائنات کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔ عالمِ مثال اور ہمارے اس حواس کی دنیا میں باہمی تعلق ایک آفاقی عامل (UNIVERSAL AGENT) کے ذریعے قائم ہے۔ (اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے ہمارے کرۂ ارض کے گرد ریڈیائی لہریں موجزن ہیں اور وہ ہر کہربائی حرکت کو ایک ثانیہ میں ہر مقام پہنچا دیتی ہیں) یہی وہ عامل ہے جو ایک شخص کے خیالات کی دنیا کو دوسرے شخص کے ”عالمِ تخیل“ سے مربوط کرتے ہوئے ہے خواہ ان میں کتنا ہی بُعدِ مکانی کیوں نہ ہو۔ اب صرف کرنا یہ ہوتا ہے کہ اس عامل کو اپنا ہمנו بنا لیا جائے۔ جو ایسا کرے، ماضی، حال اور مستقبل کی تمام قوتیں اس کے اشاروں پر ناپیں گی۔ اور وہ باتیں ظہور میں آئیں گی جو کسی کی عقل و فکر میں نہ آسکیں۔ اسی کا نام سحر، افسوں، طلسم، نیرنجات ہے۔ اس عامل سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے انسان کو اپنی داخلی قوتوں کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنا ضروری ہے۔ اور یہ ان ریاضتوں اور مشقتوں سے ہوتا ہے جو اس ”سائنس“ میں قدیم سے چلی آتی ہیں۔ یہ ہیں مختصر بنیادیں جن پر اس فن کی ساری عمارت قائم ہے۔ عام طور پر سمجھا ہی جاتا ہے کہ اس فن سے مقصود فقط شعبہ بازی ہے لیکن اس کے معتقدین کا عقیدہ یہ ہے کہ شعبہ بازی تو فقط راستے کے مناظر ہیں۔ یہ دراصل ادراکِ حقیقت کا ذریعہ ہے کیونکہ ان کے نزدیک حقیقت، وہی عالمِ مثال ہے اور اس کا ادراک اسی طریق سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے قدیم زمانہ میں فنِ سحر نے ایک مذہبی حیثیت اختیار کر رکھی تھی۔ اور اب بھی مشرق میں اسے عام طور پر یہی حیثیت حاصل ہے۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی کہ اس فن کی تمام تر بنیاد اس پر ہے کہ انسان اپنی داخلی قوتوں کو اس قدر نظم و ضبط میں لے آئے کہ اس سے اس قسم کی خلافِ معمول (خارقِ عادات) باتیں ظہور میں آنے لگ جائیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ ”داخلی قوتیں“ کیا ہیں جنہیں ایک نقطہ پر مرکوز کرنا ان کا مطیع نگاہ ہوتا ہے۔

علمائے نفسیات (PSYCHOLOGISTS) کی تحقیق ہے کہ انسان کی قوتِ متخیلہ یا قوتِ ارادی

(WILL POWER) کو مختلف طریقوں سے بڑھایا جاسکتا ہے۔ غالب قوتِ ارادی والا انسان، اپنے سے کمزور قوتِ ارادی والے انسان کو اپنی قوت سے متاثر کر سکتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے حواس اس کی مرضی کے تابع کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ یعنی اس کی آنکھیں وہی کچھ دیکھتی ہیں جو یہ دکھانا چاہے۔ اس کے

کان وہی کچھ سنتے ہیں جو یہ سنانا چاہے و قس علیٰ ہذا۔ انسان کے حواس اس کے ذہن کے تابع ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب آپ کسی گہری فکر میں مستغرق ہوں تو آپ کے سامنے سے کوئی گزر جاتے، آپ کو خبر تک نہیں ہوتی حالانکہ آپ کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں۔ اس لئے قوتِ غالب والا انسان دراصل کمزور قوت والے انسان کی دماغی قوت کو مغلوب کر لیتا ہے اور اس طرح اس کے حواس خود بخود اس کی قوت کے تابع کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ اب اگر یہ چاہے کہ ایک پتھر کا ٹکڑا اُسے سونا بن کر دکھائی دے تو وہ اسے سونا ہی دیکھے گا اور سونا ہی سمجھے گا۔ یا یہ کہ اس کا دماغ درد کا احساس نہ کرے تو وہ اس کا احساس چھوڑ دے گا، جیسے کلوروفارم کے اثر کے ماتحت دماغ سے قوتِ احساس معطل ہو جاتی ہے۔ یہ ہے وہ بنیاد، جس پر سحر و فسون کی تمام مجیر العقول اور نگاہِ ضریبِ عمارت استوار ہے (STEINER) اپنی کتاب (THE WAY OF INITIATION) میں لکھتا ہے:-

ہر انسان میں ایسی مخفی قوتیں موجود ہیں جن کی مدد سے وہ عالم بالا کا علم حاصل کر سکتا ہے۔۔۔۔۔ جب سے فوج انسانی کی ابتداء ہوئی ہے ایسے اسکول موجود رہے ہیں جن میں وہ لوگ، جن کی یہ قوتیں بلند سطح پر موجود تھیں، ان لوگو کو یہ کچھ سکھاتے تھے جو اس کی تلاش میں تھے۔

فین سحر کا بہت بڑا محقق (ELIPHAS LEVI) لکھتا ہے :-

جس طرح جسمانی ورزشوں کے ذریعہ سے انسان اپنی جسمانی قوتوں کو محیر العقول درجہ تک لے جا سکتا ہے اور قائم رکھ سکتا ہے اسی طرح ”ردحانی“ قوتوں کا حال ہے کیا آپ اپنے آپ پر اور دوسروں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں؟ اگر کرنا چاہتے ہیں تو یہ سیکھئے کہ اپنی قوتِ ارادی کو کس طرح استعمال میں لایا جاسکے۔ فنِ سحر کا سب سے پہلا راز یہی ہے اور اس راز کی بنیادوں کو محکم بنانے کے لئے قدیم استادانِ فن نے یہ طریق اختیار کر رکھا تھا کہ اپنی خاتقاہوں کے ارد گرد ایسی ایسی نگاہ فریب اور بھیاں تک صورتیں پیدا کر چھوڑتے تھے کہ جوشِ گداس فن کے سیکھنے کے لئے اس حلقہ میں داخل ہونا چاہتا، اس کی قوتِ ارادی کا پہلے ہی امتحان ہو جاتا اور اس کے بعد اسے ایسی ایسی مشقت آمیز ریاضتوں سے گزارا جاتا جن سے اس کی قوتِ محکم سے محکم تر ہوتی جاتی۔

ان بیانات کے پیش نظر (EVELYN UNDERHILL) نے اپنی کتاب (MYSTICISM) میں لکھا ہے "فن سحر کے دورِ حاضرہ کے استادوں کے نظریہ کی رو سے یہ فن اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ قوتِ ارادی کو اس

کی عام حدود سے آگے بڑھا دیا جائے۔ لہذا سحرکاری یہی ہے کہ ذہن کو خاص نظم و ضبط کے ماتحت لاکر قوتِ ارادی کو ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا جائے۔ جب قوتِ ارادی میں اس قسم کا نظم و ضبط پیدا کر دیا جائے تو یہ کیا کیا کرشمے دکھا سکتی ہے، اس کے متعلق (E. TOWENER) اپنی کتاب (JOY-PHILOSOPHY) میں لکھتا ہے:-

ذرا تصور میں لائیے کہ یہ تمام کائنات اور ستاروں کا ہجوم سب کے سب چشمِ براہ ہیں کہ آپ انہیں کیا حکم دیتے ہیں۔ پھر تصور میں لائیے کہ آپ کو فقط ایک بٹن دبانا ہے اور اس کے بعد جو کچھ آپ کہیں گے یہ کریں گے۔ جو نہی آپ نے کہا کہ میں یہ کچھ کر سکتا ہوں اور میں یہ کر کے دکھاؤں گا۔ کائنات کی تمام قوتیں آپ کے اشارے پر ناپچنے کے لئے تیار ہوں گی۔

قوتِ ارادی کو بیدار اور مستحکم کرنے کے لئے عجیبے غریب طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ سب سے بڑی چیز اسے ایک نقطہ پر مرکوز کرنا (CONCENTRATION) ہے۔ اس کے لئے مراقبے کرائے جاتے ہیں۔ مختلف الفاظ اور فقرات کو خاص طریقوں سے دہرایا جاتا ہے۔ بڑی بڑی مشقتیں اور ریاضتیں اٹھانی پڑتی ہیں (LEVI) لکھتا ہے:-

یہ تمام شکلیں اور ان کی مثل حرکات و سکنات۔ یہ تمام اعداد و شمار اور حروف و الفاظ، مقدس فقرے، منتر، تعویذ سب قوتِ ارادی کی تربیت کے ذرائع ہیں جن سے یہ قوتیں ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور اس طرح متخیلہ کی تخلیقی قوتوں کو محکم بنا دیتی ہیں۔ ایک عمل، خواہ وہ کتنا ہی توہم انگیز اور جہالت آمیز کیوں نہ نظر آتا ہو، مؤثر ہو سکتا ہے کیونکہ اس سے قوتِ ارادی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

عملیات کے ذریعے مریضوں کا علاج کرنے کے متعلق یہی محقق لکھتا ہے:-

عامل کی تمام قوت کا راز یہی قوتِ ارادی ہے اور اس کا کمال فقط یہ ہے کہ وہ مریض کے دل میں اپنی عقیدت پیدا کر دے۔

یہ ہے فنِ سحر کی بنیاد۔ یعنی قوتِ ارادی اور متخیلہ کے کرشمے۔ جس شخص پر اس قوت کو اثر انداز کیا جاتا ہے وہ، وہی کچھ دیکھنے اور سمجھنے لگ جاتا ہے جو کچھ اسے دکھایا اور سمجھایا جائے۔ یعنی جو کچھ اسے دکھائی دیتا ہے وہ فی الواقعہ ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ محض فریبِ نگاہ ہوتا ہے۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ”سحرِ بابل“ کے عنوان میں بتایا جا چکا ہے، ان توہم پرستیوں کا آغاز تو بابل اور اس کے گرد و پیش کی سرزمین سے ہوا لیکن یہودی اور باطنیت

اس سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ شروع شروع میں انہوں نے اسے اس کے اصلی نام — سحر — (جادو) ہی سے پکارا لیکن جب یہ نام بدنام ہو گیا اور یہ شعبہ بازی سمجھا جانے لگا تو ان کے اخبار و رہبان نے ضروری سمجھا کہ اسے کوئی مقدس لبادہ اوڑھادیا جائے۔ انہوں نے اسے باطنیت کہہ کر پکارا۔ انگریزی زبان میں اسے — (MYSTICISM) کہا جاتا ہے اور ہمارے ہاں یہ ”تصوّف“ کے نام سے مشہور ہے۔ آئندہ سطور میں، ہم باطنیت اور تصوّف کو مرادف معنوں میں استعمال کریں گے۔ اس وضاحت کے ساتھ آگے بڑھیے۔

یہودیت، ظواہر پرستی کا مذہب ہے۔ اس لئے اس میں باطنیت کی گنجائش بہت مشکل تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس کی پہلی تباہی کے بعد بابل کی اسیری کے زمانے میں، جب یہ قوم اپنے ضعف و انحطاط کی انتہا تک پہنچ چکی تھی، ان میں بھی کچھ کچھ باطنیت کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے۔ چنانچہ اس دور میں ان کے ”نبیوں“ (PROPHETS) کے احوال و ظروف کچھ ایسے ہیں جیسے باطنی خلوت گاہوں میں ارباب تصوّف کے ہوتے ہیں۔ اسی قسم کا اسلوب زندگی، وہی انداز گفتگو۔ اسی طرح کے مکاشفات اور الہامات۔ اسی نوع کی پیش گوئیاں۔ لیکن حقیقی تصوّف ان میں اس کے بعد جا کر آیا جب ان کے مذہبی پیشواؤں نے اسکندریہ میں یونانی فلسفہ کا مطالعہ کیا اور وہاں اس فلسفہ اور اپنے معتقدات کے امتزاج سے ایک نیا مذہب ایجاد کیا۔ فیلو (PHILO) اس مذہب کا امام ہے۔ تصوّف کا ابوالابار در حقیقت افلاطون (PLATO) کو سمجھنا چاہتے۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ علم السحر کے معتقدین کا عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے حواس کی دنیا سے ماوراء ایک عالم امثال ہے۔ یہ تصور در حقیقت سب سے پہلے افلاطون نے پیش کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس عالم محسوس کے اوپر ایک عالم امثال ہے۔ وہ عالم حقیقی وجود رکھتا ہے اور یہ عالم محض اس کا برتو ہے۔ اس عالم میں جو کچھ ہے اور جو کچھ ہوتا ہے اس کی حقیقت سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس حقیقی عالم کے متعلق علم، حواس کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا، باطنی طریق سے حاصل ہو سکتا ہے۔ افلاطون کے اس فلسفہ کی نشاۃ ثانیہ، بعد کے فلاسفوں کی ایک جماعت کے ہاتھوں ہوئی جن کا امام فلوطینس (PLOTINUS) تھا۔ ان فلاسفرز میں ایک (APOLLONIUS OF TYANA) نے ہندوستان کا سفر کیا اور وہاں کے برہمنوں سے ویدانت (ہندی تصوّف) سیکھا۔ فلوطینس، رومی شکر کے ساتھ ایران گیا اور وہاں کے نغوں سے مجوسی تصوّف کی تعلیم حاصل کی اس کے بعد ان فلاسفوں نے فلوطینس کی زیر سرکردگی افلاطون کے فلسفہ قدیم کے متعلق، ضمناً، جلد اول (آیات ۱/۱۱۲ ذ ۲۳۳ ذ ۲/۳۸ ص ۳۵۱) اور جلد دوم (آیات ۲/۳۸ ذ ۲/۵۵) میں ذکر اچکا ہے۔ یہاں ایک اور زاویہ نگاہ سے اس کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔

کو، ان ہندی اور ایرانی تصورات کے ساتھ ملا کر، ایک جدید قالب میں ڈھالا۔ اس کا نام نوسنلاطونی فلسفہ (NEO-PLATONISM) ہے۔ اس فلسفہ کا مرکز اسکندریہ تھا اور یہیں اس سے قبلو کا یہودی تصوف متاثر ہوا۔ اس تصوف کا سربس پہلا اثر یہ تھا کہ تورات کی شریعت، باطنیت میں بدل گئی۔ چنانچہ یہودی تصوف کی سب سے اہم کتاب زہار میں ہے کہ:-

تورات کی روح در حقیقت اس کے باطنی معنوں میں پوشیدہ ہے۔ انسان ہر مقام پر خدا کا جلوہ دیکھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ تورات کے باطنی معانی کا راز پا جائے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے لگ جائے۔

تورات کی شریعت، ہر بنی اسرائیل کے لئے کھلی تھی لیکن تورات کے باطنی معانی صرف خواص تک محدود ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ مشنا (کتاب حقیقت) میں لکھا ہے کہ:-

کتاب پیدائش کے باطنی معنی کی تعلیم ایک وقت میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو نہیں دی جانی چاہئے، اس کی سخت ممانعت ہے۔ اور کتاب حزقیل کے پہلے باب کی تعلیم تو ایک آدمی کو بھی نہیں دینی چاہئے، تاوقتیکہ اس نے مقام ولایت حاصل نہ کر لیا ہو۔

ان کا عقیدہ یہ تھا کہ تورات کے اصلی معانی اس کے الفاظ سے نہیں مل سکتے۔ ان کی گہرائیوں تک پہنچنے کا ایک اور طریقہ ہے جو عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ وہ کہتے تھے کہ عبرانی زبان کے حروف ابجد میں عجیب و غریب تاثیر ہے اور انہیں خاص طریقوں سے اکٹھا کرنے اور دھرانے سے تورات کے الفاظ کے باطنی معانی معلوم ہو جاتے ہیں۔ نیز ایک سے دس تک کے عدد بھی یہی خواص و تاثرات رکھتے ہیں۔ ان حروف اور اعداد کے متعلق کتاب زہار میں ہے کہ:-

خدا نے ان کے نقوش تیار کئے۔ پھر ان کے سانچے بنائے۔ ان کا وزن کیا۔ ان میں ادل بدل کیا۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ ملایا اور ان کے پر اسرار مجموعوں سے کائنات کی ہر شے کی روح پیدا کی۔ چنانچہ کائنات میں جو کچھ بھی موجود ہے وہ بھی انہی کی قوت کے سہارے قائم ہے اور جو کچھ پیدا ہوگا، وہ بھی انہی کے ذریعے پیدا ہوگا۔

ان حروف اور اعداد کا باطنی علم، علم حقیقی ہے اور اس سے انسان پر، اسرار درموزہ کائنات اور تورات کے حقیقی مفہوم کی راہیں کھلتی ہیں۔ جس پر یہ راہیں کھلتی ہیں اس سے عجیب و غریب کرامات صادر ہونے لگ جاتی ہیں چنانچہ ان کے

”رَبَّانِی صُوفِیوں“ (RABBANIC MYSTICS) کی شعبہ بازیوں کے عجیب و غریب قصے مشہور ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ سبت کی شام، رموز کائنات کے حل کرنے میں مصروف ہوتے۔ بھوک لگتی تو ایک تین سالہ بچہ نمودار ہو جاتا جسے وہ کھا جاتے۔ وقس علیٰ ہذا۔ ان کے یہ ارباب تصوف اپنے ہاں کی الہامی کتابوں کی تاویلات اپنے ذاتی مکاشفات کرتے اور خوابوں کی تعبیرات سے زندگی کے مسائل کا حل بتاتے اور آنے والے واقعات کی خبریں دیتے۔ آپنے دیکھا کہ عہدِ قدیم کا وہی سحر، کس طرح نئے روپ میں نمودار ہو گیا۔

جب عیسائیت کا ظہور ہوا تو تصوف یہودیوں میں عام تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم (خدا کے سچے نبی کی تعلیم کی طرح) ان خرافات کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہودی پیشوا ان کی جان تک کے دشمن ہو گئے۔ لیکن ان کی تشریف براری کے بعد خود عیسائیت یہی کچھ بن کر رہ گئی۔ ایک تو اس لئے کہ جو لوگ عیسائی ہوتے تھے وہ پہلے یہودی ہی تھے اور دوسرے اس لئے کہ عیسائیت اپنے ابتدائی دور ہی میں سخت نامساعد حالات کا شکار ہو گئی، اس لئے اسے بہت جلد، مجاہدانہ سعی و عمل کو چھوڑ کر، تصوف کی قرار گاہ میں پناہ لینی پڑی۔ بہر حال، اب ہم عیسائیت کی طرف آتے ہیں۔

عیسائیت میں پہنچ کر باطنیت نے ایک منظم مسلک (ORGANISED SYSTEM) کی شکل اختیار کر لی۔ اب باقاعدہ خانقاہیں قائم ہو گئیں۔ ان کے قواعد

عیسائیت اور تصوف

ضوابط وضع ہوئے۔ ان میں داخلہ کی شرائط مقرر ہوئیں۔ ان کے اندر زندگی بسر کرنے کے طور و طریق متعین ہوئے جن پر نہایت سختی سے پابندی لازمی ٹھہرائی گئی۔ اس روحانی ترقی کے لئے مختلف قسم کی ریاضتوں اور مشقتوں کے ذریعے تجرینے ہوئے۔ جگہ جگہ مختلف ادلیار (SAINTS) نے اپنے حلقے اور مراکز قائم کئے اور اس طرح پورا مذہب باطنیت کی آماجگاہ بن گیا۔ اب ہر مقام پر اس قسم کے الفاظ دہرائے جانے لگے کہ :-

اگر تم حواس کے دروازے بند کر کے دل کی آنکھیں کھولو۔ اگر تم جسمانی لذائذ سے منہ موڑ کر روحانی کیفیات کا پیچھا کر دو تو تم خدا کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لو گے۔ جب آدم اور حوا کی جسمانی آنکھیں کھلی ہیں تو ان کی روحانی آنکھیں بند ہو گئی تھیں لیکن اس کے بعد یسوع مسیح آیا کہ جن کی آنکھیں بند ہیں وہ دیکھنے لگ جائیں اور جو دیکھ رہے ہیں ان کی آنکھیں بند ہو جائیں۔ بس یاد رکھو! حواس کی آنکھیں بند اور دل کی آنکھیں کھولنے سے خدا اور اس کا اکلوتا بیٹا بے نقاب ہو کر سامنے آسکے گا۔

(ST. ORIGIN)

اس مقصد کے لئے ترک دنیا، ترک علاقہ، ترک خیالات، ترک آرزو، غرضیکہ ”روحانیت“ کے علاوہ ہر شے کا ترک، ضروری قرار پا گیا اور حقیقی زندگی اسے سمجھا گیا جس میں انسان ہر وقت — گوش بند و چشم بند و لب بہ بند — کی حالت میں مراقبہ میں بیٹھا رموز و اسرار کائنات کے جلوے دیکھتا رہے۔

وہ عالم غیب، وہ دنیائے نور، وہ بلند سے بلند تر مقام، جہاں سادہ، غیر متبدل اور مطلق حقیقتیں، طہنیت کی مضر خاموشیوں کی نورانی قبائیں میں لپٹی ہوئی ہیں۔ ان کے جلوے، دیدہ ظاہر ہیں سے نہیں دیکھے جاسکتے۔ انہیں دیکھنا چاہتے ہو تو اپنے حواس کو بھی پیچھے چھوڑ دو اور عقل و خرد اور شعور و ادراک کو بھی۔ یعنی ہر اس چیز کو جو عقل و حواس کے ذریعے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ خواہ وہ موجود ہے یا غیر موجود۔ سب کو چھوڑ دو اور اپنے آپ کو اس میں جذب کرنے کی کوشش کرو جو ان تمام حدود و قیود سے ماورا رہے۔ یاد رکھو! اگر تم میں ان نسبتوں میں سے کوئی نسبت بھی باقی رہی جن سے وہ ماورا رہے تو تم اس تک نہیں پہنچ سکو گے۔ اس کے نور کی شعاع، کامل تاریکی میں نظر آیا کرتی ہے، کامل تاریکی میں۔ (DONYSIUS)

اس کے لئے ترک دنیا، مرشد کی اطاعت، خاموشی اور انکساری اولین شرائط ہیں۔ (ST. BEDICT)۔ ان طریقوں سے ایک تارک الدنیا زاہد کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ :-

اسے ایک نور کی چادر اوڑھادی جاتی ہے۔ اس کے دل سے روشنی کی کرن پھوٹتی ہے جو اور زیادہ گہری اور تیز روشنی کی طرف اس کی راہنمائی کرتی ہے تا آنکہ وہ دریائے نور میں غرق ہو جاتا ہے۔ اب اسے اپنے آپ پر بھی کوئی اختیار نہیں رہتا۔ وہ دنیا داروں کی نگاہوں میں پاگل اور وحشی سا نظر آنے لگتا ہے لیکن درحقیقت وہ تکمیل نفس کی منزلیں طے کر رہا ہوتا ہے۔ اور تمام اسرار و رموز کے پرے اس کی آنکھوں سے اٹھتے جاتے ہیں اور آخر الامر وہ خود حقیقت مطلق میں جذب ہو جاتا ہے۔ (ST-MACARIUS)

خدا اور انسانی روح کے اہم تعلق کو (ORIGEN) ”عربی تعلق“ کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے دوسرے ولی (SAINTS) بھی اسے ”آسمانی دلہن“ (HEAVENLY SPOUSE) کہہ کر پکارتے ہیں۔ چونکہ اس طرح زہد و انزوا کی زندگی بسر کرنے والے، لوگوں کی نگاہوں میں بے حد مقبول اور واجب التعظیم قرار پاتے تھے اس لئے رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ لوگ فوج در فوج اس مسلک کی طرف بڑھنے شروع ہو گئے۔ چنانچہ چوتھی صدی عیسوی میں حالت یہ ہو چکی تھی کہ بستیاں خالی ہو رہی تھیں اور خانقاہیں آباد۔ شام اور فلسطین کے علاقے خاص طور پر اس مشرب خانقاہیت کے مراکز تھے۔

ہم نے یہاں، ایران اور ہندوستان کی باطنیت کا ذکر قصداً نہیں کیا۔ اس لئے کہ ہم ”تصوف کی تاریخ نہیں لکھ رہے ہیں۔ ہم بتانا صرف یہ چاہتے ہیں کہ سحر (جادو) کی توہم پرستیوں نے پہلے یہود و نصاریٰ کو اور اس کے بعد مسلمانوں کو کس طرح متاثر کیا، اور کس طرح، یہ چیزیں مذہب کی روح (دین کا مغز) بن کر ان تمام اہل مذاہب کے اعصاب پر مسلط ہو گئیں۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، قرآن آیا اور اس نے آکر دلائل و اشکات الفاظ میں بتایا کہ کائنات میں کوئی سر مستور نہیں، کوئی راز خفی نہیں، کوئی باطنی علم نہیں۔

قرآن اور باطنیت

خالق کائنات کے مقرر کردہ قوانین ہیں جن کی رو سے ہر معلول (EFFECT) ظہور میں آتا ہے۔ ان قوانین کا علم حاصل کرنا انسان کا فریضہ ہے۔ وحی خداوندی نے اس حقیقت کا چھٹی صدی عیسوی میں پہلی مرتبہ اعلان نہیں کیا۔ اس نے سلسلہ رشد و ہدایت کی داستان کا آغاز جس نبی کے تذکرہ سے کیا ہے اس کے ضمن میں اس حقیقت کی بھی وضاحت کر دی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ ابتدائے انسانیت کا دور تھا۔ اُسے آپ دور پرستش میں شمار کر لیجئے۔ یا عہد سحر میں، ہر حال تھا وہ انسانی جہالت کا دور، جس میں وہ ہنوز قانون کے تصور سے نا آشنا تھا۔ وہاں سیلا آیا تو حضرت نوحؑ نے یہ نہیں کہا کہ کیسی دیوی دیوتا کی کف دہانیاں ہیں۔ نہ ہی یہ کہا کہ میں اسے اپنی کسی مخفی قوت کے ذریعے روک دیتا ہوں۔ انہوں نے وحی کے زیر ہدایت کشتی بنائی۔ کشتی اس قانون خداوندی کی مظہر ہوتی ہے کہ مساوی عجم پانی کے شے، پانی پر تیرتی رہتی ہے۔ لہذا انہوں نے اس قانون خداوندی کی رو سے سیلاب کی تباہیوں سے بچاؤ کی صورت اختیار کی۔ وحی کا یہ سلسلہ جاری رہا اور قرآن کریم میں آکر تکمیل کو پہنچا جہاں اس نے قدم قدم پر بتایا کہ یہاں خدا کے غیر متبدل قوانین کی کار فرمائی ہے۔ کار گاہ کائنات میں محبوبہ پسندی اور شعبہ بازی کو کوئی دخل نہیں۔ جہاں تک انسان کی اپنی زندگی کا تعلق ہے اس کے لئے بھی اس کتاب عظیم میں، واضح الفاظ میں راہنمائی کے لئے اصول و قوانین عطا کر دیئے ہیں ان میں بھی کوئی سر مستور نہیں۔

..... کوئی راز پس پردہ نہیں۔ قرآن کریم، عربی زبان کی ایک واضح کتاب ہے جس کا مفہوم علم و بصیرت اور فکر و تدبیر کی رو سے سمجھا جاسکتا ہے۔ لہذا اس کتاب عظیم کی ماننے والی قوم میں باطنیت کا تصور تک بھی بار نہیں پاسکتا تھا لیکن، آپ ہی نہیں، دنیا اس حیرت انگیز ”حادثہ“ پر انگشت بدنداں ہے کہ یہ قوم بھی باطنیت کا شکار ہوئی اور دیگر اہل مذاہب کے بھی کہیں زیادہ شدت کے ساتھ شکار۔ ہمارے ہاں اس باطنیت کو تصوف کہہ کر پکارا گیا۔ ۱۰

۱۰۔ میں نے جادو۔ باطنیت۔ تصوف کے موضوعات پر اپنی مختلف تصانیف میں لکھا ہے۔ اس باب میں ان کا ملخص ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔

مسلمان اور تصوف | جہاں تک اس لفظ تصوف کا تعلق ہے اور تو اور خود صوفیاً بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ اس کے بنیادی معانی کیا ہیں اور صوفی کو صوفی کیوں کہتے ہیں۔ بعض اس لفظ کو (صحابہ صنفہ کے نام سے ماخوذ سمجھتے ہیں یعنی روایات کے مطابق) وہ صحابہؓ جو مدنی زندگی کے ابتدائی ایام میں پناہ گزینوں کی طرح بے سروسامانی کی حالت میں، مسجد نبویؐ کے ایک چوترے پر رہا کرتے تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ صفا سے مشتق ہے۔ بعض اسے یونانی لفظ صوفیاء (SOPHIE) سے ماخوذ سمجھتے ہیں جس کے معنی عقل و دانش کے ہیں اور جو فلسفہ (PHILOSOPHY) کی ترکیب میں شامل ہے لیکن اکثر کا خیال ہے کہ یہ لفظ اون کی نسبت سے وضع کیا گیا ہے کیونکہ یہ لوگ اون کے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں میں پہلا شخص، جو صوفی کے لقب سے مشہور ہوا، ابو ہاشم عثمان بن شریک تھا اور صوفیوں کی پہلی خانقاہ سنہ ۱۷ھ میں رملہ کے قریب (جو فلسطین میں واقع ہے) قائم ہوئی۔ ابو ہاشم کو ذکاوت کا رہنے والا تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر رملہ کی خانقاہ میں آگیا۔ یہاں سنہ ۶۸ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ اگرچہ صوفیوں کی پہلی خانقاہ فلسطین میں قائم ہوئی جو عیسائیوں کے مسلک خانقاہیت کا مرکز تھا۔ لیکن تصوف کے بنیادی تصور کو اسلام میں ایرانیوں نے داخل کیا۔ مسلمانوں نے ایرانیوں کو جتنی بڑی شکست دی تھی وہ اس کا بدلہ جنگ کے میدان میں نہیں لے سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے دوسرے میدان تجویز کئے۔ وہ مسلمان ہو کر اسلامی مملکت کے بڑے بڑے شہروں میں آ گئے اور یہاں پہنچ کر اپنے آبائی معتقدات کو عام کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کی قوت کا راز قرآن کی تعلیم میں ہے اس لئے وہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمان کو قرآن سے بیگانہ نہ بنایا جائے اس کی قوت میں ضعف نہیں آسکتا۔ وہ قرآن کے الفاظ کو چھیڑ نہیں سکتے تھے اس لئے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا تھا اور اس کا انتظام بڑا سخت تھا۔ لہذا انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس کے الفاظ تو دہی رہیں لیکن ان الفاظ کا مفہوم بدل جائے۔ اس کے لئے ایک طریقہ تو یہ تھا جسے (مثلاً جیسا کہ پہلے بیان کیا چکا ہے) مفسر طبری نے اختیار کیا۔ یعنی ہر آیت کی تفسیر کے لئے کوئی نہ کوئی روایت وضع کر لی اور اس آیت کے معنی اس روایت کی رو سے یہ کہہ کر کر دیتے کہ یہ معنی خود رسول اللہؐ نے بیان فرمائیں۔ لہذا قرآن کریم کے الفاظ تو دہی رہے لیکن ان الفاظ کا مفہوم کچھ سے کچھ ہو گیا۔ یہی مفہوم ہے جو ہمارے ہاں اس وقت سے آج تک متواتر چلا آ رہا ہے۔ دوسری طرف انہوں نے یہ خیال پھیلانا شروع کر دیا کہ قرآن کے اصلی معنی اس کے الفاظ سے متعین نہیں ہو سکتے۔ اس کے الفاظ کے نیچے ایک باطنی مفہوم ہے جو قرآن کا مغز اور اس کی روح ہے۔ وضعی روایات کی رو سے قرآن کی تفسیر کا سلسلہ آگے نہیں

چل سکتا تھا، کیونکہ روایات جس قدر بنانی ممکن تھیں، اس زمانہ میں بن گئیں لیکن اس باطنی طریق سے تفسیر کا طریق ہمیشہ کے لئے جاری رہ سکتا تھا۔ چنانچہ یہ سلسلہ جاری ہوا اور آج تک جاری ہے۔ یہ اس طریق سے اسلام کو جو نقصان پہنچا اس کے متعلق علامہ اقبالؒ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت (SUBTLE) طریق تفسیر کا ہے اور یہ طریق وہی قومیں اختیار کیا یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت کو سفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبعیتاً موجود تھا۔ اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصے تک اس کا نشوونما نہ ہونے دیا تاہم وقت پاکر ایران کا آباء اور طبعی مذاق ابھی طرح سے ظاہر ہوا۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعرا نے نہایت عجیب غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تفسیر کی ہے۔ (اقبالؒ، جلد اول صفحہ ۴۵)

اس مقام پر شاید بعض حضرات کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ قرآن کریم جیسی واضح، یقین، کتاب منیر کی موجودگی میں مسلمانوں میں اس قسم کے عقائد راسخ کیسے ہو گئے۔ اس کے لئے ایک بڑا خوبصورت اور ”مقدس“ طریقہ اختیار کیا گیا۔ (جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے) یہ کہا گیا کہ رسول اللہؐ کو وحی کے علاوہ الہام بھی ہوتا تھا۔ اسے وحی خفی یا وحی غیر متلو کا نام دیا گیا (واضح رہے کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں مسلمان، ان اصطلاحات سے آشنا تک نہ تھے) اس عقیدہ نے دو کام کئے۔ ایک طرف ان روایات کو وحی کا درجہ حاصل ہو گیا جو قرآن کی تفسیر یا ”اسلام کی تکمیل“ کے لئے وضع کی جا رہی تھیں اور دوسری طرف قرآن کے باطنی مفہوم کے لئے سند ہاتھ آ گئی۔ اس کے علاوہ انہیں اس سے ایک اور بڑا فائدہ ہو گیا۔ ان لوگوں کو خدشہ یہ تھا کہ اگر باب شریعت کی طرف سے باطنی مفہوم کی مخالفت ہوگی، لیکن جب ارباب شریعت نے اس اصول کو مان لیا کہ رسول اللہؐ کو وحی کے علاوہ الہام بھی ہوتا تھا اور ختم نبوت کے معنی سلسلہ وحی کا ختم ہو جانا ہے، نہ کہ سلسلہ الہام کا۔ تو وہ اصولاً اہل باطن کی مخالفت کر ہی نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ اس قسم کی روایات خود ہماری کتب احادیث میں موجود ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ رسول اللہؐ نے مجھے دو برتن

۱۔ باطنی معانی کی رو سے قرآن کریم کی متعدد تفاسیر لکھی گئیں۔ اس مسلک کے سرخیل ”شیخ اکبر“ محی الدین ابن عربی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے باطنی معانی پر مشتمل سو جلدوں میں تفسیر لکھی تھی۔

عطا فرمائے تھے۔ ایک کو تو میں نے کھول کر عام کر دیا ہے (یہ شریعت کا علم ہوا) لیکن اگر دوسرے کو کھول دیا تو میری شاہ رگ کاٹ دی جائے (یہ ہوا باطن کا علم جو سینہ بسینہ آگے چلتا ہے) باقی رہیں خالق ہوں کی ریاضتیں، سو ان کے لئے اس قسم کی وضعی روایات موجود ہیں کہ رسول اللہ نبوت سے پہلے، پانی اور ستور لیکر غار حرا میں تشریف لے جاتے تھے اور وہاں کئی کئی روز تک مصروف مراقبہ رہتے تھے۔ انہیں ریاضتوں کا نتیجہ خدا کی طرف سے وحی کا ملنا تھا۔ یہ تھے وہ حربے، جن سے، قرآن کے علی الرغم، باطنیت جیسا قرآن دشمن عقیدہ عام ہوتا چلا گیا۔

دوسری طرف یہودیّت اور نصرایت کے تصوف نے پہلے ہی سے فضا کو ان خیالات سے معمور کر رکھا تھا۔ جو یہودی یا نصرانی مسلمان ہوئے انہوں نے اس کو اپنے قدیمی رجحان کے عین مطابق پایا اس لئے انہوں نے اسے لپک کر گلے سے لگا لیا۔ نتیجہ یہ کہ تیسری ہجری میں خود مسلمانوں میں اسی زور شور سے خالق ہوں کھلنی شروع ہو گئیں جس طرح اس سے پہلے عیسائیوں کے ہاں ہوا تھا۔

اگر تصوف کے سلسلہ کی ابتداء ان لوگوں کے نام سے کی جاتی جنہوں نے فی الحقیقت اس کی ابتدا کی تھی تو ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ خیال گذرتا کہ یہ ان کی اپنی اختراع تھی۔ اس کیلئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ ان حضرات نے باطنی طور پر سلسلہ بسلسلہ رسول اللہ سے فیض حاصل کیا تھا اور چونکہ یہ تصور ایرانیوں کا پیدا کردہ تھا اس لئے اس میں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی نمایاں طور پر درمیان میں لایا گیا اور انہیں "شاہ ولایت" کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔ اب صوفیوں کے مختلف "شجروں" کا منتهی حضرت علیؑ ہی قرار پاتے ہیں۔ مثلاً حضرت جنیدؒ مرید تھے حضرت سری سقطیؒ کے۔ سری سقطیؒ مرید تھے خواجہ حسن بصریؒ کے اور خواجہ حسن بصریؒ مرید تھے حضرت علیؑ کے، جنہوں نے یہ باطنی علم رسول اللہ سے حاصل کیا تھا۔ حالانکہ تاریخ میں اتنی شہادت بھی نہیں ملتی جس سے یہ مترشح ہو کہ خواجہ حسن بصریؒ کی ملاقات کبھی حضرت علیؑ سے ہوئی تھی۔ لیکن یہ باتیں تو اہل ظواہر کی ہیں۔ صوفیاء کے نزدیک زمان و مکان کا بعد کچھ حیثیت نہیں رکھتا اور سب کچھ بیٹھے بٹھاتے، ایک لمحہ میں ہو جاتا ہے۔ مثلاً چوتھی صدی ہجری میں حضرت جنیدؒ کے ایک مرید نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ان کے پیر و مرشد کو خرقہ تصوف حضرت انس بن مالکؓ سے ملا تھا جو رسول اللہ کے صحابی تھے، حالانکہ حضرت جنیدؒ تیسری صدی کے ہیں۔ ان کی وفات (۲۹۸ھ) میں ہوئی تھی آپ نے دیکھا کہ وہی عہد قدیم کا سحر (MAGIC)، مسلمانوں سمیت، تمام دنیا کے اہل مذاہب پر کس طرح اکاس

بیل کی طرح مسلط ہو گیا، اور مسلط چلا آ رہا ہے۔ اس کے صرف چوڑے بڑے گئے ہیں، حقیقت ہر مقام پر وہی ہے۔ اقبال کے الفاظ ہیں :-

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں :- اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

قرآن کریم کا نزول عربی زبان میں ہوا۔ یہ حقیقت بڑی حیرت انگیز ہے کہ اگرچہ دنیا کی دیگر قومیں پرست قوموں کی طرح عربوں میں بھی سحر (جادو) کا عقیدہ عام تھا لیکن اس کے باوجود وہ اسے سمجھتے تھے جھوٹ اور فریب ہی۔ چنانچہ ارباب لغت نے کہا ہے کہ اس مادہ (س۔ ح۔ ر) کے بنیادی معنی موڑنے توڑنے کے ہوتے ہیں اور اس سے مطلب ہوتا ہے باطل کو حق کی صورت میں پیش کرنا۔ دوسرے مقام پر ہے کہ اس کے اصلی معانی کسی چیز کو اصل حقیقت سے غیر حقیقت کی طرف پھیر دینے کے ہیں۔ صاحب تاج العروس نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایسا دھوکہ ہے جس میں پتہ چلے کہ دھوکہ کس طرح دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد یہ لفظ عام دھوکے کے معانی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ سَحَرَهُ وَ سَحَّرَهُ کے معنی ہیں اس کو دھوکہ دیدیا۔ قرآن کریم میں یہ لفظ انہیں معانی میں استعمال ہوا ہے، اور جادو کے معانی میں ان مقامات پر آیا ہے جہاں دوسروں نے اسے ان معانی میں استعمال کیا۔ داستان حضرت موسیٰ علیہ السلام میں یہ لفظ تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ اس مقام پر ہم بتائیں گے کہ وہاں نہ ساحرین کے معنی جادوگر کے ہیں اور نہ ہی وہ معرکہ جادو کی شعبہ بازیوں دکھانے کا تھا۔ وہ دین حقہ اور باطل پر مبنی مذہب کے درمیان دلائل و براہین، پر مبنی ایک مناظرہ تھا۔ بہر حال اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

زیر نظر آیت (۲/۱۰۳) میں واضح الفاظ میں کہا گیا ہے: **وَلَكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ** (۲/۱۰۳) ”شیاطین لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے تھے اور یہ کفر تھا“ لیکن ہمارے ہاں ایسی روایات وضع ہوئیں جن سے یہ ثابت کیا گیا کہ جادو ایک حقیقت ہے اور اپنا اثر رکھتا ہے اور اس کے لئے (یہ لکھتے ہوئے ہماری روح کا پتہ ہے کہ) اس کا بدن خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو بتایا گیا۔ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی تفسیر تفہیم القرآن، کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ وہ اس میں قرآن کریم کی آخری دو آیات کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

صلح حدیبیہ کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو محرم سنہ ۶ میں خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ آیا اور ایک مشہور جادوگر سے ملا اور اس سے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ ہم نے ان پر بہت جادو کرنے کی کوشش کی مگر کوئی کامیابی

نہیں ہوئی۔ اب ہم تمہارے پاس آئے ہیں کیونکہ تم ہم سے بڑے جادوگر ہو۔ لو یہ تین اشرفیاں حاضر ہیں انہیں قبول کرو اور محمدؐ پر ایک زور کا جادو کرو۔ اس زمانے میں حضورؐ کے ہاں ایک یہودی لڑکا خدمت گزار تھا۔ اس سے ساز باز کر کے ان لوگوں نے حضورؐ کی کنگھی کا ایک ٹکڑا حاصل کر لیا جس میں آپؐ کے موتے مبارک تھے۔ انہی بالوں اور کنگھی کے دندانوں پر جادو کیا گیا۔۔۔۔۔ آپؐ پر اس جادو کا یہ اثر ہوا کہ آپؐ گھلتے چلے جا رہے تھے۔ کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا تھا، اپنی ازدواج کے متعلق خیال فرماتے کہ آپؐ ان کے پاس گئے ہیں، مگر آپؐ نہیں گئے ہوتے تھے اور بعض اوقات آپؐ کو اپنی نظر پر بھی شبہ ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے، مگر نہیں دیکھا ہوتا تھا۔

(تفہیم القرآن جلد ششم صفحہ ۵۵۴)

یہ افسانہ کھلے بندوں پکار رہا ہے کہ یہ یہودیوں کا وضع کردہ ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ:

إِذْ يَقُولُ الظَّالِمُونَ إِنَّا تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَّسْحُورًا (۱۸)

”ان ظالموں کی طرف دیکھو کہ یہ جانتے مومنین سے کہتے ہیں کہ تم ایسے شخص کا اتباع کرتے ہو جس پر جادو کیا گیا ہے۔“ اس کے بعد خدا کا ارشاد ہے:

أَنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا۔ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا (۱۹)

”لے لو دیکھو کہ یہ بد بخت تمہارے خلاف کس کس قسم کی بہتان تراشیاں کرتے ہیں۔ یہ ایسے گمراہ ہیں کہ صحیح راستے کی طرف آنے کی استعداد ہی کھو بیٹھے ہیں۔“ آپؐ دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ ان مخالفین کی بہتان تراشیاں تھیں جو کہتے تھے کہ حضورؐ پر جادو کیا گیا ہے اور ہماری تفاسیر یہ کہہ رہی ہیں کہ مخالفین کا الزام بالکل صحیح تھا۔ رسول اللہؐ پر واقعی (معاذ اللہ) جادو کیا گیا تھا اور اس کا اثر بھی آپؐ پر ہو گیا تھا۔ اثر بھی اس حد تک کہ آپؐ اندر ہی اندر گھلتے چلے جا رہے تھے اور حافظہ اس حد تک بگڑ چکا تھا کہ وہ خیال فرماتے کہ ایک کام کر دیا گیا حالانکہ وہ نہیں کیا ہوتا تھا (مثلاً) حضورؐ نے نماز نہیں پڑھی ہوتی تھی لیکن اپنے دل میں خیال کر لیتے تھے کہ میں نماز پڑھ چکا ہوں حتیٰ کہ آپؐ کو ایسی چیزیں نظر آنے لگ گئی تھیں جو فی الواقعہ موجود نہیں ہوتی تھیں۔ آپؐ سوچتے کہ یہ کتنی بڑی سازش تھی جو اس قسم کی روایات وضع کرنے کی شکل میں کی گئی۔ افسوس ان دشمنوں پر نہیں، ان کا تو زندگی کا مشن ہی یہ تھا، افسوس تو اس پر ہے کہ ہم روایات کو مقدس غلافوں میں لپیٹے، ہزار برس سے اپنے سینے سے لگائے پھرتے ہیں اور آج بھی انہیں دنیا کے سامنے قرآن کریم کی تفسیر کی شکل میں پیش کرتے ہیں!

یہی نہیں کہ اس قسم کی وضعی روایات ہماری کتبِ احادیث و تفاسیر میں داخل ہو چکی ہیں۔ ہم جادو کو مانتے

ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہوتے ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ ہم اسے جادو نہیں کہتے۔ ہم نے اس کے بڑے مقدس نام رکھ لئے ہیں۔ یہ درود و وظائف، یہ گندے تعویذ، یہ مراقبے اور ریاضتیں اسی حقیقت کے مظاہر نہیں تو اور کیا ہیں!

اور پھر ان کی تقدیس، گوسالہ سامری کی طرح اس طرح ہلکے دل کی گہرائیوں میں

تعویذ اور ورد وظیفے

حلول کر چکی ہے کہ ہم اسے سننا تک بھی گوارا نہیں کرتے کہ انہیں سحر جادو کہہ دیا جائے۔ اگر ان سے کہا جائے کہ ایسا کچھ تو کفار اور مشرکین بھی کرتے رہتے ہیں، وہ بھی گندے تعویذ دیتے ہیں، دم کہتے ہیں۔ شعبدے دکھاتے ہیں، پھر ان میں اور ان میں فرق کیا ہے، تو اس کے جواب میں یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیا اور دوسروں کو فریب دے دیا جاتا ہے کہ وہ ”کالا علم“ ہے اور یہ ”نوری علم“۔ حالانکہ اس میں کالے اور نوری کا سوال ہی نہیں۔ اس کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ الفاظ یا اعداد میں خاص قوت ہوتی ہے۔ انہیں خاص طریقے سے دہرایا یا لکھا جاتے تو وہ اپنا اثر پیدا کر دیتے ہیں خواہ الفاظ کچھ بھی ہوں جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ یہ ایک فن ہے جسے ہر انسان بلا لحاظ عقیدہ و مسلک حاصل کر سکتا ہے۔ مختلف اقوام میں اس کے حصول کے مختلف طریقے ہیں چونکہ جن لوگوں سے اس قسم کی مجر العقول باتیں سرزد ہوتی تھیں انہیں بڑی بڑی فوق الفطرت قوتوں کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے ان قوتوں کی تقدیس و عظمت، دلوں میں گھر کر جاتی تھی۔ لہذا ازمنہ قدیم سے اس قسم کی قوتیں اور مذہبی تقدیس لازم ملزوم چلی آتی ہیں۔ ہندوؤں کے جوگی، بدھوں کے لاما، یہود و نصاریٰ کے رہبان اور دوسرے مذاہب کے فقیرنش لوگ، جو ان قوتوں کو حاصل کرتے ہیں ہمیشہ مذہبی احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ ان باتوں کو مذہب کا انتہائی مقام قرار دیدیا گیا۔ اس لئے اس قسم کے لوگ انتہائی عزت و تکریم کے مستحق قرار پائے اور شرف انسانیت کے تمام شعبے اس سے ادنیٰ درجے پر رہ گئے۔ اسی وجہ سے یہ چیزیں زیادہ عام ہو گئیں اور عظمت و عقیدت کے حصول کا آسان ذریعہ قرار پائیں۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ ان تمام لوگوں نے اسے دیدہ دانستہ، دنیاوی مقاصد کے حصول کی خاطر، بطور مکرو فریب اختیار کیا تھا۔ ایسے لوگ بھی تھے جو اسے فی الواقعہ مذہب کا انتہائی مقام سمجھتے تھے اور یہی سمجھ کر انہوں نے اسے اختیار بھی کیا تھا۔ لیکن اس سے بھی اس کی حقیقت نہیں بدل سکتی۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے یہ ایک فن ہے اور ہر شخص بطور فن اس کی تحصیل کر سکتا ہے۔ اگر ایک مسلمان، تا بہ کربانی میں کھڑا ہو کر، سورۃ یس کی بعض آیات کا درد کر کے کچھ خاص قسم کی قوت حاصل کر سکتا ہے تو ایک ہندو جوگی، اپنے طریق پر، دید کے کسی ستر سے ویسی ہی قوت حاصل کر سکتا ہے۔ آپ ان کا نام مختلف

رکھ لیجئے۔ اسے کالا علم اور اُسے نوری علم کہہ دیجئے لیکن جہاں تک اس فن کا تعلق ہے حقیقت دونوں کی ایک ہے۔ یہ سب قوت ارادی کی تنظیم و انضباط کے ذرائع ہیں۔ بقول (UNDERHILL) ”اس باب میں ذرائع کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اصل چیز تو قوت ارادی کو ایک نقطہ پر مرکوز کرنا ہے“ (MYSTICISM P-158)۔ لے وظیفہ، گنڈہ تعویذ یا قرآنی آیات کے عملیات کو دین سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ سب قوت ارادی کو مجتمع کرنے کے لئے مختلف ذرائع ہیں اور ان کے نتائج (مثلاً امراض کا علاج وغیرہ) اسی قوت کے کرشمے، مشرق میں یہ طریقے بڑے مخفی رکھے جاتے تھے (اور ابھی تک رکھے جاتے ہیں) لیکن مغرب نے اسے ایک سائنس کی حیثیت سے عام کر دیا ہے۔ امریکہ میں —

(MENI-CULTURE ; NEW THOUGHT اور NEW CONSCIOUSNESS) کے سکول اور یورپ میں مختلف سوسائٹیاں اپنے اپنے طریقوں پر یہ سب کچھ سکھاتی پڑھاتی ہیں۔ لہذا اسے قرآنی آیات کے ”عمل“ سے حاصل کیجئے یا لوگ کے ذریعے۔ یورپ کی سوسائٹیوں سے سیکھئے یا امریکہ کی تنظیموں سے۔ نتیجہ ہر صورت میں وہی برآمد ہوگا۔ لیکن جب آپ اسے دین، اور دین کا بھی سٹہ پنچوڑ قرار دیں گے، اور وجہ افضلیت خارق عادات باتیں تسلیم کریں گے۔ تو مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلم (مثلاً ہندوؤں کے جوگی، سنیا سی) ایسے ایسے محیر العقول شعبہ دے دکھائیں گے جن کا جواب نہیں بن پڑے گا۔ آئے دن آپ اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں کہ فلاں مقام پر فلاں جوگی نے اس قسم کی محیر العقول بات دکھائی اور فلاں مقام پر اس قسم کی۔ لہذا اگر کسی مذہب کی حقانیت کی دلیل اس کے پیروؤں کے خارق عادات شعبہ دے ہیں تو دنیا میں اسلام کی برتری کا ثبوت مشکل ہو جائے گا۔ باقی رہا یہ کہ آپ کے ہاں کے شعبہ دے کرامات ہیں اور دوسروں کے شعبہ دے محض سحر کاری کی ”شیطنیت“۔ تو یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ دوسرے لوگ یہی کچھ آپ کے متعلق کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم، اس اسلام کو، جس میں زندگی اور حرارت پائی جائے، صحیح اسلام قرار نہیں دیتے بلکہ صحیح اسلام اسے قرار دیتے ہیں جس میں اس قسم کی ”روحانیت“ کے کرشمے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ غیر مسلموں کی طرف سے مسلمانوں کے پیروں اور فقیروں یعنی ”روحانی

لے (WHITE) اپنی کتاب (THE OCCULT SCIENCE) میں تفصیل کے ساتھ لکھتا ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے مختلف ریاضتیں، مراقبہ اور وظائف کس طرح ایک ہی قسم کے نفسیاتی اثرات پیدا کرتے ہیں۔

لے شریعت اور طریقت کی باہمی آمیزش کے مباحث پر نگاہ ڈالئے، ہر مقام پر طریقت کا پلٹا جھکا ہوا دکھائی دے گا۔ اہل طریقت معرفت کا بالعموم دعویٰ یہ ہے کہ شریعت محض ظاہری اعمال کا نام ہے ”روحانیت“ جو مذہب کی غایت ہے، انہی کے ہاں ہے اور اس کا ثبوت اسی قسم کی خارق عادات باتوں سے پیش کیا جاتا ہے، جنہیں کرامات کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

بزرگوں کی عام طور پر تعریفیں کی جاتی ہیں اور بہت سے غیر مسلم ان کے معتقدین کے حلقہ میں داخل ہو جاتے ہیں لیکن وہ مسلمانوں کے ان جلیل القدر مشاہیر کو کبھی بنظر استحسان نہیں دیکھیں گے جنہوں نے دین کو ایک عملی نظام کی حیثیت سے نافذ کیا تھا۔ اس لئے کہ ”روحانی بزرگوں“ کو اسلام کا سچا پیرو قرار دیکر وہ غیر اسلامی مذہب کو اسلام سے برتر نہیں تو کم از کم اس کے برابر ثابت کر سکتے ہیں اور اس طرح اس دعویٰ کا بلند آہنگی سے اعلان کر سکتے ہیں کہ ”تمام مذاہب اپنی بنیادی صداقتوں کی رُو سے یکساں ہیں“ لیکن دین کو ایک نظام زندگی قرار دیکر ایسا دعویٰ اور اس کا ثبوت ممکن نہیں۔

لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں زیادہ طول طویل بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کریم نے بھی اپنے متعلق یہ کہا ہے کہ میری فلاں آیت یا فلاں لفظ کو اتنی مرتبہ دہرا لینے سے فلاں نتیجہ برآمد ہو جائے گا؟ جب قرآن کریم نے اپنے متعلق یہ نہیں کہا تو قرآن کا یہ مصروف انسانی دماغ کے اختراع کے بسوا اور کیا ہو گا؟ باقی رہا یہ کہ ”صاحب! جب ایسا کرنے سے یہ نتائج ہمارے سامنے آجائیں تو قرآنی آیات الفاظ میں ان قوتوں کی موجودگی کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی؟ لیکن جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ فرض کر لینا حقیقت سے چشم پوشی ہے کہ یہ نتائج محض قرآنی آیات و الفاظ کے اوراد و وظائف سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ تجربہ شاہد ہے کہ غیر قرآنی (اور بعض اوقات بالکل مہمل) الفاظ و کلمات سے، ایسے بلکہ اس سے بھی زیادہ عجز العقول نتائج مرتب ہو جاتے ہیں۔ لہذا اس قسم کے نتائج، خواہ قرآنی الفاظ سے مرتب ہوں یا غیر قرآنی سے۔ بہر حال قوت ارادی کی کرشمہ سازیوں کا ہی نتیجہ ہیں جو اکتسابی طور پر ہر شخص حاصل کر سکتا ہے۔ اور قرآن کریم سے اس کی کوئی سند نہیں مل سکتی۔

اس مقام پر ایک بڑی دلچسپ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے جس کا ذکر کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہمارے ہاں اہل سنت و الجماعت کے تین فرقے مشہور ہیں۔ اہل حدیث اور اس کے مقابلے میں اہل فقہ۔ پھر اہل فقہ دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں دیوبندی اور بریلوی۔ اہل حدیث کہتے ہیں کہ وہ اس قسم کی توہم پرستیوں کو بدعت قرار دیتے ہیں اور سخت گمراہی۔ بریلوی حضرات (اہل حدیث کی رد سے) بدعتی کہلاتے ہیں کیونکہ وہ اس قسم کی توہم پرستیوں کو مانتے ہیں۔ دیوبندی حضرات کا دعویٰ ہے کہ وہ اس قسم کی توہم پرستیوں پر عقیدہ نہیں رکھتے۔ لیکن درود و وظائف، گندے، تعویذ ان کے ہاں بھی عام ہیں۔ دیوبند سے شائع ہونے والے رسالہ ”خالہ“ میں ان کے کسی بزرگ کی کتاب ”عطار المنان“ کا ترجمہ

مسلل شائع ہوا کرتا تھا جس میں بڑے بڑے جلیل القدر بزرگان دین کے ”عملیات“ درج تھے مثلاً ایک عمل یہ تھا :-

”الہی بحرۃ یلیٰحیٰ - کلیٰحیٰ - کشفوطا - کشا فطینوس - تبونس - اذرفطیرنی - یوانس بوش و کلہم قطیر و علی اللہ قصد السبیل و منها جار و لو شام لہدکم اجمعین - ایک تعویذ یہ تھا : ہٹٹی ہٹٹی ہٹٹی ہٹٹی ہٹٹی ہٹٹی ہٹٹی (بچوں کے گلے میں ڈال دیا جائے) ایک اور عمل تھا : بسم اللہ علیقہ ملیقہ - ثلیقہ - تلیقہ - سحی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ و علی ولی اللہ (فائدہ) بغرض اجرائے حضرات ایک چلتا ہوا عمل ہے۔

آپ غور فرمائیے کہ جب اس قسم کے مہل الفاظ و کلمات سے بھی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں تو پھر کالے علم اور نوری علم میں فرق کیا ہے ! جہاں تک ”نوری علم“ کا تعلق ہے، ان حضرات (دیوبندی) کے ہاں سے ”عملیات قرآنی“ پر اکثر کتا ہیں شائع ہوتی رہتی ہیں جن میں یہ بتایا جاتا ہے کہ قرآن کریم کی فلاں آیت کا ورد کرنے سے یہ اثر ہوتا ہے اور فلاں تعویذ لکھنے سے یہ اثر۔

قرآن کریم نے عمل پر بڑا زور دیا ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ — عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی لیکن اب ”عال“ سے مراد قرآن کریم کے مطابق اعمال صا کہ کرنے والا نہیں لیا جاتا۔ اس سے مطلب ہوتا ہے تعویذ، گنڈے، ورد و وظیفے کرنے والا۔ ”اعمال قرآنی“ کے موضوع پر کتا بوں میں قرآنی آیات کے وظیفے اور تعویذ لکھے جاتے ہیں اور ان کتا بوں کے مصنف بڑے بڑے عالم اور بزرگ ہوتے ہیں۔ چونکہ اس قسم کے ”عمل“ بالعموم تکیوں، دائروں میں کئے جاتے ہیں جہاں ”عالم لا ہوت کی سیر کرنے کے لئے“ نشے میں مدہوش ہوا جاتا ہے۔ اس لئے نشہ کے لئے بھی ”عمل“ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً جب پوچھا جائے کہ وہ کونسا ”عمل کرتا ہے“ تو اس کے معنی ہوتے ہیں وہ کون کون سے نشہ کا عادی ہے۔ یہ وہ مقام، جہاں ہمیں ”باطنیت“ نے پہنچا دیا ہے۔ انہیں جہلا کی باتیں کہہ کر مست کر دیا جائے گا۔ لیکن (جیسا کہ ہم نے ابھی ابھی کہا ہے) ”اعمال سحرانی“ پر مشتمل کتا ہیں تو بڑے بڑے جید علماء کی تصنیف کردہ ہیں اور تعویذ گنڈے ہمارے ہاں کے چوٹی کے عالموں کے ہاں سے ملتے ہیں۔ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ قرآنی آیات پر مبنی ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اقبالؒ نے کہا تھا کہ :-

مکتب و ملا و سرار کتاب کور مادر زاد و نور آفتاب

تو اس سے انہوں نے اس بلند حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہمارے ہاں کی مذہبی پیشوائیت اس کا احساس ہی نہیں کر سکتی کہ قرآن کا مقام کیا ہے۔

جس شخص کے قلبِ سلیم کو اللہ تعالیٰ نے متاعِ ایمان سے بہرہ یاب اور اس کی نگاہوں کو نورِ بصیرت سے سرفراز فرمایا ہو، وہ جب خدائے حی و قیوم کی اس زندہ و پائندہ کتاب کی عظمتوں پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کے جبروت و جلال کے سامنے تھر تھرا اٹھتا ہے۔ اس عظیم المرتبت ضابطہٗ خداوندی کی شوکت و سطوت

قرآن کی عظمت

کے پیشِ نظر اس کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اس سراجِ منیر کی درخشندگی کو دیکھ کر اس کی نگاہوں میں خیرگی پیدا ہوتی ہے۔ وہ جب تدبیر و تفکر سے اس کی گہرائیوں میں اترتا ہے تو حقائق و معارف کی ایک نئی دنیا اس کے سامنے جلوہ دار ہوتی ہے۔ اگر کسی کتاب کی رفعتِ شان کا اندازہ اس کے ”مصنف“ سے لگایا جاسکتا ہے تو اس کتابِ حکیم کی بلندیِ منزلت کا کیا پوچھنا جس کا ”مصنف“ خود خدائے علیم و بصیر ہو۔ اگر اس کی تقدیس کا جائزہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا محل کون ہے تو اس کتابِ مقدس و مبارک کا کیا کہنا جس کا مہبط اس ذاتِ اقدس و اعظم کا قلبِ منور تھا جو معراجِ انسانیت کی مظہر اتم تھی۔ اگر اس کتاب کی عظمت کا اندازہ اس کے مشمولات سے کیا جاسکتا ہے تو اس زندہ و پائندہ کتاب کے علوِ مرتبت کا کیا ٹھکانہ جس کے اصولوں کے ماتحت نظامِ کائنات سرگرم عمل ہو اور جس کے قوانین، اقوام و مللِ عالم کی موت و حیات کے فیصلے کر رہے ہوں۔ اور پھر اگر اس نسخہٗ متکوین حیات کی درجندی کی قدر و قیمت اس کی تعلیم کے نتائج سے پہچانی ہو تو اس کے متعلق پوچھئے سرزمینِ عرب کے ان ذرات سے، جنہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح ایک اونٹ چرانے والی بادِ نیشین قوم، دیکھتے ہی دیکھتے، قیصرِ کسریٰ کی دولت و ثروت کی وارث بن گئی اور مکارمِ اخلاق کے اس بلند مقام پر فائز ہو گئی جو آج تک چشمِ عالم کو دیدہٗ حیراں بنا رہا ہے حقیقت یہ ہے کہ یکتا نہیں بلکہ ایک برقی خاطر تھی جو فاران کی بدلیوں سے چمکی اور ہر طاغوتی قوت کو خاکِ کستر بنا گئی۔ ایک شمشیرِ برہنہ تھی جو فضا کے عالم میں کوندی اور ہر اس زنجیر کو کاٹ کر الگ کر گئی جس نے انسانیت کو غیر خداوندی بندشوں میں جکڑ رکھا تھا۔ یہ تھی وہ کتابِ حکیم جو مسلمانوں کو اس نئے دی گئی تھی کہ وہ اسے قیامت تک کے لئے اپنا نصابِ زندگی بنائیں اور اس کے قوانین کے تابع چلیں۔ لیکن ذرا غور کیجئے کہ کوئی مریض کسی طبیب کے درِ سر کا نسخہ لے تو اس کا فائدہ اسی صورت میں ہوگا کہ اس نسخہ کے مطابق دوا بیاں خرید کر انہیں حسبِ ہدایت استعمال کرے۔ لیکن اگر وہ اس کا غد کو جس پر وہ نسخہ لکھا ہے، سبز کپڑے میں لپیٹ کر سر پر باندھ

لے تو اس کی اس حرکت پر عقل ہنسے گی اور علم روئے گا۔ پھر سوچئے کہ اگر کوئی شخص تعزیراتِ پاکستان کی اس دفعہ کے الفاظ کو جس میں (مثلاً) لکھا ہے کہ چوری کی سزائیں سال کی قید ہے، دس ہزار مرتبہ پڑھ کر پھونکے کہ اس سے چور کا سراغ مل جائے گا تو اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟ قرآنِ کریم قوموں کے امراض کہن کا نسخہِ کیمیا ہے، ایک ضابطہ قوانین ہے، جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کو انفرادی اور اجتماعی شرف و مجد حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس نسخہِ کیمیا کو کاغذ پر زعفران سے لکھ کر گھول گھول کر پیا جائے یا اس ضابطہ قوانین کی مختلف دفعات کے چلنے کاٹے جائیں تو اس سے بڑھ کر اس کتابِ حکیم کا غلط مصرف اور کیا ہو گا؟

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس قسم کی کرامات پسندی انسانی فضیلت کا معیار کس طرح بدل جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے انسان کی فضیلت کا سب سے بڑا معیار تقویٰ ہے یعنی یہ کہ اس کی زندگی کس قدر، قوانینِ خداوندی کے مطابق ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ ایک شخص نہایت بلند سیرت و بلند کردار ہو، وہ گم نامی کی زندگی جئے گا۔ کوئی اس کی طرف رجوع نہیں کرے گا۔ اس کے برعکس، ایک شخص کسی خانقاہ میں بیٹھا بھنگ کی لہروں اور چندو کی موجوں میں مستغرق ہو۔ لیکن اگر وہ سٹہ کا نمبر صحیح بتا دے تو جیسے جی مرجعِ انام ہے گا اور مرنے کے بعد اس کی قبر کی پرستش ہوگی۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ معیارِ فضیلت، سیرت و کردار کی بلندی نہیں بلکہ شعبہ بازی قرار پا چکا ہے۔ اب اگر کسی ایسے شخص سے اس قسم کے شعبداتِ ظہور میں آتے ہیں جو بیباکانہ لغو زندگی بسر کر رہا ہے تو اس کی لغویت پر طرح طرح کے پڑے ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ اس کی ”بزرگی“ کی شان میں فرق نہ آنے پائے۔ اس قسم کے لوگوں کی عقیدت و عظمت، کچھ اس طرح غیر شعوری طور پر قوم کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ہے کہ بڑے بڑے اربابِ علم و فضل، ان کی شان میں گستاخی کا حکم زبان پر لاتے خوف کھاتے ہیں۔ گویا ان لوگوں کو محکمہ قضا و قدر میں ایسا دخل حاصل ہے کہ معلوم ان کی سوراہی سے کتنی بڑی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اس غلط معیارِ فضیلت سے قوانینِ الہیہ اور اقدارِ خداوندی کی جو قدر و قیمت دلوں میں رہ سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔

ایسے حضرات بھی ہیں جو اگرچہ شریعت کے پابند ہیں لیکن معیارِ فضیلت اسی قسم کی چیزوں کو قرار دیتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کی ”پرستش“ میں بھی کوئی کسر باقی نہیں رکھی جاتی۔ اگرچہ زبان سے سب یہی کہتے ہیں کہ ہم کبھی لوگوں کو اس قسم کی باتوں کی جرأت نہیں دلاتے لیکن وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے

ہیں کہ لوگ کس طرح انہیں اور ان کے بزرگوں کو قبلہ حاجات و کعبہ مقصود سمجھتے ہیں لیکن بایں ہمہ وہ ایک لفظ اس کے خلاف نہیں کہتے۔ اور اگر وہ بفرض محال، زبان سے اس کی مخالفت بھی کریں تو بھی اس کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے جب وہ اپنے عمل سے لوگوں کو خود انسان پرستی کی طرف دھکیل کر لاتے ہیں۔ ان کے ماننے والوں کے دلوں میں یقیناً خدا کی ایسی عظمت و عقیدت نہیں ہوتی جتنی خود ان حضرات کی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنی ہر مشکل میں انہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور گو کہتے یہی ہیں کہ ہم ان کے ”واسطہ“ سے اپنی درخواست خدا تک پہنچاتے ہیں (رجوع خود ایک غیر قرآنی عقیدہ ہے) لیکن فی الحقیقت اپنی مرادوں کا منبع انہیں کو سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کا خدا کے ساتھ وہ تعلق کبھی نہیں رہ سکتا جو قرآن کریم قائم کرنا چاہتا ہے۔ سنئے کہ اس باب میں غیر مسلموں کی شہادت کیا ہے۔

اگر گہرائیوں میں اتر کر دیکھئے تو عملیات کا ہر طالب اس مقام کی طرف جدوجہد کرتا دکھائی دے گا جہاں وہ صرف بٹن دبا دے اور باقی سب کچھ آفاقی قوتیں خود بخود کر دیں۔ وہ جب بہ ہزار مشقت اس قسم کی قوت حاصل کر لیتا ہے جس سے وہ بہت سوں پر غالب آجائے تو اس سے اُس ”ایک“ کو بھول جانے کی طرف میلان ہو ہی جاتا ہے (LEVI) کے الفاظ میں فطرت کے امور کا بہت گہرا مطالعہ، اس قسم کے غیر محتاط متجسس کو خدا سے بیگانہ بنا دیتا ہے کیونکہ اس کی دماغی تکان اس کے ارتعاش قلب کو مفلوج کر دیتی ہے۔

(MYSTICISM: BY UNDERHILL)

اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس خانقاہ نشینی کے طلسم نے جس طرح مسلمانوں جیسی یکسر برقی تپاں قوم کو جمود و تعطل کے بیکار محبسے بنا کر رکھ دیا ہے وہ کسی تشریح کے محتاج نہیں۔ عمل بالقرآن نے وہ قوم پیدا کی تھی جس کے ہاتھ میں اقوام عالم کی ”تقدیریں“ تھیں۔ جن کی نگاہوں سے موت کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ جن کی ہیبت سے مصائب و مشکلات کی پیشانی پر پسینہ آ جاتا تھا۔ وہ جس طرف باگیں اٹھاتے، فتح و ظفر ان کی رکاب تھا مٹی۔ وہ جدھر رخ کر لیتے، کامرانی و کامیابی ان کا برٹھ کر استقبال کرتی۔ وہ قوم جو ”اپنے اور اپنے خدا کے درمیان کسی دوسری طاقت کو حائل نہ ہوتے دیتی“ وہ جو اپنے تمام عزائم و مراحل میں، اپنی قوت بازو اور قوانین خداوندی کی تائید کے سوا کسی اور چیز پر بھروسہ نہ کرتی۔ یہ تھی وہ قوم جسے قرآن کریم نے دنیا میں قوانین الہیہ کی تقیید و ترویج کے لئے پیدا کیا تھا۔ لیکن (UNDERHILL کے الفاظ میں) اس منزل کی تلاش نے، ”جہاں انہیں ہر

بٹن دبان پڑے اور باقی سب کچھ غیر معلوم آفاقی قوتیں ان کے لئے خود بخود کر دیں، اس قوم کو رفتہ رفتہ ایسی حالت میں پہنچا دیا کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی دوسروں کے آسرے ڈھونڈنے لگ گئی۔ اور قدم قدم پر اس طرح غیروں کی محتاج ہو گئی کہ ہر شخص انہیں ذلیل و خوار سمجھنے لگا۔ یہ سب اس لئے کہ وہ کشمکش حیات میں مردانہ اور حقائق کا سامنا کرنے کی بجائے، کامیابی و کامرانی کے لئے کشف و کرامات کے ”سم سم“ کے پیچھے پڑ گئے اور اس طرح وہ تمام زندہ کرامتیں جو خود ان کے دست و بازو سے ظہور میں آنی تھیں افسانے بن کر رہ گئیں۔ بقول علامہ قاضی محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا بہ ہے بندہ آزاد خود اک زندہ کرامات (ضرب کلیم ص ۷۷)

اس کا نتیجہ یہ کہ آج دنیا میں مسلمان سے زیادہ نکمائی اور اپاہج قوم شاید ہی کوئی اور ہو۔ یہ ہے مال اس ”عجوبہ پسندی“ کا جسے ان کے فریب نگاہ نے بڑے بڑے مقدس علاقوں میں لپیٹ رکھا ہے۔ اسی غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ اسلام جیسا زندہ اور زندگی بخش نظام حیات دھم بن کر رہ گیا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ وہ عظیم المرتبت مجاہدین اسلام جن کے ایمان کی حرارت نے فضائے کائنات میں توج پیدا کر دیا مسلمانوں کے ذہن سے عام طور پر اتر چکے ہیں، لیکن وہ بزرگ جن کی طرف اس قسم کی حسی کرامات منسوب ہیں، ہر وقت ان کے قلب و نگاہ کے سامنے رہتے ہیں۔ یقیناً نتیجہ یہ سب کشمکش حیات میں اعتراف شکست ہے، کشمکش زندگی سے سپر اندازی ہے، دنیائے عمل حقیقت سے فرار کی راہ ہے۔ دنیا میں سب سے بڑی کرامت وہ ہے جو جماعت مومنین کی قوتِ بازو سے ظہور پذیر ہو اور جس کا عملی نتیجہ اس زمین پر آسمان کی بادشاہت کا قیام۔ اس کرامت سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی کرامت نہیں۔ وہ کرامت جس سے جہان انسانیت میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ جائے۔ اور اس طرح یہ زمین ”اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے“

بعض حضرات، حقائق سے آنکھیں چرانے کی خاطر، تصوف کی دو قسمیں بیان کر دیتے ہیں۔ یعنی اسلامی تصوف اور غیر اسلامی (عجمی) تصوف۔ لیکن جب تصوف (علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں) اپنی اصل کے اعتبار سے ”اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے“ تو اسے اسلامی اور غیر اسلامی میں تقسیم کس طرح کیا جاسکتا ہے؟ اسلام اسلام ہے اور بس! یہ ایک نظام مملکت ہے، نظام معاشرہ ہے، ضابطہ زندگی ہے، جسے اس قسم کی باطنیت اور کشف و کرامات کی بھول بھلیوں سے کچھ واسطہ نہیں۔ قرآن کریم سے ان امور کی کوئی سند نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم۔ بلکہ احادیث تک میر بھی تصوف کا لفظ تک نہیں ملتا۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے تصوف کو، اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا کہہ کر پکارا ہے۔ مناسب

معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اس اجمال کی تفصیل بھی خود انہی کے الفاظ میں بیان کر دی جائے۔ انہوں نے لکھنؤ سے شائع ہونے والے اخبار ”نیو ایرا“ (NEW ERA) کی ۲۸ جولائی ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں، تصوف کے موضوع پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ اسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

علامہ اقبال اور تصوف

”آج کل کا مسلمان یونانی و ایرانی تصوف کی ان تاریک وادیوں میں بے مقصد و مدعا ٹامک ٹوٹے مارتے پھرنے کو ترجیح دیتا ہے جس کی تعلیم یہ ہے کہ گرد و پیش کے حقائق ثابتہ سے آنکھیں بند کر لی جائیں، اور توجہ اس نیلی، پیلی اور سرخ روشنی پر جمادی جائے، جسے ”اشراق کا نام دیدیا گیا ہے۔ یہ دراصل دماغ کے ان خانوں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہے جو ریاضت کی کثرت و قوت اثر کے باعث مادّہ ہو چکے ہیں۔ میرے نزدیک یہ خود ساختہ تصوف اور یہ ”فنائیت“ یعنی حقیقت کو ایسے مقام پر تلاش کرنا جہاں اس کا وجود نہ ہو، دراصل ایک بدیہی علامت ہے جس سے عالم اسلام کے ردبہ انحطاط ہونے کا سراغ ملتا ہے۔

دنیا نے قدیم کی تاریخِ ذہنی کے مطالعے سے یہ نہایت اہم حقیقت آپ پر منکشف ہو جائے گی کہ زوال پذیر قوموں اور گمراہوں نے ہر دور میں اس خود ساختہ تصوف اور فنائیت میں پناہ لی ہے۔ جب روح حیات فنا ہو جاتی ہے اور زمان و مکان کے مسائل سے دست و گریباں ہونے کی ہمت باقی نہیں رہتی تو داعیانِ انحطاط ایک مرمومہ ولایت و سرمدیت کی تلاش میں لگ جاتے ہیں۔ اس طرح اپنے معاشرے کی روحانی بے مائیگی اور جسمانی فرسودگی کو آخری مرحلے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ بظاہر ایک لبھا لینے والا نصب العین وضع کر لیتے ہیں، جس کے فریب میں مبتلا ہو کر محتمد اور قوی افراد بھی رفتہ رفتہ موت کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں۔ اسلامی معاشرے کا نظام ایک خاص نوعیت کا ہے جسے اوہام و دس دوس کے ان ماتوں نے شدید نقصان پہنچا یا ہے۔ بحیثیت ایک معاشرہ کے ہماری تخلیق اس حقیقت پر مبنی ہے کہ اجتماعی ترتیب و تنظیم میں نسل و زبان کے امتیازات پر خط نسخ کھینچ دیا جائے۔ یہ مقصد اسی صورت میں پایہ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس نظامِ شریعت کے تابع رکھیں جو اصلاً مبنی بر روحی ہے۔ لیکن قدیم صوفیاء کا عقیدہ یہ تھا کہ شریعت کی حیثیت تو محض ایک مظہر کی تھی۔ اور وہ خفیہ خفیہ اس کی تلقین کرتے رہے کہ حقیقت کا ایک قشر اور ایک پردہ ہے اور حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ شریعت سے الگ ہے۔ اکثر حالتوں میں شریعت کی پابندی قائم رکھی گئی تھی کہ اجتماعی مخالفت سے بچے رہیں، اگرچہ اس کی حیثیت ایک پردے ہی کی رہی۔ اسلامی فکر و ادب کا مطالعہ کرنے والا کوئی فرد اس اعتراف میں متامل نہ ہوگا کہ شریعت سے اعراض کا رجحان اسی خود ساختہ تصوف کا براہِ راست

نتیجہ ہے جو عجمی دل و دماغ کی پیداوار ہے۔ حالانکہ شریعت ہی اسلامی معاشرے کو منظم و مرتبط رکھنے کا واحد ذریعہ ہے۔ یوں اسلامی جمہوریت رفتہ رفتہ اپنے اصل مقام سے ہٹتی گئی اور اُسے ایک نوع کی روحانی امرائیت کا غلام بنادیا گیا۔ یہ امرائیت ایسے علم و قوت کی مدعی تھی جس کے دروازے عام مسلمانوں پر بند تھے۔ مسلمانانِ اندلس اسطاطیسی روایت سے آگاہی کے باعث مغربی اور وسطی ایشیائے ضعیف انگیز اثرات فکر کے دائرے سے باہر تھے۔ وہ ایشیاء کی مسلم قوموں کے مقابلے میں روح اسلام سے قریب تر تھے۔ آخر الذکر قوموں نے عربی اسلام کو عجمی تخیلات میں ڈھلنے دیا، یہاں تک کہ وہ اپنی حقیقی و اصلی حیثیت سے بالکل محروم ہو گیا۔ تسخیر ایران کا نتیجہ نہ نکلا کہ ایران اسلام کا حلقہ بگوش بن گیا، بلکہ یہ نکلا کہ اسلام، ایرانیت کے رنگ میں رنگا گیا۔

مغربی اور وسطی ایشیاء کے مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ دسویں صدی عیسوی کے بعد سے کیجئے۔ جو کچھ میں اوپر لکھ چکا ہوں اس کے ایک ایک حرف کی تصدیق و توثیق ملے گی۔ اس خطاط کے سحر کی کیفیت یہی ہے کہ جن ہاتھوں سے ہم زہر کا پیالہ پیتے ہیں، انہی کو چومتے ہیں۔

واضح رہے کہ اسلام کا آفتاب تاریخ کے روز روشن میں افق پر جلوہ گر ہوا۔ ہمارے جمہوریت پر در پیغمبرِ اعظمؐ نے حائل و دانش مند اصحابؓ میں زندگی بسر کی اور انہی میں کام کرتے رہے۔ ان اصحاب نے ایک ایک لفظ آنے والی نسلوں تک پہنچا دیا جو اس پیغمبرِ اعظمؐ کی مقدس و بابرکت زبان پر جاری ہوا۔ صلہ حضور کی تعلیمات میں کوئی بھی چیز نہیں جسے مخفی کہا جاسکے۔ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ زندگی کی مسرت اور روشنی سے لبریز ہے۔ یہ تاریک اور قنوطیت افزا تصوف کے لئے وجہ جواز مہیا کرنے ہی سے پاک و مبرا نہیں بلکہ ان تمام مذہبی تعلیمات کے خلاف کھلا ہوا جارحانہ اقدام ہے۔ جنہوں نے صدیوں تک عالم انسانیت کو مبتلائے فریب رکھا۔

پھر آئیے! دنیا کے حقائق کو خوشی خوشی قبول کیجئے۔ خدا اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے جلال و عظمت کی خاطر ان حقائق سے عہدہ برآ ہونے کی سعی و کوشش میں مصروف ہو جائیے۔ اس شخص کی بات پر کان نہ دھریئے جو کہتا ہے کہ اسلام میں کوئی مخفی اصول بھی ہے جسے نا شناساؤں پر منکشف نہیں کیا جاسکتا۔ اسی پر چھوٹے مدعیوں کے اقتدار اور آپ کی غلامی کا انحصار ہے۔

دیکھئے کس طرح رومی مسیحیت کی روح نے اپنے گرد و پیش مستحکم حصار تعمیر کر لئے تاکہ اس کی تاریک مملکتیں تاریخ نگاروں

کے ممکن حملوں سے محفوظ رہیں۔ ایسے ہی لوگوں نے تاریخ اسلام سے آپ کی نادانیت کی بنا پر فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کو غلام بنا رکھا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ تاریخ کی روشنی کبھی نہ کبھی اس کی تعلیمات کے دھندلکے کو آپ کی ذہنی فضا سے زائل کر دے گی۔ لہذا وہ آپ کو سکھاتے ہیں کہ حسی ادراک حجاب اکبر ہے (العلم حجاب الاکبر)۔ حسی ادراک کے یہ دشمن آپ کے احساس حقائق کو کند کرتے ہیں اور علم تاریخ کی بنیاد کھوکھلی کر دیتے ہیں۔

نوجوان مسلمانو! اس شعبہ بازی سے خبردار رہو۔ شعبہ بازوں کی کند بڑی مدت سے تمہاری گردنوں پر پڑی ہوئی ہے۔ دنیا سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا انحصار اس پر ہے کہ بڑی سختی سے اس توحید کو اپنا لیا جائے جو صحت کوشیوں اور مفاہمت اندوزیوں کو جانتی نہ تھی اور جس کی تعلیم تیرہ سو سال پیشتر عربوں کو دی گئی تھی۔ بحیثیت کے دھندلکے سے باہر نکلنا اور عرب کے درخشاں صحرا کی روشن فضا میں آجاء۔

یہ ہے وہ سحر، جس سے یہ امت ہزار برس سے مسحور چلی آرہی ہے اور اس کا نتیجہ بھی بھگت رہی ہے۔ اس سلسلے میں انسب یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کی اس آیت کو پیش کر دیں جس میں اس نے ”سحر بابل“ کی بھول بھلیوں میں گم ہو جانے والوں کے متعلق کہا تھا :-

﴿لَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ خَيْرٌ لَّوْكَانُوا يَعْلَمُونَ﴾

اگر یہ لوگ اس قسم کی روش اختیار کرنے کی بجائے منزل من اللہ صدقاتوں پر ایمان رکھتے اور ایسے تباہ کن استوں سے بچتے تو انہیں خدا کے ہاں سے وہ کچھ ملتا جو اس سے کہیں زیادہ گراں بہا ہوتا۔ اے کاش! یہ اس حقیقت کو سمجھ لیتے :-

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا لِكُفْرِينَ عَذَابُ الْإِيمِ﴾

بات چلی تھی یہودیوں کی ذہنیت سے۔ اور درمیان میں وہ اہم موضوع آگیا جسے آپ نے ابھی ابھی ختم کیا ہے اس کے بعد ہم اسی داستان کا سررشتہ پھر تھامتے ہیں۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ صدیوں کی محکومی، غلامی، غلمان خرابی کی وجہ سے یہ لوگ اس قدر دنی الطبع ہو چکے تھے کہ عام آداب معاشرت تک سے بھی عاری ہو گئے تھے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محفلوں

یہودیوں کی پست ذہنیت

میں آکر بیٹھتے تو وہاں بھی اس ذنارت کا مظاہرہ کئے بغیر نہ رہ سکتے۔ بات کرتے تو ذو معنی، اور پھر الفاظ ادا کرتے تو اس طرح زبان کو توڑ مروڑ کر، کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ہے: **مِنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ . وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمِعْ غَيْرَ مَسْمُوعٍ وَرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّينِ . وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاسْمِعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَقْوَمَ . وَلَكِنْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا** (۲/۲۵) ”یہودیوں کی یہ حالت ہے کہ وحی کے الفاظ تک کو ان کے اصلی مقام سے ہٹا کر ان میں رد و بدل کر دیتے ہیں اور عام گفتگو میں بھی عجیب انداز سے ذو معنی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً بجائے اس کے کہ ”سمعنا و اطعنا“ کہیں ”یعنی ہم نے اسے سنا ہے اور ہم اس کی نافرمانی کریں گے“ یا کہیں گے ”إِسْمِعْ غَيْرَ مَسْمُوعٍ“ (تو ہماری بات سن اگرچہ تیری بات نہیں سنی جلتے گی یا طنزاً کہیں گے کہ تو بہرہ ہو جائے) غرضیکہ یہ عجیب انداز سے زبان کو توڑ مروڑ کر باتیں کریں گے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ دین خداوندی کو ہدف طعن و تشنیع بنا دیا جائے۔ اس کا مذاق اڑایا جائے۔ اگر ان کی نیت نیک ہوتی اور یہ سیدھی طرح کہتے کہ ”سمعنا و اطعنا“ ”ہم نے سنا اور ہم اس کی اطاعت کریں گے“ یا ”اسمع و انظرنا“ ہماری بات سنئے اور ہم پر نگہ التفات رکھئے تو ان کے لئے بہتر ہوتا اور بات صاف اور سیدھی ہو جاتی۔ لیکن انکار و سرکشی، اور حسد و تعصب کی بنا پر ان کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ یہ عام معاشرتی حسن آداب سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ ان میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جو ایمان لائیں گے۔ جن لوگوں کی ذہنیت اس حد تک پست ہو چکی ہو وہ ایسی بلند تعلیم کو کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں؟

اس سے واضح ہے کہ یہودی، حضور کی مجلس میں آکر بیٹھتے تو یا تو ذو معنی الفاظ استعمال کرتے اور یا تلفظ ہی توڑ مروڑ کر ادا کرتے جس سے معنی کچھ کے کچھ ہو جاتے۔ اس کی مثال میں لفظ **رَاعِنَا** پیش کیا گیا ہے۔ یہ لفظ اگر مادہ (ر-ع-ن) سے ہو تو اس کے معنی حماقت اور رعونت کے ہوتے ہیں۔ اور اگر مادہ (م-ع-ی) سے ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کی رعایت کرنا۔ ان معانی کی رو سے مطلب یہ ہو گا کہ وہ رسول اللہ سے کہتے کہ ”تم ہماری رعایت کرو تو ہم تمہاری رعایت کریں گے۔ تم ہمارا خیال رکھو تو ہم تمہارا خیال رکھیں گے“ یعنی وہ سوئے بازی کرنا چاہتے تھے اور قرآن کریم واضح طور پر بتا چکا ہے کہ ایک داعی انقلاب (رسول) کسی سے سوئے بازی نہیں کرتا۔ حق باطل کے ساتھ مفاہمت کر ہی نہیں سکتا۔ تفصیل اس اجمال کی، جلد اول میں، آیت (۲۵)

کے تحت صفحہ ۱۷۸ پر گزر چکی ہے۔ اور اگر وہ اس لفظ کو ذرا زبان دبا کر بولتے تو حضور کو (معاذ اللہ) احمق اور نحوست پرست قرار دیتے۔

قرآن کریم نے یہودی کی اس قسم کی نازیبا حرکات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے، جماعتِ مومنین سے دو باتیں کہیں۔ پہلی تو یہ کہ **قُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا** (۳۳) ”ہمیشہ، بات واضح، صاف، دو ٹوک اور پٹی تلی کہو جس میں کوئی ابہام نہ ہو“ (نیز ۴۴)۔ خاص طور پر شہادت میں تاکید اُکھا کہ کبھی توڑ مروڑ کر کوئی لفظ نہ کہو (۴۵)۔ اور دوسری بات یہ کہی کہ حضورؐ کو مخاطب کرتے وقت ایسا لفظ بھی استعمال نہ کرو جس کے معنی یہ ہو جائیں کہ آپ ہماری رعایت کیجئے تو ہم آپ کی رعایت کریں گے۔ مومنین کا یہ شعار نہیں ہوتا۔ وہ رسول کی زبانِ مبارک سے احکامِ خداوند کا سنتے ہیں تو بے چون و چسدا اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اور جب رسول کسی اختلافی معاملے میں فیصلہ دیتا ہے تو فیصلے کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی کسیدگی یا گرائی پیدا نہیں ہوتی۔ وہ بطیبِ خاطر اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اسی بنا پر کہا کہ تم حضورؐ کو مخاطب کرو تو یوں کہو کہ **اُنْظُرْنَا** ”آپ ہم پر نگاہِ التفات رکھئے۔ آپ ہماری طرف دیکھتے رہئے کہ ہمارا قدم جادہ حق و صداقت سے ادھر ادھر نہ ہونے پائے۔ آپ ہماری نگرانی کیجئے“ اسی حقیقت کو ذرا آگے چل کر ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ”ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی قوم بنایا ہے تاکہ تم نوعِ انسانی کے اعمال کی نگرانی کرو **وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا** (۲۳۱) ”اور خدا کا رسول تمہارے اعمال کی نگرانی کرے۔“ تم حضورؐ سے یوں خطاب کیا کرو اور اس کے بعد حضورؐ کے فرمان کو دل کے کانوں سے سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ ایسا نہ کرو گے تو تم کفر کی روش اختیار کر لو گے اور الم انگیز عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

اس کے بعد کہا کہ یہ سب ان کی کٹ جتیاں ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت چاہتے ہی نہیں تھے کہ تمہیں نبوت ملتی، خدا کی کتاب تم پر نازل کی جاتی :-

مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ
**اَنْ يُنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ وَاللّٰهُ يُخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ
 مَنْ يَّشَاءُ۔ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ۔**

۲
۱۰۵

اہل کتاب کیوں نہیں چاہتے تھے کہ حضورؐ کو نبوت ملے۔ اس کی وجوہات پہلے بیان کی جا چکی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ

یہ چاہتے ہی نہیں تھے کہ تمہیں نبوت ملتی | چونکہ ہر مذہب کے پیرو اس فریب نفس میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ان کا مذہب سچا ہے اور تمام مذاہب سے

ارفع و اعلیٰ۔ اس لئے وہ کسی دوسرے کی آواز تک سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ لہذا یہود و نصاریٰ پر تو یہ بات بھی گراں گزرتی تھی کہ حضور انہیں دین کی دعوت کیوں دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ، عرب میں وہ لوگ بستے تھے جو کسی خاص مذہب کے پیرو نہ تھے (یعنی قریش اور دیگر عربی قبائل) قرآن کریم نے انہیں مشرکین کہہ کر پکارا ہے یہ قرآن کی اصطلاح ہے اور اس میں جہاں بھی اس زمانے کے ان مشرکین کا ذکر آئے گا اس سے مراد یہی لوگ ہوں گے۔ قریش اس دعوت کی کیوں مخالفت کرتے تھے اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔ قریش کی پوزیشن یہ تھی کہ وہ بڑی مرید قوم تھی۔ اس کے تجارتی قافلے من سے شام تک رواں دواں رہتے تھے۔ مکہ، سارے عرب اور ارد گرد کے علاقوں کی مرکزی منڈی تھا جو ان کی تحویل میں تھا۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اس سارے علاقے کی تجارت کا مرکزی کنٹرول ان کے ہاتھ میں تھا۔

کعبہ اہل عرب کی مرکزی پرستش گاہ تھا اور قریش اس کے متولی یا مہاجن تھے۔ اس سے انہیں ایسا مقدس اور بلند مقام حاصل ہو گیا تھا کہ اس زمانے میں، جبکہ رہنری اور فزاقی عام تھی، ان کے تجارتی قافلوں کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ (۱۶۶) علاوہ بریں، خود کعبہ کی آمدنی بھی کچھ کم نہ تھی۔ وہ تو ایک ریاست تھی۔

پھر، انہوں نے انسانوں کو اس طرح نسلی طبقات میں تقسیم کر رکھا تھا کہ کوئی ان پیدائشی حدود کو توڑ ہی نہیں سکتا تھا، ان طبقات میں قریش کو بلند ترین مقام حاصل تھا۔ جیسے ہندوؤں کے ہاں برہمنوں کو۔

غلامی ان کے معاشرے کا معمول تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے سارے کام کا ج غلام کرتے تھے جن کی حالت مویشیوں سے بھی بدتر تھی۔ اور ان کے گھروں میں لونڈیاں تھیں جن کی عام خرید و فروخت ہوتی تھی۔

قریش کیوں مخالف تھے | اور سب سے بڑھ کر یہ کہ، اگرچہ ان کی اپنی کوئی منظم حکومت نہیں تھی لیکن وہ کسی خارجی قانون اور ضابطہ کے بھی پابند نہیں تھے۔ وہ پنچائتی طور اپنے معاملات

طے کرتے تھے۔ اس نظام میں سرداران قوم کو بہت بڑی سیادت اور قیادت حاصل تھی۔

یہ تھے وہ مغادات، جن کے حامل قریش تھے۔ جب مکہ میں مستعدی تعلیم عام ہوئی تو انہوں نے بھانپ لیا کہ اس کی رو سے ان سے وہ سب کچھ چھین جائے گا جس کے وہ اس طرح غاصب بنے بیٹھے تھے۔ اس سے ان کی نہ مذہبی سیاست باقی رہے گی، نہ اقتصادی قیادت نہ نسلی تفوق باقی رہے گا۔ نہ سیاسی امارت۔ جب تک یہ تعلیم نظری حیثیت لئے رہی تو اگرچہ وہ اس

تعلیم پر نیک کہنے والوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے رہے لیکن انہوں نے ان کے خلاف اجتماعی طور پر کوا قدم نہ اٹھایا کیونکہ انہیں یقین نہیں تھا کہ یہ نظری تعلیم ان کے لئے سچ مچ کا خطرہ بن جائے گی۔ لیکن جب یہ تعلیم مدینہ میں ایک مملکت کی شکل اختیار کرنے لگی تو انہوں نے ان خطرات کو بے نقاب دیکھ لیا۔ انہیں صاف نظر آ گیا کہ اگر مسلمانوں کا معاشرہ قرآنی خطوط پر متکثر ہو گیا تو اس کے انسانیت ساز، حیات بخش نتائج کو دیکھ کر ساری دنیا ان کی طرف کشاں کشاں چلی آئے گی اور اس سب سے بڑا خطرہ ان کے سامنے نہ قرین باقی رہیں گے نہ ان کے امتیازات و مفادات۔ یہ وجہ تھی کہ وہ اس کے خلاف تھے کہ اس قسم کا نظام قائم ہو جائے۔ وہ تو ایک طرف، قیصر و کسریٰ تک کی سلطنتیں بھی اس سے خائف تھیں۔ حضورؐ نے جب قیصر اور کسریٰ کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ اگر تم نے اپنی موجودہ استبداد و استحصال کی روش نہ چھوڑی تو روم کے محنت کشوں اور ایران کے دہقانوں پر ہونے والے مظالم کا خیمہ انہیں بھگتنا پڑے گا تو انہوں نے بھی اس ابھرنے والی تحریک کے ہاتھوں اپنے مستقبل کا اندازہ لگا لیا تھا۔ لہذا اہل کتاب اور مشرکین عرب تو ایک طرف، دنیا کی کوئی قوت بھی یہ نہیں چاہتی تھی یہ نظام قائم ہو جائے۔

مندرجہ بالا آیت (۲۰۵) میں قرآن کریم کو، ”خیر“ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اور خیر کی وضاحت سورۃ النحل میں، ان الفاظ سے کی گئی ہے: وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا خَيْرًا لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ (۱۶) ”جماعت مؤمنین (مستقیوں) اسے پوچھا جا رہا ہے کہ جو کچھ تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل کیا ہے وہ ہے کیا؟ تو اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ وہ خیر ہے یعنی جو لوگ اس کے مطابق زندگی بسر کریں گے انہیں اس دنیا میں بھی ہر قسم کی خوشگواریاں اور سرسبز داریاں حاصل ہوں گی اور ان کی آخری زندگی بھی انہی حسنات کو لئے ہوئے

قرآن کریم خیر ہے

ہوگی۔ متقیوں کے لئے یہ ٹھکانا کس قدر خوشگوار (پر نعمت) ہوگا!۔ اس کے بعد اگلی آیات میں ان نعمات کی تفصیل دی گئی ہے۔ یہ ہے اس ”خیر“ پر عمل کرنے کا نتیجہ، جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ دنیا اور آخرت — دونوں کی خوشگواریاں اور سرسبز داریاں کا ضامن۔“

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ نبوت کسی کو کسب ہنر سے نہیں مل سکتی۔ یہ خدا کی طرف سے وہی طور ملتی ہے اور جس ہستی کو اس کے لئے منتخب کیا جاتا ہے اس کا فیصلہ خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔

وحی کے متعلق ہم اس سے پہلے بڑی تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں (ملاحظہ فرمائیے آیات (۱۰۰) (جلداول صفحہ ۱۲۲ ذ (۱۰۰))

جلداول صفحہ ۴۲ ذ (۱۰۰) جلد اول صفحہ ۱۲۰ ذ (۱۰۰) جلد اول صفحہ ۲۰۸ ذ (۱۰۰) جلد دوم سابقہ صفحات) یہاں ہم اتنا کہہ

آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں کہ نبوت، خالصتاً وہی (عطیہ خداوندی) ہوتی تھی اور چونکہ حضور کے ساتھ سلسلہ نبوت ختم ہو گیا اس لئے اب کسی کو نبوت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اہل کتاب کی طرف سے پہلا اعتراض تو یہ تھا کہ نبوت کے لئے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں منتخب کیا گیا اور دوسرا اعتراض یہ کہ اگر یہ وحی خدا کی طرف سے ہے تو ایسا کیوں ہے کہ اس کے بعض احکام ان احکامات سے مختلف ہیں جو ہماری شریعت میں موجود ہیں حالانکہ وہ بھی وحی پر مبنی ہے۔ اس کا جواب اگلی دو آیات میں دیا گیا، جہاں کہا کہ۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلَهَا. أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ. أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ. وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ۔

۲
۱۰۲-۱۰۴

یہ آیات "ناسخ اور منسوخ" سے متعلق ہیں۔ اس اہم مسئلہ کے متعلق تفصیلی گفتگو، جلد اول میں، زیر آیت (۲) صفحہ ۱۲۵ پر کی جا چکی ہے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کا تعلق قرآن مجید کی آیات سے نہیں، کتب سابقہ کے احکام سے ہے۔ قرآن کریم کا ایک لفظ بھی منسوخ نہیں۔ وہ سب کا سب مکمل اور غیر متبدل احکام و اقدار خداوندی کا مجموعہ ہے۔

اس کے بعد جماعت مومنین سے کہا گیا کہ تم اس بنیادی حقیقت کو بھی سمجھ لو کہ جس قدر احکام و قوانین کا دیا جانا خدا کو مقصود ہے وہ سب از خود قرآن مجید میں دیدیئے جاتیں گے اور جن امور کے متعلق کچھ نہیں کہا جائیگا ان کے

ناسخ و منسوخ

متعلق سمجھ لینا چاہئے کہ ایسا دانستہ کیا گیا ہے۔ خدا سے بھول نہیں ہو گئی۔ لہذا ان امور کے متعلق تم اپنے رسول سے اس قسم کے سوالات نہ شروع کر دینا جس قسم کے سوالات اس سے پہلے بنی اسرائیل، اپنے رسول، موسیٰ علیہ السلام سے کیا کرتے تھے۔

چنانچہ اگلی آیت میں ہے کہ:-

أَمْ تُرِيدُونَ أَن تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سَأَلَ مُوسَىٰ مِن قَبْلُ. وَمَن يَتَّبِدَلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ۔

۲
۱۰۸

ہم اس موضوع کے متعلق جلد اول، آیت (۲) صفحہ ۱۲۸۔ نیز زیر نظر جلد میں آیت (۲) کے تحت (سابقہ صفحات میں) گفتگو کر چکے ہیں۔ اسے دیکھ لیجئے۔ اس مقام پر اتنا کہدینا کافی ہے کہ اس قسم کی روش اختیار کر لینے کو قرآن کریم نے "ایمان کو کفر سے تبدیل کر لینے" کے مراد قرار دیا ہے۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے۔

ہم اسے دہرا دیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ ہمایوں میں اسلامی مملکت قائم
دین کی جزئیات کا تعین ہو چکی تھی اسلئے قرآنی احکام و اقدار کی جو تفصیل اور جزئیات قرآن کریم میں نہیں دی

گئیں تھیں، انہیں یہ نظامِ مملکت باہمی مشاورت سے طے کرنا تھا۔ اس لئے یہ صورت ہی پیدا نہیں ہوتی تھی کہ امت رسول سے کہے کہ وہ
 ان جزئیات کو بھی بذریعہ وحی حاصل کرے۔ لیکن بعد میں، جب وہ اسلامی نظام باقی نہ رہا تو، ان جزئیات کو احادیث کی رو سے متعین
 کرنے کی کوشش کی گئی اور عقیدہ یہ وضع کیا گیا کہ یہ احادیث بھی وحی پر مبنی ہیں۔ وحی کا ایک حصہ (جسے وحیِ نبلی کہا جاتا ہے) قرآن مجید کے اندر
 ہے اور اس کا دوسرا حصہ (جسے وحیِ نہنی کہا جاتا ہے) احادیث میں۔ گویا اس طرح ہم نے اس سوال کو دہرایا کہ جو کچھ قرآن کریم میں نہیں
 آیا اسے بھی خدا کو بذریعہ وحی دینا چاہئے تھا اور اس نے اسے وحی کی دوسری قسم کے ذریعے دیدیا۔ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں، وحی کی ان
 دو قسموں کا عقیدہ بھی غیر قرآنی ہے۔ وحی کی ایک ہی قسم ہے اور وہ سب کی سب قرآن مجید کے اندر محفوظ ہے، خارج از قرآن کہیں نہیں۔



آیت (۱۰۹) میں کہا گیا ہے کہ اہل کتاب چاہتے ہی نہیں تھے کہ یہ وحی رسول اللہ کی طرف نازل ہوتی، لیکن جب یہ نازل ہو گئی اور
 لوگوں نے اسے قبول کرنا شروع دیا تو اس کے بعد ان کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ کسی طرح، ان لوگوں کو اس دین سے برگشتہ کر دیں، چنانچہ آگے ہے۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُّوْكُمْ مِّنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا
 حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا
 حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

۲
۱۰۹

آیت کے آخری حصے میں آسمانی انقلابی پروگرام کی ایک اہم کڑی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس انقلاب کی بنیاد
 نفسیاتی تغیر پر ہے۔ اس کے لئے طریق کار یہ تھا کہ رسول، وحی کی تعلیم کو عام کرتا جائے اور لوگوں کو اس پر غور و فکر
 کی دعوت دے۔ معترضین کے اعتراضات کا بہ دلائل و براہین جواب دے۔ ان کے شکوک و شبہات کو رفع کرے
 اور جو لوگ اس طرح، اس دعوت کو قبول کر لیں، انہیں اپنی جماعت میں شامل کرتا جائے۔ حضور کی حیاتِ طیبہ
 کا کافی حصہ اس تبلیغ و تنظیم میں گزرا۔ اس کے بعد جب ایسا مقام آ گیا جہاں دیکھا گیا کہ باقی لوگ اس دعوت کو قبول
 کرنے کے لئے تیار نہیں اور محض ضد اور تعصب کی بنا پر اس کی مخالفت کئے جا رہے ہیں تو حضور سے کہا گیا کہ
 اب تم اپنی ساری توجہ اس جماعت کی تعلیم و تربیت و تنظیم پر مرکوز کرو اور ان مخالفین سے اعراض برتو۔ اس
 کے بعد اگر انہوں نے اپنی مخالفت میں آخری فیصلہ چاہا تو وہ بھی قوانین
مخالفین سے اعراض خداوندی کے مطابق ہو جائے گا۔ لیکن ان لوگوں سے علیحدگی اختیار کرنے کے سلسلے

میں کہا کہ **وَأَمْجَرُهُمْ هَجْرًا جَبِيلًا (۳۳)** یا **فَاَصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ (۱۵۸)** ان سے الگ بھی ہو تو حسن کارانہ انداز سے۔ دنیا میں دوسروں سے تعلقات وابستہ کرنے کیلئے تو کہا جاتا ہے کہ ایسا حسن کارانہ انداز سے کرنا چاہئے لیکن یہاں یہ تاکید ہو رہی ہے کہ مخالفین سے بھی اعراض برتنے کی نوبت آجائے تو ان سے حسن کارانہ انداز سے علیحدگی اختیار کر دو۔ ان سے درگزر کر دو، اور اپنے پروگرام کی تکمیل کے لئے آگے قدم بڑھاتے جاؤ (۱۵۸)۔

نبی کا قلب بھی بڑا ہی گداز اور پُرسوز ہوتا تھا۔ مخالفین اپنی دشمنی میں انتہا تک پہنچ جاتے تھے لیکن اُسے یہ غم کھاتے جاتا تھا کہ یہ اس طرح تباہ ہو جائیں گے۔ اے کاش! یہ کسی طرح اس تباہی سے بچ جائیں۔ یہ احساس اتنی شدت اختیار کر جاتا تھا کہ خود خدا کو یہ کہنا پڑتا تھا کہ **لَعَلَّكَ بَآخِ نَفْسِكَ لَا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ (۳۳)** ”ایسا نظر آتا ہے کہ تم تو اس غم میں، کہ یہ لوگ امن و سلامتی کا راستہ کیوں اختیار نہیں کرتے، اپنی جان گھلا لو گے۔“

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسْرَتٍ (۳۴) ”اے رسول! تو ان کی غم خواری میں اس طرح اپنی جان نہ گھلا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے“ لیکن

اس چھوڑ دینے کے باوجود یہ تاکید بھی کر دی کہ **وَذَكِّرْ لَهُ أَنْ تُنْسِلَ نَفْسًا بِمَا كَسَبَتْ (۳۵)** ”تو انہیں قرآن کے ذریعے نصیحت پر حال کرتا رہ، تاکہ کوئی شخص، حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر تباہ نہ ہو جائے“، یعنی پہلے، رسول ان لوگوں کو بھی اپنی خاص توجہ کا مرکز قرار دیتا تھا۔ اب یہ کہا گیا کہ اس اختصاص سے تو قطع نظر کر لو لیکن اپنی عمومی دعوت جاری رکھو۔ یہ تھی ذریعہ تبلیغ کی اہمیت! سابقہ آیت میں کہا گیا کہ اب تم جماعتِ مومنین کی تربیت و تنظیم کے لئے اپنی کوششوں کو مرکوز کر دو۔ اس کے لئے پروگرام دہی دیا گیا جو دین کی اساس ہے۔ کہا یہ گیا کہ:-

وَاقِمْ الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَمَاتَّقُوا مَوَالَا نَفْسِكُمْ مَنْ خَيْرٌ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ - إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ -

۲
۱۱۰

یعنی ”اقامتِ صلوٰۃ اور اتانے زکوٰۃ“ کا پروگرام۔ اقامتِ صلوٰۃ کے متعلق جلد اول میں آیت (۲۳۸) کے تحت (صفحات ۱۴۰-۹۷) پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اور زکوٰۃ کے متعلق آیت (۲۵۴) کے تحت سابقہ صفحات میں۔ اُسے دھرانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں کہا یہ گیا کہ اپنی جماعت پر اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دو کہ اس انقلابی پروگرام کے ابتدائی دور میں تمہاری سعی و عمل کا محسوس نتیجہ جلدی سامنے نہیں آئے گا لیکن تم اس یقین پر استقامت سے آگے بڑھتے چلے جاؤ کہ تمہارا کوئی عمل ضائع نہیں ہو رہا۔ تم یوں سمجھو کہ تمہارے اعمال، وہ پیش رو کارندے ہیں جو کاروان کے منزل پر پہنچنے سے پہلے ان کے لئے سب انتظام کر رکھتے ہیں یہی کچھ تمہارے اعمالِ حسنہ کریں گے۔ تم اس پروگرام

پر عمل کرتے جاؤ اس سے اس دنیا میں بھی جنتی معاشرہ قائم ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد اگلی دنیا میں بھی۔
یہ ان اہل کتاب کا زعمِ باطل اور فریبِ نفس ہے جو کہتے ہیں :-

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارًا. تِلْكَ
أَمَانِيُّهُمْ. قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ. ۲/۱۱۱

یعنی یہ کہ جنت، یہود و نصاریٰ کے لئے مخصوص ہو چکی ہے۔ اس آیت کا بنیادی تعلق، خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے ہے جس کی تشریح گذشتہ صفحات (بالخصوص زیر آیت ۲/۱۰۸) پر کی جا چکی ہے۔
اہل کتاب کے اس زعمِ باطل کے بعد کہا کہ خدا کا قانون یہ ہے کہ :-

بَلَىٰ مَن أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ. فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ. ۲/۱۱۲

جو بھی اپنے آپ کو خدا کے قوانین کے سامنے جھکا کر، حسن کارنامہ انداز سے زندگی بسر کرے گا اس کا اجر اُسے
خدا کے ہاں سے ملے گا۔ اور اس اجر کو ان چار الفاظ میں دہرایا کہ ان پر نہ کسی قسم کا خوف ہو گا نہ حزن۔
قصہ آدم کے آخر میں یہی کہا گیا تھا کہ جو لوگ ہمارے بتائے ہوئے راستے پر چلیں گے ان پر کسی قسم کا خوف اور
حزن نہیں ہو گا (۲/۳۸)، اسی کو یہاں دہرایا گیا ہے۔

بنی اسرائیل کی داستان تو آگے بھی چلتی ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ قارئین اس منزل پر تھوڑی دیر کے لئے
ستائیں اور داستان کے اگلے حصے کے لئے تیسری جلد کا انتظار فرمائیں۔
والسلام۔ واللہ اعلم۔

خلاصہ باب پنجم و ششم

(آیات ۵۵ یا ۱۱۲)

(۵۵)۔ ہم نے تمہیں ایک واضح ضابطہ قانون دیا تھا جس کے نتائج نے تمہیں، خود بخود بتا دینا تھا کہ وہ (واقعی) خدا کا
قانون ہے، کسی انسان کا خود ساختہ نہیں۔ لیکن، بجائے اس کے کہ تم اس پر عمل پیرا ہو کر اس کے نتائج سے خدا کو

پہناتے، تمہاری ذہنی سطح اس قدر پست، اور تم محسوسات کے اس درجہ خوگر ہو چکے تھے، کہ تم موسیٰ سے یہ کہنے لگے کہ ہم تیری کوئی بات ماننے کے لئے تیار نہیں جب تک ہم اس خدا کو جس کی طرف سے، تم کہتے ہو کہ یہ قانون نازل ہوا ہے (خود اپنی آنکھوں سے بے نقاب نہ دیکھ لیں۔) حالانکہ ظاہر ہے کہ خدا کوئی سادی پیکر نہیں جسے آنکھوں سے دیکھا جاسکے۔ اس کا تو، اس کی خدائی اور اس کے قوانین کے نتائج سے، بہ چشم بصیرت ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

نقضاء تمہارا خدا کو بے نقاب دیکھنے کا تھا، اور ہمت کا یہ عالم کہ زلزلہ کی گرج دار آواز، اور ارتعاش سے (۱۵۵) تمہارے ہوش اُڑ گئے، حالانکہ تم دیکھ رہے تھے کہ وہ زلزلہ ہی ہے۔ (یہ اس لئے کہ تمہاری نوہم پرستیوں نے، جن کی وجہ سے تم نے پکھڑے تک کو دیوتا بنالیا تھا، ان مظاہر فطرت کا خوف تمہارے دل میں پیدا کر رکھا تھا۔ شرک کا یہی نتیجہ ہوتا کرتا ہے)۔

(۱۵۶) ہم نے اس کے بعد بھی تمہیں اٹھا کھڑا کیا اور اس کا موقعہ دیا کہ تمہاری صلاحیتوں کی پوری نشوونما ہو سکے تاکہ تم غلامی کے مرگ آفرین اثرات سے آزاد ہو کر انسانی سطح کی حیاتِ نو سے سرفراز ہو سکو۔ اور اس طرح تمہاری کوششیں ثمر بار ہو سکیں۔

(۱۵۷) اس کے لئے تمہیں بلا مزد و معاوضہ، سامانِ معیشت کی فراوانیاں عطا کی گئیں۔ اُس بیابان میں، پانی سے بھرے ہوئے بادل تمہارے سروں پر سایہ لگ گئے، اور کھانے کے لئے تہایت خوشگوار غذا — پرندوں کا گوشت اور خورو و نباتاتی شیرینی — تمہارے لئے وجہ سکون و اطمینان بنتی تھی۔

لیکن تم اس پر بھی ہمارے قوانین کے اتباع پر قائم نہ رہے! اس سے ہمارا کچھ نقصان نہیں ہوا، تم نے اپنا ہی نقصان کیا، اور خود اپنے ہاتھوں سے ایسا کیا۔

(۱۵۸) ہماری تجویز یہ تھی کہ تم فلسطین کی سرزمین میں فاتحانہ حیثیت سے رہو (۱۵۹) اور اس طرح، اپنے اختیار و ارادہ سے، جیسے اور جب جی چاہے، سامانِ رزق سے فائدہ اٹھاؤ، فقط اس ایک شرط کے ساتھ کہ تم ہمارے قوانین کے سامنے اپنا سر جھکائے رکھو۔ اس طرح، تمہاری صحرا نوردی اور خانہ بدوشی کی زندگی بھی ختم ہو جاتی، اور تم سے جو غلطیاں سرزد ہو چکی تھیں ان کے مضر اثرات سے تمہیں سامانِ حفاظت بھی مل جاتا۔ اور اگر تم اس کے بعد بھی حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے، تو ان فتوحات کا سلسلہ اور بھی آگے بڑھتا چلا جاتا۔

(۱۵۹) لیکن تم نے سپاہیانہ اور مجاہدانہ زندگی کے مقابلہ میں آرام طلبی اور تساہل انگیزی کی زندگی کو پسند کیا (۱۶۰) اور اس طرح ہمارے تجویز کردہ راستے کو چھوڑ کر، ایک الگ اختیار کر لی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کے سادی قانونِ مکافات کے مطابق تم

میں کمزوری آتی چلی گئی اور تمہاری ٹانگیں بری طرح لڑکھڑانے لگ گئیں۔ تم میں جرات و ہمت باقی نہ رہی (۲۳۷-۲۳۸)۔
[اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی سرزمین، جس کی ملکیت کا قبائلہ تمہارے نام لکھا جا چکا تھا، (۲۳۱)، چالیس سال تک تمہارے قبضہ میں نہ آ سکی۔ (۲۳۹)۔]

(۲۴۰) تم اپنی تاریخ کے اس واقعہ کو بھی یاد کرو جب تمہیں پانی کی دقت ہوتی۔ اور موسیٰؑ نے اس کے لئے ہم سے دعا کی تو ہم نے ان کی راہنمائی اس مقام کی طرف کر دی جہاں پانی کے چشمے مستور تھے۔ وہ اپنی جماعت کو لے کر وہاں پہنچا، چٹان پر سے مٹی بٹائی، تو اس میں سے، ایک دو نہیں اکٹھے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ اس نے ان چشموں کو نامزد کر دیا اور ہر قبیلہ کو بتا دیا کہ ان کا چشمہ کونسا ہے اس طرح ہم نے تمہیں سامانِ معیشت کی فکر سے نجات دلادی۔ اور کہہ دیا کہ دیکھو! اب جب کہ تمہاری معاشی ضروریات پوری ہو رہی ہیں، تم۔۔۔ معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کر کے اس کا شیرازہ منتشر نہ کر دینا

(۲۴۱)۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ۲۳۹) تم نے، سپاہیانہ زندگی پر، شہری زندگی کو ترجیح دی۔ اس کے لئے موسیٰؑ سے کہا کہ ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم (اس صحرائی زندگی میں) صبح و شام ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے رہیں۔ اس لئے، تم اپنے نشوونما دینے والے سے ہمارے لئے زرعی پیداوار طلب کرو۔ سبزیاں، ترکاریاں، لکڑیاں، لہسن (یا مختلف قسم کے پھل) مسور پیاز (وغیرہ)۔ حالانکہ صحرائی زندگی تمہاری عسکری تربیت گاہ تھی اور وہاں کی خوراک ایسی تھی جو تم میں زندگی کی حرارت پیدا کر دیتی۔

موسیٰؑ نے کہا کہ (کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ) تم اس بہترین زندگی کی بجائے، جو تمہارے لئے تجویز کی جا رہی تھی اس قسم کی ادنیٰ زندگی اختیار کرنا چاہتے ہو، اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو جادو شہر کی زندگی اختیار کر لو۔ وہاں تمہیں یہ سب کچھ مل جائے گا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں عسکریت اور کشور کشائی کی صلاحیتیں مفقود ہو گئیں اور محکومیت اور تسلیمِ انگریز کی خصلتیں پیدا ہو گئیں۔ اور اس طرح، ان پر ذلت و خواری کا عذابِ خداوندی مستولی ہو گیا۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ انہوں نے قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے انبیاء کی عزت و توقیر کے بجائے، انہیں ناحق ذلیل کرنے کی تدبیریں کرنے لگے۔ نیز بعض کی جان تک کے لاگو ہو گئے (۲۴۲)۔ یہ سب کچھ ان کی سرکشی اور حدودِ امر و نہی کا نتیجہ تھا۔

(۲۴۲)۔ یہ تو تمہاری روش رہی ہے، اور اس کے باوجود تمہارا عقیدہ یہ ہے کہ تم خدا کی چہیتی اولاد ہو (۲۴۳) اور جنت تمہاری

نسل کے لئے مخصوص ہے (۲/۱۱۱)۔ یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ جنت کسی نسل کے لئے مخصوص نہیں۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ یہودی ہوں یا نصرانی۔ صابی ہوں یا وہ لوگ جو کسی مذہب میں رسمی طوڑ پر داخل ہوئے بغیر ویسے ہی خدا کو ماننے ہیں۔ یا خود مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے والے۔ غرضیکہ کوئی بھی ہو، جو بھی خدا کے اقتدارِ اعلیٰ، زندگی کے تسلسل، اور اس کے قانونِ مکافات پر اس طرح ایمان رکھے جس طرح اس قرآن میں بتایا گیا ہے (۲/۱۱۲)، اور اس کے دیتے ہوئے پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کرے، تو ان کے نشوونما دینے والے کے قانونِ مکافات کے مطابق، ان کا اجر ملے گا، (جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ) نہ کسی قسم کا خوف ان کے دامن گیر ہوگا، نہ حزن، وجہ افسردگی بنے گا۔ (۲/۱۳۶ ذ ۵۶، ۲/۱۱۱ ذ ۹، ۲/۹۶ ذ ۹۶)۔

(۶۳)۔ (اس ضمنی گوشہ کے بعد تم پھر اپنی تاریخ کی طرف پلٹو) اور اس حقیقت کو سامنے لاؤ کہ تمہاری طبیعی حفاظت کا سامان اس طرح کر دیا گیا تھا کہ تمہاری پشت پر پہاڑ کھڑا تھا اور تم اس کے دامن میں تھے۔ اور تمہاری انسانیت کی حفاظت کے لئے تمہیں ضابطہ قوانین دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہم نے تم سے کہا تھا کہ تم اس ضابطہ ہدایت کو نہایت مضبوطی سے تھامے رکھنا۔ یعنی جو کچھ اس میں کہا گیا ہے اسے بروقت اپنے پیش نظر رکھنا، تاکہ تم زندگی کے ہر خطرے سے محفوظ رہ سکو۔ تم نے اس کا محکم عہد کیا تھا۔

(۶۴)۔ لیکن، اس محکم عہد و پیمان کے بعد، تم اس سے پھر گئے۔ یہ تو ہمارا قانونِ مہلت تھا جس کی وجہ سے تم پر فوراً گرفت نہ کی گئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم سے زندگی کی خوشگواریاں اور سامانِ نشوونما کی فراوانیاں، جو تمہیں حاصل تھیں، فوراً چھین جاتیں اور تم بالکل تباہ و برباد ہو جاتے۔

(۶۵)۔ ضابطہ خداوندی کو مضبوطی سے تھامنا تو بہت بڑی چیز تھی، تمہاری ناپختگی سیرت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ تم سے کہا گیا کہ ہفتے میں ایک دن اپنا کاروبار بند رکھو، اور پھلیاں نہ پکڑو (۲/۱۱۳)۔ لیکن تمہاری حرص و ہوس اتنی ہی پابندی کی بھی متحمل نہ ہو سکی (۲/۱۱۳ ذ ۱۵۳)۔ اور تم نے اس نظم و ضبط کو توڑ ڈالا۔ (اس سے ہمارا تو کچھ نہ بگڑا) تم خود ہی ذلت و مسکنت کے چلتے پھرتے پیکر بن گئے۔ سرکش قوتوں کی محکومی کے شکنجے میں جکڑے گئے (۲/۱۱۴ ذ ۵)۔ اور زندگی کی شادایوں سے محروم رہ گئے (۲/۱۱۴)۔

(۶۶)۔ تمہاری یہ ذلت و خواری، ہر اس قوم کے لئے جو تباہیوں سے بچنا چاہے، عبرت و موعظت کا سامان اپنے اندر رکھتی ہے۔ ان کیلئے بھی جو اس وقت تمہارے ہم عصر تھے، اور ان کے لئے بھی جو ان کے بعد آئے، اور انہوں نے تاریخِ نوشتہ سے تمہارے حالات کو پڑھا۔

(۶۷) پھر تمہاری خوتے بہانہ سازی کا یہ عالم ہو چکا تھا، کہ جب تمہیں خدا نے حکم دیا کہ ایک سانڈ ذبح کر ڈالو تاکہ تمہارے دل سے گو سالہ پرستی کا وہ جذبہ عقیدت نکل جائے جو تم نے قبیلوں کی دیکھا دیکھی اپنے اندر پیدا کر لیا تھا (۱۶: ۱۷)۔ تو پہلے تو تم نے اس حکم ہی کا مذاق اڑانا شروع کر دیا، حالانکہ تمہیں معلوم تھا کہ تمہیں وہ حکم خداوندی ایک پیغمبر کی وساطت سے ملا ہے، اور یہ بات ایک پیغمبر کے شایان شان نہیں ہوتی کہ وہ جہالت آمیز باتیں کرے۔ (۶۸) جب تمہیں بتایا گیا کہ یہ خدا کا حکم ہے اور اس کی تعمیل ضروری، تو تم نے خواہ مخواہ موٹگافیاں شروع کر دیں، اور کہنے لگے کہ خدا سے کہو کہ وہ ذرا واضح طور پر بتائے کہ وہ سانڈ کس قسم کا ہونا چاہئے۔

جب تم نے خود ان جزئیات کا تعین چاہا تو تم سے کہا گیا کہ وہ سانڈ نہ بوڑھا ہونا چاہئے نہ بچہ، بلکہ اس کے بین بین ادھیڑ عمر کا ہونا چاہئے۔ لہذا اب تم اس حکم کی تکمیل میں لیت و لعل مت کرو۔

(۶۹) تم نے کہا کہ نہیں، بات اب بھی واضح نہیں ہوئی۔ اپنے رب سے پوچھ کر یہ بتاؤ کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ کہا گیا کہ گہرے زرد رنگ کا سانڈ، جو دیکھنے والوں کی نگاہوں میں اچھا لگے۔

(۷۰) اس پر بھی تم آمادہ عمل نہ ہوئے، اور مزید حجت بازی کے لئے کہا کہ بات اب بھی کچھ مشتبہ سی رہی۔ ذرا اور وضاحت سے بیان کیجئے تاکہ ہم صحیح بات تک پہنچ جائیں اور جو کچھ خدا کا منشاء ہے ٹھیک اسی کے مطابق کریں۔

(۷۱) کہا گیا کہ ایسا سانڈ جیسے نہ ہل میں جو آگیا ہو اور نہ کنوئیں پر چلایا گیا۔ ہر طرح سے صحیح سالم اور بے داغ — کہا کہ ہاں! اب تم نے ٹھیک ٹھیک پتہ بتایا۔

سو تم نے ایک معمولی سی بات میں بھی اس قدر موٹگافیاں شروع کر دیں۔ یہ کچھ تم نے اس لئے نہیں کیا تھا کہ پہلے بات واضح نہ تھی۔ تمہیں شروع ہی سے معلوم تھا کہ ہم تمہارے ہاتھوں سے سانڈ (دیوتا) اس لئے ذبح کرنا چاہتے تھے کہ تم نے اسے معبود بنا رکھا تھا، اور ہم چاہتے تھے کہ تمہارے دل سے یہ جذبہ عقیدت نکل جائے۔ لیکن تمہارا جی نہیں چاہتا تھا کہ تم اسے ذبح کر دو۔ اس کی محبت تمہارے دل کی گہرائیوں تک اتر چکی تھی (۱۶: ۲۰)۔ لیکن تم اس کا اقرار بھی نہیں کرنا چاہتے تھے، اسلئے تم نے جلد سازیاں کرنی شروع کر دیں، اور اس قدر لمبی چوڑی باتوں کے بعد اس حکم کی تعمیل کی۔

یاد رکھو! تعمیل احکام میں وہ باتیں کرید کرید کر نہیں پوچھنی چاہئیں جو خدا نے خود نہ کہی ہوں (۱۶: ۲۱)۔

(۷۲) ایک طرف تو تمہاری یہ حالت کہ ایک جانور کے ذبح کرنے میں اس قدر حیل و حجت، اور دوسری طرف یہ عالم کہ ایک انسانی جان ناحق لے لی۔ اُسے (خفیہ طور پر) مار دیا، اور جب تقشیش شروع ہوئی تو لگے ایک دوسرے کے سر الزام دھرنے۔ یعنی تم میں اتنی اخلاقی جرات بھی نہ تھی کہ جرم ہو گیا ہے تو کھلے بندوں اس کا اقرار کر لو۔ لیکن جس بات

کو تم چھپانا چاہتے تھے خدا اسے ظاہر کر دینا چاہتا تھا، تاکہ جرم بلا قصاص نہ رہ جائے۔

(۷۳)۔ مشرکانہ توہم پرستیوں سے، جن میں تم مبتلا ہو چکے تھے، انسان کی نفسیاتی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اسے کسی ذرا سی خلاف معمول بات کا سامنا کرنا پڑے تو اس پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے (۷۳)۔ چونکہ خدا تمہاری اس نفسیاتی کیفیت سے واقف تھا، اس لئے اس نے قاتل کا سراغ نکالنے کے لئے ایک نفسیاتی ترکیب بتائی (جو انسان کی اس زمانے کی ذہنی سطح کے اعتبار سے، بڑی خلاف معمول تھی) اس نے کہا کہ تمہیں جن لوگوں پر شبہ ہے انہیں ایک ایک کر کے بلاؤ اور ان سے کہو کہ وہ لاش کے کسی حصے کو چھوئیں۔ (چنانچہ جو مجرم تھا جب وہ لاش کے قریب پہنچا تو خون کی وجہ سے اس سے ایسے آثار نمایاں ہو گئے جو اس کے جرم کی غمازی کرنے کے لئے کافی تھے)۔ اس طرح اللہ نے اس قتل کے راز کو بے نقاب کر دیا اور، مجرم سے قصاص لے کر ان مرگ آفرین تاثرات کو جو قوم پر چھا رہے تھے، مبدل بہ حیات کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قصاص میں قوم کی حیات کا راز پوشیدہ ہوتا ہے (۷۴)۔ اللہ اس طرح تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا رہتا ہے تاکہ تم، عقل و شعور سے کام لے کر، ایسے معاملات کو سلجھالیا کرو، اور اس حقیقت کو سمجھ لو کہ نفسیاتی تغیر سے (افراد سے آگے بڑھ کر) کس طرح خود قوموں کی حالت بدل جاتی ہے (۷۵)۔

(۷۴)۔ غرضیکہ، تمہارے ساتھ یہ کچھ ہوتا رہا۔ تم بگڑتے اور بنتے رہے۔ آخر الامر تم نے ضابطہ خداوندی سے یکسر منہ موڑ لیا۔ اس سے تمہارے دل پتھر کی طرح سخت ہو گئے، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ اس لئے کہ، بعض پتھر بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے ندیاں پھوٹ نکلتی ہیں، اور بعض ایسے کہ وہ پھٹ جاتے ہیں تو ان کے اندر سے (ندیاں نہ سہی) پانی کے چشمے ضرور بہ نکلتے ہیں۔ اور ایسے پتھر بھی ہوتے کہ وہ قانون خداوندی کے سامنے، سختی کو چھوڑ کر، اپنے مقام سے نیچے اتر آتے ہیں یعنی نرم پڑ جاتے ہیں۔ ایسے نرم کہ انہیں آسانی سے پیسا جاسکتا ہے اور بعض کو پگھلایا بھی۔ لیکن تمہارے دل ہیں کہ نہ وہ انسانیت کی غمخواری میں نرم ہوتے اور نہ قانون خداوندی کے سامنے بھکتے ہیں، اور نہ آنسو بن کر تمہاری آنکھ سے ٹپکتے ہیں۔

لیکن اس سے خود تمہارا اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ تمہاری کوئی حرکت تمہارے قانون مکافات کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ ان میں سے ایک ایک کا نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا۔

و لے جماعت مؤمنین، دیکھنا! تم بھی کہیں ان جیسا نہ ہو جانا۔ (۷۶)۔

(۷۵)۔ لے قرآنی انقلاب کی طرف دعوت دینے والی جماعت! ہم جانتے ہیں کہ تم دل سے چاہتے ہو کہ یہودی بھی اس انقلاب

میں تمہارا ساتھ دیں، اور اس طرح، وہ خود بھی اس ذلت و خواری کی زندگی سے نجات حاصل کر لیں اور انسانیت بھی ان کی دسیسہ کاریوں سے مخلصی پائے۔ لیکن کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس قسم کی قوم، جس کی قلبی کیفیت وہ ہو چکی ہو جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، کبھی تمہارا ساتھ دے سکتی ہے؟ بالخصوص، جب ان کی حالت یہ ہے کہ وہ یہ کچھ لاعلمی سے نہیں کرتے۔ ان میں (مذہبی پیشواؤں کا) گروہ موجود ہے جو قوانین خداوندی کو سنتے ہیں، سمجھتے ہیں، اور پھر جان بوجھ کر اس میں تغیر و تبدل کر دیتے ہیں، اور اس کی ایسی ایسی تائیدیں کرتے ہیں جن سے بات کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔ باقی لوگ انہی کا اتباع کرتے رہتے ہیں۔

جو لوگ دیدہ دانستہ یہ کچھ کریں، ان سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ حق کو قبول کر لیں گے؟

(۷۶) تم انہیں ایماندار سمجھتے ہو، حالانکہ ان کی حالت یہ ہے کہ جب تمہارے پاس آتے ہیں تو اپنے آپ کو ایماندار ظاہر کرتے ہیں اور جب آپس میں، ایک دوسرے سے تنہائی میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اس جماعت سے خلا ملنا رکھنا تو اچھا ہے، لیکن ہمیں اس کی احتیاط برتنی چاہیے کہ ان سے اپنی کتابوں کی وہ باتیں نہ کہہ دی جائیں جنہیں یہ ہمارے خلاف بطور دلیل خداوندی لاکر، ہمارا منہ بند کر دیں۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

(۷۷) لیکن یہ اتنا نہیں سوچتے کہ جس خدا کی طرف سے انہیں وہ باتیں ملی تھیں، یہ، اُسی خدا سے ان باتوں کو چھپانا چاہتے ہیں! ان سے پوچھئے کہ کیا خدا سے یہ باتیں چھپی رہ سکتی ہیں؟ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ لوگ ظاہر کیا کرتے ہیں اور چھپا کر کیا رکھتے ہیں۔

(۷۸) یہ لوگ دوسروں کے ساتھ ہی اس قسم کی فریب کاری نہیں کرتے، خود اپنوں کے ساتھ بھی یہی کچھ کرتے رہتے ہیں (مثلاً) ان میں بعض لوگ ایسے ہیں جو پڑھے لکھے نہیں۔ وہ خوش عقیدگی کی پیدا کردہ جھوٹی آرزوؤں کو پلے باندھے رکھتے ہیں۔ اور توہم پرستیوں اور قیاس آرائیوں میں مست رہتے ہیں۔ اور شریعت کے متعلق جو کچھ انہوں نے پوچھنا ہو، اس کے لئے اپنے اجمار و رہبان (علماء مشائخ) کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

(۷۹) ان کے علماء کرتے یہ ہیں کہ شریعت کے احکام خود اپنے ذہن سے، اپنی مرضی کے مطابق، وضع کر لیتے ہیں، اور ان پر پڑھ لوگوں سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ سب ارشادات خداوندی ہیں۔ اور اس طرح ان سے ناجائز فائدہ حاصل کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ ان کی یہ خود ساختہ شریعت، اور اس کے ذریعے کمائی ہوئی دولت، سراسر تباہی اور بربادی کا موجب ہے۔ (۵۶)

(۸۰) ان کی یہ خوتے فریب دہی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ، اور تو اور، یہ خود اپنے آپ کو بھی دھوکا دینے سے

نہیں چوکتے۔ چنانچہ، یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم جو جی میں آتے کریں، ہم سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ ہم، زیادہ سے زیادہ، چند دنوں تک جہنم میں رہیں گے (یعنی صرف اتنے وقت کے لئے جب تک ہمارے شفاعت کر نیوالے ہمیں خدا سے بخشوا نہیں لیں گے)۔ ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اس کے متعلق خدا سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس لئے کہ خدا اپنے عہد سے پھر نہیں کرتا۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں۔ تم خدا کے متعلق اس قسم کی باتیں کرتے ہو جن کے لئے تمہارے پاس کوئی علم و دلیل نہیں۔

(۸۱)۔ تم سے کس نے کہہ دیا کہ خدا کے ہاں سفارشیں چلتی ہیں؟ وہاں کسی کی سفارش نہیں چل سکتی، نہ ہی اس کی کوئی چہیتی قوم ہے۔ اس کا غیر متبدل قانون یہ ہے کہ جس قوم نے بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کی، اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سارا معاشرہ خطا کاریوں سے بھر گیا اور ہر سمت فساد ہی فساد رونما ہو گیا، تو یہ وہ لوگ ہیں جن کی کھیتیاں جھاس کر رہ جائیں گی، اور وہ تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

(۸۲)۔ ان کے برعکس، جو قوم خدا کے قانون پر یقین رکھتے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوگی، تو ان لوگوں کو جنتی زندگی نصیب ہوگی۔ اور ان کی کھیتیاں ہمیشہ لہلہاتی رہیں گی۔ (۱۱۶)۔

(۸۳)۔ تمہارا خدا سے یہ عہد نہیں تھا کہ تم جو کچھ بھی کرتے رہو گے، تم سے اس کی باز پرس نہیں ہوگی۔ تمہارا عہد یہ تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی اور کے قوانین و احکام کی اطاعت نہیں کرو گے۔ (ضعیف) ماں باپ سے حسن سلوک سے پیش آؤ گے۔ نیز اپنے رشتہ داروں سے، اور ان لوگوں سے جن کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے اور ان کی زندگی کی کڑی کھڑی ہو جائے۔ ان سب سے ایسا برتاؤ کرو گے کہ ان کی کمیاں پوری ہو جائیں اور اس طرح معاشرہ کا توازن بگڑنے نہ پائے۔

تم نے یہ عہد بھی کیا تھا کہ تم لوگوں سے ہمیشہ خوش معاملگی سے پیش آؤ گے، اور انہیں اچھی باتوں کی تلقین کرو گے۔ نیز یہ کہ تم ایسا نظام قائم کرو گے جس میں تمام افراد، قوانینِ خداوندی کا پورا پورا اتباع کریں۔ اور ان کی نشوونما کا سامان ہم پہنچتا رہے۔ لیکن تم نے، اس عہد کے بعد، گریز کی راہیں نکالنی شروع کر دیں اور معدیے چند کے سوا، سب کے سب، سیدھا راستہ چھوڑ کر دوسری طرف چل نکلے۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی۔ تمہاری نفسیاتی کیفیت ہی ایسی ہو چکی تھی کہ تم قانونِ خداوندی کو چھوڑ کر دوسری راہوں پر چل نکلے!

(۸۴)۔ تم نے یہ عہد بھی کیا تھا کہ تم باہمی خونریزی نہیں کرو گے، اور اپنے میں سے کمزوروں اور غریبوں کو ان کے گھر سے نکال باہر نہیں کرو گے۔ تم نے اس کا اقرار کیا تھا۔ اور سب کچھ دیکھتے بھلتے، سوچتے سمجھتے اقرار کیا تھا۔ تم اب بھی اسے تسلیم کرتے ہو۔

(۸۵) لیکن تم ہو کہ ایسے محکم قول و اقرار کے بعد، باہمی خونریزیاں کرتے ہو اور، اپنے غریب بھائیوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرتے ہو۔ اور بجائے اس کے کہ تمہاری سوسائٹی، ان مجرمین کے خلاف، کوئی کارروائی کرے، تم اُنٹے ان غریبوں کے خلاف ظلم و استبداد میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو۔۔۔۔۔ کہیں کمزور کو کمزور تر بنانے سے اور کہیں ان سرکشوں کی حوصلہ افزائی کرنے سے۔۔۔۔۔ اور ستم ظریفی یہ کہ جب، ان گھروں سے نکالے ہوئے غریبوں کو دوسرے لوگ پکڑ کر لے جاتے ہیں تو تم بڑے خدا ترس بنتے ہو اور ان کا زبردستیہ ادا کر کے انہیں چھڑا لیتے ہو، اور اس سے سمجھتے ہو کہ تم نے بڑا نیکی کا کام کیا! حالانکہ خود ان لوگوں کو ان کے گھروں سے نکالنا وہ سنگین جرم تھا جس سے تمہیں منع کیا گیا تھا۔ سو تمہاری حالت یہ ہے کہ تم ضابطہ خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے سے انکار کرتے ہو۔ (حالانکہ جس طرح انسانی زندگی کے حصے بخرے نہیں کٹے جاسکتے اسی طرح اس ضابطہ خداوندی کبھی ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جاسکتا۔ اسے مانا جائے گا تو سب کا سب مانا جائے گا۔ اور انکار کیا جائے گا تو پورے کے پورے سے انکار کیا جائے گا۔ جس طرح جسم کے دو ٹکڑے کر دینے سے کوئی ٹکڑا بھی زندہ نہیں رہ سکتا اسی طرح جو قوم ضابطہ خداوندی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے، اور جو حصہ مفید مطلب جو اس پر عمل کرتی ہے اور دوسرے کو چھوڑ دیتی ہے، تو) اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا کہ ایسی قوم کے حال کی زندگی بھی ذلت اور رسوائی کی زندگی ہو، اور مستقبل کی زندگی بھی اندوہناک تباہیوں سے بریز۔ دنیا میں بھی ذلت اور آخرت میں بھی رسوائی۔

ضابطہ خداوندی سے اس قسم کا برتاؤ کرنے کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ یاد رکھو! خدا کے قانونِ مکافات کی نگاہوں سے تمہارا کوئی عمل پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔

(۸۶)۔ یہ لوگ محض ذاتی مفاد کی خاطر، ضابطہ خداوندی کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرتے ہیں، اور طبعی زندگی کی آسائشوں کے لئے مستقبل کی سرفرازیوں کو بیچ ڈالتے ہیں لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، ان کی یہ زندگی بھی تباہ ہو جاتی ہے، اور آخرت کی زندگی بھی خراب) اور یہ تباہی بڑھتی چلی جاتی ہے، اور کوئی ایسا نہیں ہوتا جو اس حال سے نکلنے میں ان کی مدد کر سکے۔ یہ درحقیقت نتیجہ ہوتا ہے اس غلط نظام کا جس میں صاحبِ اقتدار اور سرمایہ دار طبقہ کو کھلی چھٹی ہوتی ہے کہ وہ غریبوں اور محنت کشوں کا استحصال کر کے انہیں مفلس سے مفلس تر بناتے جائیں اور پھر صدقہ و خیرات سے ان کی بھولی میں بھیک کے چند ٹکڑے ڈال کر اپنے آپ کو فریب دے لیں کہ ہم بڑا ثواب کا کام کر رہے ہیں۔ یاد رکھو! غلط نظام سے پیدا ہونے والی تباہیاں اس قسم کے فریب نفس سے رک نہیں سکتیں وہ آکر رہتی ہیں۔

(۸۷)۔ تمہاری طرف قوانین خداوندی بھیجنے کا سلسلہ موسیٰ تک ہی نہیں رہا، بلکہ، اس کے بعد بھی، تمہارے پاس، مختلف رسول، یکے بعد دیگرے آتے رہے۔ آخر میں عیسیٰ ابن مریم آیا۔ اسے بھی ہم نے واضح دلائل و براہین دیتے تھے۔ یعنی ہم نے اُسے اس وحی کی رُو سے تائید و تقویت عطا کی تھی جو ہماری طرف سے بلا آمیزش اس نکت پہنچی تھی۔ اور تمہارا پاس انبیائے سابقہ کی جو وحی رہ گئی تھی اس میں تم نے اپنی طرف سے ہزار ملاوٹیں کر رکھی تھیں۔

لیکن تمہاری روش ہمیشہ یہ رہی کہ جب کبھی کسی رسول نے ایسی بات کہی جو تمہارے مفاد و رجحان کے خلاف جاتی تھی اور اس لئے تمہارا دل اُسے پسند نہیں کرتا تھا، تو تم وہیں اکڑ گئے۔ پھر ان رسولوں میں سے بعض کی تم نے تکذیب کی اور بعض کے قتل کے درپے ہو گئے۔

بہی کچھ اب تم اس کتاب کے متعلق کر رہے ہو، تاکہ اس میں تمہاری منشاء کے مطابق تبدیلی کر دی جائے۔

(۱۵) ذ ۱۱/۱۳ ذ ۱۶/۲۴ ذ ۱۷/۲۹ ذ ۱۸/۳۵)۔

(۸۸)۔ قرآنی تعلیم سے ان کی بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ اس پر غور کرنا تو ایک طرف۔ یہ اسے سننا تک بھی نہیں چاہتے۔ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر اس کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ (ان سے کہو کہ یہ کوئی خوبی اور فخر کی بات نہیں کہ تمہارے دل اس کا اثر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ دل کا فریضہ تو ہر بات پر غور و فکر کر کے سچی بات کو قبول کرنا ہے۔ جو دل ایسا نہیں کرتے، سمجھ لو کہ) وہ اپنی اس استعداد اور صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں ایسے لوگوں کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ جو بات بھی ان کے سامنے پیش کی جائے اس پر غور و فکر کرنے کے بجائے پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ہم نے اسے ماننا ہی نہیں (۲/۱۰)۔ اس قسم کی ذہنیت والوں میں سے بہت کم لوگ ایسے ہیں کہ صحیح بات کو سمجھ سوچ کر اسے تسلیم کر لیں۔

(۸۹)۔ ان کی یہ حالت اس وقت ہنور ہی ہے جب انکے پاس اللہ کی طرف سے وہ ضابطہ قوانین آجکا ہے جو ان اخلاقی اقدار اور دعاوی کو سچ کر دکھانے والا ہے جو تعلیم خداوندی میں سے ان کے ہاں موجود ہیں، اور جس کے لئے یہ خدا سے دعائیں مانگا کرتے تھے کہ وہ آئے تو یہ کفار پر غلبہ پاسکیں۔ یہ خوب پہچانتے ہیں کہ یہ ضابطہ قوانین خدا ہی کی طرف سے نازل ہوا ہے، لیکن اس کے باوجود، یہ اس سے انکار کر رہے ہیں۔ لیکن اس انکار سے انہوں نے اس ضابطہ خداوندی کا کیا بگاڑا؟ اس سے ہوا یہ کہ یہ خود اس کی برکات سے محروم رہ گئے۔

(۹۰)۔ تمہیں معلوم ہے کہ ان کے انکار کی اصلی وجہ کیا ہے؟ صرف یہ حسد کہ یہ رسول غیر اسرائیلی کیوں ہے! (انہوں نے از خود یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ دنیا بھر کی برکات و سعادات بنی اسرائیل کے لئے مخصوص ہو چکی ہیں، حتیٰ کہ نبوت بھی انہی کی قومیت کے دائرے میں محدود ہے) حالانکہ نبوت ایک ایسی موہبت ہے جو خدا کے قانون مشیت

کے مطابق اسے دی جاتی ہے جسے اس کا اہل سمجھا جائے۔ (اس میں، قوم اور وطن اور زبان اور رنگ کی کوئی خصوصیت نہیں)۔
 بہر حال، ان کی اس ضد سے اس کے سوا اور کیا ہوا کہ یہ زندگی کی تمام خوشگوار یوں سے محروم رہ گئے۔ ان کی
 امیدوں کی کھیتی جل کر راکھ ہو گئی اور ان کا انکار اور سرکشی ان کے لئے ایسی ذلت آمیز تباہی کا موجب بن گئی جس نے
 ان کی ساری اجتماعی قوت کو توڑ کر رکھ دیا۔ کتنا بُرا ہے یہ سودا جو انہوں نے اپنی زندگی کے عوض کیا ہے!!
 اور یہ انجام ہر اس قوم کا ہوتا ہے جو قوانین خداوندی سے سرکشی اختیار کرے۔

(۹۱)۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ! اس ضابطہ خداوندی کی صداقتوں پر ایمان لاؤ، تو اس کے جواب میں یہ کہتے
 ہیں کہ نہیں ہم تو صرف اسی پر ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوا تھا۔ اس کے سوا ہم کسی اور تعلیم پر ایمان لانے
 کے لئے تیار نہیں۔ حالانکہ یہ قرآن (ان کی طرف بھیجی ہوئی سچی تعلیم کے خلاف نہیں بلکہ ان اقدار اور دعائی کو سچ کر دکھانے
 والا ہے جو تعلیم خداوندی میں سے ان کے پاس موجود ہیں۔

ان سے کہو کہ (اگر تمہارا اعتراض یہی ہے کہ ہم اس فرمان کو اس لئے نہیں مانتے کہ یہ ایک غیر اسرائیلی کی طرف
 نازل ہوا ہے تو) بتاؤ کہ، اس سے قبل، جو اسرائیلی انبیاء تمہاری طرف آتے رہے تھے، تم ان کی تذلیل و تحقیر پر کیوں
 اُتر آیا کرتے تھے۔ ان کی تعلیم کو غیر موثر کیوں بنا دیا کرتے تھے۔ اور ان کی جان تک کے دشمن کیوں بن جایا کرتے تھے؟
 تمہارا یہ دعویٰ کہ تم اسرائیلی انبیاء پر ایمان لایا کرتے تھے، خود تمہاری اپنی تائیدِ سخ کی رُو سے جھوٹا ثابت ہو رہا ہے۔
 (۹۲)۔ دیگر انبیائے بنی اسرائیل کو تو چھوڑو، تم نے خود موسیٰؑ کے ساتھ کیا کیا؟ وہ تمہارے پاس ایک واضح ضابطہ
 قوانین لایا تھا (جس کی بنیاد ہی تعلیم توحید تھی)۔ لیکن تم نے، اُسے چھوڑ کر، گویا سالہ پرستی شروع کر دی۔ کہو! ایمان
 تھا یا کفر؟ یہ اطاعت تھی یا سرکشی؟

(۹۳)۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے (۲/۲۳) جب ہم نے تم سے، دامنِ کوہ میں، اس بات کا پختہ عہد لیا تھا کہ تم اس
 ضابطہ خداوندی کو پوری قوت سے تھامے رہو گے، تو تم سے کہہ دیا گیا تھا کہ تم اس بات کو دل کے کانوں سے سن لو! اور
 اچھی طرح سمجھ لو۔ تم نے جواب دیا تھا کہ ہم نے اسے اچھی طرح سن اور سمجھ لیا ہے۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ ہوایا کہ تم نے ان قوانین کی عادت
 کے بجائے ان سے سرکشی اختیار کر لی۔ یہ اسلئے کہ گویا سالہ کی عقیدت تمہارے دل کی گہرائیوں میں اتار چکی تھی۔ تمہارے خون میں حلول کر چکی تھی۔

ان سے کہو کہ یہ ہے تمہارا سابقہ ریکارڈ! لہذا، تمہارا یہ کہنا کہ ہم اس لئے قرآن پر ایمان نہیں لاتے کہ ہم اس ضابطہ
 خداوندی پر ایمان رکھتے ہیں جو ہماری طرف نازل ہوا تھا، خود فریبی اور فریب دہی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر تمہارا ایمان
 تمہیں یہی کچھ سکھاتا ہے، اور اس قسم کی زندگی بسر کرنے کا حکم دیتا ہے تو ہزار افسوس ہے ایسے ایمان پر!

(۹۳)۔ ان سے کہو کہ تمہارا یہ بھی دعویٰ ہے کہ تم خدا کی چہیتی اولاد ہو (۱۵)۔ اور آخرت کا گھر، یعنی جنت، تمہارے لئے مخصوص ہے (۶)۔ اور غیر اسرائیلیوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں (۱۱)۔ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو تمہیں موت سے کبھی نہیں ڈرنا چاہئے، بلکہ اس کی تمنا کرنی چاہئے۔ تمہیں نکھر کر میدان جنگ میں سامنے آنا چاہئے۔ چھپ چھپ کر سازشیں نہیں کرنی چاہئیں۔ موت تو حسن عمل کا پہلا امتحان ہے، (۱۲ ذ ۶)۔

(۹۵)۔ لیکن تم دیکھو گے کہ یہ لوگ مرنے کیلئے کبھی تیار نہیں ہوں گے، اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ انہوں نے اپنی مستقبل کی زندگی کیلئے کیا کمائی کر کے آگے بھیجی ہوئی ہے۔ اللہ، اس قسم کے فریب کار سرکشوں کی ابلہ فریبیوں سے خوب واقف ہے۔ (۹۶)۔ مرنے کی تمنا تو ایک طرف، تم دیکھو گے کہ یہ لوگ، زندہ رہنے کے لئے، مشرکین عرب سے بھی زیادہ حریص ہیں۔ ان میں سے ایک ایک کی تمنا یہ ہے کہ اُسے ہزار سال کی عمر مل جائے۔ لیکن، یہ نادان (تنا نہیں سمجھتے کہ اس درازی عمر سے کیا ہوگا؟ کیا اس سے یہ اپنے غلط اعمال کے تباہ کن نتائج سے بچ جائیں گے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ خدا کا قانون مکافات ان کے ایک ایک کام پر نگاہ رکھتا ہے۔ اسلئے ان کے بر عمل کا نتیجہ ان کے سامنے آکر ہے گا۔

(۹۷)۔ یہ لوگ جبریل سے ناراض ہو رہے ہیں کہ اس نے ایک غیر اسرائیلی کو وحی کیوں دیدی (۲)۔ ان سے کہو کہ اس میں جبریل سے ناراض ہونے کی کونسی بات ہے؟ وہ از خود تو کسی کی طرف وحی نہیں لے جاتا۔ اس نے اس قرآن کو قلبِ محمّی پر خدا کے حکم کے مطابق نازل کیا ہے اور جو کچھ نازل کیا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ان دعادی کو سچ کہہ دھانے والا ہے جو خود تمہارے ہاں موجود ہیں۔ اور تیسرے یہ کہ یہ وحی، ہدایت و سعادت کو بنی اسماعیل میں محدود نہیں کرتی کہ تمہیں شکایت ہو کہ تم اس سے محروم کر دیئے گئے ہو۔ یہ تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلی ہے، اور ان لوگوں کی جو اس کی صداقتوں پر ایمان لائیں، زندگی کی صحیح منزل کی طرف راہ نمائی کرتی ہے اور حال و مستقبل کی خوشگوار یوں کی خوشخبری دیتی ہے (خواہ وہ کسی نسل سے کیوں نہ ہوں)۔

(۹۸)۔ ان سے کہو کہ تمہارے اس اعتراض کی نشتر، صرف جبریل تک ہی نہیں پہنچتی۔ یہ تو خود خدا پر اعتراض ہے اور اس کے تمام نظام وحی پر، اور ان وسائل پر جو اس کے حکم سے تدبیراً مقرر کرتے ہیں۔ یعنی جبریل و میکائیل سمیت تمام ملائکہ پر اعتراض۔ اس قسم کا اعتراض، درحقیقت، خدا اور اس کے نظام سے کھلا جوا انکار ہے۔ سوچو، کہ جو لوگ اس قسم کی روش اختیار کئے ہوں، خدا ان کا دوست کیسے ہو سکتا ہے!

(۹۹)۔ ان سے کہو کہ تمہاری تمام مخالفت، اور حسد و عناد کے علی الرغم، خدا نے یہ واضح تعلیم تیری طرف نازل کی ہے۔ اس سے وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو زندگی کے صحیح راستے کو چھوڑ کر غلط راہوں پر چل نکلے ہوں۔

(۱۰۰)۔ (یہ تو ہے ان کی اعتقادی زندگی کا عالم باقی ہی ان کی عملی زندگی، سو اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب یہ کسی سے عہد پیمان کرتے ہیں تو اگرچہ وہ عہد و پیمان پوری کی پوری قوم کی طرف سے ہوتا ہے لیکن) ان میں سے ایک جماعت اس معاہدہ کو ردی کا غذا کا ٹکڑا سمجھ کر پھینک دیتی ہے اور اس کا کوئی احترام نہیں کرتی۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ کسی مستقل قدر اور غیر متبدل اصول پر ایمان ہی نہیں رکھتے، مصلحت کو مٹتی ان کا شیوہ اور مفاد پرستی اس کا شعار ہے۔ وہ کسی طریق سے بھی حاصل ہوا۔

(۱۰۱)۔ (لے رسول! یہ جو اس طرح تمہاری مخالفت کر رہے ہیں۔ تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یہ ہمیشہ یہی کچھ کرتے رہے ہیں۔ قتلًا تم سے پہلے) جب ان کی طرف ایک رسول (عیسےؑ) آیا۔ وہ رسول جو تمہاری طرح) ان اقدار و عادی کو بچ کر دکھانے والا تھا جو تعلیم خداوندی میں سے ان کے پاس موجود تھے۔ (اور وہ بنی اسرائیل میں سے تھا، اور ان کی کتابوں میں اس کا صریح ذکر بھی موجود تھا) لیکن اس کے باوجود، ان لوگوں کے ایک گروہ نے، جو کتاب الہی اپنے پاس رکھتے تھے، اس کتاب کو یوں پس پشت ڈال دیا، گویا وہ اُسے جانتے تک نہ تھے (اور اس رسول کے قتل تک کے درپے ہو گئے)۔

(۱۰۲)۔ (ان لوگوں کا شیوہ ہی یہ رہا ہے کہ یہ خدا کی سچی تعلیم کو ٹھکراتے رہے) اور اپنے خود ساختہ افسانوں کے پیچھے لگے رہے۔ ان افسانوں میں ایک یہ بھی تھا کہ (انہوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ خدا کا برگزیدہ پیغمبر سلیمانؑ حقائق خداوندی کو چھوڑ کر، سحر آفرینیوں اور شعبدہ بازیوں کو ماننے لگ گیا تھا۔

سلیمانؑ خدا کا پیامبر، اور اس قسم کی کافرانہ روش کا حامل! یہ کیسے افترا پردازی تھی، جو اس کی نبوت کے خلاف ان شیاطین نے تراش رکھی تھی۔ اس باطل روش کا اتباع سلیمانؑ نے نہیں کیا تھا، خود ان کے فتنہ پرداز سرغنوں نے کیا تھا۔ وہ لوگوں کو جادو، ٹوٹے سکھاتے تھے (اور اسے منسوب کرتے تھے سلیمانؑ کی طرف)۔

پھر ایک افسانہ یہ بھی تھا (جو انہوں نے مشہور کر رکھا تھا) کہ بابل میں دو فرشتے تھے۔ ہاروت و ماروت۔ ان پر خدا نے اس علم (جادو) کو نازل کیا تھا۔ لوگ ان کے پاس جا کر اس قسم کے تعویذ گنڈے سیکھتے جن سے دیاں بڑی میں افتراق پیدا ہو جاتے۔ لیکن وہ (فرشتے) یہ کچھ سکھانے سے پہلے لوگوں سے کہہ دیتے کہ بھائی! ہم تو ایک فتنہ ہیں۔ تم یہ کچھ سیکھ کر کیوں کافر بننے ہو۔ لیکن اس کے باوجود، لوگ ان سے یہ باتیں سیکھتے۔ ان باتوں میں لذت ہی ایسی ہوتی ہے)۔

لیکن یہ سب افسانہ ہی افسانہ ہے۔ نہ بابل میں اس قسم کے کوئی فرشتے تھے۔ اور نہ ہی خدا نے انہیں کوئی باطنی علم سکھایا تھا۔ یہ سب ان لوگوں کی خود ساختہ کہانیاں ہیں۔

باقی رہے گندے، تعویذ۔ سو یہ، ان کے ذریعے کسی کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ نفع و نقصان، سب قوانین خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ تعویذ گندے سیکھنے (اور کرنے) والوں کو اس سے کچھ دنیاوی مفاد ضرور حاصل ہو جاتے ہیں؛ لیکن ردِ انظارِ تعمق دیکھا جائے تو یہ حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے کہ اس میں ان کا نقصان ہی ہے، نفع نہیں۔ اس لئے کہ اس سے انہیں دنیاوی مفاد حاصل ہو جاتے ہیں، لیکن مستقبل کی خوشگوازیوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ مستقبل کی خوشگوازیوں کے مقابلہ میں، عاجلہ مفاد کچھ وزن نہیں رکھتے) — جو شخص جانے کر، جسم کی لذتیں خریدتا ہے، اس کی تجارت نفع کا سودا کس طرح قرار پاسکتی ہے؟ اے کاش! یہ اس قدر کھلی ہوتی بات کو سمجھ سکتے۔ (۱۰۳) اگر یہ لوگ ان افسانوں کے پیچھے لگنے کے بجائے، قرآنی حقائق پر ایمان لے آتے، اور قوانین خداوندی کی نگہداشت کرتے تو خدا کے ہاں سے انہیں اس کا بہت اچھا بدلہ (نتیجہ) ملتا — کاش، یہ عقل و فکر سے کام لیتے!

(۱۰۴) اے جماعتِ مومنین! اس مقام پر ایک اہم حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ تم نے دیکھا ہے کہ یہودیوں کی فہمیت یہ تھی کہ وہ موسیٰ سے بار بار اس قسم کے مطالبے کرتے تھے کہ ہمارے لئے یہ جہیز کر دو تو ہم تمہاری بات مانیں گے۔ یہ روش زندگی غلط ہے تم یہ نہ کرنا کہ اپنے نظام سے اس قسم کی سودے بازی شروع کر دو۔ اور اس سے کہہ دو کہ اگر تم ہماری رعایت کرو گے تو ہم تمہاری رعایت کریں گے۔۔۔۔۔ تمہارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہئے کہ تم اپنے رسول (نظامِ خداوندی کے مرکز) سے یہ کہو کہ آپ ہم پر نگاہ رکھیں کہ ہم بے راہ نہ ہونے پائیں، اور ہم آپ کی اطاعت کرتے جائیں گے۔ نیز باہمی گفتگو میں، ذو معنی الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ نہ ہی بات تو ٹوڑوڑ کر کرنا چاہئے یہودیوں کی یہ بھی عادت (۱۰۵) یاد رکھو! یہ باتیں یوں تو بڑی عام سی دکھائی دیتی ہیں، لیکن ان کے اثرات بڑے دور رس ہوتے ہیں۔ جو لوگ ان حقیقتوں سے انکار کرتے ہیں وہ الم انگیز عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

(۱۰۵) ان اہل کتاب، اور مشرکین عرب میں سے جو لوگ قرآن پر ایمان نہیں لاتے، وہ اسے دیکھ ہی نہیں سکتے کہ تمہاری طرف خدا کی وحی آئے (۳۰ ذ ۱۶) اور اس کی بنا پر تمہیں زندگی کی خوشگوازیوں حاصل ہوں۔ لیکن اس میں ان کے چاہنے یا نہ چاہنے کا کیا سوال ہے؟ یہ سب کچھ خدا کے قانون کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ جس فرد کو چاہتا ہے وحی کے لئے چن لیتا ہے، اور پھر جو چاہے اس وحی کی خیر برکت سے مستفید ہو سکتا ہے۔ اس کی نعمتوں کا دسترخوان ہر شخص کیلئے کھلا ہے۔ جو ہاتھ بڑھا کر کچھ لینا چاہے لے لے۔

(۱۰۶) ان (اہل کتاب) کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ جب خدا کی کتابیں پہلے سے موجود تھیں، تو پھر ایک نئی کتاب (قرآن) کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔ نیز یہ بھی کہ اگر یہ کتاب خدا کی طرف سے ہے تو اس میں ایسے احکام کیوں ہیں جو خدا کی پہلی وحی (تورات) کے خلاف ہیں

ان سے کہہ دو کہ ہماری طرف سے وحی کا انداز یہ ہے کہ کسی سابقہ رسول کی وحی کے ایسے احکام، جو وقتی طور پر نافذ العمل رہنے کے لئے دیئے گئے تھے، انہیں، بعد میں آنے والے رسول کی وحی کے احکام سے بدل دیا جاتا ہے، اور یہ نئے احکام پہلے احکام سے بہتر ہوتے ہیں۔ جن سابقہ احکام کے متعلق اس کا فیصلہ ہوتا ہے کہ انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جائے، یا جنہیں سابقہ رسولوں کی قومیں ترک یا فراموش کر دیتی ہیں، یا ان میں اپنی طرف سے آمیزش کر دیتی ہیں (۲۲)۔ ان کی جگہ، انہی جیسے احکام جدید وحی میں دیدیتے جاتے ہیں (۱۶)۔ اور یہ سب کچھ ہمارے مقرر کردہ اندازوں کے مطابق ہوتا ہے جن پر ہمارا پورا پورا کنٹرول ہے۔

انہی اندازوں کے مطابق اب یہ آخری ضابطہ حیات دیا گیا ہے، جس میں تمام سابقہ سچائیاں آگئی ہیں (۵)۔ جو ہر طرح مکمل ہے (۶)۔ اور جو ہمیشہ محفوظ رہے گا (۱۴)۔ اس لئے یہ ضابطہ، اب تمام سابقہ ضوابط کی جگہ لے لے گا، اور ہمیشہ نافذ العمل رہے گا۔

(۱۰)۔ ان سے کہو کہ اس بارے میں کوئی شخص خدا پر اعتراض نہیں کر سکتا کہ اس نے وحی کا انتظام ایسا کیوں رکھا ہے؟ کیا انہیں اس کا علم نہیں کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں سب اقتدار اسی کا ہے، اس لئے وہی جانتا ہے کہ کونسا قانون کب نافذ کرنا چاہئے۔ (ان سے کہہ دو کہ)، اس کے باوجود، اگر تم اس ضابطہ قوانین کی اطاعت سے انکار کرتے ہو گے تو تم خود دیکھ لو گے کہ کوئی دوسرا ضابطہ، زندگی کی مشکلات دور کرنے میں تمہارا کارساز اور مددگار نہیں ہو سکے گا۔

(۱۱)۔ اس سلسلہ میں (اے جماعتِ مومنین!) تم بھی ایک بنیادی حقیقت کو سمجھ لو۔ اور وہ یہ کہ جس قدر احکام قوانین کا دیا جانا خدا کو مقصود ہے، وہ سب، از خود، قرآن میں دیدیتے جاتیں گے، اور جن امور کے متعلق کچھ نہیں کہا جاتے گا، ان کے متعلق سمجھ لینا چاہئے کہ ایسا دانستہ کیا گیا ہے، خدا سے بھول نہیں ہو گئی۔ لہذا ان امور کے متعلق تم اپنے رسول سے، اس قسم کے سوالات نہ شروع کر دینا جس قسم کے سوالات، اس سے پہلے، بنی اسرائیل اپنے رسول موسیٰ سے کیا کرتے تھے۔ (اس کو یاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ایسی باتوں کو اپنے لئے غیر متبدل شریعت بنا لیا جن کا ہمیشہ کے لئے نباہنا مشکل تھا۔ آخر الامر انہیں ان سے انکار کرنا پڑا۔ سو تم بھی ایسا نہ کرنا (۱۲)۔ جو قوم بھی ایمان سے بہرہ یاب ہو کر پھر کفر کی روش اختیار کرے، فلاح و بہبود کی راہ اس سے گم ہو جاتی ہے۔

(۱۳)۔ ان اہل کتاب میں سے اکثر چاہتے ہی یہ ہیں کہ تمہارے اس ایمان کے بعد، تمہیں پھر کفر کی طرف لڑا دیں۔ یہ اس لئے نہیں کہ حقیقت ان پر واضح نہیں ہوئی۔ حقیقت تو ان کے سامنے نکھر کر آچکی ہے، لیکن یہ اپنے قومی تعصب کی بنا پر اس دین کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں، اور نہ ہی دیکھ سکتے ہیں کہ اس نظام زندگی کی برکات سے تم فیض یاب ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کا علاج کیا ہے؟ تم ابھی اپنے نظام کے ابتدائی دور سے گزر رہے ہو۔ اس لئے اُن سے اُلجھ کر اپنا وقت اور توانائی ضائع مت کرو۔ اس وقت تک کہ فیصلہ کن انقلاب کا مرحلہ سامنے نہ آجائے، تم ان سے اُڑھو، اور ان کا خیال کئے بغیر اپنے پروگرام کی تکمیل میں آگے بڑھتے جاؤ، اور جو کچھ یہ کہتے ہیں اس سے درگزر کرو (۱۱/۱۵)۔ خدا ہر بات کے اندازے سے واقف ہے اور حالات پر پورا پورا کنٹرول رکھتا ہے۔ اس لئے وہ جانتا ہے کہ کس موقع پر کونسی روش اختیار کرنی چاہئے۔

(۱۱۰) اس پروگرام کی تکمیل، اقامتِ صلوٰۃ اور اتیانِ زکوٰۃ سے ہوگی۔ یعنی ایسا معاشرہ قائم کرنے سے جس میں ہر فرد قوانینِ خداوندی کے پیچھے چلتے ہوئے، ان کی رو سے عائد شدہ فرائض کو ادا کرتا جائے، اور نوعِ انسان کی نشوونما کا سامان ہم پہنچاتا رہے (۱۲)۔ اس ابتدائی مرحلہ میں ایسا محسوس ہوگا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو، اس کا کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہو رہا۔ لیکن، یقین رکھو کہ تمہاری محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ تم اپنی محنتوں کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق، وقتِ مقررہ پر، اپنے سامنے دیکھ لو گے (۱۳)۔ کسی کا کوئی عمل، اس کے قانونِ مکافات کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتا۔

(۱۱۱) ان (اہل کتاب) کا دعوئے ہے کہ حُزتِ لبس انہی (یہود و نصاریٰ) کے لئے مخصوص ہو چکی ہے، ان کے علاوہ اس میں کسی اور کا داخلہ نہیں ہو سکتا۔ (۱۴)۔ یہ ان کی خوش فہمی ہے جو ان کے فریبِ نفس اور جہالت نے پیدا کر رکھی ہے۔ ان سے کہو کہ، ذرا جذبات سے الگ ہٹ کر، علم و بصیرت کی رو سے بات کریں، اور اگر یہ اپنے اس دعوئے میں سچے ہیں، تو اس کی تائید میں دلائل و براہین پیش کریں۔ حقائق کے فیصلے خوش آئند جذبات کی رو سے نہیں ہوا کرتے، علم و برہان سے ہوتے ہیں۔

(۱۱۲) اور علم و برہان کا فیصلہ یہ ہے کہ زندگی کی خوشگواریاں اور کامرانیاں، قومی گروہ بندیوں اور دل خوش کن آرزوؤں سے وابستہ نہیں۔ ان کے لئے ایک ابدی اور غیر متبدل قانون ہے۔ اور وہ قانون یہ ہے کہ جس کسی نے بھی اپنے آپ کو قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکا دیا۔ جس نے اپنا رخ اس منزل کی طرف کر لیا جو اللہ نے انسانوں کے لئے مقرر کی ہے۔ اور اس کے بعد (افراط و تفریط کو چھوڑ کر) (۱۵)؛ (۱۶)، حسن کارانہ انداز سے قرآن کے مطابق زندگی بسر کی، تو اس کے اس ایمان و عمل کا نتیجہ خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق اسے مل جائے گا۔ ایسے لوگوں کی نشانی یہ ہوگی کہ نہ ان کے لئے کسی قسم کا خوف و خطر ہوگا، اور نہ ہی افسردگی اور غمگینی۔